من و یزداں

میں اور میرا خُدا

علّامہ نیاز فتح پوری

آواز اشاعت گھر
الکریم مارکیٹ' اردو بازار لاہور

محمد شعیب عادل نے
یمانی پریس سے چھپوا کر
آواز اشاعت گھر لاہور سے شائع کی
قیمت: 400 روپے

ڈسٹری بیوٹر
دوست ایسوسی ایٹس
الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون: 7122981

فہرست

خدا ہے یا نہیں؟

اس کا جواب سورج کے طلوع و غروب سے چاہو' چاند کے ایاب و ذہاب سے پوچھو' آبشاروں کی روانی اور وشت و صحرا کی ویرانی سے دریافت کرو' پہاڑوں کے سکوت اور دریاؤں کے شور سے طلب کرو۔

موسموں کا باقاعدہ تغیرو تبدل' بہار خزاں کا ظہور وخفا۔ نباتات کی بوقلمونی و حوش و طیور کی طبیعی نیرنگی' نوع انسانی کے قوائے کا منہ' فضائے بسیط کے ستارے' کائنات کی لا انتہا وسعت' خورد و شبنم' ذرہ و آفتاب اور ان سے بھی فروتر انسانی مساعی کی مختلف صورتیں (جن کا نام ہم نے (علم طبقات الارض' علم الجو' علم الافلاک' علم الکیمیا' علم وظائف الاعضا' علم الہیات' نفسیات وغیرہ رکھا ہے' بتائیں گی کہ یقیناً" کوئی ایسی قوت موجود ہے جس کے سمجھنے کے لیے ہم اپنی عقل کو عاجز بے بس پاتے ہیں اور اسی لیے یہ مسئلہ اس قدر بدیہی' اس درجہ روشن و واضح ہے کہ اگر چاہوں تو ایسے مشاہدات سے تعبیر کر سکتا ہوں جس کے لیے نہ کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی حجت و استدلال کی۔

آفتاب طلوع ہوتا ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے آگاہ ہو جاتا ہے صبح کو پھول کھلتے ہیں اور سارا کنج نکہت سے معمور ہو جاتا ہے' یہ وہ حقیقت ہے جو آپ اپنی برہان ہے' یہ وہ صداقت ہے جو آپ اپنی مصدق ہے اگر ہم اس سے ناواقف ہیں تو کس کا قصور!

حق خامش ست و باتو بصدرنگ گفتگوست
شوق آرمیدہ است و فسلک تاز جستجواست
موقوف اضطراب زبان نیست عرض راز
گر • داری اشارہ تحقیق موبموست
ہرگہ نظر خطاب کند حرف خامشی ست
ہر جا بہار ساز شود نغمہ رنگ و بوست
کثرت حجاب جلوہ وحدت نمی شود
مژگاں بہم چہ بازکنی دیدہ محولوست

پھر اب اور نہ کبھی' یہ سوال تو پیدا ہی نہیں ہوا کہ کوئی قوت مافوق الادراک ہے یا نہیں البتہ عقول انسانی کا اختلاف اس امر میں ضرور ہوا ہے کہ ہم اس کا تصور کیونکر کریں' اس نہ دیکھے جا سکنے والے کو کیونکر دیکھیں اور اس نہ سمجھے جا سکنے والے کو کس طرح سمجھیں فلسفہ آج تک اس گرہ کو نہ کھول سکا' مذہب کی عقدہ کشائیاں تمامتر ——— سے وابستہ رہیں اور مختلف زمانوں میں' مختلف قوموں نے مختلف طریقوں سے اسی مسئلہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا لیکن کیا یہ امر حیرت ناک نہیں کہ باوجود اس کے کہ حقیقت ایک ہے مگر تعبیرات بے انتہا' شاہد ایک ہے مگر اس کی داستانیں کثیر!

حسنک واحد و عبارا تنا شتے

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ راعذر نبہ

چوں ندید حقیقت رہ افسانہ زوند

مذاہب عالم اور اقوام و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو گا کہ کفر و اسلام' اذان و ناقوس کی جنگ جو آج نظر آ رہی ہے' کوئی نئی چیز نہیں بلکہ اس کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی ہے جب انسان اپنا جذبہ تفوق پرستی لے کر سامنے آیا پھر یہ جنگ یقیناً" علم و مذہب کی جنگ نہیں' کیونکہ اگر مذہب کا مقصود حقیقی صرف خدا شناسی ہے تو پھر مجھے کوئی سمجھائے کہ دنیا کا وہ کون سا علم ہے جو معناً" اس غائت تک نہیں پہنچتا' بلکہ یہ جنگ ان رقیبوں کی تھی جو ایک ہی محبوب کے جلوہ کے لیے بیتاب تھے' ان جاندار گان خود فراموش کی تھی جو سوا اپنے کسی اور کو "خلوتیان راز" میں شامل دیکھنا پسند نہ کرتے تھے' یا زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہیے کہ وہ اپنے ہی ذوق محمود کا تفوق ثابت کر کے آستان "محبوب" کو اپنے لیے مخصوص کر لینا چاہتے تھے اور یہ کمزوری کم و بیش ہر زمانہ کے انسان میں پائی گئی ہے اور اج بھی تمام افتراق و انشقاق اسی کمزوری کا نتیجہ ہے۔

فلسفہ و استدلال کی دنیا میں آکر جس وقت اس مسئلہ پر غور کیا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ خدا کے جس تصور کو مذاہب عالم نے پیش کیا وہ صحیح نہ تھا' ہو سکتا ہے کہ صرف قومی نظام تمدن کے لحاظ سے وہ کسی قوت مناسب رہا ہو لیکن اخوت عامہ اور ہمہ گیری کے لحاظ سے وہ ناکمل تھا۔ دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ایسا ہوا ہے جس نے ہزاروں لاکھوں سال کی اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھایا اور اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اب نہ مذہب کے لحاظ سے کسی اور مذہب کی ضرورت دنیا کو باقی ہے نہ مبلغ مذہب کی حیثیت سے

کسی اور ہستی کے رونما ہونے کی ضرورت ہے اور وہ مذہب اسلام ہے جو نہ کسی ملک کے لیے مخصوص ہے نہ کسی قوم کے لیے مختص' اس کی دعوت گبرو ترسا یہود و نصاریٰ' عالم و جاہل' امیر و فقیر' شاہ و گدا' مشرق و مغرب' شمال و جنوب' ہر طبقہ و ہر ملک کے لیے یکساں ہے۔ اور اسی لیے اس نے جو مفہوم خدا کی کبریائی کا پیش کیا ہے وہ ایسا جامع' ایسا قرین عقل' ایسا ہمہ گیر اور اس درجہ وسیع ہے کہ جس آسانی سے ایک جاہل اسے قبول کر سکتا ہے بالکل اسی طرح ایک فلسفی بھی اس کے ماننے پر مجبور ہے۔

وہ زمانہ جب "آسمانی بادشاہت" کا وعظ کہہ کر خدا کو ایک دنیاوی صاحب جبروت بادشاہ کی طرح پیش کیا جاتا تھا' ختم ہو گیا۔ وہ عہد جب عقول انسانی صرف مرئی و محسوس اشیاء پر ایمان لا سکتے تھے اور جب ضرورتاً" و مصلحتاً" مسیح کو خدا کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت ہوئی تھی' گذر گیا' وہ دور انسانیت جب تمرکز نفس Concentration Of Mind کے لیے رمزی اور اشاری Symbolic طریق عبادت محسوس کر کے خدا کے وجود کو بتوں' ہیکلوں' تمثالوں اور مجسموں میں تبدیل کیا گیا' باقی نہیں ہے' یہ تمام زمانے اب سے تقریباً" 1400 سال قبل ختم ہو گئے جب ریگستان عرب سے ایک انسان کامل کا ظہور ہوا اور اس نے نہایت ہی مختصر سادہ الفاظ میں خدا کے وجود کا وہ فلسفہ بیان کیا جو اس سے قبل کسی نے بیان نہ کیا تھا۔ اس نے ثنویت و تثلیث کی تردید کی' اس نے تجسیم و تشکیل کو غلط ٹھہرایا' اس نے تشت و انتشار کو محو کیا' تفریق و افتراق کی راہوں کو بند کیا اور اپنے بتایا کہ خدا تمام مکانیات و زمانیات سے بے نیاز ہے' مادیات کی دنیا سے علیحدہ ہے اور تمام ان نسبتوں و اضافتوں سے منزہ جو عقول انسانی کو کسی وجود کے سمجھانے کے لیے متعین کی جاتی ہیں۔

ایک طرف تو اس نے بتایا کہ اس کا قیام عرش بریں پر ہے یعنی ذات انسانی سے علیحدہ کائنات کی فضائے وسیع و لا متناہی میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور دوسری طرف اس کو شہ رگ سے زیادہ قریب بتایا یعنی جس حد تک ذات انسانی کا تعلق ہے اس کے قرب کی کوئی انتہا نہیں' وہ سانس میں جاری ہے' خون میں ساری ہے' روح میں دوڑ رہا ہے' قلب میں جاگزیں ہے اس کو رحمان و رحیم بتایا' اور جبار و قہار ظاہر کیا' بہ ظاہر یہ نام ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن یہیں سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جن کو اسماء حسنیٰ کہا جاتا ہے وہ نہ خدا کے ذاتی نام ہیں نہ صفاتی بلکہ آثاری و مظاہری اسماء ہیں جن کا تعلق کائنات کے ہر تغیر و تبدل' زندگی کے تمام اصول اور ہستی کے جملہ اعتبارات و امتیازات سے ہے

یعنی اگر انسان خوش و پر امن زندگی بسر کر رہا ہے تو یہ بھی اسی کا مظہر ہے اور اگر قہر و جبر کی ساعتیں گزار رہا ہے تو یہ بھی اسی ایک ذلت کی وجہ سے ہے جس نے اسباب و علل پیدا کر کے عالم کی تمام کیفیات مادی و ذہنی کو اپنے سے منسوب کیا اور جن کے ترک و اختیار کے لیے انسان کو عقل کامل عطا فرمائی۔

یہ تھا خدا کا وہ تصور جو بانی اسلام نے بتایا' اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس سے زیادہ پاکیزہ و منزہ خیال جو بلند ترین فکر انسانی کے لیے بھی قابل قبول ہو اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہی ہے وہ اصل اصول مذہب جو انسان کو وسیع النظر بناتا ہے' جو تمام افراد کو ایک رشتہ اخوت سے وابستہ کر سکتا ہے اور جو دلوں کو تعصب و جہل کینہ و بغض سے پاک رکھتا ہے لیکن کیا کوئی مسلمان آج ایسا ہے جو کہہ سکے کہ وہ خدا کو ایسا ہی سمجھ رہا ہے جیسا بانی اسلام نے سمجھایا تھا اور اس کی آغوش ہر انسان کے لیے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کسی ملک و قوم کا ہو پوری طرح کھلی ہوئی ہے'

ہمارے ہاں کے علماء مقدس جو اپنی ساری زندگی صرف روزہ نماز کی تلقین میں بسر کر دیتے ہیں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی غور نہیں کرتے کہ جس خدا کا پیام وہ دنیا کو پہنچا رہے ہیں وہ پہلے روزہ و نماز کے مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس تعلق کی تصدیق چاہتا ہے جو اس کے اور بندوں کے درمیان قائم ہے اور جس کے سمجھنے پر کائنات کی ترقی' روح کا استعلا' اخلاق کی پاکیزگی' مادی ارتقاء اور عالم امن و سکون منحصر ہے' اگر ایک مسلمان نماز پڑھنے کے بعد مسجد سے یہ خیال لے کر نکلتا ہے کہ مندر و کلیسا خدا کی حکومت سے علیحدہ ہیں اگر وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر اپنے سوا تمام عالم کو غیر خدا کی مخلوق سمجھتا ہے تو مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم!

پھر جب خدا سب کا ہے تمام مخلوق اسی کی ہے جب اس کو نہ مذہب سے فائدہ پہنچتا ہے نہ لا مذہبیت سے نقصان تو پھر یہ عصبیت کیوں' یہ تفوق و برتری کا غلط معیار کیسا' طریق عبادت کے اختلاف پر جنگ کیا معنی' وضع و لباس کی تفریق' تمدن و معاشرت کے امتیازات پر آویزش کیسی؟

دل چو آزاد از تعلق شد منور می شود
قطرہ کز موج دامن چید گوہری شود
ہیچکس را در محبت شرم ہم چشمی مباد

در ہوایت ہر کہ گرید دیدہ ام ترمی شود

"انسانیت" اب نہیں بلکہ طفولیت ہی سے حسن و جمال کا خواب دیکھ رہی ہے اور جس حد تک اس کا علم اور اس کے مشاعر بڑھتے جاتے ہیں اسی قدر زیادہ شدت و تنوع کے ساتھ یہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے چنانچہ ایک صاحب فن اپنے فن میں' ایک شاعر اپنے شعر میں' ایک ادیب اپنی انشا میں' ایک فیلسوف اپنے فلسفہ میں' یہاں تک کہ ایک مادہ پرست بھی (جو اپنی فطرت کے لحاظ سے حسن کے مفہوم سمجھنے کا بہت زیادہ نا اہل ہے) حسن ہی کا خواب دیکھتا ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ جمال کسے کہتے ہیں؟

جمال ایک خیال ہے جو مادہ کے ملبوس میں جلوہ گر ہوتا ہے وہ ایک تبسم ہے جو چہرہ انسانیت کی پیشانی پر نمودار ہوتا ہے وہ صحرا حیات تھک جانے والے تمدن کی جائے پناہ ہے' وہ ایک قوت ہے جو مادہ کی قیود سے ہمیں آزاد کرتی ہے' وہ حیات سے زیادہ ترقی یافتہ چیز ہے جو حیات کو بھی بھلا دیتی ہے' ماں اپنی لڑکی کے سنہرے بالوں کے چھلوں کو دیکھ کر فرط مسرت سے مسکرا پڑتی ہے اور لڑکی ہنس دیتی ہے۔ شاعر دیکھتا ہے اور ان دونوں کی ہنسی میں جمال الہی کی چمک محسوس کرتا ہے۔ ایک نوجوان اپنی محبوبہ کے چہرے پر نگاہ ڈال کر اپنے قلب کو سکون سے بھر لیتا ہے۔ ایک شخص شام کے وقت آسمان کی رنگین فضا کو دیکھ کر آفتاب کو افق لا نہایت میں غروب ہوتے ہوئے دیکھ کر جمال فطرت سے متاثر ہوتا ہے' ایک شاعر مغنی اس سے متاثر ہو کر اپنی موسیقی سے فضا میں اس تاثر کو پھیلا دیتا ہے پھر اگر اس کا نغمہ عظمت وطن سے متعلق ہے تو وہ اپنے نفس کو وطن کے ہیکل مقدس پر قربان کر دیتا ہے اور اگر وہ نغمہ محبت ہے تو ہر آواز کے ساتھ وہ اپنی روح کے اجزاء کو اس پر صرف کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔

"تارد" Tarde اپنی کتاب "المنطق الا جتماعی" Lognque Social میں کہتا ہے ہم وطن کو جمیل کہتے ہیں جب وہ قوی ہوتا ہے ہم اسے عظیم کہتے ہیں۔ جب اس کے افراد مہذب و شائستہ ہوتے ہیں' یقیناً" جمیل ہے۔ وہ وطن وہ ظلم کے سامنے نہیں جھکتا اور جو لواء حضارت بلند کرنا اپنا نصب العین قرار دیتا ہے۔

اسپارٹا حسین تھا۔ جب اسپارٹا کا رہنے والا دیکھتا تھا کہ وہ بلاد یونان پر حکمراں ہے۔ مصر قدیم جمیل تھا۔ جب اہل مصر اپنے ملک کی عظمت اور وہاں کے ہیاکل و آثار میں وہ انوار ربانی کی روشنی کو مرکوز پاتے تھے۔ رومہ جمیل تھا جب اہل رومہ اپنی مملکت کو تمام بلاد عالم

کی ملکہ جانتے تھے۔ بلاد عرب جمیل تھا۔ جب اسلام اس کے فرزندوں کو حضارت و مدنیت سے آراستہ کر رہا تھا اور اس کی شوکت و جبروت کی داستانیں دنیا کے ہر گوشہ میں سنی جاتی تھیں۔

یہ خیالات تھے ایک مصری ادیب کے جن میں رات میں محو تھا میں نے سوچا کہ سرزمین ہند بھی جمیل تھی جب کرشن کی تعلیم نے صحیح معنی میں حریت و آزادی کی روح گوشہ گوشہ میں پھونک رکھی تھی۔ لیکن اب وہی سرزمین مشرق جو ہمیشہ سے طلوع حق و صداقت اور ظہور تہذیب و مدنیت کے لیے مشہور تھی' سوگوار ہے کیونکہ اس کا جمال محو ہو گیا ہے۔ اس کی عظمت مٹ چکی ہے اور غالباً اس سے زیادہ دردناک داستان اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یہ تمام سوگواریاں خود فرزندان ملک کی لائی ہوئی ہیں' کیا ہندوستان کی تاریخ غلامی سوا اس بدبختی کے کسی اور چیز کی تاریخ ہے' کیا فرزندان آریہ ورت کہہ سکتے ہیں کہ ان میں وہی غیرت و حمیت وہی بلند خیالی و عالی نظری پائی جاتی ہے جو ان کے اکابر و اعاظم میں پائی جاتی تھی' آج ہندوستان کی آبادی کا عنصر غالب غیر کی حکومت سے آزاد ہونے کے لیے بے تاب ہے لیکن کبھی اس نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ وہ خود اپنے برادران وطن کے ساتھ کس سلوک ورواداری کو جائز رکھتا ہے ہندوستان کے لیے آزادی اور سوراج کے طلبگار حکومت موجودہ سے اپنے فطری ملکی حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی ملک کی اس آبادی کے جذبات کا خیال نہیں کرتے جن کے نحیف شانوں کی مدد حاصل کیے بغیر یہ بار آسانی سے نہیں اٹھ سکتا۔

○ ○ ○

آہ زعمرے کہ گزشت این چنیں

چند دن سے میں جس کیفیت میں مبتلا ہوں اس کو اگر کسی ایک فقرہ سے ظاہر کر سکتا ہوں تو عنوان کے مصرع کو ملاحظہ فرمایئے۔

آہ زعمرے کہ گذشت ایں چنیں

• ماضی کی ہر یاد خواہ وہ کتنی ہی تلخ ہو' حال کی شیرینیوں سے زیادہ پر کیف ہوتی ہے اور مستقبل کی ہر تمنا خواہ کتنی ہی عسیر الحصول کیوں نہ ہو' حالات حاضرہ سے زیادہ قیمتی معلوم ہوتی ہے یعنی انسان نام ہے ایک طرف خواہش استرداد کا اس کے لیے جو گذر گیا اور دوسری طرف وسعت امید بڑھانے کا اس کے لیے جو ہنوز عدم میں ہے پھر چونکہ حیات انسانی کا ہر لمحہ حال ہی ہو کر گذرتا ہے اس لیے نتیجہ معلوم لیکن میری حالت اس سے بالکل مختلف ہے' ماضی کے استرداد کی تمنا نہیں اور حال کی کیفیت یہ ہے کہ۔

برمن آں می رود امروز کہ گوئی فرد است

کہتے ہیں کہ جہل کا علم' علم کی پہلی منزل ہے' لیکن شاید یقین کی نہیں! معلوم نہیں علم کو جہل سمجھنے والے اس باب میں کیا کہتے ہیں' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا پیدا ہونا ہی دماغ انسانی کی پہلی بدعت ہے جسے فطرت تو برداشت کر لیتی ہے لیکن روح کی نزاکت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ پھر کتنے ہیں جن کی روحیں اس کش مکش سے سوگوار نہیں اور کہاں ہیں وہ نفوس جو احساس کی اس بے اعتدالی سے داغدار نہیں جہل و علم سے زیادہ اہم و ضروری یہ دیکھنا ہے کہ ہم اپنی تکمیل کے طلبگار ہیں یا نہیں!

انسان کو وجود اپنی تخلیق کے لحاظ سے سراپا جستجو ہے' روح خواہ وہ مادہ سے مجرد ہو یا وابستہ یکسر اضطراب تمنا ہے' صبح کو جلوہ زریں' شام کا نقاب رنگیں' آفتاب کی زر پاشیاں' چاند کی نور افشانیاں' شاہد مقصود کے مختلف مظاہر و آثار PHENOMENA ہیں جو ہم کو عین ذات ENUHENOH کی طرف بلاتے ہیں اسی طرح خزاں کی سوگواری' بہار کی نشاط انگیزی' دریا کی روانی' پہاڑ کی استقامت اور ان کو بھی جانے دیجیے خود انسان کے نتائج عمل جو سربفلک عمارتوں' محیر العقول ایجادوں اور زر و سیم کے انبار کی صورت میں ہر جگہ نظر

آتے ہیں' یہ سب دعوتیں ہیں اصل منزل تک پہنچنے کی۔ اس آغوش رحمت میں جگہ پانے کی' جس کا نام مذہبی کاروبار والوں نے فردوس رکھا ہے' لیکن میں اس کو "دلوا لسحود النام" کہتا ہوں' جہاں پر وہ اپنی جستجو ختم کر کے شیریں خواب میں محو ہو جاتی ہے۔ جہاں تمام امتیازات رنگ و بو مٹ کر صرف ایک احساس امن و سکون میں تبدیل ہو جاتے ہیں آج علم و حکمت کی ترقیاں اس حد تک پہنچ گئی ہیں کہ زمان و مکان' سمت و جہت کا مفہوم بدل گیا ہے اور تمام محالات' ایک ایک کر کے امکان و قوع کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں' لیکن کیا انسان بایں ہمہ اقتدار و اختیار روح میں کوئی شائبہ سکون محسوس کرتا ہے؟ آج زرو دولت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ تمام وہ تمنائیں اور خواہشیں جو انسان کے گوشت و خون سے متعلق ہو سکتی ہیں "شے حاصل" کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں' لیکن سوال یہ ہے کہ کیا روح کی گرسنگی میں کسی قسم کی کوئی کمی محسوس کی جاتی ہے؟

انسان آگے بڑھ رہا ہے۔ انسانیت پیچھے ہٹ رہی ہے۔ دماغ ترقی کر رہا ہے' روح تنزل کر رہی ہے۔ اس وقت کا انسان ایک ایسا مستسقی ہے جس کے سامنے دریا جاری ہے اور وہ پانی پینے کے لئے آزاد' لیکن اس کی روح جس چیز کے لیے بے تاب ہے اس کا کہیں پتہ نہیں!

دہند شوق دلے رخصت نظر نہ دہند

دنیا کے تمام مذاہب اسی فردوس گم گشتہ کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے آئے ہیں۔ انبیاء و رسل' اولیاء' و اکابر کی ہستیاں روح کی اسی فریاد کی مختلف صورتیں تھیں جو ابراہیم و اسماعیل' سلیمان و داود' یوسف و موسیٰ' عیسیٰ و محمد' زرتشت و کرشن' بودھ و کنفوشس کی صورتوں میں ظاہر ہوئیں اور آئندہ مختلف ناموں اور شکلوں سے ظاہر ہوتی رہیں گی لیکن ان ہستیوں کے اٹھ جانے کے بعد انسان نے جو کچھ یاد رکھا وہ صرف یہ تھا کہ فلاں آتش پرست ہے اور فلاں گو سالہ پرست' یہ صلیب کا پرستار ہے اور وہ کعبہ کا' یہ ناقوس پھونکتا ہے اور وہ اذان دیتا ہے' یہ صورت کفر کی ہے اور وہ اسلام کی' حالانکہ یہ تفریق و امتیاز نوع انسانی کی اس روح کے ٹکڑے نہیں کر سکتے جس کا درد درماں ایک جس کی راحت و لذت ایک جس کا اوج و حضیض ایک اور جس کی فنا و بقا ایک ہے'۔

خدا ایک ہے اور اس کا پیغام بھی ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ ہمیشہ ایک ہی رہے گا خواہ اس کے پہنچانے والے کسی ملک و قوم اور کسی رنگ و نسل کے ہوں اس لیے آج دنیا کی

سوگواریوں کا سبب نہ خدا کی دوئی ہے' نہ اس کے پیام کا تنوع' بلکہ صرف یہ الجھن کہ پیامبر کا وطن کہاں تھا اس کا نام کیا تھا۔ اس کی صورت کیسی تھی' اس کا لباس کس طرح کا تھا' وہ کیا کھاتا تھا' کیا پیتا تھا' پھر خدا کی مرضی تو یہ تھی کہ اپنی روح ہم تک پہنچائے مگر ہم نے اس کو جسم سمجھ کر اپنے حواس کے تلذذ کو اس کے عرفان کا معیار قرار دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی نکہت سے صرف ہمارے دماغ کو متاثر کرے مگر ہم نے پھول کو اصل چیز سمجھ کر صرف اس کی ظاہری صورت سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا اور جب وہ پھول مرجھا کر فنا ہو گیا تو ہماری روحیں پھر تڑپنے لگیں آج جب کہ پھول کی چادروں سے چنگاری کی سوزش' زرکار ملبوس سے شعلوں کی تپش اور زر و سیم کے انبار سے آگ کی لپٹ محسوس ہو رہی ہے سب سے زیادہ ضرورت اسی احساس کی ہے!

بنارس کا مرتاض برہمن ہاتھ میں سمرن لیے ہوئے اٹھتا ہے اور کہتا ہے "میرے مندر میں آؤ صدائے ناقوس سنو اور مورتی کے سامنے جھک جاؤ تاکہ یہ جلن دور ہو" دیو بند اور فرنگی محل کا عباپوش مولوی جریب و تسبیح لیے ہوئے رونما ہوتا ہے اور کہتا ہے "میری مسجد میں آؤ۔ اذان کی آواز سنو' قبلہ کی طرف منہ کر کے سجدہ میں گر جاؤ تاکہ یہ سوزش دفع ہو۔" —— ایک راہب کہن سال نمودار ہوتا ہے اور تلقین کرتا ہے "میرے عالی شان کلیسا میں آؤ۔ گھنٹہ کی صدا پر متوجہ ہو پیمبر مصلوب کی شبیہ سے التجا کرو تاکہ یہ بے چینی دور ہو" —— جاتریوں کا گروہ جوق در جوق مندروں سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے' لیکن ان کے قشقہ کا صندل بھی خشک نہیں ہو چکتا کہ ان کے سر جنگ و جدل سے رنگین نظر آنے لگتے ہیں' جماعت کی جماعت مسجدوں سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر ان کی پیشانی سے سجدہ کا نشان خاک بھی محو نہیں ہو چکتا کہ ایک دوسرے پر کثافت اچھالتا ہوا نظر آتا ہے گروہ کا گروہ کلیسا سے باہر آتا ہے' اور ابھی عود و عنبر کے بخور کی خوشبو بھی ان کے لباس سے جدا نہیں ہوتی کہ معصیت کی آغوش ان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے —— ایک رند لا ابالی ایک مرد ژولیدہ مو' جو نہ کسی مندر میں گیا نہ مسجد میں' نہ جس نے کبھی دیر میں سر جھکایا نہ کلیسا میں۔ انسان کی اس بیچارگی کا مطالعہ کرتا ہے اور اس قوت کے سامنے جس کو اس نے ہمیشہ علائق مذاہب و مسالک سے بے نیاز ہو کر پہچانا۔ متحیرانہ و مستفسرانہ کھڑا ہو جاتا ہے' آسمان کا ایک ستارہ ٹوٹ کر روشن لکیر بناتا ہوا اس کی آغوش میں گر جاتا ہے اور یہ اسے سینے سے لگائے اپنی راہ لے لیتا ہے صبح کو قدوسیوں کی جماعت اس خاک بسر چاک گریباں انسان کو

دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہے کہ یہ کوئی شرابی ہے' یقیناً" وہ شرابی ہے وہ مست ہے ایسا کہ

مستیش رانبود نغمہ صہبا سلاں

دوسرا گروہ آتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ تو فاسق و فاجر ہے ملحد و بے دین ہے بے شک وہ ایسا ہی ہے مگر اس شان کے ساتھ کے

ناز دبہ کفر خود کہ بہ ایمان برابرست

اس کے مجروح جسم' اس کے داغدار سرو سینہ کو دیکھ کر لوگ نفرت کرتے ہیں اور جس وقت وہ بے تاب ہو کر چیخ اٹھتا ہے کہ

در دیست در ولم کہ بدرماں برابرست

تو اس کا سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے یہ تاثرات کب سے مجھے بیتاب بنائے ہوئے ہیں اور ٹھیک اس وقت جبکہ میں چیخ چیخ اٹھنے کے لیے مجبور تھا کس کس طرح "تاب گفتگو" مجھ سے چھین لی گئی۔ لیکن اب "اشارات" کا رخ بدل گیا ہے' ایماء ربانی کچھ اور ہے' ظلمت کی اس شدت کے بعد روشنی کا نمودار ہونا لازم ہے' مجھے بلا پس و پیش اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہیے کہ وہ لوگ جو اپنے کو اکابر دین کہتے ہیں ان کو گروہ طاغوت سمجھو' وہ جو خانقاہوں میں ہاتھوں کو رسم دست بوسی کے لیے پھیلائے ہوئے پڑے ہیں۔ ان کو دشمن روحانیت جانو' وہ جو تمہیں اپنے آگے جھکنے پر مجبور کرتے ہیں ان کو غول صحرائی سے زیادہ وقعت نہ دو' وہ وقت گزر گیا جب خدا مسجد و مندر میں ملتا تھا اب نہ وہ مسجد و مندر ہیں نہ وہ مسجد مندر تک پہنچانے والے' اب خدا ملتا ہے نفس کی آزادی میں' ترک تقلید میں' قلب کے اس انبساط میں جو صرف اپنی ہی تدبیرو تفکر سے حاصل ہوتا ہے اور روح کی اس آزادی میں جو صرف اخلاق ہی کی پاکیزگی سے میسر آتی ہے رسمی مذاہب ترک کر دو' کہ اب ان سے " صرف فساد و سفک و ماء" کا کام لیا جاتا ہے' مدعیان مذہب کو ٹھکرا دو کہ نوع انسانی کی تفریق کا ذمہ دار گروہ تنہا یہی ہے تمام انسان ایک ہیں اور انسانیت ہی کے رشتہ کو اپنا مذہب قرار دو۔ اگر مذہب کا لفظ تمہارے لیے ضروری ہے ناموں کی تفریق مٹا دو' لباس کی تمیز اٹھا دو' رنگ و نسل کا امتیاز محو کر دو' آسمانی رحمت کا دوروازہ کبھی بند نہیں ہوتا مگر اس وقت جب ہماری نگاہوں کے زاویے بدل جائیں پھر اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا میں حقیقی امن و سکون قائم ہو تمہاری روح کی بے چینیاں دور ہوں تو اپنی نگاہوں کا مرکز ایک ہی قرار دو اور حسب

و نسب کے تفاخر' دولت و جاہ کے تفوق' حسن و جمال کی تعلی اور علم و فضل کے پندار کو یکسر محو کر دو کہ خدا کی بارگاہ میں شریف و رذیل' شاہ و گدا' عالم و جاہل سب ایک ہیں اور وہاں اگر کسی جنس کو قبول حاصل ہے تو صرف تمہاری خوئے عجز' جس نے بندگان خدا میں کبھی تفریق نہیں کی اور سب کو اپنی ہی ہستی کا جزو قرار دیا۔

میں جیسا کہ میرے ایک عزیز دوست نے اندیشہ ظاہر کیا ہے' مہدویت کا دعویٰ نہیں کرتا اور نہ میں کبھی نبوت و رسالت کا مدعی ہو سکتا ہوں۔ کیونکہ اب نہ کسی مہدی کی ضرورت ہے نہ رسول کی' لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر کبھی رات کی تنہائی میں' صبح کی خلوت میں طبیعت سکون کی طرف مائل ہو تو جو میں کچھ کہتا ہوں اس کو سامنے رکھیے اور پھر مجھ سے نہیں بلکہ

زخود بجوئے کہ ماراچہ در دل افتادست

○ ○ ○

نظریہ اسلام میری نظر میں

میں نے جہاں تک اسلام کی تعلیم پر غور کیا ہے اس میں کوئی تنگ نظری ایسی نہیں جیسی آج کل مسلمانوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ اس نے عوائد و مراسم کی بیخ کنی کر کے صرف اخلاق کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ حقیقتاً مسلمان وہی ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔

سب سے پہلی غلطی جو مذہب کے باب میں لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے وہ کفر و اسلام اور شرک و توحید کے مفہوم کے امتیاز میں ہوتی ہے اور چونکہ یہ غلطی صدیوں سے چلی آرہی ہے اس لیے اس کا دور ہونا آسان نہیں ہے تاہم چونکہ اس وقت بات آپڑی ہے اس لیے مجبور ہوں کہ مختصراً اس مسئلہ پر روشنی ڈالوں۔

انسان و خدا یا خالق و مخلوق کا جتنا یا جیسا تعلق ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ خالق اور خدا کی ذات بالکل بے نیاز ہے اور انسان کی کوئی بد عنوانی' کوئی نامعقولیت۔ یہاں تک کہ بتوں کو پوجنا بھی اس کو کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ اس کی برہمی نہ انسان کی سی برہمی ہے کہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ خفا ہو جاتا ہے اور نہ اس کی مسرت ہماری مسرت ہے کہ کوئی اچھی بات کسی سے ظاہر ہوئی اور ہم اس سے خوش ہو گئے۔

چونکہ خدا کی ذات ہمارے فلسفہ مسرت و الم سے بلند ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اس کی خوشنودی یا برہمی کا مفہوم بھی کچھ اور ہو گا جب اس مفہوم کی جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس امر کو اپنی خوشنودی سے تعبیر کیا ہے وہ حقیتاً ہماری ہی بہتری سے متعلق ہے اور جس امر کو وہ اپنی برہمی سے تعبیر کرتا ہے اس کا واسطہ ہماری ہی مضرت سے ہے۔ اس لیے ظاہر ہوا کہ خدا کا منشاء صرف یہی ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے فلاح و اصلاح کی تدبیر اختیار کرے جیسا کہ — "ان ارید الا الاصلاح" سے ثابت ہوتا ہے اور ان مکارم اخلاق سے اپنے آپ کو آراستہ کرے جو تمام نوع انسانی کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ اب آپ اس اصول کو پیش نظر رکھ کر کفر و اسلام' شرک و توحید کے مفہوم پر غور کریں گے تو

آسانی سے یہ بات سمجھ میں اجائے گی کہ اسلام و توحید نام ہے صرف استقامتہ فی العمل کا۔ بلندی اخلاق کا' اخوت عامہ کا اور کفر و شرک کہتے ہیں نظم و نسق سے منحرف ہو جانے کو' ترک عمل کو' انحطاط اخلاق کو' انتشار و افتراق کو' فرقہ بندی کو' تفریق جامعہ انسانیت کو اور انسانی اجتماعیت کے خراب کرنے کو۔ کلام مجید کی یہی تعلیم ہے اور رسول چونکہ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے آئے تھے اسی لیے ان کو "کافة للناس" اور "رحمة العالمین" کے لقب سے یاد کیا گیا۔ رسول نے فرقہ بندی کے خلاف "اخوت عامہ" کے موافقت میں جو کیا یا کہا اس کا ثبوت کلام مجید سے ملتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

قل امنا باللہ وما انزل علینا وما انزل علی ابراہیم و اسماعیل وا سحق ویعقوب والا سباط وما اوتی موسی وعیسے والنبیون من ربھم لا نفرق بین احد منھم و نحن لہ مسلمون پھر کیا نبیوں میں آپ رام۔ کرشن۔ بودھ۔ کنفوشس وغیرہ کو شامل نہیں کرتے کیا ان کی نبوت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے اور کیا ولقد بعثنا فی کل امة رسولا ارشاد خدا وندی نہیں۔ پھر اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ونحن لہ مسلمون میں دنیا کے تمام ممالک و مذاہب کو شامل نہ کیا جائے۔

کلام پاک کے متعدد مقام سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشاء خدا وندی یہی ہے کہ ساری دنیا ایک جماعت' ایک امت ہو کر زندگی بسر کرے اور جو لوگ اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ حقیقتاً فطرت کی مخالفت کرتے ہیں ولو شاء اللہ لجعلکم امة واحدة ولکن یضل من یشاء و یھدی من یشاء لتسئلن عما کنتم تعملون ○

ولو شاء اللہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ "اگر اللہ چاہتا" بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تم سب کو ایک امت بنا دے لیکن وہ گمراہ کر دیتا ہے اس کو جو اپنی گمراہی چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اس کو جو اپنی ہدایت چاہتا ہے لیکن اے لوگو تم مطمئن نہ رہو خدا تم سے ضرور باز پرس کرے گا۔ تمہارے افعال و اعمال پر وہ تم سے پوچھے گا کہ کیوں تم نے ہدایت کے مقابلے میں گمراہی کو اختیار کیا اور کیوں تم نے اپنے عمل سے اپنی وسعت نظر سے اپنے رواداری سے اور اپنے اصول زندگی سے اس "اخوت عامہ" کو دنیا میں پیدا نہیں کیا جو خدا کے نزدیک محبوب ہے۔ "یضل من یشاء او یھدی من یشاء" کے معنی بھی بعض مفسرین و مترجمین نے صحیح نہیں کئے ہیں۔ اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ یعنی

انھوں نے "یشاء" کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے حالانکہ حقیقتاً "یشاء" کا فاعل "من" ہے ورنہ "ولتسئلن عما کنتم تعملون" بالکل بے کار ہو جائے گا۔ کیونکہ جب ہدایت و گمراہی صرف خدا کے لیے مخصوص ہو گئی تو باز پرس کیوں، اور کس سے؟

کلام پاک میں اسلام کے صحیح مفہوم کو ایک جگہ نہایت ہی پاکیزہ انداز میں بیان فرمایا ہے۔

"صبغة الله ومن احسن من الله صبغة ونحن له عابدون" یعنی اے رسول لوگوں سے کہہ دو کہ ایمان و اسلام جس چیز کا نام ہے وہ تو وہی اتحاد و یکرنگی ہے جسے ہم خدائی رنگ کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس رنگ سے بہتر کون رنگ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسلام کی دعوت جن مختصر الفاظ میں کی گئی ہے اور جس آسانی کے ساتھ تمام افتراق و انتشار کو مٹانے کی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ۔

قل یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا الله ولا نشرک به شیئا ولا نتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون پس اسلام نام ہوا صرف اس کا کہ سوا ذات خدا کے اور کسی کی عبادت نہ کی جائے اور نہ کسی اور ہستی کو اس کا مقابل سمجھا جائے، یہ تعلیم اس قدر سادہ اس درجہ آسان اور ایسی قریب الفہم ہے کہ گمراہ سے گمراہ قوم بھی اس کی مخالفت نہیں کر سکتی۔ ایک سوال اس جگہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی عبادت کرانے کا کیوں اس قدر شوق ہے اور وہ شرک و کفر یا جحود و انکار سے کیوں اس درجہ برہم ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسی کے سمجھنے پر نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذاہب کے سمجھنے کا انحصار ہے۔

یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خدا کی ذات اس تاثر سے بے نیاز ہے جو ایک انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس لیے اس کی برہمی یا خوشی کا مفہوم انسانی مضرت و منفعت کے علاوہ کچھ نہیں ہے، انسان کو خواہ انفرادی حیثیت سے ہو یا اجتماعی لحاظ سے کسی ایسے امر کا مرتکب ہونا جو اخوت عامہ کو صدمہ پہنچانے والا ہو یا اجتماعیت عالم کو برباد کرنے والا ہو، جو مرکز انسانیت سے انحراف پیدا کرنے والا ہو جس سے اشتراک عمل تباہ ہوتا ہو اور جس سے رشتہ تمدن اور شیرازہ تعاون کمزور ہو جانے والا ہو، شرک و کفر ہی جحود و انکار ہے، بت پرستی ہے اور ہر وہ چیز ہے جس کو غیر خدا کی پرستش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا منشاء خداوندی اور اس کی الٰہیت سے انکار کرنا ہے خدا کے وجود کو نظر انداز کر دینا ہے اور اس

کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتا۔

اسی پر آپ اسلام و توحید کے مفہوم کا بھی قیاس کر سکتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ نہ اذان سے خدا کو فائدہ پہنچتا ہے نہ ناقوس سے کوئی نقصان۔ نہ مسجد سے خدا کو کوئی راحت پہنچتی ہے' نہ کلیسا اور مندر سے کوئی تکلیف۔

اگر ایک شخص غیر مسلم ہونے کے باوجود تمام انہی مکارم اخلاق اور محاسن فطرت سے آراستہ ہے جن کی محمد نے تعلیم دی ہے تو کیا آپ اس کو صرف اس لیے کہ وہ آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہے کافر و مشرک کہہ کر ناری و جہنمی کہہ دیں گے اور دوسرا جو آپ کی جماعت کا فرد ہے لیکن حد درجہ ظالم' بے رحم' مجرم' اور شقی تو کیا اس کو صرف اس بناء پر کہ اس کا نام آپ ہی کی طرح ہے۔ آپ کے اعزہ میں اس کا شمار ہوتا ہے نجات و فردوس کا پروانہ دے دیں گے۔

ایک بے رحم قزاق قافلہ کو تباہ و برباد کر کے متعدد بے گناہ جانوں کے خون سے اپنے ہاتھ کو رنگین کر کے فارغ ہوتا ہے کہ دفعتہ" مغرب کی اذان ہوتی ہے وہ فورا" اپنے ہاتھ اور دامن سے خون کے دھبے دور کر کے نماز میں مشغول ہو جاتا ہے' دوسرا شخص جو تمام تمام دن دھوپ میں محنت شاقہ برداشت کر کے اپنے متعلقین کے لیے حلال روزی فراہم کرتا ہے۔ گاؤں کے بچوں' بوڑھوں' یتیموں اور بیواؤں کی خدمت کے لیے اپنی محنت' دولت' زندگی سب کچھ وقف کیے ہوئے ہے لیکن شام کو وہ نماز پڑھنے کے بجائے ناقوس پھونکتا ہے۔ مسجد جانے کی بجائے وہ مندر کا رخ کرتا ہے۔

اب آپ ایک مسلمان مولوی سے ایک متعصب مدعی اسلام سے دریافت کیجیے وہ نہایت آزادی سے بلا پس و پیش کہہ دے گا کہ بہر حال اس قزاق کو نجات ملنی ہے کیونکہ وہ مسلمان ہے اور اس دوسرے کو آخر کار دوزخ میں جانا ہے کیونکہ اس نے بت پرستی کی اور اسلام کو قبول نہیں کیا۔ پھر اگر اسلام نام اسی وسعت نظر و انصاف کا ہے۔ اگر "صراط مستقیم" اسی کو کہتے ہیں اگر "فامرھم بالقسط" کا یہی مفہوم ہے اگر دین محمدی کا یہی مدعا ہے تو میں مشورہ دوں گا کہ آیئے آپ بھی میرے ساتھ کافر ہوجایئے کیونکہ پھر تو خدا کفر ہی میں تلاش کرنے سے ملے گا۔

مسلمانوں کا یہ یقین کر لینا کہ صرف خدا انھیں کا ہے اور دوسری قوموں کو اس نے صرف دوزخ کا ایندھن بنانے کے لیے پیدا کیا ہے ایسا لغو و مہمل اعتقاد ہے جو کسی ذی فہم

کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا لور نہ اس تعلیم کے ساتھ ہم کسی کو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں اسی لیے میں نے کہا کہ جہاں تک نفس تعلیم مذہب کا تعلق ہے۔ مسجد و کلیسا۔ ناقوس و اذان میں کوئی فرق نہیں ہے' بہ حیثیت انسان ہونے کے ہر شخص خواہ وہ عیسائی ہو یا ہندو چینی ہو یا بدھ۔ معتزلہ ہو یا اشعریہ ناصبی ہو یا خارجی' شیعہ ہو یا سنی' خدا کے نزدیک ایک ہے۔ اس کا سب سے ایک ہی مطالبہ ہے پھر جو اس کو پورا کرے گا خدا اسی کو ترقی و فلاح دے گا لور جو اس کو ترک کرے گا خدا بھی اس کو چھوڑ دے گا۔

بے شک یہ میرا ایمان ہے کہ مذہب اسلام یعنی وہ مذہب جسے محمد نے پیش کیا یقیناً" بہترین ذریعہ تصفیہ اخلاق لور تزکیہ نفس کا ہے لور اس لیے ہر انسان کا فطری فرض ہے کہ وہ اس مذہب کو اختیار کرے۔ لیکن میں اس کی اشاعت کو اس طرح پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذہب کو برا کہوں جبکہ مذہب ہونے کے لحاظ سے وہ بھی سب سچے ہیں۔

آپ اگر ایک ہندو کو تعلیم اسلام دینا چاہتے ہیں تو آپ کا فرض یہ نہ ہونا چاہیے کہ اس کے ارکان پر ناک بھوں چڑھائیں' اس کے طریق عبادت پر نکتہ چینی کرنے لگیں' بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ آپ اس کو نفس مقصود مذہب سے آگاہ کر کے آمادہ کریں کہ وہ اپنے طریق مذہب کے ساتھ ہی ساتھ مذہب اسلام کو بھی دیکھے اور خود فیصلہ کرے کہ منزل تک پہنچانے کا سب سے زیادہ آسان لور سیدھا راستہ کون سا ہے لور میری رائے میں جادلهم بالتی هی احسن کا بھی یہی مفہوم ہے۔

آپ اگر اپنی حرمت چاہتے ہیں تو دوسروں کی حرمت کیجیے' یہ عام اصول اخلاق کا ہے' اس لیے اگر آپ اپنے مذہب کا وقار قائم کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مذاہب کی بھی عزت کیجئے۔ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا لور نہ قوت و جبر سے کوئی مذہب اشاعت پذیر ہو سکتا ہے' تلوار ایک آدمی کا نام تو بدل سکتی ہے' وضع و معاشرت میں تبدیلی پیدا کر سکتی ہے لیکن دل کو نہیں پھیر سکتی' دماغ کو مجبور نہیں کر سکتی ہے' اطمینان نفس' طمانیت روح' لطف و رافت' محبت و شفقت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے' پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ تعلیم اسلام کی جو حقیقی دولت آپ کے پاس ہے' اسے تو آپ پیش نہیں کرتے دکھاتے ہیں خزف ریزوں کو لور دنیا کو مجبور کرتے ہیں کہ انہیں کو جواہر ریزے سمجھے۔

پھر چونکہ یہ تنگ نظری نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے مقلدین میں پائی جاتی ہے اس لیے جو اعتراض میرا اہل اسلام پر ہے' وہی ہندوؤں پر ہے لور وہی دوسرے

مذاہب والوں پر' نہ ہم میں رواداری۔ نہ ان میں انصاف' نہ ہم صراط مستقیم پر' نہ وہ راہ راست پر' منزل سے دور رہنے میں سب یکساں ہے اور گمراہی میں برابر کے شریک۔

یہ ہے میرا اعتقاد و یقین مذہب کے متعلق' اور اگر موجودہ حالت افتراق قائم رہی تو باور کیجئے کہ ایک زمانہ آئے گا جب تمام مذاہب محو ہو جائیں گے اور وہی وقت تجدید اسلام و احیاء دین محمدی کا ہو گا۔

ملتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں

○ ○ ○

میری عصبیت

میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی، جب بعض حضرات میری تحریروں کی عصبیت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ خواہ وہ مذہب و معاشرت سے متعلق ہو یا علم و ادب سے جو کچھ میں کہتا ہوں وہ صرف میرے خلوص نیت کا نتیجہ ہے جس کی اگر کوئی تعبیر ہو سکتی ہو تو صرف یہ کہ۔

شکایتے است نہ گنجہ بدل زلسیاری

میں اس سے قبل بھی بارہا عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ تشیع و تسنن تو خیر نہایت ہی معمولی بات ہے میں نے تو اصطلاحی کفر و اسلام کا پردہ بھی نوچ کر پھینک دیا ہے اور "بہانگ دہل" اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ اگر جنت نام ہے صرف سکون روح و طمانیت قلب کا اور اگر یہ جنت ایک زاہد شب زندہ دار صرف تقشف ہی سے حاصل کر سکتا ہے تو میں وہ ہوں کہ۔

فردوس رابدام نگہ می کنم شکار

میں اس چیز سے واقف ہوں، جس کی جستجو دیر و حرم میں کی جاری ہیں، میں اس مقصود کو جانتا ہوں جس کو مساجد و کنائس میں ڈھونڈھا جا رہا ہے اور میں اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں ہوں کہ یہ محراب و منبر پر پیشانیاں رگڑنے والے آج تک یہی نہیں سمجھ سکے کہ وہ کیا چیز ہے جو سجدہ ہائے نیاز کا مسجود ہو سکتی ہے اور وہ کونسا پردہ ہے جس کے اٹھنے کے بعد یہ تمام اعتبارات سطحی یہ جملہ ممیزات ظاہری محو ہو کر

چشم وا کردن زمیر تا آسماں آغوش دشت

بن جاتے ہیں، پھر اس سے قبل خدا معلوم کتنی زریں صبحیں، کتنی رنگین شامیں، کتنی خنک راتیں میں نے صرف اس غور و تامل میں صرف کر دیں کہ کیا منصور کا انا الحق کہہ کر دار و رسن کی منزل سے گذر جانا واقعی شاید مقصود کے چہرہ سے حجاب کا اٹھا دینا تھا اور کیا میں بھی اگر ایسا دعوی کروں تو بے جا ہو گا، لیکن میں ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اول تو وہ منزل

جسے

مرا کردہ اند آشکارا بہ من

کہتے ہیں کہ کوئی ایسی بلند منزل نہیں جس کو ہر شخص بلوغی تامل نہ پا سکتا ہو چہ جائیکہ اس میں بھی ناصبوری سے کام لیا جائے اس لیے میں بے نیاز لنہ انداز سے آگے بڑھا اور میں نے اپنی فطری ودیعتوں میں سے ایک نہایت ابتدائی منزل کی ودیعت کو بے نقاب کرنا چاہا لیکن حیرت ہے کہ دنیا اس کے بھی سمجھنے کے لیے آمادہ نہیں اور جس وقت میں یہ دعوی کرتا ہوں کہ "یک مے ز آبگینہ و ساغر بر آورم" تو وہ مجھ سے منہ پھیرلیتی ہے مجھے کافر کہتی ہے' دہریہ و ملحد کے لقب سے یاد کرتی ہے اور اپنے جہل سے میرے علم کو مغلوب کرنا چاہتی ہے حال آنکہ یہاں یہ عالم ہے کہ "گرانی محمل" کا احساس جس قدر قوی ہوتا ہے اسی اعتبار سے

ہر پردہ راہو لولہ سنجم ہزار بار

اس لیے میں اپنے تمام احباب سے خواہ کسی مذہب و مسلک کے متبع ہوں' بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے شاہد مقصود کے سامنے یہ تمام نسبتیں' یہ جملہ اضافات وہی حقیقت رکھتی ہیں جو "پارۂ کتاں" چاند کے سامنے اور بحمد اللہ میں اس سے بہت بلند ہوں کہ اس نا استواری " نسیج" کا تماشہ دیکھنے لیے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی نگاہ پستی کی طرف مائل کرہاں۔ دنیا اگر اپنی صحرا نوردیوں میں خضر کو راہبر بنانا چاہتی ہے تو بنائے اور جب تک جی چاہے سکندر کی ناکامی کا انتقام اس سے لیتی رہے لیکن مجھے اس جستجو میں دعوت شرکت نہ دے کہ

سیلاب رابہادیہ رہبر گرفتہ ام

اگر ایک طرف یہ عزم استوار ہے کہ انتقاد خواہ وہ معاشرت و اخلاق سے متعلق ہو یا مذہب و سیاسیات سے' ہمیشہ بلند نقطہ نظر سے ہونا چاہیے تو دوسری طرف میں اپنی فطرت کی کمزوری سے بھی واقف ہوں کہ وہ کسی کا دل دکھانا گوارا نہیں کرتی اور اس لیے جب مجھے اس کا علم ہو جاتا ہے کہ میری تحریر سے کسی کو صدمہ پہنچ گیا ہے تو میں بہت ملول ہو جاتا ہوں۔ بنا براں اگر میری کسی تحریر سے' کسی شخص یا کسی مخصوص جماعت کو کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں اس کی معذرت میں صرف یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا' اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جاتی ہے تو صرف اس لیے

مستم چناں کہ گل نشناسم زنوک خار

اس سلسلہ میں مجھے برا کہنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو انتقام لینے کے لیے

صرف اپنے اہرمن سے چارہ سازی چاہتے ہیں اور گالیوں سے آزار رسانی کے سوا ان کے پاس کوئی آلہ حرب نہیں ہوتا۔ اور دوسرے وہ جو میری تحریر میں بے حجابی' عریانی فحاشی وغیرہ کے نقائص نکال کر اپنے پندار میں مجھے ذلیل و خفیف کرنا چاہتے ہیں سو اول الذکر جماعت سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جس طرح ان کا اہرمن ان کے ساتھ ہے اسی طرح میرا یزداں میرے ساتھ ہے اور اس لیے مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں اور موخر الذکر جماعت کے حضور میں اپنے ذوق ادب و انشا کی طرف سے سوا اس کے اور کچھ نہیں عرض کر سکتا کہ

نظارۂ خوباں و مے و نغمہ حرام است
دیدیم و شنیدیم و سمعنا و اطعنا!

میں پہلے بھی بارہا عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ اسلام نام ہے صرف ترک رسوم کا' تفریق قومی کے محو کر دینے اور جامعہ انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا۔

اسلام مسجد و مندر کی تفریق سے بے نیاز ہے۔ زنار و تسبیح کے امتیاز سے بالا تر ہے۔ ناقوس و اذان کی تمیز اس کا نصب العین ہے۔ نہ پکرمہ اور طواف کا فرق اس کا مطمع نظر۔ وہ تمام عالم کو ساری کائنات کو' جملہ نوع بشری کو ایک رشتہ سے وابستہ کر کے صرف ایک نقطہ پر لانا چاہتا ہے۔ اور وہ اس مساوات کا مبلغ ہے جس سے زیادہ وسیع مساوات دنیا میں کسی ہادی و رہنما۔ کسی نبی و رسول نے اس سے قبل پیش نہیں کی وہ نہ کسی کے نام کو دیکھتا ہے نہ وضع و صورت کو' نہ وہ نسب کو وجہ امتیاز قرار دیتا ہے۔ نہ دولت اس کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتی ہے' نہ جاہ و ثروت۔ وہ دیکھتا ہے صرف روا داری کو جذبہ ایثار و فدویت کو' اور محض اس اضطراب کو جو بنی نوع انسانی کے ہر فرد میں دوسرے فرد کے اعانت کے لیے پیدا ہونا چاہیے پھر آج اسلام کا صحیح مفہوم بتانے کے لیے سب سے پہلے ضرورت ہے اس عنصر کو محو کر دینے کی جو اسلام کو اصطلاحی لفظ قرار دے کر اس کو اخوت عامہ کے مقصد سے علیحدہ کر رہا ہے اور موجودہ ضروریات تمدن و زمانہ کے لحاظ سے تمام ان اصول معاشرت و حیات پر نظر ثانی کرنے کی جو آج اسلام کے چہرے کو نہایت مکروہ پیش کر رہے ہیں۔

اگر زمانہ کے ساتھ لوگوں کے امیال و عواطف اور منقول و افکار میں تغیر ہونا ضروری ہے تو یقیناً وہی مذہب حقیقی معنی میں خدائی مذاہب کہلائے گا جو عہد و زمانہ کے لحاظ سے تمام عقول و اذہان کی رہبری کر سکے اور اپنے اندر اس تغیر کو روا رکھے جس کے بغیر "اخوت

علمہ" کا مقصد عظیم حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس لیے جس ایثار و قربانی' جس رسوخ و استواری کی ضرورت ہے وہ ہم میں سے سرمد و منصور کی طلبگار ہے۔ سقراط و حسین کی آرزو مند ہے۔ اور ان مردان خدا کی منتظر ہے جو ممبر پر نہیں بلکہ دار پر اس کا اعلان کرنے کی جرات اپنے اندر رکھتے ہوں پھر اگر آج بعض نفوس مقدسہ اس قربانی کے لیے آمادہ ہو جائیں اور خدمت اسلام کے لیے اپنے تمام مصالح ذاتی کو پس پشت ڈالنے کے لیے تیار ہو جائیں تو نہایت آسانی سے حقیقی مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور دنیا ازخود ان مولویوں۔ ان ملاؤں۔ ان عالمان دین ان پیران طریقت' ان تصوف پیشگان جم مرتبت کے بتوں کو ٹھکرا دینے کے لیے آمادہ ہو سکتی ہے۔

○ ○ ○

بلقیس رعنا کے دو خطوں کا جواب

(پہلا خط)

نیاز بے نیاز!

"مسٹر لکھنا آپ کی توہین ہے اور مولانا کہنا آپ کی چڑ۔ اس لیے صرف نیاز پر اکتفا مناسب تھا ـــــ مگر بے نیاز کے اضافہ سے تھوڑی سی شاعری بھی کر دی گئی ہے۔ معلوم نہیں آپ اس کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔

میں عرصہ سے ان تمام انقلابات کا مطالعہ کر رہی ہوں جو تدریجاً" آپ کے ذہن و دماغ میں پیدا ہوتے جاتے ہیں اور انہیں کہہ سکتی کہ ان کا سلسلہ کب اور کس طرح ختم ہو گا لیکن اگر میں قیاس سے کام لوں تو کہہ سکتی ہوں کہ آپ بہت جلد خدا اور خدا کی آخری الہامی کتاب سے بھی انکار کرنے والے نظر آتے ہیں جس کا ثبوت ماہ جون کے استفسارات میں باآسانی مل سکتا ہے میں آپ کی آزادانہ تنقید کو یقیناً" پسند کرتی ہوں لیکن مجھے ابھی تک اس جذبہ کی حقیقت کا علم نہیں ہوا جو اصلی باعث آپ کے لٹریچر کا ہے کیا آپ اس پر کوئی روشنی ڈال کر مجھے "ظن و گمان" کی معصیت سے بچا لیں گے؟

بہر حال میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتی کہ اگر آپ کے تمام مقالات حقیقتاً" خلوص نیت پر مبنی ہیں تو میں خدا سے انکار کرنے کی حد تک بھی آپ کے ساتھ ہوں اور اگر کسی مصلحت سے فی الحال اس بات کا اظہار نہیں کرنا چاہتے جو چند ماہ یا چند سال بعد آپ پیش کرنے والے ہیں تو میں آپ کو مشورہ دوں گی کہ اس پردۂ مصلحت کو فوراً" چاک کر دیجئے جو اصل مقصود ہے اسے بھی ظاہر کر دیجئے کیونکہ میں آپ میں اخلاق کی اتنی کمزوری بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

1- آپ نے تو خیر مسٹر اور مولانا کا قصہ پیدا کر کے بے نیازانہ انداز میں کچھ شاعری سے کام لیا' لیکن میں کیا کروں جبکہ مجھے یہی علم نہیں کہ آپ واقعی کیا اور کون ہیں تاہم میں بہت خوش ہوتا اگر آپ اس نیاز مند کو صرف نیاز کے لفظ سے یاد کرتیں' لیکن بے نیاز کے اضافے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اس کو قبول کر لوں یا نہیں۔ میں اس وقت

شاعری سے کام نہیں لے رہا اس لیے یہ ردقبول کا قصہ بھی پیش آیا ورنہ "تسمیہ و خطاب" کے متعلق ایک عربی شاعر مجد الدین طوسی عجیب و غریب و دلنشین نکتہ بتا گیا ہے۔

اصم اذا نوریت باسمی و اننی   اذا قیل یا عبدھا لسمیع
لاتدعنی الابیا عبدھا فانہ لاشرف اسمائی

(جس وقت لوگ میرا نام کہہ کر پکارتے ہیں تو میں بہرا ہو جاتا ہوں اور جب اے فلاں کے غلام" کہہ کر پکارتے ہیں تو میں سن لیتا ہوں۔ اس لیے اے لوگو! مجھ کو تو تم اس کا غلام ہی کہہ کر پکارا کرو کہ میرا یہی نام سب سے بہتر ہے۔)

چہ جائیکہ آپ خود کوئی نام تجویز کریں اور میں اسے گردن جھکا کر قبول نہ کر لوں "نازم بہ بندگی کہ نشانے نمادہ" میری طرف سے "پسندیدگی و عدم پسندیدگی" کی خلش میں آپ کے دشمن مبتلا ہوں' جب تک "خون دو عالم" اپنی گردن پر لینے والے دنیا میں موجود ہیں' آپ کیوں اپنی عشق کی ناکامی کے خیال سے فکر مند ہوں۔

جلوہ برخود کن و مارابہ نگاہے دریاب

2- آپ عرصہ سے میرے ذہنی انقلاب کا مطالعہ کر رہی ہیں "اس سے زیادہ خوش بختی میری اور کیا ہو سکتی ہے" "خستگاں راول بہ پر شسلائے پنہاں بردہ" لیکن معاف فرمایئے اگر میں عرض کروں کہ آپ نے میرے انقلابات ذہنی کے انجام پر صحیح رائے زنی نہیں فرمائی اور آپ بھی وہی کہنے لگیں جو دنیا کہہ رہی ہے۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے

اگر آپ باور کریں تو میں کہوں کہ میں دنیا میں ہر چیز سے انکار کر سکتا ہوں یہاں تک کہ آفتاب کے طلوع و غروب کا بھی انکار کر سکتا ہوں جو کائنات کا روشن ترین مشاہدہ ہے لیکن خدا کا انکار مجھ سے ممکن نہیں کیونکہ اس کی عظمت و جلال' اس کی وسعت ہمہ گیری' اس کی ابدیت ولانہایت کا علم مجھے نہایت عمیق مطالعہ کے بعد حاصل ہوا ہے اور میں اس کو حد درجہ عزیز رکھتا ہوں۔

خدا نام ہے "خالق کل کا" لیکن مذہب والوں نے اس کے ٹکڑے کر کر کے ہر ٹکڑے کا نام علیحدہ علیحدہ خدا رکھ لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں خدا نام ہے "محبت" کا اور "محبت ہی سے کائنات کو معمور ہونا چاہیے کہ یہی ہے اصل مفہوم خدا کے "محیط" ہونے کا اور اسلام کا درس بھی یہی ہے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کو میری نیت کے خلوص کی طرف سے کیوں شک پیدا ہوا کیونکہ وہ شخص جو تمام افراد نوع انسانی کو ایک ہی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اس کے باب میں تو غرض و مصلحت کے سوال کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ البتہ اگر آپ کو میرے مقصود کی طرف سے کوئی شبہ پیدا ہوتا تو بے شک آپ کا یہ فرمانا ایک حد تک معقولیت پر مبنی ہو سکتا ہے۔

3- میں گزشتہ ملہ کے استفسار کا جواب دینے کے بعد سمجھتا تھا کہ بعض حضرات اس سے وہی نتیجہ نکالیں گے جو آپ نے فرمایا۔ لیکن میں اس کا جواب دینے پر مجبور نہیں ہوں جب تک اس مسئلہ پر منھ کھول کر کوئی بات نہ کی جائے۔ اگر کوئی شخص قرآن مجید کے اسرائیلی قصص کو "واقعات تاریخی" کی حیثیت سے ثابت کرنے کا مدعی ہے تو اس کو چاہیے کہ پہلے ان باتوں کا جواب دے جنھیں میں نے بائبل کے سلسلہ میں ظاہر کیا ہے۔

اس کے بعد میں ظاہر کروں گا کہ قرآن مجید میں ان قصص کو کس انداز سے اور کس مقصود کے لیے بیان کیا گیا ہے۔

4- آپ نے آخیر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر میں یہ سب کچھ خلوص نیت کے ساتھ کہتا ہوں تو آپ منکر خدا کی حیثیت سے بھی میرا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہیں اس کے متعلق اس کے سوا کیا عرض کروں کہ میں تو اپنے خیال کے مطابق جو کچھ کہتا ہوں وہ خلوص نیت ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اگر آپ پھر بھی میرا ساتھ نہ دیں تو میری بد قسمتی ہے۔ لیکن اگر آپ کی معیت کی تنہا شرط خدا کا انکار ہی ہے تو پھر یہ بھی کر دیکھیں۔

من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

(دوسرا خط)

آپ نے جولائی کے نگار میں جس کیفیت کے ساتھ میری تحریر کا جواب عنایت فرمایا ہے اس کا شکریہ قبول فرمایے حقیقت یہ ہے کہ آپ کی ادبیت ایک افسوں ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ آپ کے مخالفین بھی آپ کی تحریروں سے خاص لطف اٹھاتے ہیں۔ آپ نے مذہبی تنقیدوں میں بھی اپنے زور قلم سے وہ رنگ پیدا کر دیا ہے کہ جی چاہے یا نہ چاہے لیکن ان کو دیکھ کر ایمان متزلزل ہی کرنا پڑتا ہے "کافر ماجرائی" کی ایسی مثالیں کم نظر آتی

ہیں میں پہلے بھی سمجھتی تھی کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وہ خلوص سے خالی نہیں اور اب آپ کے جواب سے اور زیادہ یقین اس کا ہو گیا ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ آپ کی "تلقین" کو ماننے ہی ایک قسم کا خوف معلوم ہوتا ہے اور جی جھجکتا ہے' کیا آپ اس کا سبب بتا سکتے ہیں؟

فی الحال میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کے نزدیک سب سے اچھا مذہب کون سا ہے اور کیوں؟ اصول اسلام میں آپ کو کیا خرابیاں نظر آتی ہیں اور وہ کیونکر دور ہو سکتی ہیں۔

(جواب) آپ نے میری' "الوہیت" کی فسوں زائی اور انشاپردازی کی تعریف میں جو کچھ سپرد قلم فرمایا ہے وہ خواہ کتنا ہی خلاف حقیقت کیوں نہ ہو لیکن مجھے مغرور بنا دینے کے لیے کافی سے زائد ہے۔

خوشا لطافت اندازۂ ادا فہمی

اگر میں اپنی زندگی میں کسی ایک ہی کا ایمان (بقول آپ کے) "متزلزل" کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھے خود بھی اس "کافرماجرائی" پر فخر کرنا چاہیے مگر اے میری محترم خاتون' کبھی آپ نے اس حقیت پر بھی غور فرمایا ہے کہ جس کیفیت کو دنیا "کفر و ایمان" سے تعبیر کرتی ہے وہ صرف لفظی نزاع تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ایک ہی چیز کے دو جدا جدا نام رکھ کر مجادلہ ہو رہا ہے' آہ دنیا کی عمر اس بحث و اختلاف میں گزر گئی ہے کہ پردۂ جمال کو حجاب کہیں یا "نقاب" اور یہ ہوش کسی کو نہیں کہ صرف نقاب اٹھا کر شاہد مستور کا مشاہدہ کریں جو ان تمام ظاہری امتیازات سے بہت بلند واقع ہے منصور و فرہاد کی سرگذشت پر جو تنقید چاہے کر لیجیے لیکن آخر کار حقیقت وہی ایک نظر آئے گی کہ

آشفتہ نوائے بہ سردار برآمد

شوریدہ ادائے بدم تیشہ رواں دلو

کیا اب بھی آپ مجھ سے دریافت کریں گی کہ میرے نزیک سب سے بہتر مذہب کون ہے؟ دیکھیے ان لوگوں سے جن کا مذہب صرف مسلک عشق ہو اس قسم کے سوالات نہیں کیے جاتے کیا آپ نے نہیں سنا۔

بلبل شدگان ہر کہ در النگو برالنگو

کسی حیراں سے یہ نہ دریافت کیجیے کہ اسے جلوہ محبوب کہاں نظر نہیں آتا اور ایک

عاجز و سرگشتہ سے یہ ذرا پوچھیے کہ اس نے شاہد مقصود کو کس جگہ پایا۔ وہ تو آسانی سے کہہ دے گا کہ "ہر جگہ اور کہیں نہیں" لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس جواب کو سن کر اپنی ہنسی ضبط کر سکیں گی؟

بیدل کہتا ہے

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجاست	چرخ رگشتہ کہ خورشید جہاں تاب کجاست
دیر زیں غصہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم	کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست
اے سمندر بہوس داغ فردش آتش کو	ماہیاں تشنہ بہ میر یدم آب کجاست

لیکن وہ حضرات جن کی سطح میں نگاہیں صرف الفاظ کو دیکھتی ہیں اس پر ہنستے ہیں آپ کو میری "تلقین" پر یقین لاتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے' جی جھجکتا ہے یوں کیوں نہ کہیے کہ کلیجہ دھڑکتا ہے' اس کا جواب بہت عرصہ ہوا دہلی کا ایک شاعر ان الفاظ میں دے چکا ہے کہ

لو ہر لاؤ ذرا دست حنائی
پکڑ لیں چور کا دل ہم یہیں سے

مجھے آپ کے اسی خوف اور اسی دھڑکن سے محبت کا سراغ ملتا ہے اور غالباً" وہ وقت دور نہیں جب میں آپ کو اپنے "حلقہ خیال" کا اسیر دیکھ کر آزادی سے کہہ سکوں گا

کہ بیابیا عراقی توزخا مکان ملی

میں کوشش کروں گا کہ آپ کے "خدشات" دور کرنے میں کامیاب ہوں اور بالکل اسی طرح (جس طرح آپ چاہتی ہیں)

دل رلبہ طرہائے خم اندر خم' فگنم

○ ○ ○

مذہبی بیماری

جس طرح جلدی بیماریاں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ لازم و متعدی۔ اسی طرح دماغی بیماریوں کی بھی دو قسمیں ہیں' لازم کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو غور و فکر کا اہل نہ سمجھے اور متعدی یہ کہ دوسروں کو بھی نہ سوچنے دے۔

اسلام نے ایمان و اعتقاد کو دو چیزوں پر منحصر کیا ہے۔ تصدیق بالجنان و اقرار باللسان یعنی ضمیر کا اطمینان اور اس کا زبان سے اقرار۔ ظاہر ہے کہ جب تک نفس مطمئن نہ ہو گا ایمان و اعتقاد میں استحکام و رسوخ پیدا ہونا ممکن نہیں اور جب یہ نقش اچھی طرح دل نشین ہو جائے گا تو زبان سے اس کا اقرار اور گفتگو کے ذریعہ سے اس کا اظہار بھی ایک اثر پیدا کرے گا۔ اس اطمینان نفس و ضمیر کا ذکر قرآن میں اکثر جگہ آیا ہے۔ یہاں تک کہ جب ایک پیغمبر نے خدا کے مشاہدۂ عینی کی خواہش کی تو اس کا سبب بھی یہی اطمینان قلب بتایا گیا۔ ہرچند دنیا اب اس منزل پر نہیں ہے کہ وجود باری پر یقین لانے کے لیے وہ رویت ظاہری کو ضروری قرار دے تاہم ریب و شک' وہم و ظن' اشتباہ و التباس کی کارگاہ ہنوز قائم ہے اور غالباً" زیادہ وسعت و فراوانی کے ساتھ' زیادہ الجھن اور پیچیدگی لیے ہوئے پھر یہ کس قدر عجیب و غریب ذہنیت ہے کہ ایک طرف تو اس روایت کی تصدیق کی جاتی ہے کہ ایک شخص کے اطمینان قلب کے لیے خدا نے اپنے آپ کو بے حجاب و بے نقاب کر دیا اور دوسری طرف اس کی بھی اجازت نہیں دی جاتی کہ ہم جانشینان رسول سے صرف یہ سوال کر سکیں کہ وہ کس استحقاق کی بناء پر اپنے آپ کو حامل دین سمجھتے ہیں اور وہ دین متین کیا ہے جو فطرت انسانی کو مطمئن کر سکتا ہے۔

اسلام دنیا کا تنہا فطری مذہب ہم کو ہر ہر موقعہ پر غور و فکر تامل و تدبر کی تعلیم دیتا ہے' وہ ہم کو بتاتا ہے کہ مذہب کی اصل روح نظام عالم پر غور کرنا کائنات اور اس کے مظاہرو آثار کو دیدۂ نقد و اعتبار سے دیکھنا ہے لیکن مذہب کا علمبردار آج دنیا کو یہ درس دے رہا ہے کہ تعلیم کی تکمیل ہو چکی' دین درجہ کمال کو پہنچ گیا اور وہ تعلیم وہی ہے جو بتایا ہے' وہ دین وہی ہے جسے وہ اپنے اسوۂ بلند سے ظاہر کرتا ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ اخلاقیات کا انتہائی درس جو دیا جا سکتا تھا۔ دیا جا چکا ہے اور اب دنیا کو کسی مذہب کی ضرورت نہیں' لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس حقیقت کو اپنے کسی عمل کسی قول' کسی حجت' و دلیل سے ثابت کر سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے اس دعوے سے دنیا کو مطمئن کر سکتا ہے؟

دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ عقل انسانی بھی ترقی کر رہی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ترقی کی حد کیا ہوگی؟ لیکن یہ مذہب کی حمایت کے لیے تڑپنے والا اب تک یہی درس دے رہا ہے کہ مذہب نام ہے بے عقلی اور ہرزہ کاری کا دین نام ہے صرف کورانہ اتباع کا اور زبان سے ہر اس امر کے اقرار کر لینے کا جس پر دل کسی طرح مطمئن نہ ہو۔ اس کا نام اس نے اعلاء کلمتہ الحق "اور" امر بالمعروف رکھ چھوڑا ہے در آنحالیکہ اس سے زیادہ توہین و تذلیل اسلام کی اور اس سے زیادہ اشاعت کفرو الحاد کی کسی طرح ممکن ہی نہیں۔

وہ زمانہ گیا جب علیین و سجین کے ہفت طبقات کی نعیمین' کوثر و سلسبیل کی روانی اور آتش دوزخ کی شعلہ فشانی کے ذکر سے وہ جاہلوں پر ہیبت طاری کر دیا کرتا تھا۔ اب زمانہ ہے علوم و فنون کی ترقی کا' انکشاف حقائق کا' استقراء و مشاہدہ کا' اور اسُ لیے ٹھیک اس وقت جبکہ وہ منبر پر بیٹھ کر معجزہ و کرامات کا ذکر کرتا ہوتا ہے صاحبان عقل و دانش اس ہٹتے ہیں اور جن اصول کو پیش کر کے وہ اسلام کی طرف بلاتا ہے اسے دیکھ کر لوگ اور زیادہ اس سے ہٹتے جاتے ہیں' حالانکہ موجودہ زمانہ سے بہتر زمانہ تعلیم و صداقت کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور واقعی سچ کو سچ کی طرح پیش کیا جائے' کیونکہ دنیا سے مذہب کے اوہام مٹ چکے ہیں' اور رسم و رواج کی حکومت اب اعتقادات کی دنیا میں قائم نہیں رہی' پھر اگر کوئی اس دور کی ذہنیت میں واقعی صحیح اصول اخلاق کے پیش کرے جو عین مدعا کسی مذہب کا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اسے قبول نہ کرے۔

کہا جاتا ہے کہ اس ہنگامہ مادیات میں جب کہ انسان صرف ایک "میکانکی" چیز ہو کر رہ گیا ہے' روح کا اضطراب سکون کا طلبگار ہے جسے اخلاقی یا تمدن اصطلاح میں دنیا کا امن کہا جاتا ہے' لیکن مبلغین مذہب کو اس کا علم نہ ہو گا وہی چیز جسے دنیا کا امن و سکون کہا جاتا ہے اس کے لیے مذہب میں ایک نہایت ہی جامع و پر معنی لفظ صراط مستقیم کا استعمال کیا گیا ہے جس کو زبان سے تو ہزار بار ادا کیا جاتا ہے لیکن اس کے مفہوم پر ایک مرتبہ بھی غور نہیں کیا جاتا جس طرح دو نقطوں کے درمیان خط مستقیم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح دنیا

میں اس منزل تک پہنچنے کے لیے بھی جو ارتقاءِ انسانیت کا نصب العین ہے ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے! اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ راستہ وہی ہے جو اسلام نے بتایا اور جو تمام نوعِ انسانی کو بلا تفریق نسل و قومیت بلا امتیاز ملک و ملت یکساں طور پر دعوت دیتا ہے۔

لیکن کیا اسلام کی یہ صلحِ کل تعلیم' یہ ہمہ گیر درسِ اخلاق و عمل آج بھی باقی ہے؟ اس کا جواب ان کلید برداران فردوس سے چاہو' ان اجارہ داران خلد سے طلب کرو ان قائدین اسلام و رہنمائے ملت حنیفی سے دریافت کرو جن کے یہاں اخلاق اسلامی نام ہے صرف ایک خاص وضع و صورت کا' ایک مخصوص رسم ورواج کا اور جو آفرینش انسان کی حقیقی غایت حور و قصور اور کوثر و سلسبیل کے حصول کے سوا کسی اور چیز کو نہیں سمجھتا' پھر وہ لوگ جو خدا کے وجود کے ساتھ مخصوص انداز کی عبادت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ کیا ان سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ سب کس مقصد کے حصول کے لیے ہے۔ اگر اس سے مدعا وہی ہے جو ابھی عرض کیا گیا۔ تو خیر ورنہ از راہِ کرم مجھے بتائیں کہ کلام پاک میں "لکل امة جعلنا منسکا ہم ناسکوہ فلا ینازعنک فی الامر" کا کیا مفہوم ہے اور لکل امة جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ سے کیا مراد ہے؟ کیا عبادت و نسک ایک ہی چیز نہیں۔ کیا نماز اور نسک ایک ہی مفہوم کے دو لفظ نہیں؟

O O O

ہمارے علماء کرام کا دینی نظریہ

10 دسمبر 1929ء کو میں نے ایک استفتاء مرتب کیا جس کا مضمون یہ تھا۔

ایک شخص خاندانی مسلمان ہے اور خود بھی نہایت پابند صوم و صلوٰۃ ہے۔ تہجد گزار ہے' ذکر و شغل کا بھی عادی ہے' وضع ظاہری بھی بالکل شریعت اسلام کے مطابق رکھتا ہے' لیکن زندگی اس کی مکرو فریب' کذب و افتراء' ایذارسانی و قطع رحم میں بسر ہوتی ہے۔

دوسرا شخص قوم کا برہمن چشتی کافر و مشرک ہے' اس کے گلے میں بتوں کی ہیکل پڑی رہتی ہے' رات دن پوجا پاٹ کرتا رہتا ہے مگر اسی کے ساتھ اس کی زندگی "ابنائے جنس کی خدمت یتامیٰ کی پرورش' بیواؤں کی ہمدردی میں بسر ہوتی ہے اور اس کی ذات یکسر امن و سکون ہے۔

براہ کرم مذہب اسلام کے نقطۂ نظر سے بتائیے کہ ان دونوں میں کون ناجی ہے اور کون ناری یا دونوں ناجی ہیں یا دونوں ناری' اگر آپ چاہیں تو استناداً قرآن حدیث' اقوال اکابر کا حوالہ دے دیں ورنہ اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے مجھے صرف جناب کی رائے بہ حیثیت ایک عالم دین ہونے کے درکار ہے۔

اس کی مطبوعہ نقلیں بغرض حصول جواب ہندوستان کے 32 مشہور علمائے کرام کے نام روانہ کی گئیں جن میں صرف 24 حضرات نے جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائی۔

ان جوابات کو اگر ان کی مختلف ذہنیتوں کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو ان کو چار علیحدہ علیحدہ قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ ضعیف و کمزور یا مصلحت اندیش ذہنیت جو کسی قسم کا جواب دینا پسند نہیں کرتی۔ دوسری وہ جسے ہم "تمبذبین" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں تیسری جس کا تعلق راسخوں سے ہے اور چوتھی وہ جو بالکل غیر جانب دار رہنا چاہتی ہے اور عدم علم کا اظہار کرتی ہے۔

اول الذکر ذہنیت کی مثال آپ کو صرف مولانا اشرف علی صاحب کے جواب میں نظر آئے گی کہ انھوں نے نہ صرف جواب دینے سے احتراز کیا بلکہ اس کی بھی کوشش کی کہ ان کی شخصیت کا پتہ نہ چلے۔ کیونکہ انھوں نے جواب میں نہ اپنے دستخط ثبت فرمائے اور نہ

مقام درج کیا۔

انھوں نے جو جواب دیا ہے اس کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے کہ۔

"سوال تنقیح طلب ہے جو تحریر میں خالی از" تکلف نہیں ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے"

مولانا کا مدعا اس جواب سے غالباً یہ ہے کہ "اس استفسار یا استفتا پر بعض تنقیحیں" عدالتی نہیں بلکہ دینی (مذہبی) قائم ہونا چاہئے اور ان تنقیحوں کے قائم کرنے میں انھیں تکلف ہے، تکلیف کا اندیشہ ہے' اس لیے ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے کیونکہ نہ کوئی شخص لکھنؤ سے تھانہ بھون جانے کی زحمت اختیار کرے گا۔ اور نہ مولانا کو جواب دینے کی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ یہی وہ "تلوک فرمائی" ہے جو سودا کے زمانہ میں صرف "مرغ قبلہ نما کو" تڑپا دیتی ہے لیکن اب "حلیم کعبہ" کو متزلزل کر رہی ہے۔

شکر ہے کہ اس ذہنیت کی مثال مجھ کو تمام جوابوں میں صرف ایک ہی ملی اور وہ بھی ایک ایسی ہستی کی طرف سے جو شاید مسائل روزہ و نماز سے زیادہ کسی ایسے استفسار کا جواب دینے کی اہل نہیں ہے جو فلسفۂ مذہب سے متعلق ہو یا کسی اصول گفتگو سے۔

باقی تین ذہنیتوں میں سے وہ ذہنیت جس کو میں نے "راسخون" میں داخل کیا ہے یا جدید سیاسی اصطلاح میں قدامت پسند یا کنزرویٹو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے حسب ذیل حضرات کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے۔

قاضی صاحب بھوپال۔ مفتی صاحب رام پور' مفتی صاحب حیدر آباد' مولانا حسین احمد صاحب مفتی دیوبند' مولانا نثار احمد صاحب مفتی آگرہ' مولانا محمد کفایت اللہ صاحب' مولانا احمد سعید صاحب دہلی' مولانا محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی مولانا سید سلیمان شاہ پھلواروی' مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی لکھنؤ' مولانا محمد عبدالعزیز صاحب' مولانا محمد سجاد صاحب۔

ان حضرات نے نہایت صفائی اور پورے رسوخ و یقین کے ساتھ حکم لگایا ہے کہ مسلمان چاہے کچھ کرے۔ بہرحال ناجی ہے بشرطیکہ ایمان پر اس کا خاتمہ ہو اور بت پرست کافر کتنا ہی اچھے اخلاق کا کیوں نہ ہو اس کا ناری ہونا یقینی ہے۔

غیر جانب دار یا اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنے والی ذہنیت مولانا عبد الستار لاہوری اور مولانا احمد احمدی کے جوابات سے ظاہر ہوتی ہے' اول الذکر نے صاف طور پر لکھا ہے کہ ناری اور ناجی ہونے کے متعلق وہ "قلب کشائی" نہیں کر سکتے۔ اس کا علم مالک الملک کو

ہے۔ اس طرح ثانی الذکر صاحب نے صفائی کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ اس کو خدا بہتر جانتا ہے کہ کون ناری ہے اور کون ناجی۔

اب صرف ایک جواب مولانا سید سلیمان ندوی کا رہ گیا جس کو میں نے مذبذب ذہنیت کے نام سے موسوم کیا ہے' کیونکہ وہ جواب شروع کرتے ہیں ان الفاظ سے کہ۔

"دونوں ناری ہیں" اور ختم کرتے ہیں اس "لیکن پر جس میں مسلمان کے بخشے جانے اور کافر کے نہ بخشے جانے کا امکان ظاہر کیا ہے اور ایک شخص کے لیے دشوار ہے کہ ان دونوں راہوں میں کس کا اعتبار کرے ار کس کو صحیح جواب خیال کرے۔

یہ تھا ایک سرسری اور مختصر سا جائزہ یا عمومی تبصرہ جو "علماء کرام" کے جوابات پر کیا گیا ہے۔ اب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ایک اصولی گفتگو اس مسئلہ پر کرنا چاہتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ عقل انسانی یا فطرت انسانی جس پر اسلام کی بنیاد کا قائم ہونا یا بیان کیا جاتا ہے ان جوابات میں سے کسی جواب پر مطمئن ہو سکتی ہے یا کسی پر نہیں۔

مولانا عبد الستار صاحب لاہوری اور مولانا احمد صاحب کے جوابات تو قطعاً لائق اعتناء نہیں کیونکہ جب وہ اسلام کی صداقت کے مدعی ہونے کے بعد اس کی پیروی کر رہے ہیں تو ان کا یہ کہنا کہ ہمیں علم نہیں کون ناری ہے کون ناجی اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلام سے بہتر کسی اور مذہب کے ہونے کا امکان باقی ہے اور وہ ایک ایسے مسلک کے ماننے والے ہیں جو خود ان کے اندر کوئی کیفیت یقین اور سوخ کی پیدا نہیں کرتا اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ وہ کیوں مذہب اسلام کو صحیح مذہب مانتے ہیں تو اصولاً وہ یہی جواب دیں گے کہ اسلام ان کے نزدیک سب سے بہتر مسلک ہے لیکن اس کے بعد اگر ان سے دریافت کیا جائے کہ کیا اسلام کا بہترین مسلک ہونا اس کے نزدیک اس لیے نہیں ہے کہ اسی پر انسان کی نجات منحصر ہے تو کیا ان کو یہی جواب دینا چاہیے کہ اس کا علم ان کو نہیں ہے' حیرت ہے کہ وہ اس عالم ریب و شک میں کس طرح اپنے آپ کو حقیقی معنی میں اسلام کا متبع کہہ سکتے ہیں اور دوسرے کو دعوت اسلام کیونکر دے سکتے ہیں جب کہ خود انہیں اس امر کا یقین نہیں کہ اسلام نجات کا ضامن ہے مجھے مولانا احمد احمدی کے اس جواب پر بہت زیادہ حیرت ہے کیونکہ احمدی جماعت بالکل تبلیغی جماعت ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ کسی کو بھی اپنے مسلک کی طرف دعوت دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا جواب بھی زیادہ توجہ طلب نہیں۔ کیونکہ انہوں نے کوئی یقینی

بات نہیں کی' اگر وہ صرف دونوں کے ناری ہونے پر حکم لگاتے تو گفتگو ہو سکتی تھی لیکن چونکہ اخیر میں انہوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے پہلا بخشا جائے اور دوسرا نہیں۔ اس لیے جو گفتگو راقم الحروف کے جوابات کے سلسلہ میں ہو گی' وہی مولانا ندوی کے فتویٰ کے خلاف پیش کی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ پہلے ظاہر کیا گیا ہے کہ منجملہ سولہ حضرات کے' بارہ نے پورے وثوق کے ساتھ مسلمان کے ناجی ہونے پر حکم لگایا ہے' خواہ وہ کتنی ہی معصیت کرے اور برہمن کو ناری ہونے کا فتویٰ دیا ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں اس لیے کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لیے پہلے چند تنقیحوں کا قائم کر لینا ضروری ہے۔

1- مذہب کا مقصد صحیح کیا ہے؟

2- اخلاق حسنہ کی غایت کیا ہو سکتی ہے؟

3- ناری و ناجی ہونا کسے کہتے ہیں؟

4- خدا اور مذہب کا باہمی تعلق کس قسم کا ہے؟

اگر ہم ان چار باتوں کا فیصلہ کر سکے تو ان علماء کرام کے جوابات پر بھی تنقید کر سکیں گے اور خود بھی اپنے استفتاء کا جواب دے سکیں گے جو ہندوستان کے اتنے حاملین شریعت کے پاس بغرض حصول فتویٰ بھیجا گیا تھا۔

چونکہ مختلف اوقات میں مختلف مذہبی مباحث کے تحت نگار میں ان تمام امور پر اس سے قبل کافی گفتگو ہو چکی ہے' اس لیے زیادہ میں تفصیل و طوالت سے کام نہ لوں گا بلکہ مختصراً صرف انہیں امور کو پیش کروں گا جو مسئلہ زیر بحث پر روشنی ڈالنے کے لیے ضروری ہیں۔

تنقیح اول کے متعلق ساری دنیا کی متفقہ رائے یہی ہے کہ مذہب کا مقصد اصلاح اعمال' تزکیہ اخلاق اور تصفیہ نفس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اسی طرح تنقیح دوم کے متعلق بھی یہی ایک رائے پائی جاتی ہے کہ اخلاق حسنہ کی غایت صرف یہ ہے کہ انسان دنیا کے نظام تمدن میں عضو مفید کی حیثیت اختیار کر کے دوسروں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے۔ ابنائے جنس کے نظام عمرانی میں ایک فرد معاون ہو کر زندگی بسر کرے اور نفسی و ذاتی اغراض سے شیرازۂ اخوت عامہ کو درہم و برہم نہ ہونے دے چنانچہ یہی وہ اصل اصول تھا جس کی بناء پر شریعتیں مرتب ہوئیں۔ قوانین وضع کیے

گئے اور اچھے برے افعال کی فہرست ترتیب دے کر عوام کے سامنے گناہ و ثواب اور سزا اور خدا کی تعیین کی گئی تاکہ جو لوگ حقیقت کو نہیں سمجھتے ہیں وہ بھی اصل راہ سے منحرف نہ ہوں اور قانونی پابندی سے ان کی بے راہ روی کو منعضر بنایا جائے۔

تیسری تنقیح سب سے زیادہ اہم تنقیح ہے کیونکہ استفتاء میں یہی دریافت کیا گیا تھا اور اسی میں مجھے اکثر علماء کرام سے اختلاف ہے' عام طور پر ناری و ناجی ہونے کا تعلق "حیات بعد الممات" سے سمجھا جاتا ہے یعنی جب انسان مرجائے گا تو جو اعمال دنیا میں اس نے کئے ہیں ان کے لحاظ سے اس کو انعام یا سزا ملے گی اور اس انعام و سزا کو بہشت و دوزخ کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ عذاب و ثواب جسم کے ساتھ ہو گا اور دوزخ میں واقعی سانپ بچھو اور آگ کے شعلے ہوں گے اور جنت میں حقیقتاً حوریں' غلمان' باغ اور میوے وغیرہ ہوں گے' لیکن بعض کہتے ہیں کہ عذاب و ثواب روحانی ہو گا' اور دوزخ و جنت کا بیان صرف تشبیہی و تمثیلی ہے' بہرحال وہ انعام و سزا جسمانی ہو یا روحانی' نتیجہ ہے اعمال حسنہ یا افعال سیئہ کا جو اس دنیا میں انسان سے سرزد ہوئے ہیں۔

اس وقت اس بحث میں نہ پڑوں گا کہ مرنے کے بعد سزا یا جزا کا مفہوم نتیجہ خیز و قابل یقین امر ہے یا نہیں بلکہ میں اس کو حرف حرف صحیح ماننے کے بعد ناجی و ناری کے مفہوم پر ایمان لاتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ناری و ناجی ہونے کا تعلق علاوہ اعمال حسنہ کے کسی اور چیز سے ہے اور اگر ہے تو کیوں؟

اور جو کچھ اوپر بیان ہو چکا ہے اس سے لازماً ہر شخص اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ جو چونکہ مذہب کا مقصود اصلی اخلاق حسنہ کی تعلیم ہے اس لیے ناری و ناجی ہونے کا انحصار صرف اخلاق انسانی پر ہونا چاہیے اور وہ برے ہیں تو ہم کہیں گے کہ وہ ناری ہے اور اچھے ہیں تو حکم لگائیں گے کہ وہ ناجی ہے۔

اس لیے ہمارے علماء کرام کا فاسق و فاجر مسلمان کے متعلق یہ حکم لگانا کہ بہرحال وہ ناجی ہے اور خوش اخلاق برہمن کی نسبت یہ فتویٰ صادر کرنا کہ وہ کچھ کرے نجات اس کی ممکن نہیں یقیناً متذکرہ بالا اصول سے علیحدہ کسی اور اصول پر مبنی ہو گا پھر آیئے غور کریں وہ اصول کیا ہو سکتا ہے؟

میں نے جہاں تک غور کیا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ علماء کرام نے مذہب اسلام اور اخلاق حسنہ کو علیحدہ علیحدہ دو چیز قرار دیا ہے اور ان کے درمیان جو نسبت پائی جاتی ہے وہ اس طرح

ہے کہ ان دونوں کا اجتماع بھی ممکن ہے اور اتفاق بھی' یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو لیکن اخلاق حسنہ نہ رکھتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی میں اخلاق حسنہ موجود ہوں اور وہ مسلمان نہ ہو۔ یعنی اصل چیز ان کے نزدیک اخلاق انسانی نہیں بلکہ محض مسلمان ہونا ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں؟

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر محض مسلمان ہونا ہی نجات کا ضامن ہے اور انسان کے اچھے اعمال کوئی چیز نہیں ہیں تو پھر اسلام کا مقصد کیا ہے اور اسلام کس چیز کا نام ہے؟

جن علماء کرام نے بدکار مسلمان کے ناجی ہونے اور نکوکار برہمن کے ناری ہونے پر حکم لگایا ہے وہ گویا بہ الفاظ دیگر اس بات کے معتقد ہیں کہ محض خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا اقرار کر لینا یا یوں کہیے کہ ان کی مقرر کی ہوئی ایمان مجمل و مفصل کی عبارت کو ایک اشلوک کی طرح پڑھ کر اعتقاد کر لینا کافی ہے' اور کائنات میں انسان کا وجود صرف اس لیے ہے کہ وہ ان چند الفاظ کو یاد کرے۔ کیونکہ خدا اور اس کی خدائی کائنات اور اس کا جملہ نظام عبارت ہے انہیں دو سطروں کے حفظ کر لینے سے۔

اگر حقیقتاً اسلام یہی ہے اور اس کی تمام تعلیمات کا خلاصہ صرف اسی قدر ہے تو ہم کو تنقیح چہارم کا پہلے فیصلہ کر لینا چاہیے کہ خدا اور مذہب کا باہمی تعلق کیا ہے یعنی خدا کو مذہب کی ضرورت ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا وہ ضرورت صرف ایک شخص کے اپنے آپ کو مسلمان کہنے سے پوری ہو جاتی ہے۔

یہ مسئلہ میرے نزدیک زیادہ پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ خود انہیں علماء کرام کے اعتقاد کے موافق خدا کی ذات بے نیاز ہے اور وہ ہماری عبادت' ہماری نیائش بلکہ خود ہماری اور ساری کائنات کی ہستی کی طرف سے بالکل بے پرواہ ہے۔ نہ آفرینش سے اس کی کوئی غرض وابستہ ہے نہ ہلاکت و فنا سے' اس نے اگر عالم کو پیدا کیا تو اس طمع و غرض سے نہیں کہ کوئی اس کا نام لے گا اور اگر وہ سب کو تباہ و برباد کر دے تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اگر وہ ہمارے انسانی بادشاہوں اور رئیسوں کی طرح نہیں ہے تو نہ اس میں جذبہ انتقام کی پرورش ہوتی ہے اور نہ جذبہ احسان کی۔ کوئی عمر بھر اگر اس کی عبادت کرے تو وہ اپنے اصول بدلنے والا نہیں اور اگر کوئی ہر وقت اسے گالیاں دے تو اس سے متاثر نہیں ہوتا اس لیے اب سوال نہ اصطلاحی عبادت کا رہا نہ اصطلاحی کفر کا۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی واضح ہو گیا

کہ ہماری عبادتیں اگر کسی غرض سے وابستہ ہو سکتی ہیں تو وہ خدا سے متعلق نہیں ہے بلکہ خود ہماری فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا اثر ہماری ہی دنیاوی زندگی پر پڑنا چاہیے دنیاوی زندگی کی تخصیص میں نے اس لیے کی کہ اخروی زندگی کے ماننے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اور سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ خدا کیوں اس سلسلہ کو قائم رکھے اور اس سے حیات انسانی و تمدن انسانی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے اور جب کہ بقول معتقدیان مذہب دوبارہ عالم آب و گل میں آنا ہے تو جزا و سزا نتیجہ کے لحاظ سے بالکل بے کار چیز ہو جاتی ہے۔ سزا و جزا کا مدعا یہ ہے کہ ایک شخص آئندہ فعل مذموم سے احتراز کرے' لیکن جب اس کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی اور دارالعمل ختم ہو جاتا ہے تو سزا و جزا محض ایک لایعنی سے شے ہو کر رہ جاتی ہے بہرحال جو صورت ہو یہ بالکل یقینی ہے کہ خدا سے ہماری عبادت و نافرمانی کا کوئی تعلق نہیں ہے یعنی خدا اس سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس کا اثر خود ہماری اوپر ہوا ہے اور وہ اثر فلاح و بہبود یا ہلاکت و زوال کے سوا کچھ نہیں۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام نے کیوں اعمال حسنہ کو تنہا ذریعہ نجات قرار نہیں دیا۔ سو آیئے سب سے پہلے قرآن میں جستجو کریں کہ اس کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ اس کے فیصلہ سے علماء کرام کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں جہاں کہیں ایمان و اسلام کا ذکر آیا ہے وہیں اعمال صالحہ کو بھی اس کے ساتھ لازم کر دیا ہے اور بغیر افعال حسنہ کے ایمان کا کوئی مفہوم قرار نہیں دیا گیا۔ قرآن میں کثرت سے اس مفہوم کی آیات موجود ہیں مثلاً چند یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

انما المومنون اخوۃ فاصلحوابین اخویکم یعنی مومنین کی پہچان یہی ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں اور باہم گرامن صلح صلاح و فلاح کی زندگی بسر کریں

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیر ایرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرایرہ۔ یعنی جو کوئی (خواہ وہ کسی ملک و قوم کا ہو) ذرہ برابر نیکی کرے گا اس کا نتیجہ دیکھ لے گا اور جو کوئی ذرہ برابر بدی کرے گا اس کا نتیجہ پائے گا۔

ان اللہ لا یغیر مابقول حتی یغیروا ماباا نفسھم یعنی اللہ کسی قوم کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے اندر بری یا بھلی کوئی تبدیلی نہ پیدا کرے۔

ان اللہ لا یظلم الناس شیئا ولکن الناس انفسھم یظلمون بلکہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ خود انسان ہی اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔

الغرض یہ اور اسی قسم کی متعدد آیات ایسی پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کا مفہوم ہی عمل صالح ہے۔ چنانچہ ایک جگہ صاف صاف ارشاد ہوتا ہے۔

ومن الناس من یقول امنا باللہ و بالیوم الاخر وماھم بمومنین یعنی بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے درآں حالیکہ وہ مومن نہیں ہیں۔

کیوں؟ اس لیے کہ ان کے اعمال اچھے نہیں ہیں' اور ان کے اخلاق برے ہیں پھر کیا اس آیت کے تحت وہ مسلمان جن کا ذکر میں نے اپنے استفتاء میں کیا ہے' ایمان سے خارج نہیں ہو جاتا' اور اس کو ناری نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح کثرت سے کلام مجید میں اعمال و نتیجہ اعمال کے فلسفہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ

لیس للانسان الا ما سعی یعنی انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس نے کوشش کی ہے اور وہی ملے گا جو اس کے عمل کا اقتضاء ہے۔

پھر کیا اس اصول کے ماتحت وہ برہمن اپنے اعمال حسنہ کا اجر نہ پائے گا اور وہ مسلمان اپنے افعال سیہ کی سزا کا مستوجب نہ ہو گا اور کیا اس اجرو سزا کو ناجی و ناری کے الفاظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

اس مسئلہ میں سب سے بڑی الجھن جس چیز نے پیدا کر دی ہے وہ شرک و توحید یا کفرو اسلام کی تفریق ہے چونکہ مشرک و کافر کے لیے قرآن میں جا بجا ناری ہونے کی وعید آئی ہے اور مشرک و کافر کا مفہوم بت پرست یا غیر مسلم قرار دیا گیا ہے اس لیے ایک مولوی نہایت آسانی کے ساتھ ایک غیرمذہب والے کے ناری ہونے پر فتوٰی صادر کر دیتا ہے' خواہ اس کے اعمال کتنے ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں۔

میرے نزدیک کفرو اسلام یا شرک و توحید کا مفہوم ہی ان لوگوں نے بالکل غلط سمجھا ہے جس طرح توحید کے معنی زبان سے خدا کو ایک کہہ دینے کے نہیں ہیں اسی طرح شرک کے معنی بت پرستی کے نہیں ہیں۔ توحید سے مقصود خدا کو ایک کہنا' نہیں - کیونکہ ایک کی نسبت بھی اس کے شان کے منافی ہے' بلکہ اس سے مراد اس کو کل سمجھنا ہے اور اپنے آپ کو بھی اسی کل کا جزو قرار دے کر تمام قوائے عمل سے کام لے کر تمام ان مدارج ارتقاء کو طے کرنا ہے جو اس کل یا قدرت نے سعی و عمل کے لیے مخصوص کر دیئے ہیں چونکہ بت

پرست اقوام' یعنی وہ قومیں جو تمام کاموں کا انحصار بتوں کی خوشنودی پر رکھتی ہیں' رفتہ رفتہ اپنے تمام عزائم و قوائے کاسبہ کو معطل بنالیتی ہیں اس لیے رفتہ رفتہ انسانی عمران و تمدن کو تباہ کرکے خود بھی تباہ ہوتی ہیں۔

چونکہ عہد رسالت میں مشرکین عرب کی حالت بالکل اسی طرح درجہ انحطاط پر پہنچ گئی تھی اس لیے شرک و کفر کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا بغیر اس کے کہ انہیں فلسفۂ کفر و اسلام کو سمجھا جاتا جس کے سمجھنے کے وہ اہل نہ تھے۔

اس لیے معلوم یہ ہوا کہ محض کفر و شرک بغیر کسی سبب کے معصیت نہیں ہے اور خود خدا کی خوشنودی یا برہمی یا اس کے اعزاز و توہین کا سوال اس میں پنہاں نہیں ہے اگر کوئی رسول پیدا ہوتا ہے اور وہ کسی قوم کے لیے قوانین وضع کرتا ہے یا کوئی اسلوب حیات متعین کرتا ہے تو اس سے مراد اس کی یہ ہوتی ہے کہ قوم ان پر کاربند ہو کر ترقی کرے محض ان قوانین کا حفظ کرلینا یا بالکل مادی طور پر رسم و رواج کی طرح اس اسلوب زندگی پر عامل ہو جانا مفید مدعا نہیں۔ اس لیے اگر کوئی مسلمان باوجود نماز روزہ و دیگر احکام کی شریعت کی پابندی کے اپنے اندر کوئی معنوی یا روحانی تبدیلی پیدا نہیں کرتا اور یہ سمجھتا ہے کہ صرف ان اعمال و شعائر کی پابندی اس کی نجات کے لیے کافی ہے (جیسا کہ ہمارے علماء کرام نے اپنے فتوے میں ظاہر کیا ہے) تو میں اس کو بھی شرک و کفر ہی قرار دوں گا اور ایک بدکار بت پرست کے مقابلہ میں اس کو کوئی ترجیح نہیں دے سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کے درمیان سوا اس کے کوئی فرق نہیں ہے کہ ایک نے بت پتھر کا بنایا ہے اور دوسرے نے وہم و خیال کا۔ وہ اگر صرف مورت کی پرستش کو انجام مقاصد کا ذریعہ سمجھتا ہے تو یہ صرف نماز و روزہ کو اصل ایمان قرار دیتا ہے اس کا خدا پارۂ سنگ ہے اور اس کا بت نماز۔

اسی طرح اگر کوئی شخص بت پرستی کے بعد اعمال حسنہ کا عامل ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس کے اخلاق کی پاکیزگی کو بے نتیجہ و لایعنی قرار دیں۔ اگر یہ نتیجہ اس کی بت پرستی کا نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ آپ اس کی بت پرستی کو ایک لایعنی شے کہہ سکتے ہیں اور یہ بھی حکم لگا سکتے ہیں کہ اگر وہ بت پرست نہ ہوتا تو بھی چونکہ فطرت کی طرف سے اس کو طبع سلیم عطا ہوئی تھی۔ اس لیے اسی طرح کا پاکیزہ اخلاق کا انسان ہوتا۔ لیکن یہ حق آپ کو کب حاصل ہے کہ اس کا افعال حسنہ کا بالکل نظر انداز کر دیں۔ پس اس صورت میں کیا اسلام کا مفہوم بت پرستی کے علاوہ کچھ اور رہ جاتا ہے کیا اس صورت میں آپ اس کے

قائل نہیں ہوتے کہ اسلام کا مقصود صرف ظاہری مراسم کی پابندی ہے اور کیا قرآن میں اس سے انکار نہیں کیا گیا ہے اس لیے میرے نزدیک اس فتویٰ کا صحیح جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ۔

"ایک بدکار مسلمان قطعاً ناری ہے اور ایک نکوکار برہمن یقیناً ناجی"

○ ○ ○

سید سلیمان ندوی سے

معاصر معارف کے فاضل محرر نے فروری 1931ء کے شذرات میں جو ابتدائی دو صفحے تحریر فرمائیں ہیں خواہ وہ کتنے ہی عام مصلحانہ انداز میں کیوں نہ لکھے گئے ہوں لیکن لکھنے والے کی تعمیم میں ایک ایسی تخصیص اور اس کی نگاہ غلط انداز میں ایسی "پرستش پنہاں" موجود ہے کہ ہم کیا دنیا جان سکتی ہے کہ کس کو بسمل کرنے کے لیے مولانا نے اپنے "دست بازو" کو رنج پہنچانے کی زحمت گوارا کی ہے۔

"قربان نگاہے تو شوم باز نگاہے"

جنوری کے نگار میں مندرجہ بالا مضمون کو دیکھ کر جس میں "علماء کرام" کے فتاویٰ اور ان کے نظریہ دینی پر تنقید کی گئی تھی، سب سے زیادہ جس کو متوجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہمارے مولانا سید سلیمان ندوی ہی تھے کیونکہ انہیں کا فتویٰ ایسا تھا جو "صنعت تذبذب" میں لکھا گیا تھا اور اس لیے انہیں پر اس کی شرح و تفسیر واجب تھی لیکن ہمیں افسوس ہے کہ انہوں نے شذرات کے صرف دو صفحات پر کفایت فرمائی جو حقیقتاً "بہ اندازۂ نیم نگاہ" بھی تسکین بخش نہیں، پھر اس سے زیادہ ہماری نارسائی بخت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ٹھیک اس وقت جب کہ نگار جنوری کی اشاعت کے بعد ہم اپنے آپ کو ساری دنیا کی طرف سے نوید "قتل و ذبح" پہنچا رہے تھے ترکش سلیمانی سے ایک تیر صرف بھی کیا جاتا ہے تو شکستہ پر، گستہ سوفار نشانہ سے الگ اور ست رفتار، کیا یہی ہے جسے ملوک گمنی کہتے ہیں۔

ہم کو محترم مولانا سے جو دارالمصنفین ایسے خانوادۂ علم و فضل کے چشم و چراغ اور شبلی اسکول کی ذہنیت کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ یہ توقع تھی کہ وہ نگار کے فتاویٰ والے مضمون کو دیکھ کر ہماری غلطیوں کی اصلاح فرمائیں گے جو شکوک و اوہام ہم ایسے عامی و جاہل لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں انہیں اپنے فاضلانہ طرز استدلال سے دور کرنے کی سعی کریں گے، اور اگر یہ سب نہیں تو کم از کم وہ اس قدر عنایت تو ضرور روا رکھیں گے کہ اپنے ممکن والے معمہ کو حل کر کے فتوے کو صحیح مفہوم سے دنیا کو آگاہ کر دیں۔ لیکن افسوس ہے کہ نہ انہوں نے اپنے منصب دینی کے لحاظ سے اس مسئلہ پر کوئی توجہ کی اور نہ

دوستانہ حیثیت سے ہم کو لائق اعتنا سمجھا۔

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

مولانائے محترم نے اپنے شذرات میں جو کچھ اظہار خیال فرمایا ہے وہ ان کے نزدیک ایسے اصول راسخ سے متعلق ہے کہ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے (اور تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں) تو پھر وہ اصول خود باطل ہو جاتے ہیں جن پر فتوے والے مضمون کی بنیاد قائم کی گئی تھی اور اس طرح کسی تفصیلی گفتگو کی بھی ضرورت نہیں رہتی' اچھا آیئے تو ان اصول پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں جو مولانا نے قائم کئے ہیں اور غور کریں کہ ان میں کون سی نئی چیز پائی جاتی ہے۔

شذرات میں ابتدائی چار ٹکڑے اسی موضوع کے لیے وقف کئے گئے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے۔

> "ہر قسم کی کامیابی صرف دو چیزوں پر موقوف ہے ایک تو چند طے شدہ اصولوں کو دل سے تسلیم کر لینا۔ اور دوسرا ان طے شدہ اصولوں کے مطابق سختی سے عمل کرنا ان کو عام محاوروں میں اصول و عمل کہو یا مذہب کی زبان میں ایمان و عمل۔ بات ایک ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پہلے اصول' پھر عمل' یا پہلے عمل' اور پھر اصول' ظاہر ہے فلسفیانہ حیثیت سے یہی جواب ملے گا کہ پہلے اصول پھر عمل یہ کہنا کس قدر حماقت ہے کہ پہلے پابندی پھر اصول یا پہلے عمل پھر ایمان۔

ہم کو بھی اس سے حرف بہ حرف اتفاق ہے اور کون ہے جو اصول کی تعیین سے پہلے پابندی اور ایمان کی تعیین سے قبل عمل کا مطالبہ کرے گا۔ لیکن سوال یہی ہے کہ آج کل مسلمانوں نے جس چیز کو اصول یا ایمان قرار دے رکھا ہے وہ حقیقتاً اصول یا ایمان ہے بھی یا نہیں۔

مولانا معاف فرمائیں اگر میں یہ عرض کروں کہ وہ ابھی تک یہی نہیں سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں میرا اصل اعتراض تو یہی ہے کہ اصول ایمان کی صحیح تعیین ہی باقی نہیں رہی اور پابندی یا اعمال ہی کو اصول یا ایمان قرار دینے کی حماقت میں دنیا مبتلا ہے میں کب کہتا ہوں کہ کسی منزل کی تعیین نہ کیجئے۔ کوئی مقصود سامنے نہ رکھئے کوئی غرض مشترک نہ پیدا کیجئے کیونکہ بغیر اس کے جدو عمل' سعی و اقدام' کوئی معنی نہیں رکھتے بلکہ میں خود اس

وقت ایک مولوی سے ہر اس صاحب جبہ و دستار سے جو خود کو تما آئنہ رشد و ہدایت سمجھ کر عوام کی دسترس سے دور' قدیم روما و یونان کے غضب آلود دیوتا جیوپیٹر کی طرح کبر و غرور کی شکنیں چہرہ پر ڈالے ہوئے ایک مرتفع مسند پر اپنے آپ کو اس قدر بلند کھینچے ہوئے ہے۔ میں یہی دریافت کرتا ہوں کہ خدا کے لیے اور اس رسول کے لیے جس کا تو جانشین بنا ہوا ہے بتا اور سچ سچ بتا کہ ایمان کیا ہے' اصول مذہب کیا ہیں؟ وہ کہتا ہے "نماز و روزہ و تسبیح و توبہ' استغفار" میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایمان نام درستی اخلاق کا نہیں' اصول خیر و نجات " تزکیہ" نفس و روح سے متعلق نہیں۔ وہ اس کے جواب میں "ہاں" تو کہہ دیتا ہے لیکن اس کا وعظ یہی ہوتا ہے کہ اصل چیز صرف نماز ہے ایک مخصوص طریقہ عبادت ہی کا نام ایمان ہے' اور کوئی شخص اس طریق سے علیحدہ ہو کر چلتا ہے تو وہ گمراہ رہے گا خواہ اس کے اخلاق کتنے ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں؟

پھر اب میں خود مولانا ندوی سے پوچھتا ہوں کہ اصول کی تعیین ایمان کی تخصیص کو کس نے نظر انداز کیا' طریق کار اور راہ عمل کو کس نے اصل ایمان قرار دیا' میں نے جو صرف نکوکاری کو اصول و ایمان قرار دیتا ہے' یا اس مولوی نے جو کہتا ہے کہ "اخلاق حسنہ سے نجات ممکن نہیں ہے' جب تک ایک شخص خاص وضع' خاص لباس' خاص قسم کی داڑھی اور متعین حرکات کے ساتھ نماز نہ پڑھنے والا نہ ہو"۔

خدارا اب آپ ہی فیصلہ کیجئے داوری آپ ہی کے ہاتھ ہے کہ وہ کون ہے جو ذریعہ کو صرف ذریعہ سمجھتا ہے اور وہ کون ہیں جنھوں نے ذریعہ کو اصل مقصود قرار دے دیا ہے۔ شذرات کا دوسرا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

> کسی سمجھ دار انسان سے کوئی کام نتیجہ کے سمجھے بوجھے بغیر صادر نہیں ہو سکتا وہی نتیجہ اس کام کی غرض و غایت ہوتی ہے' اخلاق' محض اخلاق کا تصور' غرض و غایت اور نتیجہ کے بغیر ممکن نہیں' اخلاق کا کمال اعمال میں نہیں بلکہ ان کی غرض و غایت کی بلندی' اور ذاتی خواہشوں اور طلب معاوضہ سے انتہائی پاکی میں ہے۔ انسان کے اعمال کا پست اور ذلیل جذبات نفسانی ہو اور ہوس سے پاک ہونا اخلاق کی بلندی اور طہارت کے لیے ضروری ہے انسان کا کام صرف اس قدر نہیں ہے کہ کسی غریب آدمی کو چند پیسے دے دے بلکہ اس کے بعد یہ بھی ہے کہ یہ کام اس طرح کیا جائے کہ کرنے والے کا مقصود اپنی ناموری نمائش'

معاوضہ' فریب اور اس غریب کو ممنون احسان بنانا نہ ہو بلکہ صرف اخلاص قلب ہو۔ ان قلبی جذبات اور دل کے رجحانات کی اصلاح و پاکی سوا اس کے ممکن نہیں کہ ایک دانا کے رموز و عالم الاسرار ہستی کا یقین کیا جائے کہ جو دلوں کے ایک ایک رگ کی جنبش اور ایک ایک ریشہ کی حرکت کو دیکھتا اور سنتا اور جانتا ہے اس لیے خدا پر ایمان لائے بغیر حسن عمل اور حسن خلق کا تصور ممکن ہی نہیں کہ جوارح کے اعمال کی درستی' سراسر قلب کے اعمال کی درستی پر موقوف ہے۔"

مولانا کا مقصود اس تحریر سے غالباً" یہ ہے کہ اخلاق کی بلندی کا معیار صرف اخلاص ہے اور اخلاص حاصل ہونا ممکن نہیں جب تک خدا پر ایمان نہ رکھا جائے یقیناً" مجھے بھی لفظ بہ لفظ اس سے اتفاق ہے۔ لیکن تھوڑے لفظی و معنوی اختلاف کے ساتھ اور وہ یہ کہ جس چیز کو وہ اخلاص قلب کہتے ہیں میں اسے "احساس فرض" کہتا ہوں اور یہ بھی صرف اس لیے کہ "نفسانی ہوا وہوس" کا کوئی لگاؤ باقی ہی نہ رہے' اگر ایک شخص خدا پر ایمان رکھنے کے بعد اخلاص قلب سے کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس کا اجر خدا سے چاہتا ہے اور اس طرح گویا وہ بندے سے نہیں تو اس کے خدا سے طور بیع و شراء کرنا چاہتا ہے اور یہ جذبہ کلیتاً" ہوا وہوس سے خالی نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر تعلیم یہ دی جائے کہ کسی کے ساتھ نیکی کرنا ہر انسان کا فرض ہے جو قدرت یا خدا کی طرف سے اس پر عائد کیا گیا ہے تو پھر کسی قسم کا شائبہ نفسانی خواہش یا غرض ذاتی کا پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ کسی پر احسان کرنا گویا خود ممنون ہونا ہو گا کہ اس طرح وہ ایک فرض سے سبکدوش ہو گیا۔

جب تک اعمال کے ساتھ خدا کا ڈر یا اس کی خوشنودی و برہمی کا خیال شامل رہے گا انسان صحیح معنی میں کبھی کوئی نیکی نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے تمام افعال حسنہ یا تو اس طمع کے زیر اثر ظہور پذیر ہوں گے' جو حور و غلمان' یا کوثر و سلسبیل سے متعلق ہو سکتے ہیں' یا اس ڈر سے جو فطرتاً" آگ' اژدہا' سانپ بچھو وغیرہ سے انسان کو ہوتا ہے۔ خدا کو ماننا اور اس طرح ماننا کہ گویا وہ ہندوستان کی کسی ریاست کا نواب ہے جس کے جاسوس ہر وقت ہر جگہ لگے ہوئے ہیں اور جو ذرا ذرا سی بات میں دار پر کھنچوا سکتا ہے۔ کم ازکم میرے خیال میں کسی طرح نہیں آتا۔ میں خدا کو بے نیاز مطلق جانتا ہوں' جس کو نہ ہمارے افعال بد سے واسطہ ہے نہ اعمال حسنہ سے کوئی تعلق' کائنات کے اور تمام نظام کے ساتھ اس نے

انسان کی تمدنی زندگی کا بھی ایک قانون بنا دیا ہے جس کو انسان نے اپنی ارتقائی دور کے مختلف منازل میں اچھی طرح سمجھ لیا ہے پھر اگر وہ اس پر کار بند ہو گا تو خود اسی کی ہیئت اجتماعی کو فائدہ ہو گا ورنہ تباہ و برباد ہو جائے گا خواہ بجائے پانچ کے چالیس وقت کی نماز کیوں نہ پڑھے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ۔

"خدا پر ایمان لائے بغیر حسن عمل کا تصور ہی ممکن نہیں"

میں نے اس کے ماننے کے لیے تیار نہیں کیونکہ دنیا میں بعض افراد ایسے بھی مل سکتے ہیں جو باوجود انکار خدا کے اچھے خصائل رکھتے ہیں اور اپنے ابنائے جنس کو فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں' صرف اس خیال کے تحت کہ یہ ہر انسان کا فطری فرض ہے۔ میں حیران ہوں کہ مولانا اس کا انکار کیسے کر سکتے ہیں جبکہ وہ خود بھی اسی کے قائل ہوں گے کہ "نیکی خود آپ اپنا بدلہ ہے" اور اس نظریہ کے تحت خدا کے ماننے کی ضرورت نہیں یہ تو اصول گفتگو ہوئی۔ اب رہا وہ مسئلہ جس کے سلسلہ میں مولانا نے یہ اظہار خیال کیا ہے سو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ جو ایک نیکوکار برہمن کو ناری بتاتے ہیں تو کیا وہ خدا کا قائل نہیں ہے' کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایک بت پرست (اصطلاحی معنی میں) حقیقتاً" ایک ایسی قوت کا قائل نہیں ہوتا جسے سوا خدا سمجھنے کے کوئی چارہ نہیں اس لیے میری رائے میں مولانا کو یہ لکھنا چاہیے تھا کہ "بغیر مسلمان ہوئے حسن خلق کا تصور ممکن نہیں" اور یہ ثابت کرنے کے بعد وہ بے شک نکوکار برہمن کو ناری اور بدکار مسلمان کو ناجی کہہ سکتے تھے۔

اس کے بعد مولانا زیادہ کھل کر اصل مدعا کی طرف آئے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"آج جبکہ مسلمانوں کو عملاً" کام کرنا ہے صرف باتیں بنانا نہیں' کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو اس پر بحث نہیں کرتے کہ ایمان ہو یا حسن خلق' عملاً" عمل کرنا چاہیے بلکہ اس پر بحث کرتے ہیں کہ نجات اخروی کا ذریعہ محض ایمان ہے۔ یا حسن عمل صرف حسن عمل ہی سہی۔ ہمارے داعی اس کا نمونہ بن کر دکھائیں اس کی اہمیت نمایاں کر کے بتائیں' وہ کبھی اس کی دعوت نہیں دیتے کہ نماز پڑھنی کس قدر ضروری ہے لے دے کے دعوت یہ ہے کہ نماز پانچ وقت ہے کہ تین وقت' تین ہی وقت سہی' مگر تینوں وقتوں میں پڑھی بھی تو جائے یہ وہ لوگ ہیں جو ایجابی اسلام کے بجائے صرف سلبی اسلام کو مسلمانوں کی ہر ترقی کا ذریعہ جانتے ہیں۔ حالانکہ پانچ وقتوں والا نمازی سلطان صلاح الدین سلطان محمد فاتح اور سلیمان اعظم پانچ وقتوں کی نماز پڑھنے سے نہ اپنی سلطنت کھو بیٹھے اور نہ اس عہد کے ملاحدہ ترک صلوٰۃ

و عدم ایمان کے باوجود ملک کا چھوٹا سا گوشہ حاصل کر سکے' اگر ملک ہی حاصل کرنا ترقی ہے۔

مولانا نے اس بیان میں چند در چند غلطیاں کی ہیں اول تو "وہ کچھ لوگ جو ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو نجات اخروی سے کوئی بحث نہیں کرتے" اس میں سے اگر آپ لفظ اخروی نکال دیں تو بے شک آپ کا یہ دعوی درست ہو سکتا ہے کیونکہ اخروی کا جو مفہوم آپ کے ہاں ہے اس سے وہ کوسوں دور ہیں اور اگر بطور معارضہ یا استفادہ اخروی نجات سے گفتگو کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ آپ اس کے قائل ہیں اور آپ ہی کے مسلمہ اصول کو سامنے رکھ کر اصولاً" بحث کرنا چاہیے۔

دوسری غلط بیانی یہ ہے کہ ان لوگوں کو صرف باتیں بنانے والا ظاہر کیا گیا اور عملاً" حسن خلق سے بالکل بیگانہ۔ اگر اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ دوسرے گھر کی تیز روشنی کو گل کر کے اپنے گھر کی ضعیف روشنی کو نمایاں کیا جائے تو میں حیران ہوں کہ مولانا نے کیسے کہہ دیا کہ ایسے لوگ حسن اخلاق سے معرا ہوتے ہیں اور عمل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے' اس وقت اظہار انکسار کی ضرورت نہیں' مجھے صاف صاف دریافت کرنا چاہیے کہ مولانا مجھے کیوں اخلاق حسنہ سے معرا جانتے ہیں اور کس روایت کی بناء پر وہ مجھے بداخلاق کہہ سکتے ہیں در آنحالیکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ "مجھ صرف باتیں بنانے والے" کے اخلاق بدرجہا اب بہت سے مولویوں سے اچھے ہیں جو مولانا کے نزدیک عملاً" حسن اخلاق کے تعلیم دینے والے ہیں اور باتیں نہیں بناتے۔

اب رہا یہ الزام کہ ایسے لوگ تین ہی وقت نماز پڑھنے کی دعوت لوگوں کو کیوں نہیں دیتے' سو اس کا جواب زیادہ دشوار نہیں جبکہ صدیوں سے پانچ وقت کی نماز پڑھنے اور پڑھانے والوں کے اخلاق سامنے موجود ہیں "تو بروں در چہ کردی کہ درون خانہ آئی" گفتگو تو اسی میں ہے کہ مولویوں نے لوگوں سے اس قدر نمازیں پڑھوائیں' اتنے روزے رکھوائے کہ وہ نماز وہ روزہ ہی کو اصل ایمان سمجھنے لگے۔ اس لیے اب وقت کا اقتضاء کیا ہے نماز کی اہمیت کا درس دینا یا اس چیز کا جس کے حصول کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ نماز بھی تھی اور جو اب اپنی اہمیت ذریعہ ہونے کو بھی کھو چکی ہے۔

اگر سلطان صلاح الدین وغیرہ پانچ وقت نماز پڑھنے سے اپنی سلطنت کھو بیٹھے تو اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا کہ سلطنت ان کو پانچ وقت کی نماز ہی سے حاصل ہوئی تھی۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو کیوں نہ آج تمام مولوی پنج وقتہ نماز پڑھ کر کم از کم صوبہ برار ہی انگریزوں

سے چھین کر حضور نظام کو دلوا دیں' یا خود ہی لے لیں اور خیر صوبہ برار یا کوئی حصہ ملک تو خیر بڑی چیز ہے' میں کہتا ہوں کہ بجائے پانچ وقت کے وہ چالیس وقت کی نماز 40 ہزار برس تک ادا کرتے ہیں تو بھی وہ ایک انچ زمین حاصل نہیں کر سکتے۔

اب رہا دوسرا الزام کہ ملاحدہ ترک صلوٰۃ و عدم ایمان کے باوجود کیوں نہیں ملک کا کوئی چھوٹا سا گوشہ حاصل کر لیتے' سو یہ بالکل بے محل ہے' کیونکہ انھوں نے تو اس کا کبھی دعویٰ ہی نہیں کیا' اور نہ وہ اس کے قائل ہیں کہ سلطنت یا ملک گیری نماز سے متعلق ہے اور اگر الزامی جواب دینا چاہیں تو کہہ بھی سکتے ہیں کہ آج دنیا میں حکمرانی کس قوم کا حصہ ہے' کیا وہ بڑی خدا ترس ہے' کیا وہ بڑی مسلمان ہے' کیا وہ ملحد بے دین نہیں' اور دور کیوں جایئے خود ترکی کو دیکھیے کہ اس کے احیاء ثانیہ کا کیا راز ہے' اور کیا ترکوں پر الحاد و بے دینی کا الزام عائد نہیں کیا جاتا' نماز کے متعلق آپ گفتگو کا ایسا پہلو کیوں اختیار کرتے ہیں جو بالکل بے محل و غیر متعلق ہے میں نے کب کہا کہ نماز بری چیز ہے۔ یقیناً" وہ ایک بہتر طریقہ اصلاح نفس کا ہے' اور میں پابند صوم و صلوٰۃ کو اچھا سمجھتا ہوں' بشرط آنکہ وہ آپ ہی کے نظریہ کے مطابق ایمان و عمل میں امتیاز پیدا کر سکے۔ نماز اگر نفس ایمان سمجھ کر ادا کی جائے گی تو یقیناً" وہ اپنے حدود سے متجاوز ہو کر ناجائز چیز قرار دی جائے گی' لیکن اگر اس کو محض ایک ذریعہ فلاح سمجھ کر اختیار کیا گیا اور جذبہ رافت و لطف اس کی وساطت سے اپنے اوپر طاری کیا گیا تو اس کے بہتر ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

اخیر میں مولانا فرماتے ہیں کہ۔

اصل یہ ہے کہ آج کل یورپ کی نقالی ہر چیز میں ہے مذہب و اصلاح مذہب میں بھی نقالی ہے۔ یورپ کے رفارمیشن کی تاریخ پڑھ پڑھ کر ہر جدت پسند کو اسلام کا لوتھر بننے کا خیال ہے لیکن یہ خبر نہیں کہ اسلام و مسیحیت میں اشتراک کیا ہے؟ جس کے لیے اسلام کو لوتھر کی ضرورت پیش آئے عیسائیوں نے عیسائیت ملنے کی پندرہ سو برس بعد عیسا-ئت کو چھوڑ کر سلطنت پائی لیکن مسلمانوں نے تو اسلام اور سلطنت ایک ساتھ پائی اور جب اسلام چھوڑا سلطنت بھی چھوٹی! کیا یہ فرق ہمارے نئے مصلحین کے سامنے ہے۔ غلط رسوم و رواج اور خارجی بدعات کا نام مذہب نہیں ہے جس کی تصویر آپ اپنے واہمہ سے کھینچ کر دکھائیں۔

اس کے جواب میں ہم اسی عبارت کو دہرا کر خود مولانا سے سوال کریں گے کہ وہ

اسلام کہاں گیا جس کے ساتھ ساتھ سلطنت آئی تھی۔ اگر سلطنت کا ساتھ آنا' اسلام کا لازمی نتیجہ ہے تو پھر اس سے کیوں انکار کیا جاتا ہے کہ ترقی ملک گیری کا نام نہیں ہے' اگر آج اسلام کہیں نہیں ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا علماء کا گروہ اس الزام سے بری ہو سکتا ہے' یا تو اس کا اعتراف کیجیے کہ اس وقت کوئی عالم دین' کوئی ہادی شریعت' کوئی مصلح مذہب و ملت موجود نہیں ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ان اسباب کو تلاش کیجیے جنھوں نے سلطنت کو اسلام سے جدا کر دیا وہ لوگ جنھیں آپ نئے مصلحین کے لقب سے یاد کرتے ہیں وہ بھی اس جستجو میں ہیں اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ یہ سارا اوبار انھیں کا لایا ہوا ہے جو اپنے آپ کو علماء کرام اور ہادیان مذہب کہتے ہیں' اور آپ بھی اس جستجو میں ہیں لیکن آپ کی جستجو خود اپنے اندر سے شروع نہیں ہوتی اور اس لیے آپ کو اس "تنکا ڈھانے والا" کا پتہ نہیں چلتا۔

یہ آپ صرف زبان سے کہتے ہیں کہ "غلط رسوم اور خارجی بدعات" کا نام اسلام رکھ لیا گیا ہے لیکن ان رسوم و بدعات کے مٹانے کے لیے آپ کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے کیونکہ آپ میں ایسا کرنے کی جرات و جسارت نہیں ہے اور یہ جرات و جسارت کیوں نہیں ہے؟ اس لیے کہ جب تک نصیحت دوسروں سے متعلق ہوتی ہے بہت دلچسپ ہے لیکن جہاں اپنی ذات کا سوال آیا تو پھر وہی "کشف ساق" کا پیش آجاتا ہے جس کا تحمل آسان نہیں۔

بندہ نواز اگر ہم کچھ نہیں کر سکتے تو ہمارے پاس اس کا ایک معقول جواب بھی ہے کہ ہم اس کے اہل نہیں۔ لیکن آپ تو ایسا نہیں کہہ سکتے' اٹھیے اور ان رسوم و بدعات کو مٹائیے جن میں اسلام گم ہو گیا ہے اگر ہم سلبی اسلام والے ہیں تو آپ ایجابی اسلام والے کیوں نہیں سامنے آتے اور ان اوہام و شکوک کو کیوں نہیں رفع کرتے جنھوں نے مسلمانوں کو نصف سے زیادہ تعداد میں ملحد بے دین اور کافر بنا رکھا ہے۔

آپ لوگوں کو صرف کافر ملحد کہہ کر ذہن کی اس رفتار کو نہیں روک سکتے جو زمانہ کے ساتھ ساتھ ایک سیلاب کی طرح بڑھتی آرہی ہے بلکہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ آپ خود اس سیلاب میں پڑکر بہہ نکلنے والوں کو طوفان سے بچائیں لیکن آپ اس سے معذور ہیں تو پھر یہ وعظ و نصیحت بھی ترک کیجیے کہ اس سے بجائے فائدے کے اور نقصان ہے اور کبھی کبھی اپنی جماعت کو بھی غیر معصوم جان کر اس کے اعمال و افعال کا جائزہ لے لیا کیجیے کہ خانقاہوں

کے گوشوں اور مسجد کے محراب و منبر سے جو تقدس کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں کا وہ واقعی صحیح اور درست ہیں؟

اتنی نہ بڑھا پاکی و اماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ' ذرا بند قبا دیکھ

○ ○ ○

نگار کی الحاد پروری

غالب مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"سنو صاحب شعراء میں فردوسی' فقراء میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر و پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے' فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے اور عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو —"

اس میں اگر یہ اضافہ کر دیا جائے کہ ایک صداقت پرست' ایک حق شناس اور ایک بے لاگ تنقید کرنے والے کی انتہا یہ ہے کہ وہ کافر و مرتد بنا دیا جائے۔ ملحد و بیدین کے نام سے پکارا جائے تو میرے لیے اس سے زیادہ فخر کا موقعہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ آج میں بھی اسی منزل میں ہوں جو کسی وقت فردوسی' حسن بصری اور مجنوں کو اپنے فن میں نصیب ہوئی تھی اور ناشکری ہو گی اگر اس سے زیادہ کوئی اور سعادت طلب کروں'

ملبہ جاے کہ زجم ماند قناعت کردیم

بہ سکندر بدہیدانچہ زدارا ماند

آج سے کئی صدی قبل جب مذہب نام نفس و ضمیر کے سکون کا تھا جب قرآن کا مفہوم ایک مولوی کے مواعظ و ارشادات سے بلند تھا۔ جب دین حنیف میں جبرو اکراہ کا ذرا سا بھی شائبہ گوارا نہ کیا جاتا تھا اور جب عہد بنی عباس میں آزادی کے ساتھ ہر شخص کو اسلام کا صحیح مفہوم جاننے کے لیے جرح و تنقید کی اجازت تھی۔ اس وقت کفروار تداد کا مفہوم صرف یہ تھا کہ اصول اخلاق کو پس پشت ڈال کر انسانیت کی ترقی کو روک دیا جائے لیکن اب یہ معیار بہت بلند ہو گیا ہے۔ اس قدر بلند کہ میں تو خیر کیا چیز ہوں' اگر آج غزالی اور رازی زندہ ہوتے تو ان کا دامن بھی مولوی کے ہاتھ میں ہوتا۔ غضب خدا کا میں سوبار کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت و جبروت اور اس کی قوت و قدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ہزار بار لکھ چکا کہ رسول کی صداقت و بلندی فطرت پر جس طرح ایمان لایا ہوں' شاید ہی کوئی ایمان لایا ہو' لیکن باوجود اس اقرار کے بھی میں کافر ہوں

ملحد ہوں۔ مرتد ہوں۔ پھر اگر اسی اقرار و عقیدہ کا نام کفر الحاد ہے تو۔

نازم بہ کافری کہ بہ ایمان برابر است

لاؤ ساری دنیا کی بے دینی مجھے دے دو' تمام عالم کا ارتداد میرے حوالے کر دو اور کائنات کے ہر گوشے کا الحاد میرے قلب میں بھر دو کہ اس دولت کے ساتھ تو مجھے جہنم بھی اس فردوس سے زیادہ عزیز ہے جہاں ایک مولوی مسلمان کو کافر بنائے بغیر نہیں جا سکتا۔

ایں چہ شورے ست کہ در دور قمری بینم

اس دوران میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے زیادہ منظم طور پر میری بے دینیوں کے خلاف تبلیغ و اشاعت کی گئی۔ یہاں تک کہ بعض انجمنوں نے جو مقامی مولوی جماعت کے زیر اثر تھیں میرے نگار کے الحاد کو ناقابل برداشت قرار دے کر نگار کی خریداری سے لوگوں کو باز رکھنے کی کوشش کی۔ صوبہ بہار کے کوئی بزرگ مولوی عبدالحکیم یا حکیم الدین صاحب ہیں انھوں نے اپنے صوبہ کے اخبار اتحاد میں ایک خطیبانہ مقالہ کے ذریعہ سے ابناء وطن کو نگار کے فتنہ سے آگاہ کر کے اس کے مطالعہ کو حرام و ناجائز قرار دیا۔ یہاں تک کہ یہیں لکھنؤ میں بعض اکابر قوم و مذہب نے جلسہ کر کے یہ بھی ارادہ کیا کہ میری اس عارضی زندگی ہی کو ختم کر دیا جائے۔ بعض حضرات نے متعدد خطوط اس نوع کی تخویف و ترہیب کے بھی میرے پاس روانہ کیے۔ مقامی اخباروں میں روزنامہ ہمت اور ہفتہ وار سچ نے اس کار ثواب میں زیادہ اہتمام و توجہ سے کام لیا۔ الغرض اس دوران میں وہ سب کچھ ہوا جو صحافت و پروپاگنڈہ کی مدد سے ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے ان تمام حملوں کے جواب میں صرف سکوت سے کام لیا' کیونکہ ان تمام حضرات میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کی ہو اور مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے یہ سب ظن و قیاس اور عوام کی افواہ کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ بے معنی ہوا کرتی ہے یا پھر دیدہ و دانستہ کتمان حقیقت ہے اور میرے خلاف میری ہی تحریر کی غلط تعبیر جو ممکن ہے اصول جنگ کے لحاظ سے ان کی شرع متین میں جائز قرار دے دی گئی ہو۔ یا جنھوں نے میرے خلاف تبلیغ و اشاعت ہی کے ذریعہ سے فرد ہیں ایک قصر تازہ کی تعمیر کا عزم راسخ کر لیا ہو۔

ہمارے مسٹر عبدالماجد صاحب دریابادی (زباں پہ بارخدایا یہ کس کا نام آیا) نگار کی الحاد پروری کا ذکر تو اکثر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی کوئی ضعیف سی کوشش انھوں نے اس امر

کی بھی کی ہے کہ وہ صبیت سے علیحدہ ہو کر میرے خیالات پر غور فرماتے اور پھر فیصلہ کرتے کہ میرا حقیقی مقصود' اسلام کی خدمت ہے' یا اس کی تخریب و توہین' مجھے حیرت ہے کہ باوجود ایں ہمہ دعوائے ادبیت و تفلسف وہ تعصب و برہمی کے زیر اثر یہ بھی نہ غور کر سکے کہ جن مضامین کے اقتباسات وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انھیں سے ان کی تردید ہوتی ہو۔ میرکائی کے ذاتی مضمون میں خدا کے متعلق جو خیالات پریشان ظاہر کیے گئے ہیں وہ ایک دیوانہ یا مخبوط الحواس کی طرف سے ہیں جیسا کہ مضمون کی ابتداء میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور مضمون سے جو نتیجہ پیدا کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان خدا کو جو چاہے کہے' جس اصول کے تحت چاہے مطالعہ کرے لیکن آخر کار وہ خدا ہے اور وہی کرتا ہے جو اسے منظور ہوتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ وانتم سکاری کو علیحدہ کر کے صرف "لاتقربو الصلوۃ" پیش کرنے والے ذہنیت جناب عبدالماجد صاحب دریا بادی کو کس مدرسہ میں زلوائے ادب تہ کرنے سے حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح انھوں نے دوزخ و جنت کے متعلق میرے سے خیالات سمجھنے میں غلطی سے کام لیا (گو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غلطی قصد وارادہ کے تحت تھی یا تعصب و ناانصافی کی بناء پر) میرا مقصود ان مضامین سے یہ تھا کہ جن غلط روایات کی بناء پر دوزخ و جنت کا مفہوم عام طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ کس قدر مضحک اور اسلام کی شان کے منافی ہے پھر جب تک کہ جناب دریابادی یا انھیں کی طرح کوئی اور حامی دین یہ ثابت نہ کر دے کہ واقعی دوزخ و جنت کا تعلق مادی لذات سے ہے اس وقت تک میرے ان مضامین کو توہین مذہب یا مخالفت سلام کی صورت میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ کہنا بھی سخت غلط بیانی ہے کہ میں امام بخاری کا مخالف ہوں' میں صرف یہ کہتا ہوں کہ نہ صرف بخاری بلکہ تمام کتاب احادیث بحالت موجودہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر کلیتاً" اعتماد کر کے کسی مذہب کے اصول کو پیش کیا جا سکے۔ علی الخصوص مذہب اسلام جو دنیا کا تنہا فطری مذہب ظاہر کیا جاتا ہے' کیا جناب دریابادی کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت ہے کہ صحاح ستہ میں جتنی احادیث درج ہیں وہ واقعی وہی ہیں جو ان کے جامعین نے فراہم کی تھیں اور ان میں کوئی تدلیس و تحریف یا حذف و اضافہ کچھ نہیں ہوا۔ یقیناً" اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے میری مخالفت نا امام بخاری سے ہے نہ ان کے مجموعہ احادیث سے بلکہ صرف اس خیال سے کہ کیوں بغیر تنقید کے ہر قول کو رسول اللہ سے

منسوب کر کے مذہب اور رسول کی توہین کی جائے اور کیوں ایک ایسے شخص کو جو بغیر سمجھے ہوئے احادیث کو احادیث سے ماننے کے لیے تیار نہیں' مذہب کا مخالف قرار دیا جائے۔ بخاری کے درس سے ترک مذہب کا درس اسی لحاظ سے کہا گیا ہے کہ یہ حالت موجودہ اگر شروع سے لے کر آخر تک تمام احادیث کو صحیح تسلیم کرنے پر انسان کو مجبور کیا جائے تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ مذہب کا خیال ترک کر دے گا۔ اور اگر ایسا نہ کرے گا تو پھر وہ جس مذہب کا پیرو ہو گا اسے اسلام تو کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور جو نام چاہے اس کا قرار دے دیجیے۔

اسی طرح جناب عبدالماجد صاحب نے 25 ستمبر کے سچ میں میرے خلاف اور جو الزامات قائم کیے ہیں وہ سب تحریف مفہوم کا نتیجہ ہیں اور میرے مقصود سے بالکل علیحدہ ہیں میں نے جن اکابر ملت کی طہارت و عصمت کی داستانوں کا ذکر کیا ہے ان سے مراد صرف آج کل کے بعض ایسے نام نہاد علماء کرام ہیں جو صداقت کو محو کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں اور جن کا باطن ان کے ظاہر سے بالکل مختلف ہے' میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سلسلہ میں انہوں نے ابو حنیفہ وغیرہ کو کیوں شامل کر لیا۔ کیا عبارت کے سیاق و سباق سے وہ یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ میری مراد اکابر ملت سے کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگست 30ء کے ملاحظات میں اپنا ذکر دیکھ کر وہ جیاب ہو گئے اور فرط غضب میں محض انتقام لینے کے لیے انہوں نے میرے فقرہ کا محل بدل کر خواہ مخواہ ایسے معنی پیدا کیے جو لوگوں کو مشتعل کر دینے والے ہوں۔

پھر یہ سب کچھ جانے دیجیے۔ میں مانتا ہوں کہ جو کچھ میں لکھتا ہوں یا جو مضامین نگار میں شائع ہوتے ہیں وہ یکسر الحاد شرک ہیں لیکن خدارا کبھی ان کا جواب دینے کی بھی توسعی فرمایئے۔ بفرض محال یہ بھی مان لیجیے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ غیر مسلم ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں' تو کیا آپ کا فرض بہ حیثیت ایک مسلم ہونے کے یہ نہیں ہے کہ میرے شبہات کو دور کریں' مجھے راہ راست پر لائیں۔ یا یہ فرض اس طرح پورا ہو جاتا ہے کہ مجھے ملحد و مرتد بنا کر خدا کے حوالے کر دیا جائے اور "نگار" کے مطالعہ کو حرام قرار دے کر میری تاریک ذہنیت میں اور اضافہ کیا جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے' یہ کس نوع کی خدمت اسلام ہے یہ کس انداز کی تبلیغ ہے۔

تمام رسائل میں صرف "معارف" ہی ایک رسالہ ایسا ہے جو کبھی کبھی جواب دینے کی

زحمت گوارا کرتا ہے اور محض "کفرگری" کو ذریعہ حرب و دفاع قرار نہیں دیتا لیکن افسوس ہے کہ نگار میں جس نقطہ نظر سے گفتگو ہوتی ہے اس سے وہاں بھی اعتنا نہیں کیا جاتا اور اس لیے میری تشنہ کامیاں بدستور باقی رہتی ہیں۔

میرا دعویٰ یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی صرف ایک مذہب ایسا ہے جو وقت و زمانہ کے ساتھ دینے والا ہے اور یہی اک تنہا مسلک ہے جس نے اخوت عامہ اور انسانیت کبریٰ کو منزل حقیقی قرار دے کر ساری دنیا کو اشتراک عمل کی دعوت دی اور اسی اعتقاد و یقین کے ساتھ میں تمام اصول و شعائر پر نگاہ ڈالتا ہوں۔ یوں تو ایک مولوی بھی بظاہر یہی کہتا ہے کیونکہ جب تک وہ یہ دعوے نہ کرے مذہب اسلام کا امتیاز اور اس کی ہمہ گیری کیونکر ثابت ہو سکتی ہے' لیکن جس وقت اصول و عقائد۔ شعائر و عمل کا سوال آتا ہے پھر اس کا چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے جو یقیناً" کسی پیرو اسلام کا نہیں ہو سکتا۔

اس لیے اس وقت جو برہمی علماء کرام کی میرے خلاف ہے اس کا سبب حقیقتاً" یہ نہیں ہے کہ میں اسلام کا مخالف ہوں بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں کیوں ان کے سامنے سر بسجود نہیں ہوتا" اور میں کیوں اسلام کو ان کے عقول کا پابند نہیں سمجھتا جن حضرات نے نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر اسلام نام صرف یزداں پرستی کا ہے تو اس کے متعدد شواہد اس میں نظر آ سکتے ہیں۔ لیکن اگر اسلام کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں اور فاش و برملا کہتا ہوں کہ میں ہرگز مسلمان نہیں ہوں اور نہ دنیا میں کوئی انسان مسلمان ہو سکتا ہے۔

آج زمانہ جس دور اضطراب سے گزر رہا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ پھر کوئی بت شکن نبی پیدا ہو' بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ کوئی مذہب شکن رسول آئے اور دنیا سے مذہبیت کی اس کی گرانباری کو دور کر دے جس نے دنیا کا امن و سکون غارت کر رکھا ہے پھر اگر آپ ایسے نازک وقت میں اسلام کی کوئی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں اور اپنے اس دعوے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کا نصب العین دنیا میں امن و سکون قائم کرنا ہے تو اس کی صورت وہ نہیں ہے جو آپ لوگ اختیار کرتے ہیں' بلکہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ۔

یک دو نفس نالہ شوریدہ دل دیوانہ برآ

اسلام کے چہرے کو ان تمام داغوں سے پاک کیجیے جنھوں نے اس کے اصل خط و خال

کو پوشیدہ کر رکھا ہے اور وہ حقیقی سادگی، وہ بلندی نظری، وہ فراخ دلی اور علوئے نگاہ پھر پیدا کیجیے جو اسلام کے عناصر ترکیبی تھے۔ اس وقت تک آپ ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے صرف "بہ آواز دو لاب مستی کنند" کو اپنا ایمان قرار دیے ہوئے ہیں اور کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ آپ کے ان حرکات مذبوحی پر جرح و تنقید کرے لیکن اگر آپ نے کبھی یہ دعوے کیا کہ آپ اپنے اصول کی تبلیغ بھی چاہتے ہیں تو پھر معاف کیجیے۔ اس وقت آپ کا مجھے فرد طور کہہ دینا نگار کے خلاف لغو غلط پروپاگنڈہ قائم کر کے عوام میں ہیجان پیدا کر دینا مفید مطلب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شاید آپ کو علم نہیں کہ اس وقت دماغ انسانی جس اضطراب میں مبتلا ہے۔ اس کی تشفی آپ کے پروپاگنڈہ سے نہیں، بلکہ نگار ہی کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے پھر ممکن ہے کہ آج کا ماحول اس کی قدر نہ کرے، لیکن ایک وقت آئے گا جب نگار کے صفحات ہی میں آپ کو پناہ لینا پڑے گی اور آپ کے پاس کوئی ذریعہ دفاع نہ ہو گا مگر وہ جسے نگار اور صاحب نگار قائم کر چکا ہے وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کلام اللہ کے بعد جس مذہبی لٹریچر (یعنی مجموعہ احادیث) کو آپ اپنا مقصود سمجھے ہوئے ہیں اس نے اسلام کی جڑوں کو کس قدر متزلزل کر دیا ہے عیسائیوں کے اعتراضات، آریوں کے حملے اور تمام غیر مسلم اقوام کی نکتہ چینیاں کلام مجید پر اتنی منحصر نہیں ہیں جتنی احادیث پر، اور حقیقت یہ ہے کہ آج تک ڈاکٹر تسدل کی مشہور کتاب ینابیع الاسلام کا جواب ہمارے ہاں کے کسی بڑے سے بڑے عالم سے بن نہیں پڑا، کیونکہ اس کے تمام اعتراضات کا بڑا ماخذ مجموعہ احادیث ہے اور آپ اس پر مجبور ہیں کہ جو واقعہ یا لفظ رسول اللہ سے منسوب کر دیا گیا ہے اسے غلط نہ قرار دیں خواہ وہ کتنا ہی لغو مہمل کیوں نہ ہو یعنی یہ تو آپ تو گوارا کر سکتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد کھوکھلی ہو جائے لیکن مجموعہ احادیث پر آپ سے کبھی تنقید نہ ہو گی۔ اور اگر دوسرا اس کی جرات کرے گا تو اس طور بیدین، فتنہ پرداز اور خدا جانے کیا کیا کہیں گے، درآنحالیکہ ان تمام الفاظ کا بہترین مخاطب تو واضعین احادیث ہی کی ذات بابرکات ہو سکتی ہے۔

بہر حال میں ان تمام حضرت نگاریوں کے بعد بھی ہر وقت اپنے آپ کو ایک مبتدی طالب علم سے زیادہ نہیں جانتا اور اس کے لیے تیار ہوں کہ ہندوستان کا کوئی ایک مولوی یا مولویوں کی کوئی بڑی سے بڑی جماعت مجھے سمجھا دے اگر میں غلطی پر ہوں لیکن اس کا طریقہ شاید یہ نہیں ہے جو آپ لوگ اختیار کر رہے ہیں۔

میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ مذہبیات کے سلسلہ میں اس مقصود سے ہٹ جاؤں جس کا نام میں نے صرف معرفت انسانی رکھا ہے اور خواہ مخواہ وہ الجھنیں عوام کے سامنے لے آؤں جو مجموعہ احادیث اور علمائے کرام کی تنگ نظری سے پیدا ہو گئی ہے۔

○ ○ ○

کورانہ تقلید

صنم کہ بمعل و دین خود استوار نیست
بہ نیم غمزہ ہم این را رہائے وہم آں را
(غالب)

انسان کی زندگی میں بعض ساعتیں ایسی بھی آتی ہیں جب وہ محو خواب ہوتا ہے لیکن انسانیت بیدار ہوتی رہتی ہے۔ اس کے قواء بظاہر بیکار نظر آتے ہیں لیکن روح اپنا کام کرتی رہتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کے جوارح ظاہری درد تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن قلب و دماغ آہستہ آہستہ "سکون جان" کی منزل سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ انسانیت پوری طرح آنکھ کھول کر مسکرانے لگتی ہے' روح ایک فاتحانہ مسرت کے ساتھ اچھل پڑتی ہے' قلب و دماغ نشہ کامیابی ونشاط سے سرشار ہو جاتے ہیں اور آخر کار انسان بھی چونک پڑتا ہے' اس کے اعضاء بھی بیدر ہو جاتے ہیں اور ہو منزل سامنے آجاتی ہے جسے آشتی جسم و روح سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اسی کا دوسرا نام دنیائے عمل ہے سی کو "عالم تگ و دو" کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے شاعراز زبان میں" شک زمیاں رفت و یقیں جلوہ کرد" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر تاہیں دم کرہ ارض کی زندگی پر کوئی صدی کوئی قرن کوئی دن' کوئی ساعت' بلکہ میں تو کہوں گا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا ہے جس میں قدرت کے اس نظام فطرت کے اصول اور خدا کی اس نہ تبدیل ہونے والی سنت پر کشود کار کا انحصار نہ رہا ہو۔ جو ہر فرد اور قوت کا باہمی تعلق' مادہ کی مختلف صورتیں' ایتھر بلکہ ماوراء ایتھر عناصر آفرینش کا نواۃ اور برق پاروں کی صورت اختیار کرنا۔ بلطخات سحابیہ کا رفتہ رفتہ منجمد ہو کر مختلف کروں' سیاروں' چھوٹے چھوٹے ستاروں' چاندوں اور شہاب ثاقب میں تبدیل ہو جانا یہ کیا ہے؟ کیا سب اسی بیداری کا نتیجہ نہیں۔ کیا مادہ کا تفاعل اس کی بیداری نہیں۔ کیا برق پاروں کی گردش ان کا نشاط عمل نہیں' کیا آفتاب کے طلوع و غروب' چاند کے ایاب و ذہاب میں اس ابتسام خداوندی کی جھلک موجود نہیں جس کے پر تو سے تمام ملکوتی قوتیں دفعتہ"

جگمگا اٹھتی ہیں۔

ابراہیم کی بت شکنی کیا اس بیداری کا نتیجہ نہ تھی۔ موسیٰ کا فرعون کی قوت قہرانی کے مقابل میں آجانا کیا روح و جسم کے اتحاد کا نتیجہ نہ تھا۔ عیسیٰ کا صلیب پر چڑھ جانا کیا اس احساس کے علاوہ کچھ اور تھا۔ مہاتما بودھ کا شاہانہ جاہ و جلال کی زنجیروں کو توڑ پھینک دینا کسی اور قوت کا کرشمہ تھا' رام چندر جی کی صحرانوردیاں کیا کسی جذبہ غیر سے روحانی سے متعلق تھیں' کرشن جی کی معرکہ آرائیاں کیا کوئی اور منظر پیش کرنے والی تھیں' کنفوشیوس کی ذات کیا کسی غیر کیفیت کا مظہر تھی' زروشت کی زندگی میں کیا کسی اور شعلہ کی جھلک پائی جاتی تھی' سرزمین عرب سے پیدا ہونے والے سب سے بڑے انسان کا کوہ فاران پر چڑھ کر کفار عرب کو پیام خداوندی پہنچانا کیا کسی اور احساس کا نتیجہ تھا۔ حسین کی عظیم الشان قربانی کیا کوئی اور ردعمل تھی' منصور کے ساتھ دار و رسن کا معاملہ بھی اسی معمہ کی گرہ کشائی تھی اور منصور کے حلقوم پر تیغ کی روانی بھی اسی کا اعادہ تھا۔

لیکن جس طرح قدرت عرصہ تک محو خواب رکھنے کے بعد نوع انسانی کو بیدار کرنے کے لیے اس کے کسی فرد کا انتخاب کر لیتی ہے' اسی طرح وہ یہ بھی کرتی ہے کہ وہ قرنوں تک بیدار رکھنے کے بعد دوبارہ آہستہ آہستہ نیند طاری کر دیتی ہے۔ پھر کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی قوم کے لیے یہ نیند موت کی نیند میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے فنا اور کبھی یہ نیند پھر ایسی بیداری اختیار کر لیتی ہے جیسے مردہ زمین میں از سر نو جان پڑ جائے۔

کہا جاتا ہے کہ اصلاح کی بنیاد انسان کے جہل سے شروع ہوتی ہے۔ اور علم کی روشنی میں اس کا اختتام ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ جو چیز جہل کے دور کرنے کے لیے آئے گی۔ اس کی ابتداء عہد تاریک ہی سے ہو گی اور یقیناً" جب علم کی ترقیاں انسانی دماغ کو منور کر چکیں گی تو دور اصلاح ختم ہو جائے گا۔ اگر اس کا مقصود کسی انسان کو محدود منزل تک پہنچا کر ٹھہر جانا ہے لیکن اگر کوئی خیال دنیا میں ایسا ہے یا ہو سکتا ہے جس کے دائرہ عمل سے تعین منزل کا سوال خارج ہے یا جس نے لانہایت کو اپنی تگ و دو کی جولانگاہ قرار دیا ہے یا جس کا مدعا عقول انسانی کو ہر وقت اور ہمیشہ منور کرتے رہنا ہے۔ یعنی اگر کوئی تعلیم ایسی ہے جو اخلاق ہی کی ترقی کو منتہائے نظر قرار دیتی ہے' جس کی دعوت عالم انسانی کے ہر ہر فرد کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر سکتی ہے اور جو تمام ظاہر پرستیوں سے بلند ہو کر انقیاد فطرت کا مفہوم صرف روح کے جھک جانے کو قرار دیتی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ علم د

حکمت کی ترقی کے ساتھ ایسی تعلیم کو ختم ہو جانا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک تعلیم اخلاق کا سوال ہے اس وقت تک جتنی اصلاحیں دنیا میں بروئے کار آئیں ان سب کا مقصود ایک ہی تھا۔ سب نے یہی تعلیم دی کہ اچھے کام اچھے اور برے برے ہیں لیکن اس تعلیم کے عملی پہلو کے لحاظ سے جو اصول و قوائد انھوں نے مقرر کیے وہ وقت اور زمانہ کے لحاظ سے ضرور مختلف تھے اور انھیں مختلف ہونا چاہیے تھا کیونکہ ان کا عقول انسانی کے مطابق ہونا ضروری تھا اور عقول انسانی کی ترقی ہمیشہ سے جاری ہے اور رہے گی لیکن جس وقت ہم تقابلاً" ان کا مطالعہ کریں گے' ان کے مقاصد تعلیم اور ان کے اصول اصلاح سے اور ہم ان کے اس پیام پر غور کریں گے جو انھوں نے نوع انسانی تک پہنچایا تو ہم کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان تمام تعلیمات میں صرف ایک ہی تعلیم ایسی ہے جس کے نصب العین کی بلندی تمام کائنات کا احاطہ کر لینے والی ہے اور جس نے اگر ایک طرف نقطہ نظر سے یہ تعلیم دی کہ نوع انسانی کے تمام افراد کو ایک ہی مرکز پر جمع ہو کر ابناء جنس کی خدمت کرنا چاہیے تو دوسری طرف علوم کی ترقی کے لحاظ سے اس نے تمام مظاہر فطرت انسان کے تصرف میں دے کر گویا یہ بتا دیا کہ انسان حقیقت نام ہے اس قوت عمل کا جولا نہایت تک برابر اسباب ترقی کا ساتھ دیتی چلی جائے اور زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اس کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی مسلک کا حقیقی پیام یہی ہے جو بیان کیا گیا تو دنیا کے افراد اس کے ماننے سے کیوں احتراز کرتے ہیں اور اس کے متبعین کے زوال و انحطاط کا کیا سبب ہو سکتا ہے غیر جماعتیں اس سبب کو اس کی تعلیمات میں ڈھونڈھتی ہیں اور میں اس کو تاریخ میں پاتا ہوں یعنی وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس کے اصول تعلیم ہی ایسے ناقص و ناکمل ہیں کہ اس کے متبعین زمانہ کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے پستی کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں اور میرا دعوے یہ ہے کہ اس انحطاط کا سبب ہی یہ ہے کہ انھوں نے تعلیم کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا جس کے بہت سے اسباب تاریخ میں مل سکتے ہیں۔

جس وقت آپ نوع انسانی کی ذہنی یا اخلاقی ترقی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ جب تک کسی قوم یا جماعت کا کوئی مصلح ان کے اندر موجود رہتا ہے ایک عام انقیاد و اطاعت اور اقدام عمل کے سوا کوئی صورت اختلاف کی پیدا نہیں ہوتی لیکن جس وقت وہ اٹھ جاتا ہے تو رفتہ رفتہ قواء عمل کی حرکت مضمحل ہونے لگتی ہے ور اسی کے ساتھ اختلاف

آزادہ پیدا ہونے لگتا ہے جو اجتماعی روح کے لیے سم قاتل سے کم نہیں' نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخوت و ہمدردی' عدل و مساوات کا جذبہ ضعیف ہو کر ملوکیت و استبداد کی بنیاد پڑنے لگتی ہے اور انسان برتری کا معیار اخلاق نہیں بلکہ جاہ و ثروت' دنیاوی نمود و نمائش قرار پاجاتا ہے اور آخر کار ہر ہر فرد خود غرضی' نفسانیت اور آسائش جسم و جان کو زندگی کا حقیقی مقصود سمجھنے لگتا ہے' یعنی ایک وقت تو وہ ہوتا ہے جب روئے زمین پر ہر سانس لینے والے انسان کے سامنے تعلیم و اخلاق و اصلاح پیش کی جاتی ہے اور ہر شخص آزادی کے ساتھ سوچنے سمجھنے کے بعد شمع یقین اپنے دل میں روشن کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے اور پھر دوسرا وقت آتا ہے جب خود اپنے افراد کو بھی اس کے اندر پناہ لینے کی جگہ نہیں ملتی اور اپنی کمزوریوں' اپنی نااہلیوں کا اندیشہ اس قدر غالب آجاتا ہے کہ ان کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں ہوتا' یہی وہ منزل ہے جس کی طرف غالب نے ان الفاظ میں ارشاد کیا ہے کہ۔

ناروا بود بہ بازار جہاں جنس وفا
رونقے گشتم و از طالع دکاں رفتم

یہی سبب ہے کہ آج ہماری قومی و اجتماعی حیات ہماری مذہبی و اخلاقی زندگی ہمارا اقتصادی و معاشرتی نظام' الغرض ہماری ہر ہر چیز خواہ کسی شعبہ حیات سے متعلق ہو' کسی نظام زندگی سے وابستہ ہو' بالکل ویسی ہی ہے جیسے اندھوں کی وہ نزاع جب ان میں سے ہر ایک نے ہاتھی کے مختلف اعضا کو ٹٹولنے کے بعد اس کی ماہیت کا اندازہ لگایا' اور ہر ایک نے اپنی جگہ اپنے آپ کو سچا باور کر کے دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کیا در آنحالیکہ ہاتھی کی حقیقت کو ان کے اعتقاد و یقین سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔

آج جس چیز کو ہم یقین کی صورت سے پیش کر رہے ہیں وہ محض وہم و گمان ہے آج جن باتوں کو ہم حقائق و مسلمات کہہ کر بیان کر رہے ہیں وہ صرف مزخرفات و ترہات ہیں' دنیا نئی ہے اور اس کے اصول نئے' زندگی نئی ہے اور اس کے امیال و عواطف نئے' پہلے سانس لینے کا طور اور تھا اور اب جینے کی راہیں اور ہیں' اب سے ایک صدی قبل جو انسان پیدا ہوتا تھا اب نہیں پیدا ہوتا اور پہلے عقل انسانی کے جو دروازے مقفل نظر آتے تھے اب بالکل کھلے ہوئے ہیں' ذہن و دماغ جن زنجیروں سے جڑے ہوئے تھے وہ اب ٹوٹ رہی ہیں' فراست انسانی آزاد ہے اور اب اسی شخص کو یہاں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے جو آزادی کے ساتھ سوچ سکتا ہے جو آزادی سے بول سکتا ہے جس نے آزادی ہی کے لیے مرنا اور

جینا اپنا شعار قائم کر لیا ہے اور جو دنیا کی آزاد فضا میں سانس لے رہا ہے۔

پھر کیا انسان کی یہ مسرت اس لیے ہے کہ وہ مذہب و اخلاق کی بندشوں سے چھوٹ کر بہیمانہ اخلاق اختیار کرنے کے لیے آزاد ہو گیا ہے۔ کیا یہ جذبہ سرور اس بناء پر ہے کہ خونخواری و درندگی سے باز رکھنے کے لیے ناخن و چنگال کو قطع کرنے والی قوت کوئی باقی نہیں رہی نہیں یہ مسرت صرف اس لیے ہے کہ آج بالکل پہلی مرتبہ وہ خدا کو بے نقاب دیکھ رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس نے آزادی کی پوجا کی اس نے خدا کی پرستش کی کیونکہ قدرت کا یہی وہ مظہر ہے جو انسان کو انسان اعلیٰ یا خدا کا نائب و خلیفہ بنا دینے والا ہے۔

○ ○ ○

اے خدا

اے بہ خلا و ملاخوئے تو ہنگمہ زا
باہمہ در گفتگو' بے ہما در ماجرا

اے خدا! اس وقت بھی جبکہ قرون مظلمہ کی دنیا تجھے صرف غصہ کی آگ برسانے والا دیوتا سمجھ رہی تھی۔ مجھے تیرے دونوں ہاتھ لطف و رافت کے پھولوں اور عطوفت کے ہاروں سے لدے ہوئے نظر آتے تھے۔

اول دن سے میں ڈرایا جا رہا تھا کہ میں نے ایسا کیا تو' تو خفا ہو جائے گا ایسا نہ کیا تو' تو برہم ہو کر مجھے آگ میں ڈال دے گا' لیکن میں نے تجھے قلب کی گہرائیوں' اپنی روح کے اعماق میں ہمیشہ مسکراتے ہی دیکھا۔

ٹھیک اس وقت کہ لوگ تیرے غصہ کے اندیشہ سے کانپتے ہوتے تھے' تیری محبت و شفقت کے حضور میں سکون کے ساتھ تیری تعریف کے گن گایا کرتا تھا۔ وہ روتے تھے میں ہنستا تھا۔ وہ تیرے سامنے جھکتے تھے تجھ سے ڈر کر' اور میں تیرے حضور میں سر بہ سجود ہوتا تھا۔ تیری محبت سے بیتاب ہو کر۔

دلے دارم خراب از التفات چشم بیمارت
ہمہ از جور می ترسند و من از لطف بسیارت

ایک زمانہ گزر گیا کہ اس کار گہ عالم میں' ان کا خوف اور میری محبت دونوں اسی طرح متوازی چلتے رہے' نہ ان میں یہ جرات کہ میری محبت کی آنکھوں سے تیرے تبسم و درخشاں چہرے کا نظارہ کرتے' نہ مجھ میں اس کا ہوش کہ ان کے آئینہ خوف میں تیری پیشانی کی شکنوں کو دیکھتا۔ دن گذرتے گئے۔ آفتاب کے طلوع و غروب کے نہ جانے کتنے مناظر میرے دل میں حسن مجرد کے نقوش قائم کرتے رہے۔ چاند کے عروج و زوال کی مختلف منزلوں میں تو ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے تجھے کس کس آن میں دیکھا' بہار خزاں کو متضاد کیفیات میں' دریاؤں کی روانی میں' پہاڑوں کے سکوت میں۔ آبشاروں کے شور میں جنگل کے سناٹے میں' قصر دولت کے مخملیں فرش پر' جھونپڑوں کی بوسیدہ چٹائیوں پر' خواجگان کبار

کی چین ابرو میں' کاسہان ضعیف کی عرق آلود پیشانی میں' امیروں کے زرکار لبادوں میں' کسانوں کے تار تار کرتوں میں' الغرض اے لاتعداد و شمار سے باہر' اے زمان و مکان کی قید سے آزاد' میں نے ہر جگہ تجھی کو کارفرما دیکھا اور جہاں دیکھا۔

شفقت و رافت کے لاکھوں پھول برساتا ہوا۔

میں حیران تھا کہ دنیا والے تجھ سے ڈرتے کیوں ہیں محبت کیوں نہیں کرتے تیری ہیبت کیوں ان کے دلوں میں طاری ہے تیری رحمت سے الفت کرنے پر کیوں مجبور نہیں اس حال پر بھی ایک زمانہ گزر گیا اور میں خاموش پروانہ وار تیری شمع حسن کا طواف کرتا رہا ایک دن ناگہاں تجھ سے ڈرنے والوں میں سے ایک ڈرنے والا میرے پاس آیا اور بولا کہ "چل ہمارے معبد میں ہمارے خدا کی جستجو کر" میں بولا "تمہارا معبد! تمہارا خدا! کیا وہی معبد جسے آسمان کا صاعقہ' زمین کا زلزلہ مسمار کر دیتا ہے' کیا وہی خدا کے تصور کی ابتدا خوف و ہراس سے ہوتی ہے مجھے نہ یہ چاہیے نہ وہ میرا معبد میرے دل کے اندر ہے جسے کوئی چیز تباہ نہیں کر سکتی میرا خدا میری روح کے اندر محبت کا زریں نقاب ڈالے ہوئے جگمگا رہا ہے"

پھر ایک طویل زمانہ گزر گیا اور ایک بے آب و گیاہ قطعہ زمین سے رونما ہونے والی ہستی نے مجھ سے کہا کہ "چل ہماری پرستش گاہ میں خدا کی پرستش کر" میں نے پوچھا وہ پرستش گاہ کیسی ہے اور وہ خدا کیسا ہے "جواب ملا" وہ معبد کسی مکان میں مقید نہیں' بلکہ انسان کے ہر سجدہ کے ساتھ ازخود پیدا ہوتا ہے اور وہ خدا یکسر محبت و شفقت ہے جو میرے ذریعہ سے تمام دنیا کے بسنے والوں کو اپنی رحمت کا پیام دینا چاہتا ہے"

میں فرط مسرت سے اچھل پڑا۔ لاکھوں برس کے انتظار کے بعد وہ آواز کان میں آئی جس کے لیے روح بیتاب اور دل دیوانہ تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ اس کے سامنے اپنا دل ڈال دیا۔ اس کے دامن سے اپنا دامن باندھ دیا۔ اس نے مسکرا کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا اور میری ہستی اس کی ہستی کا ایک جزو ہو کر سکون کے شیریں خواب میں محو ہو گئی ہر بات کے کہنے کا ایک محل ہوتا ہے ایک مخصوص ہستی ہی اس کو کہہ سکتی ہے' اور مخصوص زبان میں دنیائے اثر و تاثر میں کامیابی کا انحصار انہیں تین چیزوں پر ہے اور اگر ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی کمی ہوئی تو سمجھ لو کہ ناکامی یقینی ہے میخانہ میں ایک رند کی طرف سے صلاح و تقویٰ کی گفتگو ویسی ہی بے معنی ہے جیسے معبد میں ایک زاہد مرتاض کی جانب سے دعوت جام و سبو' نہ اس طرح وہاں حلقہ تسبیح و تہلیل قائم ہو سکتا ہے

اور نہ یہاں بزم نشاط برپا۔ بالکل یہی حال روح انسانی کے ان رازوں کا ہے جو وقتاً فوقتاً زبان پر بے اختیارانہ آجاتے ہیں لیکن ان میں بعض ایسے ہوتے ہیں جو صرف محراب مسجد ہی میں کہے جاسکتے ہیں اور بعض وہ جو۔

بردار تواں گفت بہ منبر نہ تواں گفت

اس لیے اگر کوئی شخص محراب و منبر سے جدا رہنا چاہتا ہے تو وہاں کی ہر بات باہر کیوں کہے اور جو دار پر چڑھائے جانے سے ڈرتا ہے وہ اس کے راز کو کیوں زبان پر لائے۔

دنیا اس دور آزادی میں مذہبی پابندیوں۔ اخلاقی بندشوں سے علیحدہ ہو کر محض اپنے ذہن و دماغ کی پرستش کرنا چاہتی ہے۔ صرف اپنے سمجھے ہوئے اصول اخلاق کی پابندی پسند کرتی ہے لیکن جس طرح عالم نظام اجتماعی اس انفرادی سرکشی کو برداشت نہیں کر سکتا اسی طرح یہ ذہنی انفرادیت بھی اب آسانی سے انقیاد و اطاعت قبول نہیں کر سکتی۔ یہ ہے وہ عظیم الشان جنگ' جو اس وقت انسانوں کے قلوب کو غیر مطمئن بنائے ہوئے ہے جس نے ذہنی توازن کے سکون کو تباہ و برباد کر رکھا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ "استرداد حیوانیت" کی صورت میں ظاہر ہو گا یا قیام "انسانیت کبریٰ" کی شکل میں'

قانون انسانی کا اقتدار و اثر انسان کے صرف ظاہری اعضا تک محدود ہوتا ہے لیکن خدائی قانون دلوں پر حکومت کرتا ہے اس لیے یہ اضطراب کسی ملکی آئین سے دور نہیں ہو سکتا۔ اس کا علاج اگر کوئی ہے تو وہی ضابطہ خداوندی جو خوف و جبر سے نہیں بلکہ محبت و رافت کے ساتھ سب کو ایک مرکز پر جمع کرنا چاہتا ہے۔ اور انفرادی اغراض کو دل سے نکال کر' اجتماعی فلاح کی بنیاد پر روح انسانی کو رواداری کے درد و ایثار کے جذبہ سے معمور کر دیتا ہے پھر آج ہے کوئی مذہب ایسا جو دنیا کے اس دماغی' روحانی اور اخلاقی ہیجان پر قابو حاصل کر سکے؟ کوئی نہیں' آپ کو معلوم ہے اس کے بعد کیا ہو گا اخلاقی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی' مذہبی بندشیں یکسر فنا ہو جائیں گی۔ درندگی و خونخواری کا نام تہذیب انسانی قرار پائے گا۔ ہر فرد کا ہاتھ دوسرے فرد کے خون سے رنگین نظر آئے گا۔ اور آخر کار جب انسان تھک کر خستہ و درماندہ ہو کر ہانپنے لگے گا۔ ایک جگہ گر پڑے گا۔ تو افق سے ایک روشن ستارہ طلوع کرتا ہوا اسے نظر آئے گا جس کی روشنی سے راحت و سکون محسوس ہو گا جس کی تیز کرنیں اس کے دکھے ہوئے اعضا اور زخمی جسم پر مومیائی کا سا کام کریں گی اور افراد نوع انسانی پھر ایک بار اسی کے درخشاں فضا میں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوں گے اور یہی ہے وہ حقیقت جس کو

غالب نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ

"ملتیں جب مٹ گئیں جزائے ایماں ہو گئیں

پھر یہ بات نہ محراب و منبر کی ہے کہ مجھ سا رند معصیت کوش اسے نہ کہہ سکے' نہ حدیث وار و رسن ہے کہ میرا ضعیف قلب اس کے اظہار سے خائف ہو۔ یہ ایک ایسے واقعہ کی پیشین گوئی ہے جس کو میری نگاہیں ابھی سے دیکھ رہی ہیں اور ہرچند اس وقت میں نہ ہوں گا لیکن جو ہو گا وہ دیکھ لے گا کہ آخر کار نوع انسانی اسی ایک مرکز پر جمع ہو کر رہے گی جسے آج کل کی اصطلاح میں نہیں بلکہ مستقبل کی اصطلاح میں سچے مذہب کے نام سے پکاریں گے کیونکہ وہ عبارت ہو گا محض انسانیت سے جس کی سب سے پہلے اسلام نے دعوت دی اور آخر میں بھی وہی اس کو انجام تک پہنچانے والا ثابت ہو گا۔

دنیا میں کوئی چیز بذات خود نہ بری ہے نہ اچھی۔ اس سے اچھائی یا برائی کا تعلق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کا استعمال کیا جائے پھر اگر اس سے خیر و فلاح کا کام لیا جاتا ہے تو اس کی تعریف کی جاتی ہے ورنہ نہیں زنگ خوار وہ لوہے کا ٹکڑا کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اگر اسی سے زخم پہنچایا جانے لگے تو لوگ اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے تیغ و تفنگ اپنی جگہ بے حقیقت چیزیں ہیں لیکن ان کے استعمال کی تاریخ اس قدر خونیں ہے کہ لوگ اس کو دیکھتے ہی خائف ہو جاتے ہیں' درآنحالیکہ اگر ان سے انسان کا خون نہ بہایا جاتا تو آج لوگوں کو یہ یقین کرنے میں بھی تامل ہوتا کہ بندوق کی گولی انسانی سینہ کے اندر پیوست ہو سکتی ہے اور تلوار کی دھار انسان کے اعضا کو قطع کر سکتی ہے۔ بالکل یہی حالت دنیا کی ان تمام تحریکوں کی ہے جن کو اصلاح نوع انسانی اور قیام امن و سکون کے لیے بروئے کار لایا گیا پھر جب تک ان سے مقصد اصلاح پورا ہوتا رہا لوگ متوجہ ہوتے رہے اور جب ان کی حقیقی روح مفقود ہو گئی تو لوگوں نے ان سے روگردانی اختیار کر لی اور وہ فنا ہو گئیں اصلاح اخلاق کی دنیا میں سب سے بڑا مرتبہ مذہب کا سمجھا جاتا ہے یعنی کوئی تحریک دنیا میں قیام امن و سکون کے نام سے ایسی پیش نہیں کی گئی جس کا نام مذہب نہ رکھا گیا ہو لیکن جب آپ اس کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ مذاہب عالم خواہ اپنی تعلیم کے لحاظ سے کتنے ہی امن پسند کیوں نہ ہوں لیکن تاریخی حیثیت سے ان کی خونریزیاں و خوں آشامیاں نوع انسانی کے مصائب کی نہایت دردناک داستانیں ہیں یقیناً" اس سے زیادہ حیرت ناک امر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو مذاہب یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ دنیا سے قتل و

غارت گری، وحشت و درندگی مثالنے آئے ہیں اور دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھیں کے متبعین نے دنیا میں خونریزیاں کیں اور مذاہب کا نام لے کر قتل و جدال کا بازار گرم کیا گیا یقیناً" ایک سوچنے والے دماغ کے لیے یہ مسئلہ بڑی الجھنیں پیدا کر دینے والا ہے اور وہ حیران رہ جاتا ہے کہ اس سے وہ کس نتیجہ پر پہنچے آیا یہ کہ مذہب کا خیال ہی دنیا میں ایک لغو خیال ہے یا یہ کہ واقعی دنیا نے مذہب کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی۔

اس حقیقت پر نگار کے صفحات میں بار ہا روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ مذہب کا خیال بالکل فطری چیز ہے اور نوع انسانی کی ترقی کے لیے کسی ایسے نظام کا قائم ہونا جو امن و سکون کی بقا اور اخلاق کے قیام کا ضامن ہو۔ خود انسان کی فطرت کا اقتضاء تھا خواہ اس کا نام مذہب رکھا جاتا کوئی اور اس لئے اس پر بحث کرنا صرف لفظی نزاع ہو گی کہ اس کا نام مذہب کیوں رکھا گیا۔ کسی اور نام سے کیوں نہ موسوم کیا گیا۔ بہر حال فی نفسہ مذہب کی ضرورت یا اس کی اہمیت سے انکار نہیں اس لیے لا محالہ ہم کو دوسری صورت پر غور کرنا پڑے گا کہ کیا واقعی دنیا نے مذہب کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی لفظ مذہب کا مفہوم طریق حیات یا طریق عمل ہے جو اپنی جگہ کس قدر معصوم معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم اس کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہی معصوم لفظ دنیا میں کتنی خونریزیوں اور معصیت کوشیوں کا سبب بنا اور وہی چیز جس کو پیام امن و نجات کی صورت سے ہمیشہ پیش کیا گیا اس نے کتنا ہنگامہ اور فتنہ و فساد عالم میں برپا کیا لیکن آپ جس وقت جنگوں کی حقیقت پر غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس وقت تک حقیقتاً" دنیا میں کوئی ایک جنگ بھی ایسی نہیں ہوئی جسے مذہب کے نصب العین سے منسوب کیا جا سکے یا کسی مذہب نے اسے روا رکھا ہو بلکہ تمام لڑائیاں صرف ہوس ملک گیری کی بنا پر لڑی گئیں یا خود غرضی یا نفسانی خواہشات پر۔ پھر یہ تو ہوا کہ بعض اہل مذہب نے محض مدافعت و حفاظت کے لیے واقعی خلوص و صداقت کے ساتھ اسلحہ اٹھائے لیکن جارحانہ جنگ کوئی ایسی نہیں ہوئی جسے مذہبی ضرورت کی صورت میں پیش کیا جا سکے تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ اس نے اپنی عسکریت کی نمائش اسی وقت کی جب مدافعت و حفظ نفس کے خیال نے ان کو اس پر مجبور کر دیا طاغوتی قوتوں نے دنیا کے امن و سکون کو خراب کرنا چاہا' ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دنیاوی اغراض کے لیے اسلام نے کسی کا خون بہایا ہو پھر جب حقیقت یہ ہے تو کیا انسانی خود غرضی اور نفس پرستی کی اس سے زیادہ کوئی مکروہ مثال اور مل سکتی ہے کہ اس نے جنگ تو کی ہمیشہ اسباب عیش و تنعم

فراہم کرنے کے لیے جاہ و ثروت دولت و حکومت کی خواہش پورا کرنے کی غرض سے' دشمنوں سے قبائلی و ذاتی عناد کا انتقام لینے کے لیے لیکن منسوب کیا اسے مذہب سے' اور مذہب کا نام لے لے کر اس نے ہمیشہ لوگوں کی جانیں لیں' تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مذہب کا اولین دور ہمیشہ اس نوع کے جذبات سے صاف و پاک رہا ہے۔ لیکن جب بعد کو اس میں ایک جماعت دنیا پرست لوگوں کی پیدا ہوئی تو جنگ و جدال' کشت و خون سبھی کچھ ہوا اور لوگوں نے غلطی سے اس کو مذہب کی تعلیم سے منسوب کیا پھر جب حقیقت یہ ہے تو خدا کے لیے آج باہم نوع انسانی کے افراد میں مذہبی تفریق کو استخوان جنگ نہ بناؤ اور مذہب کو بدنام نہ کرو کیونکہ مذہب پیام امن و سکون ہے اور فساد کو کبھی پسند نہیں کرتا اس لیے میرے نزدیک سب سے زیادہ مضرت رساں تحریک دنیا میں وہ ہے جو قومیت اور وطنیت کے رشتہ کو مذہب کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور بڑا ظالم وہ تھا جس نے اول اول اس بدعت کو رواج دیا آج ہندوستان اسی لعنت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے ہنوز غلام نظر آرہا ہے درآنحالیکہ اس سے بہت چھوٹے چھوٹے ملک کبھی کے آزاد ہو کر ترقی کی راہوں پر لگ گئے ہیں۔ غضب خدا کا کسی ایک ملک میں رہتے ہوئے صدیاں گزر جائیں۔ وہاں کی آب و ہوا کا اثر پشت ہا پشت سے ہمارے ذوق و مزاج پر ہوتا چلا آرہا ہو۔ ایک ہی قسم کی بہار و خزاں میں ایک زمانہ نامعلوم سے یکساں طور پر زندگی بسر ہو رہی ہو لیکن پھر بھی بیگانگی کا یہ عالم کہ باہم مل کر کھانا بھی نہ کھا سکتے ہوں۔ محبت و رافت کے ساتھ ایک رات بھی کسی جگہ بسر کر سکیں۔

مذہب کا شعائر و مراسم کے لحاظ سے مختلف ہونا عیب نہیں لیکن ان کی وجہ سے باہدگر نفرت و احتراز' بغض و عناد پیدا ہونا یقیناً" مذاہب کی توہین ہے۔ کیونکہ یہ کھلی ہوئی ہلاکت نوع انسانی کی ہے اور دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس کا مقصد انسانیت یا انسان کو ہلاک کرنا ہو اس لیے ہم کو شرم کرنا چاہیے کہ ہم مذہب کا کتنا غلط استعمال کر رہے ہیں اور انسانیت کی قربانی اپنے اغراض نفسانی کے دیوتا پر چڑھا کر اسے مذہب کا خراج سمجھتے ہیں۔

○ ○ ○

کیا خدا کا وجود ہے

دنیائے شاعری میں وجود باری پر سب سے زیادہ پاکیزہ خیال مرزا عبدالقادر بیدل کا ہے جنھوں نے احساس بے چارگی و بے کسی کا نام خدا رکھا ہے، لکھتے ہیں۔

علاجے نیست داغ بندگی را
اگر بیشم و گر کم آفریدند

اسی خیال کو اکبر الہ آبادی نے اس طرح ظاہر کیا ہے۔

بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو۔

خیر یہ تو شاعرانہ باتیں ہیں اور ان لوگوں کے تاثرات ہیں جن سے انکار خدا پر بھی باز پرس نہیں ہو سکتی، لیکن لطف تو یہ ہے کہ جب ہم شاعری سے قطع نظر حکمت و فلسفہ، علم و تحقیق سے مدد چاہتے ہیں تو بھی نتیجہ وہی نکلتا ہے جو بیدل یا دوسرے شعرا نے سمجھایا ہے اور یہاں بھی اعتراف عجز ہی سے معرفت الٰہی کی بصیرت شروع ہوتی ہے۔

آیئے آج کی صحبت میں اس اجمال کی تفصیل پر متوجہ ہوں۔

کائنات اور اس کی وسعت کو تو خیر جانے دیجیے کہ ضرورت اس "آسمان پروازی" کی نہیں ہے بلکہ اسی زمین پر رہنے اور بسنے کی حیثیت سے ہمیں سب سے پہلے "کار زمین" ہی کو دیکھنا چاہیے کہ خدا نے اپنے آپ کو ہم سے قریب الفہم بنانے کے لیے کچھ دلائل و شواہد یہاں چھوڑے ہیں یا نہیں۔

زمین کے موجودات تین قسموں میں منقسم ہیں۔ ایک وہ جو زندگی رکھتے ہیں اور حرکت ارادی کے بھی مالک ہیں مثلاً انسان، شیر، مچھلی، چڑیا وغیرہ اور اس قسم کو حیوان کہتے ہیں، دوسری قسم میں وہ مخلوقات ہیں جو زندہ تو ہیں لیکن حرکت ارادی سے محروم اور ان کا نام نباتات ہے تیسری قسم وہ ہے جو نہ زندہ ہے، نہ حرکت ارادی پر قادر، جیسے مٹی، پانی، پتھر اور اسے جمادات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں اور کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ پتھر کا ٹکڑا ترقی کر کے گلاب کا درخت ہو جائے اور گلاب ترقی کر کے انسان بن جائے

لیکن کس قدر حیرت ناک امر ہے کہ باوجود اس قدر ظاہری و معنوی بعدو تفریق کے جس وقت ان تینوں کی کیمیاوی تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی بنیاد ایک ہی ہے یعنی یہ سب کے سب پیدا ہوئے ہیں انہیں "ہیولو جامدہ" سے جو نہ جان رکھتے ہیں نہ حرکت ارادی پر قادر ہیں اور جن کا نام علمی دنیا میں "عناصر" رکھا جاتا ہے۔

آپ گیہوں کا دانہ زمین میں ڈالتے ہیں اور یہ دانہ مٹی، پانی اور ہوا سے بعض عناصر جذب کر کے رفتہ رفتہ درخت کی شکل اختیار کرتا ہے جس سے وہی گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ آپ لیموں کا تخم بوتے ہیں اور لیموں ہی حاصل کرتے ہیں، آپ مرغی کے انڈے کو ایک متعین مدت تک گرمی پہنچا کر اس سے مرغی ہی کا بچہ پیدا کرتے ہیں، مرغابی کے انڈے سے مرغابی اور کچھوے کے انڈے سے کچھوے ہی نکلتے ہیں۔ تماشہ یہ ہے کہ ان سب کی ترکیب انہیں عناصر سے ہوتی ہے جو بے جان ہیں جن میں کوئی حرکت ارادی نہیں لیکن کیا ممکن ہے کہ گیہوں کے تخم سے نارنگی اور طاؤس کے انڈے سے سانپ پیدا ہو سکے۔ پھر سوال یہ ہے کہ جب بنیاد سب کی ایک ہے تو یہ تفریق کیسی، اور حیات کی صورتوں میں یہ تنوع، یہ نیرنگی، یہ بو قلمونی کہاں سے آئی؟

اہل علم اس راز کے دریافت کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ مختلف زندہ اجسام کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ حیوانات و نباتات کے اجزا ترکیبی اور نباتات و جمادات کے اجزاء حیات میں کیا فرق ہے لیکن جب انہوں نے یہ عمل کیمیاوی کیا تو ہر صورت میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام موجودات خواہ وہ جاندار ہوں یا بے جان چند عناصر بسیط سے مرکب ہیں جو بالکل بے جان ہیں، پھر انہوں نے خیال کیا کہ ممکن ہے ان کو علیحدہ علیحدہ کرنے سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس لیے آؤ ان کو پھر ملا کر دیکھو۔ لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ وہ عناصر کو ایک بار علیحدہ کرنے کے بعد باہم گر ملا ہی نہیں سکتے اور اگر کسی طرح ملا دیں تو ان میں کوئی آثار حیات پیدا نہیں ہوتے۔

ایک عندلیب ہمارے سامنے چہچہا رہا ہے۔ پاس ہی ایک گلاب کا درخت ہے۔ جس کے رنگین پھولوں کی خوشبو ہمارے دماغ کو معطر کر رہی ہے اور وہیں ایک پتھر کا وزنی ٹکڑا ہے جس کو ہمارے ہاتھ آسانی سے نہیں اٹھا سکتے لیکن جب ہم عندلیب کو ہلاک کر کے اس کی ترکیب حیات کی جستجو کرتے ہیں، گلاب کا پھول توڑ کر اس کے عناصر دریافت کرتے ہیں۔ پتھر کے اجزاء تحلیل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اجزاء بالکل جامد ہیں بے جان ہیں۔ نہ

ان میں کوئی آواز ہے نہ نغمہ' نہ خوشبو نہ وزن' اور مطلق ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا چیز تھی جو بلبل کے حقیر جثہ میں ایک دنیائے نغمہ' پھول کی ضعیف و نازک شکل میں ایک ہنگامہ نکہت اور پتھر کے سکون بارد میں ایک وزن اعصاب شکن کی کیفیت رکھتی تھی پھر جب یہ صورت تحقیق و تفتیش کی کسی نتیجہ تک نہ پہنچا سکی تو انھیں علماء نے جستجو کی ایک اور راہ اختیار کی جو یقیناً" زیادہ بالغ نظری پر مبنی تھی انھوں نے ایک آلہ ایجاد کیا جس کا نام خوردبین ہے اور جو اجسام صغیرہ کو لاکھوں کروڑوں گنا بڑا کر کے دکھاتا ہے اس کے ذریعہ سے جب انھوں نے زندگی کے راز کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ زندہ اجسام میں بہت چھوٹے چھوٹے جراثیم پائے جاتے ہیں جو شفاف ہیں' بے رنگ ہیں اور کچے انڈے کی سپیدی کی طرح لیس دار ہیں' جراثیم مختلف شکل کے ہیں اور نباتات و حیوانات کے اندر ہر وقت حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مشغلہ یہ ہے کہ آس پاس سے بطور غذا مولو جلد حاصل کر کے کسی ایسے طریقہ سے جس کا علم اس وقت تک انسان کو حاصل نہیں ہو سکا' ان کو زندگی بخشتے ہیں اور پھر اعصاب' شرائین' عضلات وغیرہ میں تحلیل ہو جاتے ہیں لیکن یہ نظام اتنا مکمل ہے کہ جو جراثیم ہڈی بنانے کے لیے متعین ہیں وہ ہڈی ہی بنائیں گے جو پتی کی تشکیل پر مامور ہیں وہ پتی ہی ترتیب دیں گے اور جن کے سپرد پھل بنانے کی خدمت ہے وہ سوائے پھل کے کچھ نہ بنا سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان جراثیم کو ایک ہی قسم کا ماحول غذا کے لیے ملتا ہے' لیکن باوجود اس کے نتیجہ وہی ایک ہوتا ہے یعنی پھل کی جگہ نہ کونپل اگتی ہے اور نہ ٹہنی کے بجائے پھول اور آخر کار یہ جراثیم تمام جسم میں شرائین میں' اعصاب میں' عضلات میں الغرض ہر جگہ اس قدر کثرت کے ساتھ پھیل کر ایک ہستی کا جزو ہو جاتے ہیں کہ سوئی کی نوک کے ہزارویں حصہ کے برابر بھی جسم کا کوئی حصہ ان سے خالی نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ یہ تمام جراثیم چند ابتدائی جراثیم سے پیدا ہوتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے زندہ جرثومہ جو ان جراثیم کی آفرینش کا باعث ہوا کیا تھا؟ اس کو زندگی کس چیز نے بخشی اور پھر اس سے مختلف خواص و کیفیات رکھنے والے لاکھوں کروڑوں سے بھی زیادہ ناقابل شمار جراثیم کیونکر پیدا ہوئے۔ یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب اب تک کسی بڑے سے بڑے عالم سے بن نہیں پڑا' اور یہی وہ عجز ہے جو کسی قوت برتر و اعلیٰ کے تسلیم کرنے کی طرف ایک مخلص' کی رہبری کرتا ہے۔

آپ کسی کارخانے میں جائیں گے تو دیکھیں گے کہ بڑے بڑے دیو پیکر آہنی پہیے ہر

وقت گردش میں ہیں' بہت سے آلات لوھر سے لوھر تیزی سے حرکت کر رہے ہیں ایک منظم طریقہ سے مشین کے تمام پرزے اپنا کام کر رہے ہیں۔ لیکن دیکھنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال کسی کو پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ تمام حرکت و جنبش' یہ تمام نظام و عمل ازخود پیدا جاتا ہے۔ یقیناً" عقل انسانی اس کا سبب دریافت کرے گی اور جب اس کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب اس بھاپ کی قوت سے ہو رہا ہے جو کوئلہ اور پانی کی مدد سے پیدا کی جاتی ہے تو وہ مطمئن ہو جائے گا۔ پھر جب ایک معمولی مشین کا وجود اور اس کی حرکت و عمل بغیر کسی موجد محرک کے نہیں ہو سکتی تو قدرت کے یہ بے شمار مظاہر آثار' موجودات کروڑوں صورتیں کس طرح ازخود ظہور میں آسکتی ہیں۔

خیر اس مشین کی مثال چھوڑیے کہ یہ ایک نہایت ہی فرسودہ طریق استدلال ہے آپ ان چھوٹے چھوٹے جاندار کیڑوں کو لیجئے جن کو نگاہ نہیں دیکھ سکتی اور جو اس حد تک غیر مرئی ہیں کہ اگر ہزار اندر ہزار ان کو جمع کیا جائے تو بھی سرسوں کے دانہ سے زیادہ ان کا حجم نہیں ہوتا پھر لطف یہ ہے کہ یہ تمام خورد بینی کیڑے' اور نباتات بالکل اسی طرح پیدا ہوتے بڑھتے اور فنا ہوتے ہیں جیسے تمام ذی حیات مخلوق اور علم انسانی آج تک نہ ان کی حقیقت آفرینش کو دریافت کر سکا اور نہ اس امر پر قادر ہوا کہ ان تمام حقیر مخلوقات میں سے کسی ایک ہی مخلوق کے کسی ایک عضو کو بنا سکتا یہ صحیح ہے کہ انسان ہوا میں پرواز کرتا ہے' برق و کہربا کے ذریعہ سے زمین کی طنابیں کھینچے ہوئے ہے' اپنی ایجادات و اختراعات سے اس نے انسانی زندگی کے اصول کو بالکل بدل دیا ہے لیکن بایں ہمہ تم ساری دنیا کے ماہرین کیمیا و حیاتیات فضلائے تشریح کو جمع کر کے دریافت کرو کہ کیا وہ مچھر کی ایک آنکھ کی طرح کوئی آنکھ بنا سکتے ہیں۔ مکھی کی ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی طرح کوئی عضو بنا کر دکھا سکتے ہیں؟ تو وہ اس پر قادر نہ ہوں گے اور آخر کار ان سب آسمان و زمین کے قلابے ملا دینے والوں کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ ان کے امکان سے باہر ہے۔

یہی انسان کا اعتراف عجز یہی اس کی عقل و فراست کی حیرانی' اور یہی اس کے بے چارگی و بے بسی ہے جہاں سے وجود باری کے وجوب کے حدود شروع ہوتے ہیں اور آخر کار بقول رازی انسان کو کہہ دینا پڑتا ہے کہ اس کے پہچاننے کے لیے نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے نہ کسی حجت و برہان کی کیونکہ کائنات کے ایک ایک ذرہ کی تکوین اس حقیقت پر گواہی دے رہی ہے اور اسی کو ایک شاعر نے "ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار" کے الفاظ میں

ظاہر کیا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک امر اور بھی قابل غور ہے یعنی یہ کہ کیا خدا آفرنش کے اس سلسلہ کو قائم کر کے علیحدہ ہو گیا ہے اور اب اسے دنیا کے نظام سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا؟ بعض کا خیال یہی ہے آیئے اس مسئلہ پر ایک نگاہ جستجو ڈال لیں۔

ابھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ تمام اجسام' شفاف و لیس دار جراثیم سے بنے ہیں اور ان جراثیم کی ترکیب تمام حیوانات و نباتات میں ایک ہی ہیں۔ اچھا اب دیکھیے کہ ان جراثیم کی ترکیب کیمیاوی کیا ہے؟

یہ علم غالباً اکثر حضرات کو ہو گا کہ یہ جراثیم چار عناصر بسیط سے مرکب ہیں۔

آکسیجن' ہیڈروجن' نائٹروجن اور کاربن۔

کاربن ایک زہریلی گیس ہے' آکسیجن ایک گیس ہے جو اجسام کو مشتعل کر دیتی ہے اسی طرح ہائیڈروجن ایک شفاف گیس ہے جو آکسیجن سی ہلکی ہوتی ہے اور نائٹروجن بھی۔ لیکن ان کے باہم امتزاج سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ اسکول کے ہر طالب علم کو معلوم ہوں گے۔ جب آکسیجن اور ہیڈروجن دونوں گیسیں ملتی ہیں تو پانی وجود میں آتا ہے چنانچہ سمندر' دریا' نہر اور بادل وغیرہ میں ہر جگہ پانی کا وجود انھیں دونوں گیسوں کے امتزاج سے ہے۔ نائٹروجن اور آکسیجن جب دونوں ملیں گے تو تیزاب پیدا ہو گا۔ آکسیجن و کاربن جب ملیں گے تو ایک زہریلی گیس پیدا کریں گے اور ہیڈروجن و کاربن مل کر قابل اشتعال گیس کی صورت اختیار کر لیں گے' اور اگر یہ چاروں مل جائیں تو ظاہر ہے کہ انھیں مذکورہ بالا مرکبات میں سے کوئی نہ کوئی شکل پیدا ہو گی۔ اور یہ مخفی نہیں کہ ان میں سے کوئی صورت حیات کے لیے مفید نہیں پھر سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو ان عناصر بسیط کو مرکب کر کے جراثیم پیدا کرتی ہے اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ نباتات پیدا کرنے والے جراثیم نباتات ہی پیدا کریں گے حیوانات کے جراثیم حیوانات ہی بنائیں گے۔ کبھی ایسا نہ ہو گا کہ پھول کے جراثیم کسی طائر کی ساخت میں مصروف ہو جائیں اور طائر کے جراثیم کسی انسان کی ترکیب میں'

اگر یہ نظم و اہتمام جسے صرف نگہداشت ایزدی کہنا چاہیے شامل حال نہ رہے تو آکسیجن ہمارے جسموں کو جلا ڈالے۔ ہیڈروجن سے مل کر تمام دنیا کو عالم آب بنا دے' نیٹروجن کے ساتھ ترکیب پا کر ہمارے اوپر تیزاب کا سا کام کرنے لگے گوشت بنانے والے

جراثیم صرف خون بنانے لگیں اور ہم ایک رقیق چیز کی طرح ادھر سے ادھر بہتے پھریں اسی طرح ایک کاشتکار گیہوں بوئے اور مینڈک اگنے لگیں مرغی کو انڈوں پر بٹھائیں اور ان سے سانپ پیدا ہونے لگیں۔ الغرض تمام نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔

اگر خدا کے وجود کو تسلیم کرنا فطرت انسانی سے متعلق ہے تو اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر استنتاجی ہے تو شواہد طبیعت اور مظاہر کائنات سے زیادہ کوئی برہان مقصود تک پہنچانے والی نہیں۔

○ ○ ○

شیعہ، سنی نزاع

......لکھنؤ اپنی شیعہ آبادی کی کثرت اور اپنی مرکزیت کی وجہ سے ہندوستان میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو سرزمین ایران کو حاصل ہے اور اگر یہاں کے مراسم عزاداری اور شیون و بکا کی شدت و وسعت کو سامنے رکھا جائے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان سے زیادہ بلند اخلاق کی جماعت دنیا میں کوئی اور ہو سکتی ہے، اگر ان تمام ظاہر داریوں کے ساتھ سو میں ایک حصہ بھی سیرت حسین کی کیفیتوں کو وہ "حقیقتاً" اپنے اوپر طاری کر لیں یوں تو میرا تعلق کسی خاص مسلک و مشرب سے نہیں ہے لیکن چونکہ میرا خاندان ہمیشہ سے حنفی المذہب رہا ہے اس لیے ممکن ہے مجھے مذہبی حیثیت سے مستحق نہ سمجھا جائے کہ حضرات شیعہ کے کسی دینی اعتقاد یا رسم و رواج کے متعلق کوئی رائے پیش کروں، تاہم اس حیثیت سے جو ایک شخص ثالث کو حاصل ہوتی ہے "غالباً" مجھے آزادی سے محروم نہیں کیا جا سکتا جو صرف اظہار رائے کی حد تک بلا قید ملک و ملت ہر شخص کو ملنی چاہیے علی الخصوص اس وقت جب کہ لکھنؤ کی موجودہ فضا میں یہ تفریق امن و سکون کی خطرہ میں ڈالنے کی حد تک پیچیدگی اختیار کر چکی ہو۔

بہرحال اس وقت میرا اس مسئلہ پر قلم اٹھانا نہ اس لحاظ سے ہے کہ میں ان دونوں فریق میں سے کسی ایک فریق کا فرد ہوں اور نہ اس حیثیت سے کہ میں اس سلسلہ میں کسی مناظرو مذہبی کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہوں، بلکہ میری یہ جسارت صرف اس خیال کے تحت ہے کہ میں بھی اسی قطعہ زمین میں سانس لے رہا ہوں جہاں یہ لوگ آباد ہیں اور وہاں کا ایک ادنی باشندہ ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی رائے دینے کا حق حاصل ہے خواہ وہ کیسی ہی ادنی اور ناقابل لحاظ کیوں نہ ہو ہاں، تو جیسا میں نے اولین سطور میں ظاہر کیا، لکھنؤ کو اپنی شیعہ آبادی کے لحاظ سے جو خصوصیت حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی دوسرے شہر کو حاصل نہیں، لیکن چونکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے اکثریت سینوں ہی کی ہے اور فرنگی محل کے وجود نے ان کی مذہبی مرکزیت بھی بڑی حد تک یہاں قائم کر رکھی ہے اس لیے باوجود کثرت آبادی کے شیعہ جماعت کو یہاں بھی اپنے سے زیادہ بڑی جماعت سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور چونکہ یہاں

ہر دو فریق کے علاوہ اپنے اپنے کام میں برابر لگے ہوئے ہیں اس لیے دونوں جماعتوں کے افراد میں ہر وقت ایک قسم کی گرمی پائی جاتی ہے علی الخصوص محرم کے زمانہ میں کہ جب دونوں جانب کے مبلغین و واعظین اپنے اپنے ترکش کا ایک ایک تیر صرف کرنے میں اپنی انتہائی قوت سے کام لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

میرے نزدیک اس سے زیادہ لعنت ایک انسان کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ مذہب کے لیے لڑے اور مذہب کی خاطر جامعہ بشری میں تفریق کا باعث ہو میں حیران ہوں کہ اگر تمام دنیا میں انسان ایک ہے تو پھر اس کا مذہب کیوں نہ ایک ہو جبکہ کہا جاتا ہے کہ مذہب سب کو ایک کرنے والا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو دیکھ کر ایک شخص یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دنیا کی خونریزیوں و خون آشامیوں کا ذمہ دار صرف مذہب ہے اور جب تک اس کا خیال لوگوں کے دلوں سے محو نہ ہو جائے گا۔ عالم انسانی ہمیشہ یوں ہی مجروح و دلفگار رہے گا آپ کسی مذہب کی تعلیمات اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ اس سے زیادہ امن و سکون کا خواہشمند کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن جب آپ اس کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس سے زیادہ وحشت و درندگی کا ثبوت شاید ہی کسی اور ادارہ نے دیا ہو' عیسوی مذہب کو لیجیے جو اپنی تعلیمات کے لحاظ سے کیسا گوشہ نشین' کتنا خلوت پسند' کس درجا من خواہ اور صابر و ضابط مذہب ہے' لیکن جب آپ اس کی تاریخ پڑھیں گے تو حیران رہ جائیں گے کہ انسانی خون بہانے میں شاید ہی کوئی دوسرا مذہب اس سے سبقت لے گیا ہو اسی طرح آپ اسلامی تعلیمات پر غور کیجئے کیا ان کے مطالعہ کے بعد کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ عافیت طلبی کی خواہش کسی اور طریق تعلیم میں پائی جا سکتی ہے' لیکن تاریخ پر نگاہ ڈالیں گے تو آپ کو حیرت ہو گی کہ اس عافیت طلب جماعت' اسی امن پسند گروہ اور "رحمتہ اللعالمین" کی اس محبت پرست امت نے کیسی کیسی خونریزیاں کیں ٹھیک اسی وقت جب کہ ان کی زبانوں پر لا تفسدوا فی الارض کا وعظ جاری تھا۔ یہ زمین کے امن کو تباہ و برباد کر رہے تھے اور اسی لمحہ میں جب یہ غیروں کے ساتھ بھی اپنوں کا سا سلوک کرنے کی تلقین فرما رہے تھے' خود اپنوں سے غیروں کا سلوک کر رہے تھے گوشت سے ناخن جدا ہو رہا تھا اور انھیں پروا نہ تھی' بھائی بھائی کو ذبح کر رہا تھا اور یہ مسرور تھے۔

دنیا میں کوئی تعلیم محض تعلیم ہونے کے لحاظ سے بے معنی چیز ہے اگر عملی زندگی میں

اس سے کوئی تغیر نہ پیدا ہو' پھر تعلیمات مذاہب کو عملی زندگی کے لحاظ سے اگر کسوٹی پر کسا جا سکتا ہے تو وہ صرف صفحات تاریخ ہیں اور یہ جس طرح خون سے رنگین نظر آتے ہیں کسی سے مخفی نہیں یقیناً" یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب کا خیال دنیا میں ایک لغو خیال تھا' کیا دنیائے عمل کے لحاظ سے مذاہب عالم ناکام ثابت ہوئے کیا انسانی اخلاق پر ان کا کوئی اثر قائم نہیں ہوا' اس کا جواب مجھ سا آزاد خیال انسان تو کچھ اور دے گا لیکن ہر شخص جو اپنے آپ کو مذہب کا پابند کہتا ہے اور مذہب کی ضرورت کا قائل ہے۔ آپ کے سامنے بہت سی ایسی مثالیں پیش کر دے گا جن سے مذہب کی برکات آپ پر ثابت ہو جائیں۔ پھر آپ اس سے پوچھیے کہ اگر یہ صحیح ہے تو اب وہ برکات کیا ہوئے اور اب وہ تعلیمات کیوں بے اثر ثابت ہو رہی ہیں تو وہ اس کا جواب یہی دے گا کہ ان تعلیمات پر عمل کرنا ترک ہو گیا ہے۔ اس کے بعد آپ یہ سوال کیجیے کہ جب ہر مذہبی انسان اس بات کو محسوس کر رہا ہے کہ وہ تعلیمات مذہب پر عامل نہ ہونے سے تباہ ہو رہا ہے تو کیوں عمل نہیں کرتا جان بوجھ کر کیوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے تو وہ اس کے جواب میں صرف اپنی بدنصیبی اور "کم بختی" کا شکوہ پیش کر دے گا۔ مگر وہ لوگ جو کسی بات کی تہہ تک پہنچنے کے شائق ہیں وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ دنیا میں اب مذہبیت کی عمر ہی ختم ہو گئی ہے اور خدا اب کاروبار عالم چلانے کے لیے بالکل جدید راہیں پیدا کرنا چاہتا ہے' ہو سکتا ہے کہ حقیقت یہی ہو' لیکن میرے نزدیک اس کا ایک سبب اور بھی ہو سکتا ہے جس کا تعلق نہ بدنصیبی سے ہے نہ عدم ضرورت مذہب سے اور وہ یہ کہ کہیں ایسا تو نہیں جس کو اب مذہب سمجھا جاتا ہے وہ سرے سے مذہب ہی نہ ہو اور جن باتوں کو ہم تعلیمات مذہب قرار دے رہیں وہ حقیقتاً" مذہب سے کوئی واسطہ نہ رکھتی ہوں' دنیا نام جذبات و جذبات پرستی کا نہیں ہے۔ اگر آپ محبت کو اچھی چیز سمجھتے ہیں اور محبت نہیں کرتے تو آپ کے درس محبت کو کون سنے گا۔ آپ کی جو حالت آنکھوں کے سامنے ہے اسی کو دیکھ کر آپ کے خیال و اعتقاد پر حکم لگایا جائے گا۔ زمانہ کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ آپ کی دینی و اخلاقی گتھیاں بیٹھ کر سلجھایا کرے' اور آپ کی مذہبی تعلیمات کا مطالعہ کرے' وہ تو صرف آپ کو اور آپ کی زندگی کو دیکھے گا اور آپ کی ساری قوم اور آپ کی تمام تعلیمات مذہبی پر اسی کے مطابق حکم لگا کر صحیح و غیر صحیح ہونے کا فیصلہ کرے گا۔

پھر آیئے تھوڑی دیر کے لیے ہم خود بھی غور کریں کہ ہماری حالت کیا ہے؟ اس وقت

گفتگو نہ سیاست سے ہے نہ ترقی علم و دولت سے بلکہ ہیئت اجتماعیہ کے اس اساسی و ابتدائی مسئلہ سے جس کو خدائے پاک نے "حبل اللہ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ پھر یقیناً" خدا کی یہ رسی کوئی لوہے کی رسی نہیں ہے' فولاد کی زنجیر نہیں ہے بلکہ اس رشتہ اخوت کی زنجیر ہے جس سے تمام نوع انسانی کو وابستہ کیا گیا ہے اور جسے فولاد و آہن سے کہیں زیادہ مستحکم ہونا چاہیے۔ مگر نوع انسانی کا تو خیر ذکر ہے۔ یہاں تو اس جماعت کے افراد بھی اس سے وابستہ نہیں جس میں جماعت کا مفہوم ہی اس "حبل اللہ" کے اعتقاد نے پیدا کیا تھا۔ پھر کوئی بتائے کہ کیا شیعہ سینوں کا افتراق اسی ایک جماعت کے افراد کا افتراق نہیں ہے۔

میں نے ان دونوں جماعتوں کے اختلاف و نزاع پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا ہے کبھی اپنے آپ کو سنی سمجھ کر حالات کا مطالعہ کیا۔ کبھی شیعہ بن کر واقعات پر نگاہ ڈالی کسی وقت ایک شخص ثالث کی حیثیت سے اس کو سمجھنا چاہا' لیکن آپ باور کیجیے کہ ان کے اختلاف کا حقیقی سبب سوا حماقتوں کے اور کچھ نظر نہ آیا' سب سے زیادہ اہم مسئلہ جو دونوں فریق کے نزدیک "استخوان جنگ" بنا ہوا ہے بعض خلفاء و صحابہ سے متعلق ہے لیکن میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ اس کا تعلق دین اسلام سے کیا ہے اور اس پر جنگ و خوں ریزی کے کیا معنی ہیں؟ فرض کیجئے کہ کسی کے باپ کے پاس مختلف لوگ آتے ہیں اور وہ ان سب سے دوستی کا سا برتاؤ کرتا ہے' باپ کے مرنے کے بعد دو بیٹوں میں یہ بحث آن پڑی ہے کہ باپ کے پاس آنے والوں میں سے کون شخص سچا دوست تھا اور کون نہیں۔ ایک کہتا ہے سب وفادار دوست تھے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں بعض مخلص تھے اور بعض غیر مخلص' وہ بھی اپنے دلائل پیش کرتا ہے اور یہ بھی' یہاں تک تو خیر کوئی حرج نہیں لیکن اگر اختلاف نگاہ و حجت ایسی صورت اختیار کرے کہ دونوں بھائیوں میں سے ہر ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو جائے تو اس کو سوا حماقت کے اور کیا کہیں گے اول تو یہ پوچھیے کہ اس وقت جب کہ نہ باپ زندہ ہے نہ اس کے پاس کے بیٹھنے والے احباب اس بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر ضرورت مان لی جائے تو بھی اس گفتگو کا اس حد تک بڑھ جانا کہ دو بھائی ایک دوسرے پر تلوار کھینچ کر جان لینے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ سوا حماقت کے اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ اعتقاد کے لحاظ سے اسلام نام ہے صرف خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کے اقرار کا' سو اس میں شیعہ سنی دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اگر حضرات شیعہ بعض خلفاء و صحابہ کو اچھا نہیں سمجھتے تو ظاہر ہے کہ اس کے کچھ اسباب ولائل ان کے پاس

ہوں گے اس لیے اس مسئلہ کا تعلق صرف تاریخ و تحقیق تاریخی سے ہونا چاہیے نہ کہ مذہب سے۔ یعنی ہم کو تاریخ کے صفحات میں جستجو کرنا چاہیے کہ وہ اسباب جو بیان کیے جاتے ہیں واقعی صحیح ہیں یا نہیں۔ اگر کسی کے نزدیک صحیح ہیں تو اس کو ایک تاریخی حقیقت کی صورت سے پیش کر کے خاموش ہو جانا چاہیے برا بھلا کہنے یا گالیاں دینے سے کوئی فائدہ نہیں اور اگر کسی کے نزدیک غلط ہیں تو ان پر تنقید کر کے علیحدہ ہونا چاہیے اور اس جستجو میں نہ پڑنا چاہیے کہ کوئی اپنے گھر کیا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

آج میں پوچھتا ہوں کہ کیا تمام شیعہ حضرات اپنی تاریخی کتب کو متفقہ طور پر صحیح تسلیم کرتے ہیں یا اہل تسنن بغیر کسی اختلاف باہمی کے تمام روایات کو منقح و درست باور کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوی کرنا بالکل خلاف واقعہ ہے۔ شیعہ و سنی کی تاریخی کتابوں میں ہم کثرت سے اختلاف پاتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ جس طرح خود شیعہ علماء و مورخین بہت سے تاریخی واقعات پر مختلف رائیں رکھتے ہیں اسی طرح سنی علماء بھی باہم کر متفق نہیں تو پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جب اور تاریخی واقعات پر اختلاف ہونے کی وجہ سے آپس میں نزاع نہیں ہوتی تو خاص صحابہ کے مسئلہ پر کیوں جنگ کی جاتی ہے اور کیوں ایک دوسرے سے اس قدر علیحدہ ہو جاتے ہیں کہ ایک کا مذہب ہی امامیہ یا شیعہ کہلاتا ہے اور دوسرے کا حنفی یا سنی' اس پر جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اختلاف کا سبب محض اختلاف تاریخی نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے جس کی بنیاد آج نہیں بلکہ اسی وقت پڑ چکی تھی جب رسول اللہ بقید حیات تھے اور اسلام ایک جیتا جاگتا مذہب تھا۔

جب کوئی پیغمبر رونما ہوتا تو وہ ایک خاص خیال کے تحت اصول اصلاح و تبلیغ کو متعین کر لیتا ہے جو نتیجہ ہوا کرتے ہیں وقت کا' ماحول کا اور ان خاص خاص واقعات کا جو اس زمانہ میں رونما ہوئے' اسی کو ایک مذہب کی سائیکالوجی کہتے ہیں اور یہیں سے اس کے مستقبل پر حکم لگایا جا سکتا ہے' مثلاً آپ ہندو مذہب کو لے لیجئے اور اس کی سائیکالوجی پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہ مزارعین و فلاحین کا مذہب ہے اور اسی لیے اب تک اس کے متبعین کی معاشرت و زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ایک خاص قسم کی نباتیت پائی جاتی ہے اور عیسوی مذہب کی ابتدا ایک مظلومانہ صبر و استقلال سے ہوئی اور اس کیفیت کے بعد جو عزم راسخ ایک قوم میں پیدا ہو جاتا ہے وہ اس وقت بھی عیسوی جماعت میں پوری طرح نظر آتا ہے۔ دین موسوی دنیوی برکات کے لیے برسرپیکار ہو کر نمودار ہوا اور آخر کار اس کے مقلدین میں وہ

رد عمل پیدا ہوا جو دنیا پرست لوگوں میں قدرتاً پیدا ہو جانا چاہیے اسلام انتم الاعلون کا آوازہ بلند کرتا ہوا نمودار ہوا۔ اور اس نے پاکیزگی اخلاق کے ساتھ دنیاوی سربلندی کو بھی پیش نظر رکھا پھر چونکہ فطرت انسانی تعیش پسند و جاہ طلب واقع ہوئی ہے اس لیے عہد سعادت کے بعد ہی دونوں کا توازن مفقود ہونے لگا اور خلافت راشدہ ہی میں دو مخالف فریق پیدا ہو کر طلب جاہ و کش مکش باہمی کے مناظر سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک فریق کامیاب ہو گیا جسے آجکل کی اصطلاح میں سنی کہتے ہیں اور دوسرا ناکام رہا جسے شیعہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علوئین کی جماعت اول اول صرف جذبہ محبت کے تحت وجود میں آئی کیونکہ وہ شخص جو رسول اللہ سے محبت کرے گا اس کا آل رسول و اہلبیت سے محبت کرنا ناگزیر ہے یہ فطرت انسانی ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کو برسرعروج و اقتدار دیکھنے کی خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ رحلت نبوی کے بعد خلافت کا مسئلہ جن لوگوں نے جس طرح طے کیا اس میں محبت کی رعایت تو یقیناً نہیں تھی لیکن مصلحت و ضرورت کی رعایت ضرور تھی پھر اب یہ فیصلہ کرنا کہ خلافت کا مسئلہ برنبائے اصول محبت طے ہونا چاہیے تھا یا برنبائے مصلحت ازبس و شوار ہے کیونکہ وہ لوگ جو رسول اللہ و آل رسول سے محبت کرنے والے تھے بعد کو ان کی اولاد کے سامنے بھی سوال محبت کا نہیں رہا بلکہ وہی جاہ و ثروت کا رہ گیا تھا اور جنھوں نے اول دن مصلحت و ضرورت کو سامنے رکھ کر خلافت کے مسئلہ کو طے کیا تھا ان کی نسل میں تو خیر کوئی رعایت محبت و الفت کی ہو ہی نہیں سکتی تھی مگر بعد کو مصلحت و ضرورت کی اہمیت بھی ان کے سامنے باقی نہ رہی۔ اختلافات بڑھتے گئے مناقشات سنگین ہوتے گئے دل کی کدورتیں زبانوں پر آنے لگیں طبیعتوں کی برہمی نے تیغوں کو بے نیام کرنا شروع کیا۔ "محبت و مصلحت" کی نزاع آخر کار صرف دنیاوی ملکی اور سیاسی نزاع ہو کر رہ گئی۔ نہ رسول و آل رسول سے محبت کرنے والے رہ گئے نہ دیانت و امانت کے ساتھ مصلحت پر غور کرنے والے باقی رہے۔ اور کھلم کھلا سلطنت و دولت اور جاہ و ثروت کے لیے دونوں جماعتیں میدان میں اتر آئیں۔ پھر دیکھو کہ اس کے بعد کیا ہوا تاریخ کے صفحات ہر شخص کے سامنے کھلے ہوئے ہیں اور معمولی فہم کا انسان بھی آسانی سے ان کو پڑھ کر سمجھ سکتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جو زمانہ امیر معاویہ کی حکومت سے شروع ہوتا ہے کیا اس کو رسول و آل رسول کی محبت سے متعلق کر سکتے ہیں اور کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس میں سوا

کسب دولت و ثروت اور حصول جاہ و مرتبت کے کوئی اسلامی ضرورت کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ اگر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد روح معہ اپنے احساسات کے قائم رہتی ہے اور اہل اسلام کا یہ ایمان ہے کہ رسول اللہ عالم روحانی میں اب بھی رسول اللہ ہیں تو خدا کے لیے بتاؤ قاتل حسین سے ان کی رضامندی کی صورت کیا ہو سکتی ہے اور وہ کیونکر امیر معاویہ کو معاف کر سکتے ہیں کہ انھوں نے حسین کے ہوتے ہوئے جان بوجھ کر اپنے فاسق و بادہ خوار بیٹے یزید کو خلیفہ مقرر کیا اور نہ صرف خلیفہ مقرر کیا بلکہ اس کی خلافت کی تکمیل میں ہر اس ترکیب و تدبیر سے کام لیا جو مادی سلطنت کے استحکام کے لیے سیاسیات کی دنیا میں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ آج سنیوں کو شکایت ہے کہ حضرات شیعہ صحابہ خلفاء کو برا کہتے ہیں لیکن کیا کبھی ان خلفاء بنی امیہ و بنی عباس کے کارناموں پر بھی غور کیا ہے جنھوں نے علی الاعلان مسجدوں کے محراب و منبر پر علی کو گالیاں دیں اور دلوائیں یقیناً" میں نہایت کراہت کے ساتھ دیکھتا ہوں کہ حضرات شیعہ صحابہ میں سے کسی کو برا کہیں لیکن بالکل اسی طرح میں "سب علی" کو برا سمجھتا ہوں۔ پھر اگر یہ نزاعات و اختلافات محض تاریخی حیثیت رکھتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ کیونکہ اسلامی حکومت و خلافت کے ساتھ یہ قصہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ لیکن مصیبت یہ آپڑی ہے کہ بجائے تاریخی اختلاف کے یہ مذہبی اختلاف ہو گیا اور اگر ایک طرف حضرات شیعہ نے "سب صحابہ" ایسے مکروہ ولایعنی فعل کو داخل مذہب کر لیا تو دوسری طرف سنیوں نے اس قدر عصبیت سے کام لیا کہ "لعن یزید" کو بھی ناجائز قرار دے کر فقہ و اصول فقہ میں شامل کرنے سے احتراز نہ کیا۔ حالانکہ کوئی ان سے پوچھے کہ اس مسئلہ کا فقہ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے اور دوسرے یہ کہ اگر "لعن یزید" اس دلیل کی بنا پر ناجائز قرار دیا جاتا ہے کہ ممکن ہے خدا نے اسے بخش دیا ہو تو کیا کسی شخص کا یزید پر لعن کرنا، قتل حسین سے زیادہ شدید معصیت ہے جس کو خدا معاف نہیں کر سکتا۔

الغرض آپ سنی شیعہ کے تمام ان اختلافات کو بغور دیکھیے جن کو داخل مذہب کر لیا گیا اور پھر انصاف کیجیے کہ ان کا تعلق مذہب اسلام سے کیا ہے۔ میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایک اختلاف بھی ایسا نہیں نکلے گا جو اصول سے واسطہ رکھتا ہو بلکہ سب کے سب تاریخ سے متعلق ہوں گے جو سیاسی مصالح کی بناء پر کسی وقت قصداً" پیدا کیے گئے تھے اور اب ہم لوگوں کی حماقت سے وہ داخل دین و مذہب سمجھے جانے لگے ہیں۔

یقیناً" تعزیہ داری اور مجالس عزا میں ایسی روایات کا پڑھنا جو اہل بیت کی سیرت کو

بجائے بلند دکھانے کے پشت ثابت کرنے والی ہیں' کسی کے نزدیک اچھا فعل قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اسی کے ساتھ سنی جماعت اپنی قبر پرستی اور ان کتب مواعظ کی کیونکر پردہ پوشی کر سکتی ہے جن میں خود رسول کی ذات گرامی کو تختہ مشق بنایا گیا ہے۔

جہاں تک عوام کا تعلق ہے دونوں جماعتیں یکساں قابل ملامت ہیں لیکن سب سے زیادہ قابل ملامت ان جماعتوں کے وہ قائد و رہنما ہیں جو ان کے جاہلانہ عقائد اور وحشیانہ عقائد کو بجائے دل سے نکالنے کے اور زیادہ مستحکم کرتے رہتے ہیں۔ کیا میں حضرات شیعہ کے علماء و مجتہدین سے سوال کر سکتا کہ کبھی انھوں نے اپنی مجالس میں یہ تلقین بھی کی ہے کہ حسین کی محبت کا اقتضاء ان کی سی صداقت پرستی اختیار کرنا ہے اور سوا رونے رلانے والی حکایات و روایات کے جن میں بہت کم حصہ راستی و صداقت کا ہوتا ہے کبھی انھوں نے کسی ایسی تنظیم کی عملی کوشش کی ہے جو براہ راست لوگوں کے اخلاق کو متاثر کرنے والی ہو۔ اسی طرح کیا میں سنی علماء و واعظین سے یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ انھوں نے ایام محرم میں کبھی برادران شیعہ کے مذہبی جذبات کا احترام کر کے ان کی سوگواریوں یا مجالس عزا میں شرکت گوارا کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں جماعتوں کے علماء ہی آپس میں نہیں ملنا چاہتے اور چاہ بھی کیونکر سکتے ہیں جب کہ دنیاوی جاہ و جلال اور عظمت و وقار کی بنیاد ہی تفرقہ پردازی اور جاہلوں کو جاہل و متعصب بنائے رکھنے کے اصول پر قائم ہوئی ہے اور معاشرت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب تک دو فریق باہم رواداری سے کام نہ لیں گے کبھی بھی ان کے اختلافات نہیں مٹ سکتے یہی وہ چیز ہے جس سے ہمارے یہاں علماء کو بیر ہے۔ مگر وہ مناظرہ کے لیے ہر وقت تیار ہیں' مذہبی مجادلہ کے لیے اپنی جماعتوں کو مشتعل کرنے کے لیے ہمیشہ آمادہ ہیں لیکن اگر ان سے کہیے کہ قبلہ کوئی صورت باہم مل کر بیٹھ جانے کی بھی ہے یا نہیں تو وہ کہہ دیں گے کہ اس کا تو امکان نہیں کیونکہ ایک کے نزدیک صحابہ کو برا سمجھنا ہے اور دوسرے کے نزدیک صحابہ کو اچھا کہنا رسول و آل رسول کی توہین۔

○ ○ ○

سید سلیمان ندوی اور میں

آخر کار سید سلیمان صاحب ندوی سے ضبط نہ ہوا اور انہوں نے بھی ستمبر 32ء کے معارف میں پانچ سطریں لاڈیٹر نگار کے ملحدانہ مضامین پر سپرد خامہ کر ہی دیں۔

بہ صورت سرز لنے کہ از کمر گزرد

کیا میں سید صاحب سے پوچھ سکتا ہوں کہ وہ مجھے ملحد کیوں کہتے ہیں اور میرے کون سے مضامین ہیں جن کو کفرو الحاد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

وہ شخص جو خدا کو ایک قوت "فعال لمایرید" مانتا ہو۔ جو رسول اللہ کو بڑا مقدس نبی تسلیم کرتا ہو۔ جو ہمیشہ اعلان کرتا رہتا ہو کہ اسلام ہی دنیا کا تنہا ذریعہ امن و نجات ہے کیا اسے صرف اس لیے ملحد قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ فروع میں سید سلیمان یا کسی اور مولوی کا پیرو نہیں؟ وہ شخص جو توحید ربانی کا وحدت وجودی کی حد تک قائل ہے جو رسول کی سیرت کو پاکیزہ ترین نمونہ اخلاق و انسانیت قرار دیتا ہے اور جو اسلام کو مذہبیات کی دنیا میں "آخری لفظ" کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ کیا اسے صرف اس بناء پر کافرو بیدین بنایا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کے سمجھنے کی خود کوشش کرتا ہے اور مفسرین کی کورانہ تقلید نہیں کرتا۔

وہ شخص جو تمام کائنات کو مظہر قوت ربانی قرار دیتا ہے جو اسوۂ محمدی کو بہترین اسوۂ انسانیت سمجھتا ہے اور جو قرآن مجید کو بے مثل صحیفہ رشد و ہدایت باور کرتا ہے کیا اسے صرف اس دلیل پر کافر مرتد کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مطالعہ کا زاویہ نگاہ خود اس کا ہے اور دوسرے سے استعارہ نہیں کیا گیا۔ حیران ہوں کہ ان لوگوں کی عقلوں کو کیا ہو گیا ہے یہ کیا سمجھ رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں سچ ہے۔

پیمانہ براں رند حرام ست کہ غالب
دربے خودی اندازۂ گفتار نہ داند

آپ کی سمجھ میں تو کبھی نہ آئے گا لیکن آیئے میں بتاؤں کہ مجھ میں آپ میں کیا اختلاف ہے میں کہتا ہوں کہ چونکہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو ہر زمانہ ہر ملک اور ہر قوم کے لیے موزوں ہو سکتا ہے اس لیے اس میں ہر زمانہ کا ساتھ دینے کی لچک پائی جاتی ہے اور

اس کی تعلیم ہر شخص کے لیے قابل قبول ہے' لیکن آپ کہتے ہیں کہ نہیں اسلام کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے وہی ہے جو آپ فرماتے ہیں یعنی اسلام صرف اہل عرب کے لیے تھا اور اسی زمانہ کے لیے موزوں تھا۔ جب اس کا ظہور ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام فطری مذہب ہے اور اگر اس کا صحیح مفہوم بتایا جائے تو ہر شخص اس کی صحت پر ایمان لا سکتا ہے اس لیے میں پہلے اصول صداقت قائم کرتا ہوں اور پھر قرآن مجید کی تعلیمات پر روشنی ڈالتا ہوں آپ فرماتے ہیں نہیں' اسلام صرف مسلمانوں کا مذہب ہے اور مسلمانوں ہی کے سامنے پیش ہونا چاہیے اس لیے پہلے اپنے مفروضات و مزعومات کے لحاظ سے قرآن پر ایمان لانے کی ہدایت کرتے ہیں اور پھر لوگوں سے اس کو تسلیم کراتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اصول انسانیت پر اپنی تعلیم کی بنیاد قائم کی اور تمام عالم کو ایک "مرکز اخوت" پر جمع ہونے کی دعوت دی اس لیے میں فروع کی پابندی کو لوازم مذہبی میں داخل نہیں سمجھتا اور تمام مذاہب کو سچا سمجھتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ نہیں اسلام نے عصبیت و افتراق کی تعلیم دی ہے اور "جامعہ انسانیت" کا قیام اس کا مقصود نہیں۔ اس لیے آپ دوسروں کو برا کہتے ہیں اور کافر و ملحد وغیرہ کہہ کر بیزاری کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام نام ہے صرف تکمیل اخلاق کا۔ آپ کہتے ہیں نہیں اخلاق ہوں یا نہ ہوں صرف ارکان مذہب کی پابندی کافی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خدا سے محبت کرنا سیکھو اور آپ فرماتے ہیں اس سے ڈرو میں کہتا ہوں کہ اخلاق نبوی کو انسانیت کا بہترین نمونہ سمجھ کر اس کا اتباع کرو اور آپ فرماتے ہیں کہ نہیں پہلے اس کے معجزات و محیر العقول باتوں کو باور کرو میں کہتا ہوں کہ اسلام نام روزہ و نماز کا نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں اسلام صرف اسی کا نام ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام نام نہ لمبی داڑھی کا ہے نہ عبا و عمامہ کا۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہی اسلام کی نشانیاں ہیں میں کہتا ہوں کہ ملا ئکہ نام ہے ان قوائے کا منہ کا جن کو خدا نے انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ نہیں ملا ئکہ ایک مخلوق ہے "حیز مکان و زمان" سے متعلق جو ہاتھ پاؤں رکھتی ہے اور جس کے بال و پر ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جنت و دوزخ نام ہے انفرادی قوی و روحانی احساس و عروج و زوال کا آپ کہتے ہیں کہ نہیں ان کا تعلق مادی لذائذ سے ہے۔ میوہ دار درختوں سے ہے شہد و لبن سے ہے۔ خوبصورت عورتوں اور حسین لڑکوں سے ہے۔ میں کہتا ہوں اچھا کام خود آپ اپنی جزا اور برا کام آپ اپنی سزا ہے۔ آپ فرماتے ہیں نہیں اچھے کام کا عوض حور و قصور ہونا چاہیے اور

برے کلام کی پاداش نار جہنم و ماء حمیم' میں کہتا ہوں کہ خدا کی عظمت و بزرگی اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ وہ ہمارے افعال سے متاثر ہو کر جذبہ تحسین و انتقام اپنے اندر پیدا کرے۔ آپ فرماتے ہیں نہیں وہ دنیاوی بادشاہوں کی طرح خفا بھی ہوتا ہے اور خوش بھی' میں کہتا ہوں کہ جو خدا روزانہ بے شمار کرے زمین سے ہزاروں لاکھوں گنا بڑے بناتا ہے بگاڑتا رہتا ہے اور جس کا یہ مشغلہ ازل سے ابد تک جاری رہنے والا ہے۔ وہ زمین ایسے حقیر کرہ کی ذلیل مخلوق کو تباہ کرنے کے بعد کیوں دوبارہ زندہ کرنے لگا۔ اس کو کیا غرض ہے اس کا اس میں کیا فائدہ ہے' کیا مصلحت ہے آپ کہتے ہیں کہ نہیں خدا کی عظمت صرف اسی کرہ سے متعلق ہے اور اس کی خدائی کا مفہوم اسی طرح ثابت ہو سکتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کوئی نئی بات نہیں ہے اس سے قبل بھی لوگوں نے کہا ہے اور وہ اسلام سے خارج نہیں سمجھے گئے۔ لیکن آج میں باوجودیکہ وحدانیت کا قائل ہوں رسالت رسول کا ماننے والا ہوں۔ قرآن پاک کی بلند تعلیمات پر ایمان رکھنے والا ہوں۔ کافر قرار دیا جاتا ہوں۔ ملحد بتایا جاتا ہوں۔ اور بے دینی کا سب سے بڑا علمبردار ہوں کیوں؟

آیئے آج کی صحبت میں مختصراً" اس راز کو بھی ظاہر کر دوں' جن حضرات نے شروع سے "نگار" کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ میرا موضوع سخن ہمیشہ علماء سوء کا گروہ رہا ہے' اور میں نے ان کے حرکات ناشائستہ ان کے اخلاق ذمیمہ' ان کے افعال رکیکہ اور ان کے مشاغل خبیثہ کو بے نقاب کر کے لوگوں کو بتایا ہے کہ ان کا وجود اللہ کا عذاب ہے۔ ان کی ہستی خدائی لعنت ہے' جس نے مسلمانوں کو گھیر رکھا ہے۔ ان کا مقصود زندگی صرف ریاء و مکر سے دولت کمانا ہے اور ان کو مطلق پروا نہیں۔ اگر ان کی تعلیمات سے اسلام و صاحب اسلام دنیا میں بدنام ہو جائے' یہ مذہب اسلام کو بے عقلیوں کا مجموعہ بنا کر پیش کر رہے ہیں' یہ موضوع! احادیث کو سامنے رکھ کر لغو و مہمل روایات کو اسلام سے منسوب کر کے مذہب کو ذلیل کر رہے ہیں' یہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے انسانوں کی عقلوں پر مہر لگا کر قرآن مجید پر غور و خوض کرنے کو حرام بتا رہے ہیں' یہ ذہنی و عقلی آزادیاں سلب کر کے مسلمانوں کو درجہ انسانیت سے گرا کر حیوان بناتے جا رہے ہیں' یہ اس دور علم و روشنی میں ہمیں پھر جہل و تاریکی کی طرف لیے جا رہے ہیں' اور وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو ایک خود غرض نفس پرست انسان کر سکتا ہے' میں نے قرون اولی کی تاریخ سے' عہد عباسیہ و امویہ کے واقعات سے حکومت ترکی و ایران کے حالات سے اور افغانستان

کے انقلاب حالیہ کی روداد سے لوگوں پر ظاہر کیا کہ اس جماعت نے جو اپنے کو علمبردار مذہب بتاتی ہے انسانیت پر کیا کیا مظالم روا رکھے ہیں اخلاق کا خون کس بے دردی سے بہایا ہے اور عروج ترقی کے پامال کرنے میں ان کی درازدستیوں نے کیا کیا کام کیے ہیں۔

پھر ظاہر ہے کہ مجھ سے زیادہ ان کا دشمن اور کون ہو سکتا تھا اور اس کا انتقام لینے کے لیے وہ حسب معمول سوا مذہب کے اور کس چیز کی آڑ لے سکتے تھے' پھر اگر مذہب اسلام "حقیقتاً" نام ہے انہیں عقائد و تعلیمات کا جو ان کی طرف سے پیش کی جا رہی ہیں انھیں اخلاق کا جو ان میں پائے جاتے ہیں' اسی محبت و رواداری کا' جو ان کی طرف سے ظاہر ہو رہی ہے اور اسی وسعت نظر و پرمانگی کا' جو ان کے اقوال و افعال کی سرمایہ دار ہے تو میں نہایت صفائی سے ایک بار اور ہمیشہ کے لیے یہ اعلان کیے دیتا ہوں کہ۔

میں مسلمان نہیں ہوں

لیکن اگر اسلام ضمیر و خیال کی آزادی کو نہیں چھینتا' اگر وہ فکر و رائے کی حریت کا دشمن نہیں ہے اگر وہ بغیر اطمینان نفس پیدا کیے ہوئے بہ جبر اپنی حقیقت کسی سے تسلیم نہیں کراتا۔ اگر وہ مجموعہ مزخرفات و خرافیات نہیں ہے' اور اگر وہ شخص کے لیے ہر زمانہ میں دستگیر و رہنما بن سکتا ہے تو اے مسلمانو! میں تم ہی سے پوچھتا ہوں کہ ان مولویوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے اسلام سے خارج کریں ایک توحید خداوندی کے اقرار کرنے والے کو کافر کے لقب سے یاد کریں' جس طرح وہ مجھے ملحد و بیدین کہتے ہیں۔ میں بھی انہیں کہہ سکتا ہوں اور ان کے نقطہ نظر سے اگر میں غلطی پر ہوں تو میرے نقطہ نظر سے وہ بھی گمراہی میں مبتلا ہیں' مجھے بھی انھیں کی طرح اپنے آپ کو مسلمان کہنے اور سمجھنے کا حق حاصل ہے' میں بھی اسلام و تعلیمات اسلام پر غور کر سکتا ہوں' خدا نے مجھے بھی عقل عطا کی ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ مجھے کافر و ملحد کہتے ہیں وہ خود تعلیمات اسلامی سے منحرف ہیں' رسول کی توہین کرتے ہیں' مذہب کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں اور خدا ان سے بیزار ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ مولویوں کی جنگ مجھ سے نہ مذہب سے کوئی تعلق رکھتی ہے نہ دین کی ہمدردی سے' بلکہ یہ حربہ ان کا صرف اس لیے ہے کہ میں ان کے خلاف کیوں لکھتا ہوں۔ ان کی حقیقتوں کو کیوں بے نقاب کرتا ہوں۔ سو انھیں معلوم ہو جانا چاہیے کہ اب ان کے قصر عظمت و پندار کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ ان کی مذہبیت و اخلاق کے چہرے

سے پردہ اٹھ چکا ہے اور دنیا ان سے متنفر ہو کر پیچھے ہٹ رہی ہے' افسوس ہے کہ آج پاکستان میں حکومت اسلامی نہیں' ورنہ پاکستان ان کے مذاہب سے کب کا نجات پا چکا ہوتا آج ترکی حکومت کی ترقی کی بنیاد صرف اسی جماعت کے انہدام پر قائم ہے اور ایران کی بیداری کا آغاز اسی گروہ کے بے دست و پا کر دینے سے ہوتا ہے۔

جب کوئی زبردست قوت ان کے مقابلہ میں آتی ہے تو یہ حکومت کا دروازہ کھٹ کھٹانے لگتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ قانون کب تک اس قسم کے شریروں کو موقع دیتا رہے گا۔ حالانکہ اس نوع کا احتجاج ان کے ضعف کی دلیل ہو۔ ان کی عقلی بے مائگی کا ثبوت ہے اور ایک ایسا اظہار عجز ہے جس سے ہر خوددار انسان کو شرم آنی چاہیے۔ اگر ان کے سامنے مفروضہ عقائد کے خلاف کوئی صدا اٹھتی ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ عقلی دلائل سے اس کا جواب دیں نہ یہ کہ حکومت کے سامنے دامن پھیلا کر کھڑے ہو جائیں' علاوہ اس کے مجھے حیرت ہے کہ اگر میں واقعی ملحد ہوں تو ان کو کیوں تکلیف پہنچ رہی ہے؟ کیا اس سے پہلے کوئی ملحد پیدا نہیں ہوا کیا اس وقت دنیا میں میرے سوا کوئی کافر ملحد نہیں پایا جاتا۔ پھر ایک میرے ہی خلاف یہ جہاد کیوں ہے۔ میرے ہی اوپر کیوں اس قدر عنایت صرف کی جاتی ہے۔ خدا کی خدائی میں لاکھوں غیر مسلم بے دین پائے جاتے ہیں آپ کہاں تک سر پیٹیں گے' کب تک غم کریں گے۔ اور آپ کی اس واویلا کو سنتا کون ہے۔ میں اگر اکابر مذہب کو گالیاں دوں' کسی کی توہین کروں تو بے شک شکایت کا موقع ہے لیکن جب یہ کوئی بات نہیں ہے تو پھر یہی کے کیا معنی آپ جب مجھے کافر بنا چکے' ملحد قرار دے چکے تو پھر کیوں میری پروا کرتے ہیں سمجھ لیجیے کہ جہاں اور بہت سے کافروں کو دوزخ کا ایندھن بننا ہے وہیں مجھے بھی بننا ہے لیکن اگر ان کا مقصود واقعی مجھے راہ راست پر لانا اور اپنا تبلیغی فرض ادا کرنا ہے تو میں سلیمان ندوی اور ان تمام علماء کرام کو جو ان کے ہم آہنگ ہیں چیلنج دیتا ہوں کہ وہ کسی مجمع میں جو بالکل غیر جانب دار لوگوں پر مشتمل ہو' اپنے اسلام کو پیش کریں' پھر مجھے موقع دیں کہ میں نے جو کچھ اسلام کو سمجھا ہے اسے بیان کروں اور اس کے بعد اس مجمع سے فیصلہ چاہیں وہ کس کو پسند کرتے ہیں اور یہ بھی جانے دیجیے خود مجھے موقع دیں کہ میں ان سے اسلام کی حقیقت کو سمجھوں اور اور وہ مجھے سمجھا سکے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ میں بغیر ایک لمحہ کا پس و پیش کیے ہوئے سر عجز جھکا دوں گا اور انھیں جیسا مسلمان ہونے کا اقرار کر لوں گا ورنہ یوں تیغ و تفنگ' یا حکومت کی امداد سے کسی کو زبردستی مسلمان

مٹانا' یا کسی کی آزادی خیال کو چھیننا' اسلام کی حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی' چنگیز و ہلاکو اس سے قبل ایسا کر چکے ہیں لیکن دنیا نے انھیں جیسا سمجھا وہ آپ کو بھی معلوم ہے اور مجھے بھی۔

○ ○ ○

ایک تلخ حقیقت

اگر آج ہماری قوم سے جوتا بنانے والے فنا ہو جائیں تو ہم کو کتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔ اسی طرح اگر پارچہ باف' رنگریز' سونار' لوہار' بڑھئی' معمار وغیرہ معدوم ہو جائیں تو ہماری ضروریات زندگی کو کتنا صدمہ پہنچے اور ان کو جانے دیجیے صرف شاعروں کو لے لیجیے کہ ان سے زیادہ بیکار جماعت بظاہر کوئی نظر نہیں آتی لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہوں تو ہماری بہت سی لطیف صحبتیں ختم ہو جائیں مگر خدا کے لیے کوئی بتائے کہ اگر آج روئے زمین سے اس جماعت کو فنا کر دیا جائے جو ہمارے مذہب و اخلاق کی ضامن بنی ہوئی ہے تو اس سے ملک و قوم کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔

ہر چیز کی اہمیت کا اندازہ اس کی خدمت کے لحاظ سے متعین کیا جاتا ہے' جو اس دنیا میں متعلق ہوتی ہے' پر اگر وہ خدمت زیادہ اہم ہے تو اس چیز کا وجود بھی اتنا ہی اہم سمجھا جاتا ہے اور اگر وہ چنداں اہم نہیں ہے تو اس کے وجود کی بھی زیادہ پروا نہیں ہوتی یہاں تک کہ اگر کوئی چیز بالکل بے کار ہو تو اسے مٹ جانا چاہیے۔

اچھا اب غور کیجیے کہ اس جماعت سے کیا خدمت متعلق ہے یا اس سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک وہ جس کا تعلق مادیت سے ہے اور دوسرا وہ جو اخلاقیات سے متعلق ہے۔ پھر یہ تو ظاہر ہے کہ مادی زندگی زندگی کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ نہایت فخر و ناز کے ساتھ دنیا و کاروبار دنیا سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ رہی اخلاقی زندگی سو آج تک یہی نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کس اخلاق کی تعلیم دے رہے ہیں اور دنیا کا وہ کون سا اخلاق ہے جو انسان کو دنیا سے بیزاری کا درس دے سکتا ہے۔

اسلام کی گزشتہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء اور شاہان اسلام مادیت و روحانیت یعنی دنیا و دین دونوں کا مرکز سمجھے جاتے تھے اور اسی لیے اسلام میں قدرتاً وہ اصول زندگی پیدا ہو گئے جو مذہب کا کاروبار دنیا اور ہنگامہ حیات کے دوش بدوش لے جانے کے ضامن تھے' اور یہی سبب تھا کہ اسلام کے عہد وسطیٰ میں جو یقیناً اس کا زریں دور تھا ایک شخص کے لیے یہ متعین کرنا دشوار تھا کہ مسلمانوں کے اصول زندگی میں کس طرح خط

فاصل کھینچ کر ان کے دین کو دنیا سے ممیز کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کا بیٹھنا اٹھنا' کھانا' پینا' جاگنا سونا۔ الغرض ان کا ہر دنیاوی عمل مذہب ہی کے لیے تھا جس طرح ان کے تمام مذہبی اعمال دنیاوی ترقی کے روح رواں تھے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے حکمراں جماعت اور علماء دین کے گروہ کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر رکھا تھا اور اگر اتفاق سے کوئی قاضی یا مفتی' مولوی یا عالم حکومت کے مصالح کے خلاف کوئی فتویٰ دینے کی جرات کرتا تھا تو اسے قید بند میں ڈالا جاتا تھا۔ ممکن ہے کوئی شخص اسے حکومت کی زیادتی یا سلطنت کا ظلم قرار دے لیکن جہاں تک اصول سیاست کا تعلق ہے اس طرز عمل پر نکتہ چینی کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ بہرحال مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ مسلمانوں کے عہد ترقی میں یہ جماعت کبھی آزاد و خود سر نہیں رکھی گئی اور ہمیشہ ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ حکومت کے مصالح' اور سیاست کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اپنے احکام فقہی میں تبدیل پیدا کرتے رہیں۔ پھر یہ تو یقیناً" ہوا کہ جس چیز کو سلطنت کی مصلحت بتایا گیا وہ بارہا مستبدانہ خود غرضی ثابت ہوئی لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی عالم دین نے اس خود غرضی کا احساس کر کے صدائے احتجاج بلند کی ہو اور اس کی زبان کو حرکت کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔

پھر غور کیجیے کہ اگر مسلمانوں کی حکومت بدستور قائم رہتی اور اگر بجائے عیسائی حکومتوں کے آج انھیں کی حکومت روئے زمین پر غالب ہوتی تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت جو حالت ہمارے یہاں کے علماء دین کی نظر آتی ہے اس وقت بھی پائی جا سکتی تھی' قیامت تک ممکن نہ تھا کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے سے احتراز کرنے اور ان کو زندہ و سلامت رہنے دیا جاتا کیونکہ ایک پاپائے روم کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی کلیسا کی دنیا علیحدہ قائم کر کے کاروبار عالم سے کوئی واسطہ نہ رکھے لیکن ایک مسلمان کے دل و دماغ سے کبھی یہ بات نہیں نکل سکتی تھی کہ اس کا مذہب اس کی دنیا سے علیحدہ کوئی چیز نہیں اور نہ کبھی یہ بات اس کی عقل میں آسکتی ہیں کہ مذہب اسلام کے علاوہ وہ اک چیز قومیت و وطنیت اور بھی ہے جو غیر مذہب والوں کو بھی اپنے میں شامل کر کے خالص دنیاوی تمدنی ترقی کے لیے زبردست مرکزیت پیدا کر سکتی ہے۔

الغرض حکومت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر کوئی مذہب چل سکتا ہے تو صرف اسی طرح کہ وہ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے اپنے احکام و قوانین میں بھی تبدیلی پیدا کرے ورنہ اس کا فنا ہو جانا بالکل یقینی ہے چنانچہ آج ترکی و ایران کے حالات کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ

وہاں مذہب کی کیا حالت ہے اور علماء مذہب کس بے چارگی و بے بسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں نہ مسلمانوں کی حکومت ہے نہ اکثریت نہ جہاں علم ہے نہ واقفیت، مولوی جو چاہے کہے جو بدعت جی میں آئے کرتا پھرے، لیکن ترکی و ایران میں تو جاکر کہدے کہ بنک میں روپیہ جمع کرنا حرام ہے۔

اب اتنا پڑھنے کے بعد پھر ابتدائی سطور پر غور کیجیے اور ٹھنڈے دل سے یہ فیصلہ فرمائیے کہ اس جماعت سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے یا اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے، حکومت تو ہماری ہے نہیں کہ یہ حضرات اس کا ساتھ دے کر عوام پر سلطنت کے اقتدار کو قوی بنائیں اور اس کے عوض میں گراں قدر معاوضے حاصل کرتے رہیں اور چونکہ یہ خون ان کے منہ لگ گیا ہے اس لیے وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ خود اپنی ہی ذات کو دنیا و دین کا مرکز قرار دے کر عوام کو اپنی طرف بلائیں اور اس غرض کے لیے وہ سب کچھ جائز و ناجائز روا رکھیں جو ان کے اسلاف نے شاہان اسلام کے لیے روا رکھی تھیں، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ایک مولوی کے تمام تعلیمات و نصائح مذہبی کا موضوع صرف مابعد الطبیعاتی دنیا ہوتی ہے اور وہیں کے خوفناک تاریک مناظر سے ڈرا ڈرا کر وہ اپنی پرستش کرایا کرتا ہے۔ اس کو مطلق اس سے بحث نہیں کہ دنیا کہاں جا رہی ہے، زمانہ کس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے جہل و تاریکی کس تیزی سے علم کی روشنی میں پیچھے ہٹ رہی ہے۔ وہ برابر یہی کہے جائے گا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسی کو برحق جانو، وہ اس سے بالکل ناآشنا ہے کہ اس وقت کے اقتصادی مسائل ہم سے کیا چاہتے ہیں، وہ غریب اس سے مطلق آگاہ نہیں کہ ہندوستان کی سیاسیات کا مستقبل کیا ہے مخلوط و غیر مخلوط انتخاب کیا بلا ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ اس جہل پر فخر بھی کرتا ہے اس نادانی پر نازاں بھی ہے اور کہتا ہے کہ اہل جنت تو ایسے ہی سیدھے سادے بھولے بھالے لوگ ہوتے ہیں درآنحالیکہ یہ جنت کی مخلوق جو ان معاملات میں اپنے آپ کو اس قدر نیک و بے خبر ظاہر کرنے پر فخر کرتی ہے، کتنی ہوشیار و باخبر ہے غریبوں کا روپیہ چھیننے میں اور جاہلوں کا گھر اجاڑا جاڑ کر اپنا گھر بسانے میں جس وقت یہ کسی مجمع میں وعظ فرماتے ہوتے ہیں تو ان کی صورت و حالت یونان کے اس جیوپڑ دیوتا کی سی ہوتی ہے جس کے ایک ہاتھ میں دوزخ کے انگارے ہیں اور دوسرے میں جنت کی گل فشانیاں اور وہ اپنے آپ کو بالکل مالک و مختار سمجھتے ہیں، خواہ چشم زدن میں جلا کر خاکستر کر دیں۔ خواہ بیک جنبش چشم و ابرو ہر ہر ذرہ کو گل و گلزار بنا دیں ان لوگوں کی اولین کوشش

یہی ہوتی ہے کہ لوگوں کو دنیا و کسب دنیا کے خیال سے منحرف کر دیں اور اس کے لیے وہ غلط توجیہ و تاویل کے ساتھ کلام مجید کی آیتیں بھی پڑھتے ہیں۔ احادیث نبوی سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ اقوال ائمہ کبار بھی سناتے ہیں۔ اور مثنوی مولانا روم کے اشعار بھی خاص لحن کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس تعلیم کا مقصود حقیقی سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ جب لوگ دولت کو حقیر سمجھنے لگیں گے تو نہایت آسانی سے ان کے حوالے کر دیں گے اسی کے ساتھ وہ دوسری نفسیاتی ضرب یہ لگاتے ہیں کہ قرون اولی کے مسلمانوں اور عہد سلف کے اولیاء کرام کے واقعات سنا کر ان کے خوارق عادات اور کرامات کی داستانیں سنانے لگتے ہیں کہ انھوں نے کس طرح سینکڑوں سال کی غرق شدہ بارات کو دریا سے زندہ نکال لیا۔ ایک شخص پر نگاہ ڈالتے ہی کیونکر اس کے دل کا تمام حال بتا دیا۔ کسی کے بھاگے ہوئے غلام کو کس طرح ایک تعویذ لکھ کر واپس بلا دیا اور پھر آخر میں وہ سارے وعظ کی تان علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل پر توڑتا ہے اور احمق و جاہل مسلمانوں پر اپنی عظمت و بزرگی اپنی غیر معمولی قوت روحانی اور اپنے محیرالعقول کارناموں کا سکہ بٹھا کر آخر کار ان کی جیبیں خالی کرا لیتا ہے۔

تمام دنیا کی قومیں اس اصول پر ترقی کر رہی ہیں کہ عقول انسانی کی تربیت کے لیے تمام موانع کو دور کر دینا چاہیے لیکن یہ فرماتے ہیں کہ نہیں عقلی ترقی روحانی انحطاط ہے اور اب دنیا میں کوئی شخص سوچنے سمجھنے کا مجاز نہیں' جو ہونا تھا ہو چکا' جو کچھ سمجھ میں آسکتا تھا آگیا اور وہ اسی علم و یقین یا ضلالت و گمراہی کو سامنے رکھ کر اپنا دائرہ عمل قائم کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تصنیف و تالیف' تبلیغ و اصلاح' پند و ہدایات سب اسی اصول کے تحت ہوتی ہے اور اس دائرہ سے ایک انچ ادھر ادھر ہٹنا گوارا نہیں کرتے۔

ایک قوم کے اندر انقلاب کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں' ایک یہ کہ اس قوم کے اندر حسن اتفاق سے بعض افراد صالح ایسے پیدا ہو جائیں جو قومی جمود کو دور کریں یا پھر افراد قوم کے اندر کسی خارجی اثر سے ذہنی اضطراب پیدا ہو جائے' امر اول کی تو بظاہر کوئی امید ہندوستان میں نظر نہیں آتی' لیکن دوسری صورت کے آثار ضرور رونما ہو چکے ہیں' اور ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے جو علماء دین کی تعلیمات کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگی ہے لیکن چونکہ یہاں انسان کی ذہنی و عقلی آزادی کو گہوارہ ہی سے چھیننا شروع کر دیا جاتا ہے اور خدا جانے کتنے زمانے سے نسلاً بعد نسل اس پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ

عادت چھٹتے ہی چھٹتے چھٹے گی۔ اور ہندوستان کا مسلمان مستقبل قریب میں کوئی امید اپنے لیے قائم نہیں کر سکتا علی الخصوص اس وقت جب کہ ملک کی ایک بڑی قوم ترقی اور ارتقاء کی منزل میں تیزی سے گامزن نظر آرہی ہو اور وہ اس سے تقریباً بے نیاز ہو گئی ہو کہ کون ہمارا ساتھ دے رہا ہے اور کون نہیں۔ الغرض ہندوستان کا مسلمان اس وقت جن راہوں سے گزر رہا ہے وہ اس قدر دشوار گذار ہیں کہ اگر کوئی فوری انقلاب نہایت ہی شدید قسم کا ان میں رونما ہو تو ان کے نجات کی کوئی صورت نہیں اور ان کا بالکل وہی حشر ہو گا جو ہسپانیہ کے مسلمانوں کا ہوا کہ چند منہدم آثار تو ان کے باقی رہ جائیں گے لیکن وہ خود کہیں کچھ نہ ہوں گے' ہندوستان کا مولوی یا عالم دین جو بد قسمتی سے ہمارا قائد و رہنما ہنوز ہمارا مصلح بنا ہوا ہے دوزخ و جنت کی روایات بیان کرنے میں رات دن لوگوں سے نمازیں پڑھوانے کی فکر میں تو بے شک منہمک نظر آتا ہے لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی غور نہیں کرتا کہ جس قوم سے وہ اپنے لیے لذائذ دنیوی حاصل کر رہا ہے اس کی اقتصادی حالت کیا ہے اور اس کا انحطاط کس حد تک پہنچ چکا ہے۔

میں کہتا ہوں' بہ آواز بلند کہتا ہوں اور بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ وقت اس بات کے دیکھنے کا نہیں ہے کہ مسلمان نماز پڑھتا ہے یا نہیں' روزے رکھتا ہے یا نہیں' دوزخ و جنت کا قائل ہے یا نہیں' بلکہ صرف یہ سوچنے کا ہے کہ مسلمانو کے پاس کچھ کھانے کو بھی ہے یا نہیں اگر علماء دین ہمارے حقیقی بہی خواہ ہوتے اور ان کے دلوں میں ہمارا سچا درد ہوتا تو اس وقت تمام مواعظ مذہبی کو چھوڑ کر صرف اس پر غور کرتے کہ مسلمان اپنا پیٹ کس طرح بھریں' ان کے بچے بھوک کی تکلیف سے کیونکر محفوظ رہیں' اور ان کی عورتیں کس تدبیر سے اسباب ستر پوشی حاصل کر سکیں۔ آپ ایک مسلمان کو موٹر پر سوار' نفیس لباس پہنے ہوئے دیکھ کر اس کی خوشحالی و مسرت کا اندازہ نہ کیجیے بلکہ اس کے گھر میں جا کر دیکھیے کہ کیا حالت ہے اور اس کے دل میں سما کر معلوم کیجیے کہ وہ کس تکلیف و عذاب میں مبتلا ہے' پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارے اس قائد و رہنما کو ہمارے اس دینی و دنیوی رہبر کو کبھی اس کا خیال ہوا ہے کہ جس وقت وہ اپنے وسیع دسترخوان پر نفیس نفیس غذائیں کھانے میں معروف رہتا ہے ٹھیک اسی وقت اس کے پڑوس میں کتنے مسلمان ایسے ہیں جو بھوک کے پیاسے پڑے ہوئے ہیں اور کتنے بچے ایسے ہیں جن کی مائیں اپنی خشک چھاتیوں سے ایک قطرہ دودھ کا ان کے منھ میں نہیں ٹپکا سکتیں جس وقت وہ حریر و کمخواب' یا لکھنؤ کی باریک چکن اور

ولایتی تہذیب کی اچکن پہن، کر ایک لوائے معشوقانہ کے ساتھ موٹر پر سوار ہونے کے لیے گھر سے باہر نکلتا ہے۔ کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کبھی اس کا خیال اس حقیقت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس قوم کے کتنے افراد اس وقت جھلسا دینے والی دھوپ میں ننگے بدن، برہنہ پا پتھر توڑ رہے ہیں۔ کیا اس سے زیادہ دنیا میں کوئی بے غیرتی بے حیائی اور بے شرمی ہو سکتی ہے کہ جو افراد فاقہ کر کر کے، اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر اس کے لیے یہ نعائم و لذائذ فراہم کریں انھیں کے دکھ درد کی طرف سے وہ یوں بے خبر و بے پروا رہے، ہرچند فرعون و نمرود کو گذرے ہوئے زمانہ گزر گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی اولاد اب تک دنیا میں باقی ہے اور اسی اخلاق سوز و انسانیت شکن خصوصیات کے ساتھ باقی ہے جو کسی وقت ان کے اسلاف میں پائی جاتی تھیں مگر فرق صرف یہ ہے کہ ان پر عذاب نازل ہو چکا اور ان کے لیے ہنوز دست خدا میں انتظار کر رہا ہے۔

لکھنؤ کی علماء کے کسی مجمع میں ایک بار میں نے دریافت کیا کہ "فرمائیے اب کیا ارادہ ہے اور قومی فلاح و بہبود کے لیے کون سی مقامی تحریک آپ کے پیش نظر ہے؟ ان میں سے ایک نے کہا "ہاں عرصہ سے ہمارا خیال ہے کہ یہاں کے مسلم کلب کی حالت درست کی جائے اور انسائیکلو پیڈیا کے قسم کی ایک کتاب اردو میں لکھی جائے" یہ سنتے ہی میرے بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے کہا قبلہ اپنے جھونپڑے کو محل بنانے سے پہلے کیوں آپ اس کی آرائش و زینت کی فکر میں مبتلا ہیں۔ تمدن کی ترقی، جاہ و ثروت کے تنعم کے ساتھ یہ سب کچھ اپنے آپ ہو رہے گا۔ نہ جانے کتنے کلب قائم ہو جائیں گے، کتنی انسائیکلو پیڈیا بن جائیں گے۔ اس وقت تو سوال جرحیات کا ہے۔ بقاء زندگی کا ہے تن پوشی اور دفع گرسنگی کا ہے۔ اس لیے طریقہ زکواۃ کو منظم کیجیے۔ قومی بیت المال کی طرح ڈالیے۔ گھر گھر جا کر دیکھیے کہ کون کس حال میں مبتلا ہے اور سب سے پہلے اس زخم کا علاج کیجیے جس نے ساری قوم کو مفلوج بنا رکھا ہے "یہ سن کر فرمانے لگے کہ" ہاں یہ تحریک بھی ضروری ہے اور انشاء اللہ الرحمن اس پر غور کریں گے "لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ جب مولوی کسی بات کو انشاء اللہ سے شروع کرتا ہے تو اس کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔

یہ ہے حال ان تمام اداروں کا جنھیں ہم مدرسہ و خانقاہ کہتے ہیں اور جہاں سے یہ زہریلے افعی نکل نکل کر ہندوستان کی مسلمان آبادی کو ڈس رہے ہیں ان کے علاوہ بعض ادارے ایسے ہیں جو صرف تصنیف و تالیف کے لیے وقف ہیں۔ اور جن کے مدیروں کو فخر

ہے کہ وہ دنیا میں بڑا کام کر رہے ہیں مسلمانوں کی عظیم الشان خدمت انجام دے رہے ہیں لیکن چونکہ ان کی ذہنیتیں بھی اسی مسموم ماحول کی پیداوار ہیں اس لیے ان کی جملہ تصانیف غیر ضروری اور غیر اہم بلکہ ایک حد تک مضرت رساں ثابت ہوتی ہیں یہ بڑی بڑی کتابیں تاریخ جغرافیہ کی لکھ رہے ہیں لیکن ان کی حقیقت داستان پارینہ دہرانے سے زیادہ کچھ نہیں' یہ فلسفہ و مذہب پر موٹی موٹی تالیفات پیش کر رہے ہیں لیکن بالکل اسی اندھے کی طرح جس کا سہارا ایک لکڑی کے سوا کچھ نہ ہو۔ اول تو ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ وقت اس قسم کی تصنیف و تالیف میں ضائع کرنے کا نہیں بلکہ دوڑ کر اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینے اور ڈوبتے ہوؤں کو باہر نکالنے کا ہے' اور اگر یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے تو پھر کم از کم ایسے لٹریچر پیش کرنے کا ہے جو دوسروں میں یہ ولولہ پیدا کرے' جس وقت کوئی قوم ترقی کرتی ہے تو علوم و فنون کا ذخیرہ وہ خود اپنے ساتھ لے آتی ہے اور ہمہ جگہ علمی ادارے قائم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن جب انحطاط ہوتا ہے تو یہ ادارے خود بخود ضعیف ہونے لگتے ہیں اور ان کو کوئی قوت سنبھال نہیں سکتی۔ اس لیے جس رنگ کی تصانیف ہمارے یہاں کے بڑے مصنفین پیش کر رہے ہیں وہ وقت کے لحاظ سے بالکل لغو و بے کار ہیں اور ان سے ملک و قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ مضرت کا اندیشہ ہے کیونکہ ان کا موضوع اور ان کے اصول ترتیب وہی آزادی عقل میر کے چھیننے والے اور اندھی تقلید کو مضبوط کرنے والے ہیں جس نے مسلمانوں کو نکبت و ذلت کی اس منزل تک پہنچا دیا ہے۔

پھر جب حالات یہ ہیں تو سوال صرف یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے اور اپنی بقاو تحفظ کے لیے کیا تدابیر عمل میں لانا چاہیے۔

غالباً آپ کو معلوم ہو گا کہ اس وقت کرہ زمین پر مسلمانوں کی آبادی تقریباً 40 کروڑ ہے اور اسی کے ساتھ غالباً یہ بھی آپ کے علم میں ہو گا کہ کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ آپ نقشہ اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ ایک طرف یہ سلسلہ مغربی افریقہ کے سواحل اٹلانٹک سے شروع ہو کر بحیرہ روم کے جنوبی ساحل کو اپنی آغوش میں لیتا ہوا مصر اور مغربی ایشیا تک پہنچتا ہے اور پھر سواحل بحر قلزم اور بحرا اسود سے ہوتا ہوا سائبیریا و منگولیا تک پہنچ جاتا ہے' دوسری طرف مشرقی ساحل افریقہ سے شروع ہو کر مڈغاسکر کے عرض البلد پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک سلسلہ وہ ہے جو افغانستان کے کوہستان کو عبور کر کے ہندوستان تک پہنچتا ہے اور یہاں سے جزیرہ نمائے ملایا ہوتا ہوا مشرقی مجمع الجزائر تک پہنچ جاتا ہے۔

اچھا اب اس کے ساتھ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ اسلام کی یہ تدریجی ترقی نہ تھی بلکہ ایک سیلاب کی سی ترقی تھی جو وقتاً فوقتاً اٹھتا رہا اور چند صدیوں میں کرۂ ارض کے اتنے وسیع حصہ پر محیط ہو گیا 630ء اور 750ء کے درمیان ہسپانیہ و مراکش سے لے کر وسط ایشیا تک پھیل گیا اور تقریباً ڈھائی صدی تک اسی جگہ محدود رہا۔ اس کے تقریباً ڈھائی صدی بعد 1000ء اور 1100ء کے درمیان اس کی وسعت مغربی افریقہ سے لے کر ایشیا کوچک' وسط ایشیا اور شمالی ہند تک پہنچ گئی۔ پھر دو صدی گزرنے کے بعد ایک اور لہر اٹھی جس نے (1300ء اور 1400ء کے درمیان) جزیرہ نمائے بلقان سے لے کر سائبریا' ہندوستان اور مجمع الجزائر تک تمام حصہ کو اپنے اثر میں لے لیا اور اس طرح جو نقشہ مسلم آبادی کا 1400ء میں قائم ہو گیا تھا تقریباً وہی اب بھی نظر آتا ہے۔

اس وقت میں اس امر سے بحث نہیں کروں گا کہ اس کی ترقی کے کیا اسباب تھے' یعنی کوئی خاص اخلاقی خوبی اسلام میں ایسی تھی جس کا اثر دنیا میں پڑا یا یہ کہ صرف اس کی عسکریت کو اس کا امتیاز دینا چاہیے بہرحال حقیقت یہ ہو یا وہ ہمیں اس سے بحث نہیں دیکھنا یہ ہے کہ اسلام جہاں جہاں گیا کن خصوصیات کے ساتھ گیا اور س کا نتیجہ کیا ہوا لیکن اس پر غور کرنے سے قبل بطور اصول موضوعہ ہم کو یہ متعین کر لینا چاہیے کہ اسلام سے ہماری مراد اس مضمون میں کیا ہے۔

میں اس سے قبل بھی ظاہر کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ دین و مذہب بالکل علیحدہ چیزیں ہیں۔ یعنی دین نام ہے اس اعتقاد کا جو متعلق ہے ہماری عبادات سے' ہماری مابعد الطبیعات اور اس سکون نفس سے جو کسی مخصوص عقیدہ کی بنا پر انفرادی طور پر ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ سوسائٹی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن مذہب نام ہے اس تہذیب و تمدن کا جو کسی دین کے تحت دنیا میں قائم ہو جاتا ہے۔ اور جس کا تعلق انسان کی ہیئت اجتماعی سے ہوتا ہے اس کا میں وہی مفہوم قرار دیتا ہوں جو انگریزی لفظ (CULTURE) کا ہے پس میری مراد بھی مضمون زیر بحث میں مذہب سے ہے نہ کہ دین سے یعنی میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اسلام بہ لحاظ اعتقاد مذہبی نہیں بلکہ بہ حیثیت ایک خاص مذہب (CULTURE) ہونے کے کیا خصوصیات اپنے ساتھ ہر جگہ لے گیا۔

اب اس سلسلے میں آپ سب سے پہلے یہ دیکھیے جس وقت اسلام کا ظہور ہوا اس وقت اس کا ماحول کیا تھا اس میں کلام نہیں کہ اسلام پیدا ہوا ایشیا ہی کے ایک گوشہ سے

لیکن اثر اس نے قبول کیا یورپ کی اس تہذیب کا جس کے لیے صحیح لفظ میرے خیال میں صرف "یونانیات" ہے مگر اس سے مراد ملک یونان کی تہذیب نہیں بلکہ وہ تمام مغربی تہذیب مقصود ہے جو حقیقتاً "مجموعہ تھی' رومہ و یونان دونوں کی تہذیب کا" اور جس سے نہ صرف سارا یورپ بلکہ جزیرہ نمائے عرب بھی عرصہ تک متاثر رہنے کے بعد اپنے دور انحطاط میں اسی کے زیر اثر نظر آتا تھا' چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ولادت نبوی و بعثت کے وقت سرزمین حجاز میں بھی یہود و نصاریٰ ہی کا اثر قائم تھا۔ اہل عرب باوجود اس کے کہ ان کی بت پرستی شدید قسم کی بت پرستی تھی' نصاریٰ و یہود کے علماء کا خاص احترام کرتے تھے' اور انکے علم و فضل اور روحانیت کے قائل تھے۔ اس کا ایک سبب غالباً" یہ بھی تھا کہ اہل عرب میں بت پرستی کا خیال خود یونان و رومہ سے آیا تھا۔ لیکن اس کی بڑی وجہ سلطنت رومہ کے اقتدار و وسعت' ہیبت و جبروت کی وہ روایات قدیمہ تھیں جو عرب میں ایک ایک بچہ کے ذہن نشین ہو چکی تھیں اور قدرتاً" ہونا چاہیے تھیں جب کہ اس وقت بھی قسطنطنیں اعظم کا مسیحی جھنڈا آبنائے باسفورس پر لہراتا ہوا ہر شخص کو نظر آتا تھا۔

ہر چند اسلام نے اپنی فتوحات کا اولین ہدف یونان و رومہ ہی کی حکومت کو قرار دیا لیکن بجائے اس کے کہ یونانیات کا اثر زائل ہوتا مسلمانوں پر اور زیادہ رنگ اس کا چڑھ گیا' یعنی گو ظاہری حکومت تو اہل یورپ سے ضرور چھن گئی لیکن اس کی تمدنی حکومت عربوں پر اور زیادہ قائم ہو گئی چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ عربوں نے صرف علوم و فنون میں یونانی لٹریچر کا اثر قبول کیا بلکہ تدوین شرع وفقہ میں بھی ارسطو کی تصانیف سے مدد لی گئی حتیٰ کے بعض مفسرین نے تو اسکندراعظم کو پیغمبر تک قرار دے دیا' ایک ہی تہذیب کی مختلف قوموں کا ایک دوسرے سے برسرپیکار ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمیشہ ہوا ہے اور ہو گا خود مسلمانوں میں باہم جس قدر جنگ و خوں ریزی ہوئی ہے کس سے مخفی نہیں' الغرض مسلمانوں کا رومہ و یونان کے مقبوضات کو تصرف میں لے آنا اگر ایک طرف اسلام کی فتح تھی تو دوسری طرف یونانیات کی بھی کامیابی تھی جس سے اسلام برابر متاثر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور اگر ایرانی تہذیب جو جزیرہ نمائے عرب میں کہیں کہیں اکاسرۂ عجم کے سطوت و اقتدار کو قائم کیے ہوئے تھی۔ اس وقت نہ پائی جاتی جس سے اہل عرب ایک حد تک متاثر ہو چکے تھے۔ تو آج مسلمانوں کی تہذیب یکسر مغربی تہذیب ہوتی اور اس میں کوئی شائبہ بھی مشرقیت کا نہ پایا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دور ترقی میں علوم و فنون کی بڑی خدمت

انجام دی۔ لیکن اس کی بنیاد بھی وہی یونانیات تھی جس نے کسی وقت اسلام کا ساتھ نہیں چھوڑا اور آخر کار ان کے تمام شعبہ ہائے حیات کو اس قدر سختی کے ساتھ جکڑ لیا کہ آج ہندوستان میں بھی جہاں مسلمانوں کو رہتے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں وہی مغربی خصوصیت ان کی قائم ہے اور جس نے ان کے مستقبل کو مشرق میں حد درجہ تاریک بنا رکھا ہے۔

آپ اسلامی تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ مسلمان جہاں گئے اپنی تہذیب اپنے ساتھ لے گئے اور کسی مفتوحہ ملک کے تمدن سے متاثر نہیں ہوئے جو بالکل مغربی ذہنیت ہے۔

ہندوستان میں ایک غضب اور یہ ہوا کہ دور مغلیہ ختم ہونے کے بعد انگریزوں کی حکومت شروع ہو گئی جو ایک مغربی قوم تھی اور اپنی تمام مغربی خصوصیات اپنے ساتھ لائی تھی' اس لیے جس وقت جذبات عناد و انتقام مسلمانوں کے سرد پڑ گئے تو پھر وہی ان کی تقلید میں پیش پیش نظر آنے لگے اور اپنے اوپر افرنجیت طاری کرنے میں نمایاں سبقت کا اظہار کیا۔

چنانچہ اس وقت بھی جب ہندوستان میں ایک سخت سیاسی انقلاب کے آثار پیدا ہو گئے بہت کم مسلمان ایسے ہیں جو ہندوؤں کے ساتھ شیروشکر ہو کر حقیقی معنی میں خدمت وطن پر آمادہ نظر آتے ہوں۔ ورنہ اکثر حصہ انھیں افراد کا ہے جو انگریزوں کی طرف مائل ہیں اور ان کو ہندوؤں پر ترجیح دیتے ہیں۔

آپ کسی مسلمان سے جس نے کچھ بھی مذہبی تعلیم حاصل کی ہے دریافت کیجیے کہ وہ انگریزوں اور ہندوؤں میں کس کو بہتر سمجھتا ہے تو وہ فوراً" انگریزوں کا نام لے دے گا اور یہ دلیل بیان کرے گا کہ وہ صاحب کتاب ہیں اور یہ کافر ان کی لڑکیوں سے ہم شادی کر سکتے ہیں اور کلام پاک ان کے ساتھ صلح و آشتی سے رہنے کی ہدایت کرتا ہے اور مشرکین و کفار سے نہیں الغرض وہ بہت سے اسباب و دلائل نصاریٰ کی ترجیح میں پیش کر سکے گا پھر چونکہ مسلمانوں کی یہ ذہنیت بہت قدیم ہے اور صدیوں کی پڑی ہوئی عادت کا ترک ہونا تقریباً" محال ہے اس لیے اگر اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں کی قومی و ملکی تحریکوں میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا تو یہ ان کی فطرت تھی۔ ان کی مذہبی ذہنیت کا اقتضا تھا جس میں وہ بڑی حد تک مجبور تھے اور ہیں۔

میں نے جہاں تک مسلمانوں سے اس باب میں تبادلہ خیال کیا ہے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں

کہ وہ اپنی تہذیب یا اپنے (CULTURE) کو بدلنے کے لیے تیار نہیں اور ان کو یقین ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کی سطح پر نہ آیا جائے اور ان کی سطح پر آنا اپنی قدیم تہذیب کی روایات کو صدمہ پہنچاتا ہے۔

اس لیے اب سب سے پہلا اصولی سوال یہ ہے کہ آیا ہندوستان کے مسلمان اپنی قدیم روایات تہذیب کو صدمہ پہنچائے بغیر کوئی ملکی یا وطنی جذبہ ہندوستان کے متعلق قائم کر سکتے ہیں یا نہیں اور اگر نہیں تو پھر نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

سوا ہندوستان کے اور جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں ان کے حالات پر ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کو منطبق نہیں کر سکتے کیونکہ ترکی۔ ایران۔ افغانستان۔ عرب۔ و مصر میں نہ وہ محکوم کی حیثیت سے ہیں نہ اجنبی اقوام میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کا ملک ہے ان کی آبادی ہے۔ ان کی حکومت ہے اور اس لیے اگر وہاں کے مسلمانوں کو ان کی مغربی ذہنیت یورپ کی طرف کھینچ رہی ہے تو درست ہے اور وہ انھیں اصول کو سامنے رکھ کر ترقی کر سکتے ہیں لیکن ہندوستان کے مسلمان اگر ان کی پیروی کرنا چاہیں تو کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں جبکہ ہندوستان کی بیداری نے مغربی حکومت کا جوا اپنی گردن سے علیحدہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے اور مسلمانوں کے لیے یہ رہا سہا سہارا بھی ختم ہوتا نظر آتا ہے۔

○ ○ ○

ہماری قدامت پرستیاں!

"کسی زمانہ میں ایک بزرگ تھے جو دریا کی سطح پر مصلا بچھالیتے تھے اور اس پر نماز پڑھتے ہوئے اس کو عبور کر جاتے تھے"

"کوئی ولی اللہ کسی طرف سے گزر رہے تھے کہ ایک کنوئیں پر انھوں نے آدمیوں کا ہجوم دیکھا' دریافت سے معلوم ہوا کہ ایک بھینس اندر گر گئی ہے اور لوگ اس کے نکالنے کی فکر میں ہیں انھوں نے کنوئیں میں ہاتھ لٹکا کر جو باہر نکالا تو لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ بھینس باہر کھڑی ہوئی ہے۔"

"کسی زمانہ میں ایک صاحب کرامت درویش کثرت ریاضت سے اس قدر لطیف" ہو گئے تھے کہ پکا ان کے جسم سے آرپار ہو جاتا تھا اور ان کا بدن حائل نہ ہوتا تھا"

تذکرۃ الاولیاء قسم کی کتابیں اٹھا کر دیکھیے تو ہزاروں واقعات آپ کو اس سے زیادہ حیرت انگیز نظر آئیں گے لیکن آپ نے ان پر بھی غور کیا ہے کیا واقعی کسی وقت ہمارے یہاں کے اکابر مذہب و تصوف سے اس قسم کی محیر العقول باتیں ظاہر ہوئی تھیں اور اگر یہ صحیح ہے تو اس کا کیا سبب تھا اور کس فائدہ و نتیجہ کے لیے تھا اور اب "اہل کشف و کرامات" کے لوگ کیوں نظر نہیں آتے؟؟"

آپ کسی شخص سے جو ان باتوں کی صحت کا قائل ہے یہ سوال کریں گے تو وہ نہایت ہی غم آلودہ حسرت ناک چہرہ بنا کر کہے گا کہ یہ اگلے لوگوں کی باتیں ہیں جو انھیں کے ساتھ گئیں نہ اب وہ ریاضتیں ہیں' نہ عبادتیں' نہ وہ روحانیت ہے نہ صداقت' نہ وہ ایمان ہے نہ وہ یقین' پھر آپ اس سے پوچھیے کہ اب ایسا کیوں نہیں ہے کیا مسلمان دنیا میں نہیں رہے' کیا عبادت کا اصول بدل گیا کیا اصول اخلاق و روحانیت میں کوئی تغیر پیدا ہو گیا' تو وہ اس کے جواب میں سوا اس کے کہ اپنی کم بختی کا رونا روئے خدا کی مرضی پر محمول کرے یا کل جگ کی خرابی بتا کر خاموش ہو رہے اور کچھ نہ کہے گا۔ اکثر و بیشتر میرے پاس ایسے حضرات کرام فرماتے رہتے ہیں جو میرے کفر و الحاد میں میرے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ مجھے

راہ راست پر لانے کی سعی فرماتے ہیں چنانچہ چند دن ہوئے ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے اور اس عزم کے ساتھ وہ مجھ بے دین کو بغیر مسلمان بنائے ہوئے نہ اٹھیں گے۔ میں ان کی مقطع صورت' ان کی شرعی وضع اور ان کے ہنگامہ خیز "السلام علیکم" سے چونک کر پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آج پھر کوئی "خداوند اپنے ناچیز بندہ" کو سعادت جلوہ بخشنے کے لیے آیا ہے۔ اس لیے تعظیماً" و احتراماً" اٹھ بیٹھا' صدر میں جگہ دی اور مودب ہو کر خاموش بیٹھ گیا۔ پہلے تو وہ بڑی دیر تک نہایت غور سے میری صورت و وضع کو دیکھتے رہے اور پھر ایک نہ چھپ سکنے والی خشونت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ "میں نے سنا ہے کہ تم معجزہ وکرامت کے قائل نہیں میں نے عرض کیا کہ "یہ تو آپ نے غلط سنا ہے" کیونکہ کل ہی میں کارنوال میں ولن نذمن کا کارنامہ دیکھ چکا ہوں جو 100 فٹ کی بلندی سے 3 فٹ کی جست لگاتا ہوا آگ کے شعلوں کے اندر غائب ہو جاتا ہے علاوہ اس کے یہاں کے پروفیسر مشتاق علی کی کرامتیں بارہا دیکھ چکا ہوں جو ایک رومال سے درجنوں رومال اور ایک روپیہ سے سینکڑوں روپے آن کی آن میں بنا دیتے ہیں۔

یہ سنتے ہی ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور برہم ہو کر بولے تو گویا رسولوں کے معجزے اور اولیاء کی کرامات بھی کوئی شعبدہ بازی تھی۔

میں نے کہا مجھے اس کا علم نہیں۔ لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرے لئے تو ان لوگوں کے یہ تماشے بھی معجزے ہی کا حکم رکھتے ہیں۔ کیونکہ میں ویسا کرنے سے عاجز ہوں فرمایا "مشق سے ہر شخص ایسا کر سکتا ہے" میں نے کہا کہ "ایک منکر مذہب معجزوں کے متعلق بھی یہی کہہ سکتا ہے" بولے مگر "اس کا یہ کہنا تو غلط ہو گا کیونکہ وہاں مشق و اکتساب کا کوئی سوال نہ تھا اور معجزہ اصطلاح میں کہتے ہی اس کو ہیں جو ایک نبی سے بغیر کسی مشق و اکتساب کے سرزد ہو" میں نے کہا بجا ارشاد ہوا لیکن اگر آج کل کے شعبدے دکھانے والے بھی یہی دعوی کر بیٹھیں کہ جو کچھ وہ دکھاتے ہیں اس کا تعلق مشق و اکتساب سے نہیں ہے تو آپ کیا فرمائیں گے کہنے لگے "ہم اسے جھوٹا کہیں گے اور سیکڑوں مثالیں ایسی بتادیں گے کہ مشق سے لوگ ویسا کرنے میں کامیاب ہو گئے"

میں نے کہا "یہ درست ہے لیکن نتیجہ کے لحاظ سے شعبدہ و معجزے میں کوئی فرق مجھے نظر نہیں آتا۔ سوا اس کے کہ ایک شخص کسی وہبی قوت کی وجہ سے اس کے ظہور کا مدعی ہے اور دوسرا مشق و اکتساب سے اس سے اخلاق انسانی کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ بولے "معجزہ تو

صرف اس لیے ہے کہ نبی کو نبی مانیں اور اس کے کہنے پر عمل کریں" میں نے کہا "تو خلاصہ یہ ہوا کہ نبی وہ ہے جس سے معجزہ سرزد ہوا اور معجزہ وہ ہے جو نبی سے ظاہر ہو کہنے لگے بے شک"۔

ظاہر ہے کہ جس جماعت کے رہنما و قائد اس عقیدہ و خیال کے ہوں گے وہ کیوں نہ اعجوبہ پرست ہو گی اور اس کا یہ عقیدہ کہ "اسلاف" کے سے صاحبان علم و عزیمت' حاملان فضل و کرامت اب نہیں پیدا ہو سکتے' اس کو کس درجہ مایوس اور ناکارہ بنا دے گا۔ اس میں شک نہیں کہ "عہد ماضی" میں انسان کے لیے بہت کچھ دلچسپیاں ہوا کرتی ہیں اور گزرتے ہوئے واقعات بعض دماغوں کے لیے ایک "طلسم زار" کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں لیکن اس کا تعلق صرف ہمارے جذبات محبت و عقیدت سے ہے جو انسان کے عہد وحشت سے وراثتاً" منتقل ہوتے چلے آئیں ہیں اور اب ہم ان کو ایک حقیقت و واقعہ سمجھنے لگے ہیں۔

اوارہ مذہب کے قیام کی تاریخ کا اگر آپ مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس کی بنیاد ہمیشہ کسی ایک مخصوص ہستی کے ساتھ جذبہ خوف و احترام یا محبت و عقیدت پر قائم ہوئی اور اس ہستی کے اٹھ جانے کے بعد انسان نے اپنی عقیدت وارادت کو وسیع و مستحکم بنانے کے لیے بہت سی ایسی باتیں اپنی طرف سے اضافہ کر کے بیان کرنا شروع کیں جو لوگوں کو مرعوب یا راغب کرنے والی تھیں چنانچہ انبیاء کے معجزے اولیاء کی کرامات درویشوں کی خوارق عادات سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ صرف ہمارے ہی ارادتمندانہ جذبات یا مصالح تبلیغ کی پیداوار ہیں پھر جس طرح سو سال پیشتر کے کسی بزرگ کے حالات میں اس وقت ایک معتدبہ اضافہ اس کی کرامات کا نظر آتا ہے اسی طرح آج کسی بزرگ کے متعلق بھی سو سال بعد ایسی روایتیں منسوب کر دی جائیں گی اور جس طرح چار قرن پہلے کی پختہ قبر آج کسی نہ کسی بزرگ کا مزار بن گئی ہے اسی طرح نصف صدی بعد آج کی بنی ہوئی قبر پر بھی پھولوں کی چادر کا چڑھایا جانا مستبعد نہیں۔ اگر جہل و واہمہ پرستی کا یہی عالم رہا۔

ہمارے "اسلاف نے اپنے عہد میں جو کچھ کیا وہ اس میں شک نہیں کہ لائق صد ہزار آفرین و ستائش ہے لیکن یہ کہنا جو کچھ وہ کر گئے ہیں اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں اور جو کچھ وہ کہہ گئے ہیں اس کو بلا چون و چرا آنکھ بند کر کے تسلیم کر لینا چاہیے حد درجہ مضر تعلیم ہے اور ایک قوم کی دماغی و ذہنی ترقی کو خاک میں ملا دینے والی ہے۔

آیئے اپنے بعض اسلاف کی علمی تحقیق اور ذہنی ترقی کا ایک لطیفہ سن لیجیے۔

علامہ قزوینی اور علامہ دمیری سے غالباً" ہر وہ شخص واقف ہو گا جس نے تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے۔

علامہ قزوینی وہی ہیں جنھوں نے "تاریخ گزیدہ" مرتب کی۔ ظفر نامہ لکھا اور نزہتہ القلوب تصنیف فرمائی۔ یہ حرٰن یزید کی اولاد میں سے تھے جن کو میدان کربلا میں سید الشہداء کے ہم رکاب جہاد کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور مذہباً" شیعہ تھے علامہ دمیری آٹھویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ' محدث و مفسر تھے۔ جامع ازہر قاہرہ میں فلسفہ و ادب کے لیکچرار تھے خاص سرزمین مکہ میں سلسلہ درس و تدریس جاری رکھتے تھے' صاحب کرامات بھی مانے جاتے تھے اور منجملہ خطبات و دیگر کتب کے ایک مشہور کتاب حیات الحیوان کے بھی مصنف تھے۔

الغرض یہ دونوں ایسے صاحب فضل و کمال تھے کہ آج کوئی مولوی و عالم ان کے مرتبہ تک پہنچنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن ان کی تحقیق انیق اور ان کی پختگی ذہن کا کیا عالم تھا حیات الحیوان لے کر اسکول کے کسی طالب العلم کو دے دیجیے اور فیصلہ اسی پر چھوڑ دیجیے مثلاً ان حضرات کی کاوش علمی کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ عقاب کی تحقیق کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

جب عقاب (چیل) سال خوردہ ہو جاتی ہے اور بینائی کھو بیٹھتی ہے تو وہ فضا میں بلند ہوتی ہے اور اس حد تک اوپر اڑ کر چلی جاتی ہے کہ اس کے پر تمازت آفتاب سے جل جاتے ہیں اس کے بعد وہ نیچے گرتی ہے اور ایک شور و تلخ پانی کے کنوئیں میں غوطہ لگا کر از سر نوجوان ہو جاتی ہے (قزوینی)

جب چیل ضعیف و کمزور ہو کر اندھی ہو جاتی ہے تو اس کے بچے اس کو چاروں طرف لادے پھرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک چشمہ تک پہنچتے ہیں اور اس میں غوطہ لگاتے ہیں۔ اس کے اثر سے چیل کی بینائی عود کر آتی ہے اور وہ از سر نوجوان ہو کر اپنی شکاری زندگی شروع کر دیتی ہے۔

کرگس چیل کے انڈے سے پیدا ہوتا ہے اور چیل کرگس کے انڈے سے تمام چیلیں مادہ ہیں اور دوسری چیزوں سے جفتی کھاتی ہیں' یہ صرف تین انڈے دیتی ہیں' لیکن تیسرے انڈے کو پھینک دیتی ہیں' اور صرف دو سیتی ہیں' تیسرے

انڈے کو ایک اور طائر جس کا نام کا سر العظام (ہڈی توڑ) ہے اٹھاتا ہے اور اس سے بچہ نکلتا ہے۔

چیل' ہندوستان سے ایک پتھر لے آتی ہے اور گھونسلے میں رکھ دیتی ہے تاکہ انڈے سینے میں آسانی ہو' یہ پتھر کھوکھلا ہوتا ہے جس کے اندر ایک اور پتھر ہوتا ہے یہ پتھر عورتوں کے وضع حمل میں بھی آسانی پیدا کرتا ہے۔ (دمیری)

غالباً یہ کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ عقاب کے متعلق جو کچھ ان محققین نے لکھا ہے وہ صرف نقل ہے قدیم یونانی روایات کی جو عہد قدیم سے ان کے یہاں رائج چلی آرہی تھیں پھر جب آٹھویں صدی ہجری تک ہمارے یہاں کے مورخین و مصنفین کی تحقیق کا یہ عالم تھا کہ وہ روایات قدیمہ سے ایک انچ ہٹ کر خود اپنے ذہن و عقل سے کام لینا گناہ سمجھتے تھے تو ظاہر ہے کہ اس سے قبل اور کیا عالم رہا ہو گا اور ان کے علمی کارناموں کی زمانہ موجودہ میں کیا وقعت ہو سکتی ہے۔

یقیناً" ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں کیونکہ جو کچھ انھوں نے کہا وہ ان کی بساط عقل کے لحاظ سے بالکل درست تھا' لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ تفتیش و تحقیق نے غیر معمولی وسعت اختیار کر لی ہے کیوں کسی کو اس امر کے ماننے پر مجبور کیا جائے کہ اسلاف جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے اور ہم انہیں کا اتباع کر کے ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔

یہی وہ قدامت پرستی ہے جو اس سے قبل خدا جانے کتنی قوموں کو تباہ و برباد کر چکی اور اب مسلمانوں کی جماعت اس کا شکار بنی ہوئی ہے۔

اعجوبہ پرستی کا دور گزر گیا یہ دور ہے صرف تجربہ و مشاہدہ کا اس لیے اب نہ معجزہ و کرامات پر محض اس لیے یقین کیا جا سکتا ہے کہ قدیم کتابوں میں ایسا لکھا ہوا ہے اور نہ صرف خوارق عادات کی بناء پر کسی کی عظمت و بزرگی ثابت کی جا سکتی ہے کیونکہ جب تک "طبیعیات" کی دنیا تک انسان کا دسترس نہ تھا کسی کا دس فٹ بلند جست کر لینا بھی معجزہ کہلایا جا سکتا تھا لیکن اب کہ طیاروں اور ہوائیوں کے ذریعہ سے ہمدوش ثریا ہو جانا بھی مستبعد ہیں' اولیاء کرام کی خوارق عادات کو ان کی بزرگی کے ثبوت میں پیش کرنا صرف یہی معنی رکھتا ہے کہ آج ہم یورپ کے ایک ایک موجد و مخترع کو صاحب کرامات یقین کرنے پر مجبور ہیں۔

کس قدر افسوس ناک امر ہے کہ اس وقت بھی جب تمام دنیا میں علم کا اجالا پھیل گیا

ہے اور انسان حقیقی معنی میں "خلافت الٰہی" کے دور سے قریب تر ہوا جا رہا ہے ہم بدستور اسی زمانہ میں ہیں جب بقول قزوینی دو میری چیل کے گھونسلے میں پارس پتھر پایا جاتا تھا اور مستقبل کی امیدیں صرف نزول مسیح اور ظہور مہدی سے وابستہ کیے ہوئے ہیں۔

کاش ہم سمجھ سکتے کہ اس وقت دنیا کو حاجت نہ مہدی کی ہے نہ مسیح کی بلکہ ضرورت ہے لینیسن ڈ مارکونی کی، رلیان اور بوس کی، کیونکہ انسان اب معجزہ و کرامات کی حدود سے گذر کر عالم جدوجہد کی اس منزل تک پہنچ گیا ہے جہاں خود اس میں "جذبہ الوہیت" پیدا ہوتا نظر آرہا ہے اور انسانیت کبریٰ "کا مشاہدہ ایک ایسی حقیقت ذاتی" کا احساس اس کے اندر پیدا کر رہا ہے جس کو اگر ہم چاہیں تو معرفت ربانی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اور قرب الٰہی سے بھی۔

اس لیے اگر تم قدامت پرستی کی لعنت سے آزاد ہونا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو احمق و جاہل نہ سمجھو بلکہ ہوش گوش والا انسان باور کر کے ہر بات کے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اپنے ذہن و دماغ کو نوامیس قدرت کی گتھیاں سلجھانے کا اہل بناؤ اور پرستش اسلاف ترک کر دو کہ اس سے زیادہ سنگ گراں ترقی کی راہ میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ اپنی اولاد کی تربیت و تعلیم میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ ان کی عقلی آزادی محو نہ ہونے پائے اور دوسروں کی پیروی میں مطالعہ اشیا کی عادت ان کی "حرکت فکر" کو تباہ نہ کر دے۔ پھر اگر تمہاری ایک نسل بھی اسی اصول کے تحت ترتیب پا گئی تو سمجھ لو کہ تمہاری تمام مصیبتیں دور ہو گئیں ورنہ کل جو تم کو اور تمہاری اولاد کو دیکھنا ہے اسے آج میری زبان سے سن لو اور یاد رکھو کہ جس طرح اور ہزاروں اندھی قومیں اب سے قبل تباہ ہو چکی ہیں اسی طرح تم کو بھی تباہ و برباد ہو جانا ہے اور خدا اس سے بالکل بے نیاز ہے کہ مسلمان کا وجود دنیا میں باقی رہے یا نہ رہے۔

○ ○ ○

مذہب والحاد

کبھی آپ نے اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ مذہب کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ کیا وہ کوئی معمہ ہے جسے عقل انسانی اس وقت تک حل نہیں کر سکتی' کیا وہ کوئی دقیق علمی مسئلہ ہے جس کی حقیقت کا علم ابھی تک نوع انسانی کو نہیں ہو سکا کیا وہ کوئی خیال تارو پود ہے جس کی گتھیاں کبھی سلجھائی نہیں جا سکتیں۔ کیا وہ فطرت کا کوئی ایسا راز ہے جو کبھی بے نقاب نہیں ہو سکتا اور کیا وہ کوئی شاعرانہ دعا ہے جو کبھی "شرمندہ معنی" نہیں ہوا؟

یقیناً" مذہب ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے' نہ وہ کوئی معمہ ہے نہ دقیق علمی مسئلہ نہ وہ کوئی خیالی چیز ہے نہ فطرت کا عمیق راز' نہ وہ شاعری ہے نہ محض لفاظی' پھر کیا ہے؟

اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے صرف خدا کی پرستش و نیایش کا تو آپ کو اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہو گا کیونکہ اس سے نہ خدا کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ انسان کو اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے بے چون و چرا ان صحائف پر ایمان لے آنے کا جنھیں ملہمات ربانی سے تعبیر کیا جاتا ہے تو آپ کو اس کے ماننے میں پس و پیش ہو گا' کیونکہ بغیر سمجھے ہوئے کسی بات کی تصدیق کرنا عقل انسانی کے منافی ہے' اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ مذہب نام ہے چند متعین حرکات و مراسم کا" بعض مخصوص الفاظ کے زبان سے ادا کر دینے کا تو آپ کو اس کی صحت سے اور بھی انکار ہو گا کیونکہ ان باتوں سے تاثرات دماغی کو کیا واسطہ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے احساس انسانیت کا تو غالباً" اصولی نقطہ نظر سے نہ زاہد متقشف کو انکار ہو گا اور نہ عقلیت پرست انسان کو پھر آپ کا وقت تو ضائع ہو گا لیکن آیئے چند لمحات اس کے سمجھنے میں بھی صرف کر دیں کہ "احساس انسانیت" کیا چیز ہے۔

میں انسان پیدا ہوا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ واقعی انسان ہوں لیکن اگر میں چھری لے کر اپنی کسی عضو کو مجروح کر ڈالوں یا کسی بلند دیوار پر چڑھ کر نیچے کود پڑوں تو کیا آپ اس وقت بھی مجھے انسان کہیں گے؟ غالباً" نہیں۔

زید نہایت زیرک انسان ہے' لیکن دو اور دو کے مجموعے کو وہ ہمیشہ تین سمجھتا ہے تو کیا آپ اس کی صحت و دماغ کا یقین کریں گے؟ غالباً" نہیں'

حامد بڑا صاحب عقل و فراست انسان ہے لیکن کسی دوسرے شخص کو ذبح کر ڈالنے یا لوٹ لینے میں مطلق تامل نہیں کرتا تو کیا آپ اس کی فراست و دانائی کو تسلیم کر لیں گے؟ غالباً نہیں'

اس لیے معلوم ہوا کہ انسان اس مخصوص ہیئت والی مخلوق کو نہیں کہتے جو خاص وضع کے جوارح و اعضاء رکھتی ہے بلکہ انسان نام ہے اس خاص کیفیت عقل و شعور کا۔

(1) جو خود اس کی ذاتی اہمیت کو متعین کرتی ہے۔

(2) جو عقل کا صحیح استعمال سکھاتی ہے۔

(3) جو افراد انسانی کا احترام کرنا بتاتی ہے۔

اور اس لیے اگر ان میں سے کسی ایک حس کا فقدان کسی شخص میں پایا جائے گا تو ہم کہیں گے کہ وہ دائرہ انسانیت سے خارج ہے۔

پھر آیئے غور کریں کہ مذہب والحاد کے موجودہ دور کش مکش میں انسان کہاں پایا جاتا ہے اور کس کا ساتھ دینے میں انسانی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخ مذہب کا تعلق جس حد تک بانیان مذہب سے ہے ہمیں اس میں حرف گیری کا کوئی موقع نہیں ملتا اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں یہ احساس سگانہ پوری قوت کے ساتھ پایا جاتا تھا کیونکہ جس حد تک ذاتی اہمیت کا تعلق ہے وہ اپنے آپ کو فرستادہ خدا اور مامور من اللہ کہہ کر انتہائی نقطہ تک کھینچ لائے اور جس حد تک استعمال عقل و فراست کا واسطہ ہے اس کا بین ثبوت وہ ان جماعتوں کی صورت میں چھوڑ گئے جنھوں نے ان کو رسول و نبی مان کر ان کے کہنے پر عمل کیا اور جن کی عقلوں کو اپنے زمانہ کے مقتضاء کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ رہ گیا نوع انسانی کا احترام' سو اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ انھوں نے مقلاً نہیں بلکہ عملاً ہمیشہ اسی کا درس دیا۔

لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر بانی مذہب کے اٹھ جانے کے بعد اس کی تعلیم کا اثر ضعیف ہونے لگا اور یہ ضعف رفتہ رفتہ اس حد تک بڑھ گیا کہ مذہب کا صحیح مفہوم ہی لوگوں کے دلوں سے محو ہو گیا اور وہ چیز جس کا تعلق صرف فعل و عمل سے تھا' محض لفظی و مقامی لوہا ہو کر رہ گئی۔

مثلاً عہد سعادت کو لیجیے جب رسول اللہ زندہ تھے اور ان کی تعلیم زندہ تھی کہ اس وقت اپنے آپ کو "نحن مسلمون" کہنے والے کس نوع کے انسان تھے اور آج کس انداز

کے ہیں اس وقت مسلم نام تھا ایک ایسے انسان کا جس کی ذاتی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ جب مستعد ہو کر اس نے اپنی آستین الٹ دی تو یہ سمجھیے گویا زمانہ کا ورق الٹ دیا اور جب وہ دوسروں کی ہمدردی پر آمادہ ہوا تو اپنی جان قربان کرنے میں اس نے پس و پیش نہ کیا۔ رہ گئی عقلی آزادی سو اس کا ثبوت لا اکراہ فی الدین سے زیادہ اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے۔

برخلاف اس کے کہ آجکل ان اکابر اسلام کو دیکھیے جو اپنے بڑے بڑے عماموں اور لانبی لانبی عباؤں کے ساتھ تقدس اسلامی کا قد آدم اشتہار بنے پھرتے ہیں۔ ان علمائے کرام اور صوفیائے عظام کو دیکھیے جو اپنی طویل الذیل داڑھیوں اور ڈھیلے ڈھالے خرقوں کے ساتھ ہیئت اسلامی کا دیوپیکر مجسمہ نظر آتے ہیں کہ اگر کسی ایسی بستی میں جو انسانی عصیاں کاری سے تباہ و برباد ہو چکی ہے عدوان و معصیت کا کوئی صحیح مجسمہ نصب کیا جانا مقصود ہو تو ان سے بہتر "ماڈل" مل ہی نہیں سکتا ان کے جسم کے ایک ایک ریشہ کی پرورش ان کے خون کے ہر ہر قطرہ کی روانی ایک مستقل یادگار ہے' اس بدباطنی و کور نفسی کی ایک طویل داستان ہے اس مکرو فریب اور زور و ریا کی جس کو اسلام نے بدترین لعنت قرار دے کر دنیا سے ہٹانا چاہا اور اس جماعت نے بہترین ذریعہ فلاح و کامیابی سمجھ کر اختیار کیا۔

اس کے سر نمازوں میں اس لیے نہیں جھکتے کہ مقصود خدا پرستش ہے بلکہ صرف اس لیے کہ دوسروں کے سر ان کے سامنے جھکیں۔ وہ روزے اس لیے نہیں رکھتے کہ ابنائے جنس کی عسرت و تنگدستی کا اندازہ کر کے ان کے ساتھ ہمدردی کریں بلکہ صرف اس لیے کہ بہتر سے بہتر غذائیں ان کے سامنے پیش کی جائیں وہ اپنے مواعظ میں بخشش و عطا کی فضیلت اس لیے بیان نہیں کرتے کہ اس کی اہمیت کا خود انھیں بھی اعتراف ہے بلکہ محض اس لیے کہ دوسرے اپنی دولت ان قدموں پر ڈال دیں۔

ان خدا سے ڈرنے والوں کی اندرونی زندگی کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو کہ وہ اپنی شبستان عیش میں کیسی شادکام اور عذاب الٰہی کی طرف سے کیسی مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں۔ دنیا کی کوئی معصیت ایسی نہیں جو دوسروں کے لیے حرام اور ان کے لیے حلال نہ ہو اور فرائض اخلاق میں سے کوئی امر ایسا نہیں جو دوسروں کے لیے واجب اور ان کے لیے غیر ضروری نہ ہو' ان کا خدا قہار و جبار ہے لیکن دوسروں کے لیے ان کے لیے نہیں۔ ان کا خدا رحیم و کریم ہے مگر صرف ان کے لیے دوسروں کے لیے نہیں' ان کی فردوس بھی علیحدہ ہے اور ان کا حوض و کوثر بھی دوسرا' ان کی حوریں بھی مخصوص ہیں اور ان کے غلمان بھی منتخب۔

الغرض یہ جماعت جو جسم کے لحاظ سے "شکم پروری" اور نفس کے لحاظ سے "فرعون و نمرود" ہے ایک مستقل عذاب ہے جو انسانیت . اخلاق پر نازل ہوا ہے' اور جو اصل سبب ہے موجودہ ارتداد و الحاد کا کیونکہ ان کی زندگی' ان کی تعلیم' ان کا عجب و غرور نسل حاضر کے لیے جو یقیناً" زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ اہل تنقید ہے ایک ایسا حجاب ہے قبول مذہب کے لیے جس کا دور ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان بتوں کو مسمار نہ کر دیا جائے۔ پھر یہ خصوصیت صرف علمبردار مذہب اسلامی ہی میں نہیں پائی جاتی اور نہ میرا مخاطب صرف انھیں سے مخصوص ہے بلکہ اس وقت تمام مذاہب عالم کے عالموں' پجاریوں' راہبوں' اور موبدوں کا یہی حال ہے اور اس لیے اگر ہم ان کی تعلیمات اور ان کے حالات زندگی کو سامنے رکھ کر مذہب کی حقیقت سمجھنا چاہیں تو ہم اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ "نجات انسانی" کبھی مذہب سے متعلق نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جس حد تک اعتماد نفس و احترام انسانیت کا تعلق ہے وہ یکسر نفس پرست خود غرض واقع ہوئے ہیں اور ان کی ذہنی غلامی کا یہ عالم ہے کہ مذہب کے باب میں عقل سے کام لینا وہ کسی طرح گوارا کر ہی نہیں سکتے۔ یہاں تک کہ اب مذہب نام صرف اس چیز کا رہ گیا ہے جسے عقل انسانی قبول نہ کر سکے۔

اب مذہب کے مقابلہ میں الحاد و ارتداد کو دیکھیے جو اس وقت سے نہایت قوت کے ساتھ دنیا میں پھیل رہا ہے سو اس میں کلام نہیں کہ انسان کی ذاتی اہمیت اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا ہے' اور اس کی تمام کارگاہ یکسر عقل و علم پر قائم ہے لیکن مجھے یہ ماننے میں تامل ہے کہ وہ اجتماعی طور پر نوع انسانی کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور جب تک کوئی ادارہ حقیقتاً" "حساس انسانیت" کو بیدار نہ کر سکے ہم اسے امن و سکون کا ضامن نہیں کہہ سکتے۔

ہو سکتا ہے کہ ایک ملحد و منکر دنیا میں غیر معمولی دولت کا مالک ہو جائے' ممکن ہے کہ مذہب سے آزاد ہونے کے بعد انسان کی عقلی و ذہنی آزادیاں علوم و فنون میں بیش بہا ایجاد و اختراع کا سبب بن سکیں' لیکن کفر و الحاد میں کوئی ادنیٰ سی علامت بھی اس امر کی نہیں پائی جاتی کہ وہ تمام بنی نوع انسان سے محبت کرنا سکھا سکے' اور ساری دنیا کے افراد کو کسی وقت ایک رشتہ سے وابستہ کر دینا اس کے امکان میں ہو' یورپ کی موجودہ علمی ترقیاں اور اسی کے ساتھ اس کا استعماری جذبہ اس کی تجارتی حرص اور انسانیت سوز جنگی تیاریاں کافی ثبوت اس امر کا ہیں کہ دنیا کو جس چیز کی ضرورت ہے اور عالم انسانی جس مقصود کے لیے تڑپ رہا ہے

وہ نہ اس وقت کے بتائے ہوئے مذہب سے حاصل سے ہو سکتا ہے اور نہ الحاد و لامذہبیت سے بلکہ۔

"مرواہیں رہ رانشانے دیگرست"

پھر وہ نشان کیا ہو سکتا ہے؟ وہ کون سا راستہ ہے جو منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے؟ افسوس ہے کہ اس کا جواب دنیا کی اس قوم کے لیے بہت مشکل ہے جو محکومانہ و غلامانہ زندگی بسر کر رہی ہے کیونکہ عقل و روح کی آزادی حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے خیال کی آزادی ضروری ہے اور جب تک ہم اس منزل سے نہ گزر جائیں آئندہ منزل کی جستجو بے کار ہے۔

○ ○ ○

اکابر اسلام کے بعض خرافیات

جب کوئی مذہب اپنے ابتدائی دور سے گزر جاتا ہے اور قوت عمل ضعیف ہو کر صرف قوت خیال پر معتقدات کی بنیاد قائم ہوتی ہے تو بعض نہایت عجیب و غریب صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ایک محقق کے لیے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اصل ہیئت کسی مذہب کی کیا تھی اور بعد کو اس میں کیا کیا اضافے کیے گئے اور کس طرح اس کو مسخ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیاسات و توہمات اصل مذہب قرار دے دیئے جاتے ہیں اور صرف اعجوبہ پرستی ہی سے اس کا وقار قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے چنانچہ مذہب اسلام پر بھی ایک ایسا ہی زمانہ گزر چکا ہے' جب چاروں طرف کا خار و خس لا لا کر اس چشمہ میں ڈالا گیا' یہاں تک کہ شفاف پانی کی سطح نظروں سے چھپ گئی اور لوگوں نے اس کی گندگی کو اصل مذہب قرار دے لیا۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

قاف :- ایک پہاڑ ہے جو تمام روئے زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہے میں نے احاطہ کا لفظ صحیح استعمال نہیں کیا کیونکہ قدیم عبرانیوں اور یونانیوں کی طرح اہل عرب بھی زمین کو چپٹا باور کرتے تھے۔ مدعا یہ کہ کوہ قاف زمین کے ایک سرے سے دوسرے تک چاروں طرف چلا گیا ہے لیکن اس کے درمیان ایک ایسا زبردست حلقہ تاریکی کا ہے جس کو انسان عبور نہیں کر سکتا اور اگر عبور کرے بھی تو کم ازکم چار مہینے درکار ہوں۔

ملاحظہ ہو طبری جس نے اس کے ثبوت میں رسول اللہ کی حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے۔

بعض روایات کی رد سے یہ حلقہ تاریکی محض کا نہیں ہے بلکہ نہایت ہی متعفن و تاریک پانی کا ہے جس کے ساحل ناپید ہیں اس کا نام بحر المحیط اوقیانوس ہے۔ ملاحظہ ہو ابوا خدا' القزوینی' ابن الوردی۔

کوہ قاف تمام زمین کو مع اس کے سمندروں کے اس طرح احاطہ کیے ہوئے ہے جیسے انگوٹھی انگلی کا احاطہ کر لیتی ہے۔ قزوینی اور ابن الوردی کا بیان ہے کہ کوہ قاف زمرد سبز کا ہے اور آسمان کا نیلگوں نظر آنا اسی کے عکس کی وجہ سے ہے۔

بعض کی تحقیق یہ ہے کہ وہ چٹان۔ جس پر یہ پہاڑ قائم ہے۔ زمرد کی ہے۔ اس چٹان کو وتد کہتے ہیں۔ کیونکہ خدا نے اسی کے ذریعہ سے زمین کو تھام رکھا ہے۔ (سورہ نباء آیت 7 و 8 الم نجعل الارض مھاداً و الجبال اوتاداً (کیا ہم نے زمین کو برابر سطح اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا)

طبری کا بیان ہے کہ اگر کوہ قاف زمین کو تھامے نہ ہو تو زمین ہر وقت لرزش میں رہتی اور کوئی شخص اس پر سکونت نہ کر سکتا۔ قزوینی کا بیان ہے کہ زمین ہر وقت الٹی ڈولتی رہتی تھی اس لیے خدا نے ایک فرشتہ پیدا کیا۔ قدیم یونانیوں کے یہاں بھی اس قسم کی روایت پائی جاتی ہے کہ ایلس دیوتا زمین اپنے شانہ پر لئے ہوا ہے۔ جس نے اسے اپنا شانا پر رکھ کر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ یہ فرشتہ ایک مربع قطعہ یا قوت زعفرانی پر کھڑا ہے جسے ایک بڑا بیل سینگوں پر سنبھالے ہوئے ہے یہ بیل ایک مچھلی کی پشت پر قائم ہے جو پانی پر تیرتی رہتی ہے۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ قاف دنیا کے تمام پہاڑوں کے بیخ و بن ہے اور سب پہاڑ اندر ہی اندر آکر اس سے مل گئے ہیں اور جب خدا کسی قطعہ زمین کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اندرونی سلسلہ کو جنبش میں لے آتا ہے جس سے زلزلہ پیدا ہو کر لوگ مر جاتے ہیں۔ بعض نے زلزلہ کی حقیقت بیان کی ہے کہ بیل جو زمین کو سنبھالے ہوئے ہے کبھی کبھی کانپ اٹھتا ہے اور اس کی کپکپی سے زمین بھی تھرا اٹھتی ہے۔

کوہ قاف زمین کی انتہائی حد ہے اور کسی کو معلوم نہیں ہے کہ اس کے بعد کیا ہے لیکن ابن الوردی کا بیان ہے کہ ماوراء قاف دوسرا عالم یہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی زمین چاندی کی ہے۔ اور فرشتے یہاں قیام رکھتے ہیں' ایک حدیث نبوی کی بنا پر یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ماوراء قاف اور بہت سی زمینیں ہیں ایک زمین سونے کی ستر زمینیں چاندی کی ہیں سات مشک کی ہیں اور ہر زمین دس ہزار دن کی مسافت کی ہے جہاں فرشتے ہی فرشتے رہتے ہیں۔

آپ نے کرہ ارض کی حقیقت کوہ قاف کی اصلیت اور زلزلہ کی ماہیت سن لی جسے ہمارے یہاں کے مورخین و محققین بیان کرتے ہیں اور جس کے ثبوت میں قرآن کی آیات و احادیث نبوی پیش کی جاتی ہیں' اچھا اب غور کیجیے کہ اس سے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔

ہر وہ شخص جو مسلمان ہو یا مسلمان رہنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ان باتوں پر

ایمان لائے کیونکہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اکابر اسلام کی تحقیق ہے اور تحقیق بھی وہ جس کی بنیاد قرآن و احادیث پر قائم ہے۔

ان باتوں سے انکار کرنا گویا قرآن و حدیث سے انکار کرنا ہے اور قرآن و حدیث کا منکر کافر ہے۔

(2) اگر آج کوئی شخص کہے کہ یہ تمام روائتیں بالکل لغو و مہمل ہیں نہ قرآن سے ان کا ثبوت مل سکتا ہے نہ احادیث سے تو فوراً یہ جواب دیا جاتا ہے کہ کیا ہمارے یہاں کے اکابر جو سب سے بہتر نقاد قرآن و حدیث کے تھے' تمہارے برابر بھی عقل نہ رکھتے تھے اور کیا انھوں نے بغیر غور و تحقیق کے یوں ہی اس قسم کی احادیث کو صحیح باور کر لیا تھا۔

(3) ایک شخص کے سامنے جب اسلام پیش کیا جاتا ہے تو معہ ان تمام روایات کے پیش کیا جاتا ہے جو اس میں پائی جاتی ہیں اور یہ کہہ کر کہ اب مزید تحقیق و کاوش کی ضرورت نہیں کیونکہ اسلام اور اسلامی لٹریچر کے سمجھنے والے اب موجود نہیں ہیں اور ہم کو آنکھ بند کر کے ان کی تحقیق پر عمل کرنا چاہیے۔

(4) مسلمانوں کا دعوی ہے کہ ان کی مذہبی روایات میں دیگر مذاہب کے خرافیات (میتھالوجی) نہیں پائے جاتے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا علم الاصنام کسی اور چیز کا نام ہے کیا خرافیات ان روایتوں سے علیحدہ کوئی اور چیز ہو سکتی ہے اور کیا مسلمانوں میں جو اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں وہ واقعی دوسرے مذاہب کی خرافیات سے استفادہ نہیں کی گئی ہیں۔

آیئے ایک اسی کوہ قاف کی روایات پر غور کیجیے ان کا اصل ماخذ کیا ہے۔ قدیم ایران کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوہ البرز جسے قدیم پہلوی زبان میں ہر ابر زائتی (یعنی اونچا پہاڑ) کہتے تھے بالکل اسی قسم کی روایات اس سے متعلق تھیں۔ اور قدیم یونانیوں کے کوہ اولمپس کی طرح اسے بھی خداؤں یا دیوتاؤں کا مسکن بتایا جاتا تھا۔

اس پہاڑ کے متعلق اوستا لٹریچر میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ زمین کے تمام پہاڑوں کی بنیاد ہے جو زمین کے اندر ہی اس سے نکل کر پھیل گئے ہیں۔ اسی پہاڑ میں ایک جھیل دروکشا بھی پائی جاتی ہے اس پہاڑ کا دوسرا نام قاف بھی ہے صاحب معجم البلدان نے بھی لکھا ہے کہ قاف کو پہلے البرز کہتے تھے' ہندوؤں کے پران میں بھی ایک ایسے پہاڑ کا ذکر موجود ہے جس کا نام لوکا لوک ہے ان کا خیال تھا کہ یہ پہاڑ اس دنیا کو اس سے

علیحدہ کرتا ہے اور اس کے دوسری طرف سوا تاریکی کے کچھ نہیں ہے چینی مذہب والوں کی روایات میں بھی ایک پہاڑ ملو سونر ایسا پایا جاتا ہے جو انسانی آبادی کی آخری حد سمجھا جاتا ہے۔

مندانی قوم میں بھی ایک روایت پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کو چپٹا سمجھتے تھے اور تین طرف پانی سے گھرا ہوا باور کرتے تھے' شمال کی طرف وہ ایک ایسے پہاڑ کا وجود مانتے تھے جو زمرد کا بنا ہوا تھا اور جس کے انعکاس سے آسمان نیلگوں نظر آتا تھا۔

الغرض تمام مشرقی قوموں میں شمال کی طرف ایک پہاڑ کا پایا جانا باور کیا جاتا تھا اور غالباً یہ خیال اہل بابل سے لیا گیا تھا۔ قدیم عبرانیوں میں بھی قریب قریب اسی قسم کی روایتیں رائج تھیں جیسا کہ توریت کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

متذکرہ بالا بیان سے ظاہر ہو گیا کہ کوہ قاف وہی ہے جسے ایرانی البرز کہتے تھے اور جو روایات اس کے متعلق ان کے یہاں پائی جاتی تھیں وہ مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیں اور متعدد حدیثیں رسول اللہ سے ایسی منسوب کر دیں جن سے ان روایتوں کی تصدیق ہوتی ہے لیکن طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اور مذاہب کی تو تمام روایات خرافیات میں شامل کی جائیں گی۔ لیکن اپنی روایات کو بالکل صحیح بتایا جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ نے ایسا بیان کیا ہے پھر اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو بہ حیثیت مسلمان ہونے کے کوہ قاف کو انھیں خصوصیات کے ساتھ تسلیم کیا جائے جو احادیث میں پائی جاتی ہیں یا ان سے انکار کر کے کافر و مرتد بننا گوارا کیا جائے۔

اب رہا یہ امر کہ لفظ ق جو قرآن پاک میں آیا ہے اور جس کو سمجھانے کے لیے یہ تمام روایتیں گھڑی گئیں ہیں کیا مفہوم رکھتا ہے' غالباً ہمارے موضوع سے علیحدہ ہے اور اس کے سمجھنے کے لیے یہ لازم نہیں کہ ایک شخص ان تمام روایتوں پر ایمان لائے۔

عزرائیل

اب ہم عزرائیل یا ملک الموت کی حقیقت پر اکابر اسلام کی تحقیق پیش کرتے ہیں جو کوہ قاف کی تحقیق سے کم حیرت انگیز نہیں۔

(1) عزرائیل اتنا چوڑا چکلا اور اتنا زبردست فرشتہ ہے اگر دنیا کے تمام سمندروں اور

دریاؤں کا پانی اس کے سر پر ڈالا جائے تو ایک قطرہ بھی زمین تک نہ پہنچے اس کا نورانی تخت چوتھے یا ساتویں آسمان پر ہے جہاں اس کا ایک پاؤں لگا ہوا ہے اور دوسرا پاؤں اس پل پر ہے جو دوزخ اور بہشت کے درمیان بنایا گیا ہے۔ اس کے ستر ہزار پاؤں ہیں۔

(2) اول اول عزرائیل بھی دوسرے فرشتوں کی طرح تھا۔ لیکن جب اللہ نے انسان کو پیدا کرنا چاہا تو اس نے جبرئیل کو حکم دیا کہ جاؤ اور زمین سے ایک مٹھی عناصر یا ان اجزاء کی لے آؤ جن سے انسان کی تعمیر ہو سکے لیکن جب جبرئیل زمین پر پہنچے تو ابلیس مانع آیا اور جبرئیل ناکام واپس آئے اس کے بعد میکائیل اور اسرافیل بھیجے گئے لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوئے۔ آخر میں عزرائیل کو بھیجا گیا اور یہ کامیاب واپس آیا اور اللہ نے اس کو فرشتہ موت بنا دیا کیونکہ اس میں رحم کی کمی تھی۔

(3) جب اللہ نے موت کو پیدا کیا تو تمام فرشتوں کو طلب کیا اور کہا کہ اس کی طرف دیکھو لیکن جب انھوں نے اس کی غیر معمولی قوت کو دیکھا تو حیران رہ گئے اور بے ہوش ہو کر زمین پر ہزاروں سال تک گرے پڑے رہے اس کے بعد جب انھیں ہوش آیا تو ایک زبان ہو کر بولے کہ بے شک موت بڑی زبردست تخلیق ہے خدا نے یہ سن کر فرمایا کہ "میں نے عزرائیل کو اس پر قابو دے دیا ہے"۔

() عزرائیل کے پاس تمام انسانوں کی فہرست موجود رہتی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں رہتا کہ کب کس کی موت آئے گی۔ وہ لوگ جو نجات پانے والے ہیں ان کے نام کے گرد ایک نورانی حلقہ ہوتا ہے اور جو دوزخی ہیں ان کے نام کے گرد سیاہ حلقہ ہوتا ہے۔

(5) جب موت کا دن آتا ہے تو اللہ اس درخت سے جو عرش کے نیچے ہے ایک پتہ توڑ کر گرا دیتا ہے جس پر مرنے والے کا نام منقوش ہوتا ہے اور یہ پتہ عزرائیل کی آغوش میں آکر گرتا ہے، یہ نام پڑھ لیتا ہے اور 40 دن کے بعد روح نکال لیتا ہے۔

(6) مرنے والوں میں بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو عزرائیل کا مقابلہ کرتے ہیں اور خدا سے شکایت کرتے ہیں کہ عزرائیل نہایت سختی سے جان نکالتا ہے عزرائیل اس مقابلہ کو دیکھ کر خدا کے پاس جاتا ہے اور سارا حال بیان کرتا ہے خدا یہ سن کر فردوس کا ایک سیب اس کو دیتا ہے جس پر بسم اللہ لکھی ہوتی ہے۔ عزرائیل یہ سیب لے جا کر اس جھگڑالو مرنے والے کو سنگھا دیتا ہے اور وہ فوراً جان دینے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ عمل صرف نیک بندوں کے لیے جائز رکھا جاتا ہے۔ کافروں کی جان چاہے کیسی

ہی سختی سے نکلنے پروا نہیں ہوتی۔

(7) بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب عزرائیل روح نکالنے کے لیے حلق کے اندر جانا چاہتا ہے تو بندہ کسی ذکر کے ذریعہ سے حلق کے اندر جانے کا راستہ بند کر دیتا ہے فرشتہ یہ دیکھ کر خدا کے پاس جاتا ہے اور تمام حال عرض کرتا ہے وہاں سے حکم ہوتا ہے کہ جاؤ اس کے ہاتھ دیکھو۔ اگر اس نے اپنی عمر میں صدقہ دیا ہے تو بھی جان نکالنا دشوار ہوتا ہے اور پھر عزرائیل اس کے ہاتھ پر اللہ کا نام لکھ دیتا ہے اور وہ لقاء ربانی کے شوق میں حلق کا راستہ کھول دیتا ہے۔ اور فرشتہ اندر گھس کر روح نکالنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

(8) جب کسی مسلمان یا مومن کی روح نکالی جاتی ہے تو ملک الموت نہایت نرمی و آہستگی سے کام لیتا ہے اور روح نکال کر اپنے نائب فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے جو اسے حلہ بہشتی میں لپیٹ کر آسمان کی طرف لے جاتے ہیں اور ساتویں آسمانوں کو عبور کر کے جب عرش خداوندی تک پہنچتے ہیں تو حکم ہوتا ہے کہ اس روح کو اس قبر میں لے جاؤ جہاں وہ مومن دفن کیا گیا ہے لیکن اگر کوئی غیر مسلم کافر مرنے والا ہوتا ہے تو اس کی روح نہایت سختی و بے رحمی سے نکالی جاتی ہے اور جب آسمانوں کے دروازے سے اس کے لیے نہیں کھلتے تو فرشتہ اسے وہیں زمین کی طرف پھینک دیتا ہے۔

(9) ادریس' الیاس' عیسیٰ اور خضر موت سے آشنا نہیں ہوئے اور اب تک زندہ ہیں' موسیٰ کے پاس جب ملک الموت آیا تو انھوں نے ایک تھپڑ مارا جس سے اس کی ایک آنکھ مجروح ہو گئی۔ جب فرشتہ یہ شکایت لے کر خدا کے پاس آیا تو خدا نے بہشت کا سیب اس کو دیا اور سونگھ کر وہ جان دینے پر راضی ہو گئے۔

(10) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی جان نکالنے والا فرشتہ اور ہوتا ہے اور دوسرے آدمیوں کی روح نکالنے والا کوئی اور۔ اسی طرح مومن و کافر کی جان نکالنے کے لیے علیحدہ علیحدہ فرشتے ہوتے ہیں۔

یہ ہے ہمارے اکابر اسلام کی تحقیق فرشتہ موت کے متعلق جو حسب ذیل کتابوں میں پائی جاتی ہے۔

مشکواۃ شریف (حدیث) بخاری شریف (حدیث) مروج الذہب (المسعودی) درالفاخرہ (الغزالی) عجائب الملکوت (الکسائی) تاریخ طبری' تاریخ ابن اثیر' تاریخ الخمیس (دیار بکری) قصص الانبیا (ثعلبی) کتاب الانس الجلیل (مجیرالدین حنبلی) کتاب البدء و تاریخ (طاہر

مقدس)۔

تماشہ یہ ہے کہ یہ تمام بیانات رسول اللہ سے منسوب کیے جاتے ہیں اور کسی کا خیال اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ یہ سب باتیں بعد کی گھڑی ہوئی ہیں اور رسول سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔

ملک الموت کے متعلق اس طرح کی حیرت انگیز روایات یہود میں رائج چلی آرہی تھیں، کہ اس کے چار ہزار بازو ہیں اس کے جسم میں زبان اور آنکھ کے سوا کچھ نہیں ہے یعنی جتنے آدمی ہیں اتنی ہی آنکھیں اور زبانیں اس کے جسم میں بھی ہیں اس کے چار چہرے ہیں وغیرہ وغیرہ اور بعد کو مسلمانوں نے انھیں روایات پر اعتماد کر کے اپنے یہاں لے لیا اور لوگوں کو یقین دلانے کے لیے رسول سے منسوب کر دیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس زمانہ میں بھی ان روایات پر یقین کیا جا سکتا ہے اور کیا ادنیٰ فہم و عقل کا انسان بھی کبھی باور کر سکتا ہے کہ روح نکالنے کے لیے یہ تمام لایعنی حرکتیں کی جاتی ہیں۔

پھر افسوس ہے ہمارے علماء کرام پر جو اب بھی مواعظ میں اس طرح کی روائتیں بیان کرتے ہیں اور صد ہزار افسوس ہے ان کی جسارت پر کہ ایسی باتوں کو رسول اللہ سے منسوب کر کے ان کی عظمت و عزت کو بھی خاک میں ملانا چاہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے جتنی تحقیقات علمی و تاریخی کی ہے اس کی نظیر مل نہیں سکتی۔ پھر اگر ان کی تحقیقات کا یہی عالم ہے اور ان کی علمی تفتیش وہی ہے جو کوہ قاف اور عزرائیل کے حالات بیان کرنے میں ان کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے تو خوشی کی بات ہے کہ اب دنیا میں ایسے احمق پیدا ہونا بند ہو گئے جو ایسی باتوں پر ایمان لائیں اور ایسے مذہب کا خدا حافظ ہے جو اس قسم کی روایات ماننے پر کسی کو مجبور کرے۔

○ ○ ○

ہمارا مستقبل

پیشین گوئیاں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ ایک وہ جو انبیاء و اولیاء کی زبان پر جاری ہوتی ہیں' اور دوسری وہ جو علم و تجربہ کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں قسم اول کی پیشین گوئی وحی و الہام ہو یا دور بینی (TELEPATHY) ہمیں اس سے بحث نہیں کیونکہ اول تو ایسی پیشین گوئیاں کرنے والے اب موجود نہیں اور اگر ہوں بھی تو اس دور تعقل میں کون ان کی سنتا ہے لیکن قسم دوم کی پیشین گوئی ہر صاحب عقل آسانی سے کر سکتا ہے اور اکثر بیشتر وہ صحیح بھی نکلتی ہے کیونکہ کاروبار عالم مقررہ اصول پر چل رہا ہے اور اسباب و علامات کو دیکھ کر نتائج پر حکم لگانا زیادہ دشوار نہیں۔

ابتداء آفرینش سے لے کر اس وقت تک انسان نے کہاں کہاں اور کس کس طرح زندگی بسر کی حیات اجتماعی کے لیے اس نے کیا کیا اصول مقرر کیے ارتقاء کی کیا کیا صورتیں ہم نے اختیار کیں اور اقوام عالم عروج و زوال کی منزلوں سے کیونکر گزرتی رہیں یہ اور اسی طرح کے بہت سے موضوع ہیں جن سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس وقت کوئی قوم عروج و ترقی سے گذر رہی تھی اس کو کبھی ایک لمحہ کے لئے یہ اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ اسے انحطاط و زوال کی منزل سے گزرنا پڑے گا اور آخر کار ایک دن فنا ہو جائے گی؟ کبھی نہیں۔

دنیا میں سب سے بڑی حکومت جس کی سطوت و جبروت نے تقریباً" تمام کرہ ارض کا احاطہ کر لیا تھا سلطنت رومہ تھی لیکن آج وہ کہاں ہے؟ چنگیز و ہلاکو کو جنھوں نے سارے عالم کو لرزہ براندام کر رکھا تھا' آج ان کی اولاد کہاں اور کس عالم میں ہے؟ بابل و سیریا کے محیرالعقول تمدن کی بنیاد ڈالنے والے فرمانرواؤں کے نشانات کیا ان کھنڈروں کے علاوہ کچھ اور ہیں جو اب صرف درندوں کو پناہ دے سکتے ہیں اسی طرح تم فراعنہ مصر اکاسرہ عجم اور دیگر جبابرہ عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ جب وہ دور ترقی سے گذر رہے تھے تو اپنے آپ کو غیرفانی سمجھتے تھے لیکن جبکہ وہ فنا ہو چکے ہیں یہ تسلیم کرنے میں بھی تامل ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی تھے بھی یا نہیں۔

زیادہ نہیں صرف چودہ سو سال قبل کی بات ہے کہ ایک صحرا نشین اسی ریگ زار عرب سے پیدا ہوتا ہے اور اپنے بعد ایک ایسے تمدن کی بنیاد چھوڑ جاتا ہے کہ اس کے جانشین مغرب و مشرق پر چھا جاتے ہیں لیکن آج اس قوم کا کیا حال اس کے تمدن و تہذیب کا کیا رنگ ہے اور وہ انحطاط کے کس دور سے گزر رہی ہے؟

این سخن راچہ جواب است تو ہم می دانی

لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کیا اس کا یہ دور ختم ہو گیا ہے اور کیا اس کے انجام کے متعلق حکم لگانا کوئی ایسی پیشین گوئی کرنا ہے جو صرف انبیاء کے لیے مخصوص تھی؟

اگر اقوام عالم کی ترقی اسباب کی محتاج ہے تو ان کے تنزل کو بھی اصولاً اسباب کا پابند ہونا چاہیے اور اس لیے تاریخ عالم کے مطالعہ کے بعد یہ معلوم کر لینا دشوار نہیں کہ ایک قوم کا مستقبل ہمیشہ اس کے حال میں پوشیدہ ہوا کرتا ہے اور مسلمانوں کا جو حال ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

اسلامی تہذیب دنیا کی تمام گزشتہ تہذیبوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی اور وہ حیثیت صرف یہ تھی کہ اس نے انسانی زندگی کے سامنے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا جو مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی ترقی کا بھی ضامن تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کی تمام مادی ترقیاں منحصر تھیں صرف اخلاق کی بلندی پر۔

موجودہ تہذیب میں مادی ترقی کی جو صورتیں نظر آرہی ہیں وہ یقیناً تمام ازمنہ گزشتہ سے زیادہ وسیع ہیں لیکن چونکہ اخلاق کا پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے اسی لیے وہ نوع انسانی کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اور زیادہ نقصان پہنچا رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ مادی ترقی جو خود ہی نوع انسان کی تباہی کی طرف منجر ہو کبھی صحیح معنی میں ترقی نہیں کہلائی جا سکتی۔

اسلام نے اس توازن کے قیام کے لیے سب سے پہلے جس تعلیم کو پیش کیا وہ یہ تھی کہ تمام انسان برابر ہیں اور دولت کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے جذبہ مساوات و اخوت کو متاثر نہ ہونا چاہیے پھر یہ تعلیم صرف زبانی نہ تھی یا کسی علمی نظریہ کے طور پر پیش نہیں کی گئی تھی بلکہ عملاً روز پانچ وقت شاہ و گدا کو پہلو بہ پہلو کھڑا کر کے اس کا درس دیا جاتا تھا۔

جب یہ تعلیم رائج ہو گئی تو ان کو بتایا گیا کہ انسان دنیا میں صرف کام کرنے کے لیے آیا ہے اور اس کو بے کار کبھی نہ بیٹھنا چاہیے اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ دنیا میں ترقی کی جتنی راہیں ہو سکتی ہیں ان سب کو اختیار کرنا چاہیے۔

پھر یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں جو قوم اس اصول پر کاربند ہو وہ کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتی اور اگر آج مسلمان پستی کے عالم میں ہیں تو اس کا سبب سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس نے اس تعلیم کی روح کو پس پشت ڈال دیا اور اگر یہی حالت رہی تو اس کا فنا ہو جانا بالکل یقینی ہے۔

تعلیم مساوات سے بے خبری و بے تعلقی کا یہ عالم ہے کہ نوع انسانی تو خیر بڑی چیز ہے وہ خود اپنی ہی قوم کا شیرازہ پراگندہ کر چکے ہیں اور محض فروعی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہیں عملی زندگی کی یہ کیفیت ہے کہ تقدیر پر بھروسہ کر کے ہاتھ پاؤں ڈال دینا ہی جزو مذہب قرار دیا جاتا ہے اور اس کا اصطلاحی نام صبر و توکل رکھا گیا ہے۔

رہ گیا دنیاوی ترقی میں زمانہ کا ساتھ دینا' سو اس کے متعلق کیا کہا جا سکتا جب کہ ایک زمانہ تک علوم جدیدہ کا حصول کفر کے مترادف سمجھا گیا اور اب بھی ہمارے یہاں کے مذہبی علماء اور قائدین امت ان سے بالکل نابلد ہیں اور نابلد رہنے ہی میں اپنی اخروی نجات سمجھتے ہیں۔

پھر غور کیجیے ایسا کیوں ہے؟ تاریخ کے صفحات اٹھا کر دیکھیے کہ مسلمانوں کے زوال کی تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے اور خود ہی فیصلہ کیجیے کہ کیا اس کی ابتداء علمائے مذہب سے نہیں ہوئی اور کیا ذہنی غلامی کی بنیاد ڈالنے والی کوئی اور جماعت تھی؟ بنو امیہ کی سلطنت کو تباہ کرنے والے بنو عباس کی حکومت کا تختہ الٹ دینے والے یہی لوگ تھے جو شاہان وقت کی ناجائز خواہشوں کی تکمیل کے لیے حدیثیں گھڑا کرتے تھے اور جنھوں نے صرف طمع نفس کی بنا پر رفتہ رفتہ اسلام کے لٹریچر کو اس قدر گندگی سے آلودہ کر دیا کہ آج اس کے صحیح خدو خال کا مطالعہ ازبس دشوار ہے۔

پھر ظاہر ہے کہ جب قرون اولی میں اس جماعت کا یہ رنگ تھا تو عہد حاضر میں اس کی بے بصری کا کیا عالم ہو گا اور جو قوم اپنا مستقبل ان کی تعلیم و ہدایت پر منحصر رکھے گی اس کی تباہی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

یقیناً" اس وقت تمام دنیا کے مسلمان ایک رشتہ سے وابستہ نہیں ہیں اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے لیکن اس کا علاج نہ پان اسلا مزم سے ممکن ہے اور نہ فلسطین میں کسی یونیورسٹی کے قیام سے بلکہ اس کا تعلق صرف احساس وطنیت سے ہے اور افسوس ہے ہندوستان کا

بد نصیب مسلمان اس احساس سے محروم ہے اور اب تک یہ سودا اس کے دماغ سے نہیں نکلا کہ وہ ہندوستان میں حکمراں ہو کر آیا تھا اور حکمران قوم کا فرد ہونے کی حیثیت سے اس کو ایسا تفوق حاصل ہے جس کے سامنے یہاں کے تمام باشندوں کو اس کے سامنے گردن جھکا دینا چاہیے۔

ہندوستان میں صدیوں تک قیام کرنے کے بعد یہ اجنبیت کیوں ہے؟ اس کا سر رشتہ بھی علمائے مذہبی کے ہاتھ میں ہے جنھوں نے سر زمین ہند کو دارالحرب و کفرستان اور یہاں کے رہنے والے کو ہمیشہ کافر کہہ کر اختلاف و دشمنی کی وسیع خلیج حائل کر دی در آں حالیکہ نہ ہندوستان کفرستان ہے اور نہ ہندو کافر و مشرک۔

ایک ہندو مندر میں جا کر بت کے سامنے جھک جاتا ہے تو کافر ہے لیکن ایک مسلمان مسجد میں جا کر محراب کے سامنے سر بہ سجود ہو جاتا ہے تو کافر نہیں ایک ہندو پتھر کی مورتی کو بوسہ دیتا ہے تو مشرک ہے لیکن ایک مسلمان طواف کعبہ کے وقت سنگ اسود کو چومتا ہے تو مشرک نہیں۔ کیوں؟

اگر مسلمان کے یہ مذہبی مراسم خالصتاً اللہ ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو کا مقصود اس سے علیحدہ ہو۔ اگر ایک مسلمان سنگ اسود کو صرف س لیے چومتاہے کہ وہ ایک بڑے شخص کی یاد گار ہے تو آپ کیوں یقین کریں کہ بتوں کی پرستش کسی اور جذبہ کے تحت کی جاتی ہے میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کون سا ہندو ہے جو بتوں کو خدا سمجھ کر ان کی پوجا کرتا ہے اور اگر بعض جاہل افراد ان میں ایسے ہیں تو پھر ان مسلمانوں کو کیا کہا جائے گا جو قبروں کی خاک چاٹ چاٹ کر تعزیوں اور مقبروں کی جالیوں میں منت کی دھجیاں باندھ باندھ کر ہندوں سے زیادہ کفر شرک میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

بہر حال مدعا یہ ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی آبادیوں میں تفریق و اختلاف کا سبب صرف مذہب کی وہ غلط تعبیر ہے جو ہندوستان میں دونوں کے علمائے مذہب کی طرف سے پیش کی گئی اور اب بھی پیش کی جاری ہے۔

اس لیے اگر ہندوستان کی ترقی و آزادی کے لیے ہندو مسلمان کا اتحاد ضروری ہے تو سب سے پہلے دونوں جماعتوں کو مذہبی تعصب ترک کر کے اپنا شعار صرف انسانیت کی پرستش قرار دینا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب پنڈتوں کی گرفت سے ہندو اور علماء کے چنگل سے مسلمان آزاد ہو جائیں۔

عیش یا مسرت

فرمانروائے خلد آباد کا خزانہ لعل و گہر سے مالا مال ہے اس کی حکومت لاکھوں مربع میل تک پھیلی ہوئی ہے لطف و تفریح کے جتنے اسباب دولت سے فراہم ہو سکتے ہیں وہ سب مہیا ہیں۔ اسی کے ساتھ دولت حسن بھی موجود ہے دولت شباب کی بھی کمی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ مسرور اور کون ہو سکتا ہے لیکن دفعتہ" قصر کے اندر ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے' طبیبوں کے چہرے سے سخت فکر کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔ کیونکہ بادشاہ جو ایک زمانہ سے بیمار ہے دفعتا" نہایت شدید قسم کے درد قلب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی بادشاہ تڑپ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ کوئی میری سلطنت لے لے میری تمام دولت پر قبضہ کر لے لیکن اس عذاب سے لمحہ بھر کے لیے کسی طرح نجات دلا دے ایک غریب لکڑہارا باہر قصر کے پاس سے گزرتا ہوا دل ہی دل میں کہتا ہے کہ "دولت بھی کیا چیز ہے" کاش مجھے بھی حاصل ہوتی اور میں بھی ایسی ہی مسرور زندگی بسر کرتا جیسی بادشاہ بسر کر رہا ہے۔

ملکہ نسرین جو دولت کے لحاظ سے پھولوں کی رانی مشہور ہے اپنے پاس کیا کچھ نہیں رکھتی وہ ہمیشہ مخمل و حریر کی نرمی میں سوئی اور لعل و الماس کی روشنی میں بیدار ہوئی۔ اس نے ہمیشہ پھولوں کی چادروں پر قدم رکھا اور نغمہ و رنگ کی فضا میں آنکھ کھولی حسن و جمال کا عالم یہ کہ۔

جو در پہ آگیا اسے دیوار کر دیا۔
شباب کا یہ رنگ کہ جس نے ایکبار دیکھا جی سے بیزار ہو گیا۔

سنگ مرمر کے حوضوں میں بلوریں فوارے چاروں طرف موتی بکھیر رہے ہیں' باغ کے کنجوں میں ہر جگہ تلاطم نکہت برپا ہے پھولوں کی کثرت نے قصر کے گوشہ گوشہ کو سیلاب رنگ سے لبریز کر رکھا ہے بربط در باب کے تاروں سے راگنیاں بلند ہو ہو کر فضا میں مستی کی کیفیت پیدا کر رہی ہیں مگر ملکہ نسرین ایک کمہلائے ہوئے پھولوں کی سی افسردگی لیے ہوئے سیج پر پڑی ہوئی ہے اور ریشمی تکیے۔ اس کے نہ تھم سکنے والے آنسوؤں سے تر بتر ہو

رہے ہیں کنیزیں التجائیں کر رہی ہیں سمجھا رہی ہیں لیکن اس کی ہچکیاں بند نہیں ہوتیں کیوں؟

صرف اس لیے کہ شاہزادہ نیلو فر جس کے عشق میں وہ برسوں سے مبتلا تھی کسی اور سے محبت کرنے لگا ہے ٹھیک اسی وقت ایک غریب کسان کی بیوی ٹھنڈی سانس بھر کر قصر کے سامنے سے یہ کہتی ہوئی گذر جاتی ہے کہ "ملکہ" نسرین بھی کیسی خوش نصیب عورت ہے کاش میں بھی ایسی ہی مسرور زندگی بسر کرتی۔

حقیقتوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور پردوں کے نقش و نگار کو حقیقت باور کیا جاتا ہے۔ یہ ہے انسانی تمناؤں کی ذہانت اور یہ ہے ہماری آرزوؤں کی انتہائی فراست ایک غریب تمنا کرتا ہے کاش وہ دولت مند ہوتا ایک دولت مند اپنے بہت سے روحانی آزار دور کرنے کے لیے غریب ہونے کی آرزو کرتا ہے ایک فقیر بادشاہ کی جاہ و ثروت کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور ایک بادشاہ اس آزادی کے لیے تڑپ رہا ہے جو فقیر کو حاصل ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان عیش کا خواہش مند ہے یا مسرت کا کیونکہ سامان عیش سامان مسرت نہیں اسباب عیش نہیں پھر اکثر ایسے ہیں جو تعیش کو مسرت جان کر اسی کی تمنا کرتے ہیں اور کمتر ایسے ہیں جو صرف مسرت کے طلب گار ہیں اور عیش کے خواہش مند نہیں۔

عیش نام ہے جسم کی آسائش کا اور خواہش ظاہری کی لذت کا۔ مسرت نام ہے نفس کے اطمینان اور روح کی راحت کا پھر یہ تو ٹھیک ہے کہ اسباب عیش حاصل ہونے کے بعد انسان مسرت روح کے لیے تڑپتا رہے لیکن راحت روح سے آشنا ہونے کے بعد سامان عیش کی جستجو کرنا کیا معنی؟

اس وقت جبکہ دنیا میں مادہ روح سے برسرپیکار ہے عیش کی خواہش مسرت کے صحیح مفہوم کو دنیا سے محو کر دینا چاہتی ہے یعنی اس وقت جبکہ زرو دولت کی محبت نے دنیا کے اقتصادی و معاشی وسائل کو یکسر آئین درندگی بنا رکھا ہے کیا یہ سوچنے کی بات نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے اور جس عمیق غار کی طرف "انسانیت" کو دھکیلا جا رہا ہے اس سے بچنے کی کوئی تدبیر ہے یا نہیں؟

امریکہ بیتاب ہے ساری دنیا کی دولت اس کے قبضہ میں آجائے فرانس مضطرب ہے کہ جرمنی پر اس کا تسلط قائم ہو جائے جرمنی بے قرار ہے کہ فرانس کو فنا کر دے، اٹلی بے

چین ہے کہ رومہ کی قدیم سطوت استبداد کو پھر زندہ کر دے' جاپان کوشش کر رہا ہے کہ وہ ایشیا کو محکوم بنائے لیکن کیا کوئی ایسی قوم بھی ہے جس نے جغرافیائی و ملکی امتیاز کو مٹا کر صرف "انسانیت" کی خدمت کو اپنا مقصود قرار دیا ہو؟

یہ ہے مادی ترقی کا وہ پہلو جس پر آج فخر کیا جاتا ہے اور یہ ہے علم و حکمت کی کاوشوں کا وہ منظر جسے انسان کا منتہائے نظر قرار دیتے ہیں پھر آج تو نہیں کل وہ وقت آئے گا جب انسانیت کا خون آلودہ چہرہ لوگوں کی نگاہ سے اس حجاب کو دور کر دے گا اور بتائے گا کہ عیش کی راہیں مسرت کی راہوں سے بالکل مختلف ہیں اور وہ جسم جو عرصہ تک پھولوں پر لوٹتے رہتے ہیں ان کے لیے آخر کار پنکھڑیاں بھی خار ہو جایا کرتی ہیں۔

یقیناً" حصول مسرت' حصول عیش کا منافی نہیں بشرطیکہ تعیش انفرادی حیثیت نہ اختیار کرے لیکن انسان کی اس خود غرضی کو مٹانے والا کون ہو سکتا ہے؟ کیا وہ انسانی قانون جو صرف تیغ و تفنگ کی مدد سے ایک کو غالب اور دوسرے کو مغلوب قرار دیتا ہے؟ کیا مادی علوم و فنون کی ترقی جو سب سے زیادہ مہلک گیس تیار کر کے انسان پر عرصہ حیات تنگ کر دینا چاہتی ہے؟ کیا سرمایہ و دولت کا وہ نظام استعماری جو کمزور و ضعیف انسانوں کا صرف خون نچوڑ سکتا ہے؟ نہیں بلکہ صرف وہ بلند تعلیم جو تمام نوع انسان کو ایک رشتہ اخوت سے وابستہ کرنا چاہتی ہے وہ نظام اخلاق جو رنگ و نسل کے امتیاز کو مٹا کر جملہ افراد و انسانی کو ایک سطح پر لانا چاہتا ہے وہ اصول حیات جو اسپارٹا والوں کی طرح ضعیف و کمزور کو ہلاک کر دینے کا حامی نہیں ہے وہ طریق ہدایت جو ترقی کا مفہوم زر و دولت کا انبار نہیں بلکہ صرف دنیا کا امن و سکون قرار دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایسی بلند تعلیم صرف ایک ہے ایسا نظام اخلاق صرف ایک ہے یہ اصول حیات صرف ایک مسلک نے بتایا یہ طریق ہدایت صرف ایک مذہب نے پیش کیا۔ لیکن اب اس تعلیم و مذہب کی جستجو کہاں کی جائے۔ کتابوں میں؟ مگر عمل کو کتابوں سے کیا تعلق ان انسانوں میں جو اب موجود نہیں ہیں؟ مگر اس سے نتیجہ سے ان مدعیان بلند بانگ کی زندگی میں جو اس وقت موجود ہیں ہاں مگر اس لیے نہیں کہ ان سے کوئی درس حاصل کیا جائے بلکہ صرف اس لیے کہ اس تعلیم پر آنسو بہلیا جائے جس کے یہ علمبردار ہیں اور اس مذہب کے جنازے پر ماتم کیا جائے جس کو دفن کرنے کے لیے یہ نہایت تیزی سے اپنے شانوں پر اٹھائے لے جا رہے ہیں۔

خدا لامذہبیت کے زاویہ نگاہ سے

جتنے مذاہب اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں ان سب کے معتقدات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "خدا سے ڈرنا چاہیے" لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے آخر اس تعلیم کو مان کیوں لیا اس درس میں کون سی ایسی بات تھی جس نے اس قدر مضبوطی کے ساتھ اسے خدا کی طرف سے خائف بنا دیا۔

اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔ اول اول انسان نے جب اس دنیا میں قدم رکھا تو چاروں طرف دشمن ہی دشمن اس کا احاطہ کئے ہوئے تھے اور صحرا کے خونخوار درندوں سے ہر وقت مقابلہ رہتا تھا۔ پھر چونکہ فطرت کی طرف سے اس کو قوت جسمانی کے مقابلہ میں قوت دماغی بھی عطا ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اپنی تدابیر سے ان دشمنوں سے جنگ کرتا تھا اور اکثر و بیشتر کامیاب بھی ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان سے ڈرتا تو ضرور تھا لیکن ان کی پرستش پر مجبور نہ ہوا تھا کیونکہ پرستش نام ہے انقیاد کامل کا پورے اظہار عجز کے ساتھ سپر ڈال دینے کا اور درندوں کے مقابلہ میں اس حد تک اس کی توہین نہ ہوئی تھی۔ لیکن انسانوں کا ایک زبردست دشمن اور بھی موجود تھا جسے ہم "حوادث طبیعی" کہتے ہیں یعنی وہ دیکھتا تھا کہ دفعتہ" افق سے نہایت ہی گہرا سیاہ بادل اٹھتا ہے اور آن کی آن میں اس کے جھونپڑے کو بہا لے جاتا ہے، وہ شکار سے واپس آتا ہے اور اچانک اس کا بدن آگ کی طرح جلنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ مرجاتا ہے۔ وہ کھیتیاں کرتا ہے لیکن بارش نہ ہونے سے وہ سب کی سب خشک و تباہ ہو جاتی ہیں۔ جب وہ دیکھتا تھا کہ باوجود تمام اسباب ظاہری فراہم کرنے کے بعض اوقات نتیجہ خاطر خواہ حاصل نہیں ہوتا وہ حیران رہ جاتا تھا۔ کیونکہ اس "رجم من الغیب" کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا اور وہ ان تمام باتوں کو ان بڑی بڑی روحوں کا کرشمہ خیال کرتا تھا جو اس کے نزدیک آسمان میں رہتی تھیں، چنانچہ وہ ان کو خوش کرنے کے لئے قربانیاں کرتا تھا روتا تھا گڑگڑاتا تھا تاکہ اس کی امیدیں پامال نہ ہوں یہ تھی اولین بنیاد مذہب کی جو سب سے پہلے ارواح پرستی کی صورت میں نمودار ہوئی۔ پھر جب انسان پر کچھ زمانہ اور گزر گیا تو اس نے اپنے خیال کے مطابق ان ارواح کی صورتیں بھی قائم کیں اور بت بنا بنا کر پوجنا

شروع کیا۔ یہ تھا دوسرا دور مذہبیت کا لیکن اس کے بعد جب انسان میں زیادہ معقولیت پیدا ہوئی تو اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور خدا کو ایک "قوت مجردہ" قرار دے کر یزداں پرستی شروع کی جو یقیناً" مذہب کی نہایت اچھی ارتقائی صورت ہے لیکن جو تصور اس نے خدا کی عظمت و جلالت ہیبت و سطوت کا پہلے قائم کر لیا تھا وہ علی حالہ باقی رہا۔

الغرض خدا کی طرف سے جس چیز نے انسان کو مائل کیا وہ صرف حوادث طبیعی تھے' لیکن کیا یہ امر حیرت ناک نہیں کہ وہی چیز جس نے کسی وقت انسان سے خدا کے وجود کو تسلیم کرا لیا تھا آج اسی کی بنیاد پر خدا سے انکار کیا جا رہا ہے اور جس تاثر بے چارگی نے اس کو ایک قوت برتر و اعلیٰ کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا آج وہی اعتراف عجز و بے کسی اس قوت کے انکار پر مائل کر رہا ہے۔ پھر اگر انسان کا یہ میلان واقعی سرکشی ہے تو بہت بڑی سرکشی ہے اور اگر کسی حقیقت کا انکشاف ہے تو بڑی حقیقت کا انکشاف ہے۔

خدا کا وجود ثابت کرنے کے لیے یوں تو بڑے بڑے دلائل پیش کیے جاتے ہیں لیکن اس سے انکار کرنے والے اس کو نہ ماننے والے کیا کہتے ہیں۔ آیئے آج کی صحبت میں اس پر مختصر سی گفتگو کریں۔

منکرین خدا کے خیالات

(1) کہا جاتا ہے کہ خدا نے تمام چیزیں پیدا کیں اور وہی ان سب کا رکھوالا ہے (مدبر السموات والارض) اس لیے مخلوق کو اس کا شکر گزار و مطیع ہونا چاہئے اور اسی اظہار شکریہ و اطاعت کا دوسرا نام مذہبیت ہے جو تمام اقوام عالم میں رائج ہے۔

(2) ہزاروں لاکھوں سال تک یہ عقیدہ قائم رہا کہ خدا قربانیاں چاہتا ہے اور ان قربانیوں کے عوض وہ مینہ برساتا ہے کھیتیاں اگاتا ہے اگر قربانیاں نہ کی جائیں تو پھر وہ قحط وبا طوفان و زلزلہ بھیج کر اپنے غصہ کا اظہار کرتا ہے۔

(3) اس وقت تک تمام مذہبی اقوام کا عقیدہ راسخ یہی ہے کہ خدا التجاؤں کو دعاؤں کو سنتا ہے اور پورا کرتا ہے اسی کے ساتھ یہ بھی کہ وہ ایمان لانے والوں کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور ان کی روحوں کو عذاب سے محفوظ رکھتا ہے۔

یہ ہے گویا اصل روح مذاہب عالم کی تعلیمات کی۔

اب ان تعلیمات کو سامنے رکھ کر ایک منکر خدا' ایک منکر مذہب سوال کرتا ہے کہ۔

(1) کیا مذہب کی بنیاد حقائق مسلمہ پر مبنی ہے؟ کیا واقعی خدا کوئی چیز ہے؟ اور اس نے ہمیں تمہیں پیدا کیا ہے؟ کیا حقیقتاً وہ دعاؤں کو قبول کر لیتا ہے اور قربانیوں سے خوش ہوتا ہے۔

(2) پھر اگر واقعی خدا ہی نوع انسان کا پیدا کرنے والا ہے تو اس نے کوڑھی لپاہج' دیوانے' فاترالعقل لوگ کیوں پیدا کئے' مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے افراد کی تخلیق کیوں کی۔ اور کیا کوئی ایسی قوت جو ہر نوع مکمل ہے' ارفع و اعلیٰ ہو' اس سے ایسی ناقص مثالیں تخلیق کی ظاہر ہو سکتی ہیں۔

اگر خدا تمام نظام عالم اور دنیا کے جملہ کاروبار کا سنبھالنے والا ہے یعنی اگر یہ صحیح ہے کہ ایک ذرہ بھی بغیر اس کے مرضی کے حرکت میں نہیں آسکتا تو کیا وہ نیرو اور چنگیز کی تخلیق کا ذمہ دار نہیں اور کیا وہ تمام انسانی لڑائیاں جن میں لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون پانی کی طرح بہ جاتا ہے۔ بغیر اس کی مرضی کے ہو جاتی ہیں؟ کیا وہ اس کا ذمہ دار نہیں کہ اس کی مخلوق کا بڑا حصہ صدیوں تک غلامی کے بوجھ سے دبا ہوا کراہتا رہا اور کوڑوں کی مار اس کی پیٹھ سے خون کے فوارے بلند کرتی رہی۔ اور کیا خدا کا مدبر الامر ہونا اس امر کی اجازت دے سکتا تھا کہ ماؤں کی گود سے ان کے شیر خوار بچے چھین کر فروخت کر دیئے جائیں اور وہ تڑپنے کے لیے بے یار و مدد گار چھوڑ دی جائیں۔

کیا اہل مذاہب نے جو نوع انسانی کے ساتھ مظالم روا رکھے ہیں وہ خدا کی مرضی کے خلاف تھے اور کیا خدا اس کو گوارا کر سکتا تھا کہ اس کا نام لے لے کر لوگوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دی جائیں ان کو زندہ جلا دیا جائے اور خار دار شکنجوں میں دبا کر ان کے جسم کا ریشہ ریشہ علیحدہ کر دیا جائے۔

کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ ایک ظالم و کمینہ انسان دوسرے شریف و نیک انسان کو پامال کر دے۔ اور کیا محبان وطن کے ساتھ دار و رسن کے معاملہ کے علاوہ کوئی اور معاملہ پسند نہیں کرتا۔

اگر واقعی خدا نظام عالم کا ذمہ دار ہے تو۔

(1) طوفان و زلزلہ اور قحط و وبا کے مصائب لانے سے کیا فائدہ اس نے سوچا ہے۔

(2) خونخوار درندوں اور زہریلے کیڑوں کی تخلیق سے کیا نتیجہ پیدا کرنا چاہا ہے۔

(3) ناخن و چنگال کو دنیا میں کیوں پیدا کیا؟ کیا شیر کا اسی لیے قوی پنجہ بنایا کہ وہ غریب

ہرنوں کو ہلاک کرتا پھرے' کیا عقاب کی چونچ اس لیے نکیلی بنائی کہ وہ چھوٹی چڑیوں کو چیڑ پھاڑ کر رکھ دے۔

(4) کیا مہلک بیماریوں کے لاتعداد جراثیم اسی لیے پیدا کیے گئے کہ وہ انسانوں کو ہلاک کرتے رہیں اور کیا خدا کے لیے مناسب تھا کہ سل و دق کے جراثیم کی غذا انسانی پھیپھڑے کو قرار دے۔

ان واقعات پر غور کرنے کے بعد لازماً ہم جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ صرف یہ کہ مذہب نام ہے صرف بے بنیاد خوف کا جسے خود انسان کے واہمہ نے پیدا کیا۔ یہی خوف ہے جو اس سے معابد و قربان گاہ کی تعمیر کراتا ہے اور یہی ڈر ہے جو اسے دو زانو کر کے اس کے جسم پر کپکپی طاری کر دیتا ہے (جس کا دوسرا نام اطاعت و عبادت ہے) پھر ظاہر ہے کہ جو تعلیم صرف جذبہ خوف و ہراس پیدا کرنے والی ہوتی وہ کبھی نوع انسان کی ترقی کی ذمہ دار نہیں ہو سکتی۔ اور اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مذہب نام ہے اس غلامانہ ذہنیت کا جسے صرف خوف و بزدلی یاس و بے چارگی اور غربت و مسکنت پیدا کرتی ہے اور جو جرات و ہمت کے ان جذبات سے جن پر تمام ترقیوں کا انحصار ہے انسان کو محروم کر دیتی ہے مانا کہ خدا سب سے بڑا آقا ہے اور انسان اس کا سب سے حقیر غلام لیکن سوال یہ ہے کہ کیا غلامی خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو خوشگوار چیز ہو سکتی ہے؟ آقا خواہ چھوٹا ہو یا بڑا! اچھا اب اور آگے چلیے!

اگر خدا کا وجود مان بھی لیا جائے۔ تو یہ بات کیونکر ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ رحیم و کریم بھی ہے محبت و شفقت والا بھی ہے۔ لاکھوں بندگان خدا ایسے ہیں جو دوپہر گرمی میں ہل چلا رہے ہیں سر کا پسینہ ایڑی تک بہہ رہا ہے جسم تھکن سے چور چور ہے اور وہ ان تکلیف کو صرف اس لیے برداشت کر رہے ہیں کہ جب ان کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی تو ان تمام مصائب کا نعم البدل مل جائے گا لیکن ٹھیک اس وقت جبکہ تکمیل آرزو کار زمانہ آتا ہے آسمان کو دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور بارش کا ایک قطرہ ان کی خشک کھیتیوں پر نہیں گرتا یا یہ کہ طوفانی بادل اٹھاتا ہے اور ان کی تمام محنتوں کو چشم زدن میں بہا لے جاتا ہے یہ کیا ظلم ہے؟ کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ ہزاروں بے گناہ انسان بھوک کی تکلیف میں مبتلا ہو کر فنا ہو جائیں لاکھوں معصوم بچے اپنی ماؤں کی خشک چھاتیوں سے لپٹ کر تڑپتے اور بلکتے رہیں اگر غریب کسانوں پر یہ عذاب ان کے کسی گناہ کی پاداش میں ڈالا گیا تو ان چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا قصور تھا جو دودھ کے ایک ایک قطرہ کے لیے ترسا ترسا کر یوں

ہلاک کر دیے گئے۔

اس کے ساتھ باد سموم کو دیکھو جو ریگزاروں میں گاؤں کے گاؤں تباہ کر جاتی ہے زلزلہ کی تباہ کاریوں پر غور کرو جو ہزاروں انسانوں کو زندہ نگل جاتی ہیں کوہ آتش فشاں کا خیال کرو جو بستیوں کی بستیاں جلا کر خاک سیاہ کر دیتا ہے وبائی بیماریوں کو دیکھو جو لاکھوں کا ستھراؤ کر کے رکھ دیتی ہیں پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر خدا یہ تمام مصائب نازل نہ کرتا تو کیا بنی نوع انسان یہ خیال قائم کر لیتی کہ خدا ان کی پروا نہیں کرتا اور کیا خدا کی شفقت و مہبانی صرف قحط و زلزلہ و بلاو گرسنگی ہی سے پہچانی جا سکتی تھی۔

ہم کو بتایا گیا ہے کہ تمام انسان یکساں عقل و دماغ کے پیدا نہیں کیے گئے ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے لیکن کیا اس تفریق و امتیاز کا کوئی سبب بتایا جا سکتا ہے؟ اگر اچھی عقل رکھنے والی قوموں کو خدا کے اس عطیہ پر اس کا شکرگزار ہونا چاہیے تو کیا ادنیٰ درجہ کی قوموں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ صرف اس لیے کہ وہ جانور نہیں بنائے گے۔

اگر خدا نے قوموں میں یہ امتیاز روا رکھا تھا تو یقیناً" وہ اس سے بھی آگاہ ہو گا کہ اعلیٰ قومیں ادنیٰ کے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔ ان کے لاکھوں افراد کو غلام بنا کر کوڑوں کی مار سے تڑپایا کریں گی' میدان کے میدان ان کی لاشوں سے پاٹ دیں گی اور ہزاروں معصوم بچوں کو ان کی ماؤں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کریں گی۔ پھر اگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے خدا نے یہ امتیاز رکھا تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایسے خدا کو کون محبت و شفقت کرنے والا خدا کہے گا۔

وہ تنگ و تاریک قید خانے جہاں شریف الاخلاق انسان تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے ہیں وہ سولیاں جن پر ہمیشہ خدا کے نیک بندوں کا ہی خون بہایا جاتا ہے' وہ بے یار و مدد گار غلام جن کے ہاتھ پاؤں زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں وہ بہت سے خدا کا نام بلند کرنے والے جن کا جسم شکنجوں میں دبا کر پیس ڈالا جاتا ہے وہ بہت سی دکھیاری مائیں جن کی گود میں تیغ و تفنگ کی قوت سے خالی کر دی جاتی ہیں وہ بہت سے معصوم شیر خوار بچے جن کے نرم و نازک جسموں کو تلوار دو نیم کر دیتی ہے وہ بے شمار فاقہ زدہ انسان جن کے جسم میں سوا پوست و استخواں کے کچھ نظر نہیں آتا وہ مہلک امراض میں تڑپنے اور کراہنے والی لاتعداد انسانی مخلوق' وہ طوفان و سیلاب سے سینکڑوں تباہ ہو جانے والے گاؤں وہ امساک باراں یا ژالہ باری سے خشک و افسردہ ہو جانے والی کھیتیاں وہ بابرۂ عالم جو ذبح کیے ہوئے ہزاروں

انسانوں کے مجموں کا مینا بازار بنا بنا کر خوش ہوتے ہیں وہ ظالم و سفاک سلاطین جن کا اپنی عیش کوشی پر قوم کی قوم کو قربان کر دینا لونی مشغلہ ہے' وہ بے شمار موذی جانور جن کے دانتوں سے دوسرے غریب جانوروں کا خون ہر وقت ٹپکتا رہتا ہے وہ لاتعداد زہریلے سانپ جو ہلاکت پھیلانے کے لیے اپنے تالوؤں میں زہر کی تھیلیاں لیے ہوئے لوھر ادھر رینگتے پھرتے ہیں وہ ہر جگہ ہر وقت قوی کا ضعیف کو پامال کرتے رہنا وہ مکر کا صداقت پر جھوٹ کا سچائی پر بدی کا نیکی پر غالب آجانا یہ سب کیا ہے۔ کیا سب کچھ اسی خدا کی مرضی سے ہوتا ہے جسے رحیم و کریم کہتے ہیں جو بڑا شفقت کرنے والا بتایا جاتا ہے۔

بعض لوگ ایسے ہیں جو مذہب کے بتائے ہوئے وجود خداوندی کو نہیں مانتے لیکن وہ ایک ایسی قوت برتر و اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں جو انسان کی رہنمائی کرتی رہتی ہے یہ قوت کیا ہے؟ آیئے اس پر بھی ایک اجمالی نگاہ ڈال لیں انسان کی گزشتہ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ وہ برابر ترقی کر رہا ہے لور اس کی ترقی نتیجہ ہے محض اس کے تجربات کا ایک شخص سفر کر رہا ہے لور دوران سفر میں وہ ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں دو راستے علیحدہ علیحدہ پھوٹتے ہیں وہ قیاس سے کام لے کر ایک راستہ کو اختیار کرتا ہے' لیکن جب وہ اس غلطی سے آگاہ ہو جاتا ہے تو پھر واپس آتا ہے لور دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے جو اسے منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

ایک بچہ شعلہ کی رنگینی کو دیکھ کر اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے لیکن جب اس کا ہاتھ جلنے لگتا ہے تو ہٹا لیتا ہے لور پھر کبھی اس کی جرات نہیں کرتا اس قسم کی ہزاروں مثالیں ایسی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی تجربہ ہی وہ قوت ہے جو اس کی رہنمائی کرتی رہتی ہے لور یہ قوت نہ ضمیر انسانی سے متعلق ہے نہ خدا کی رہبری سے نہ وہ کسی ارادہ کی مالک ہے نہ کسی مقصود کی متمنی بلکہ وہ محض نتیجہ ہے انسانی تجربات کا جسے واقعات و حادثات سے کسی طرح علیحدہ نہیں کر سکتے۔

اس لیے خدا کے وجود کو ایک ایسی قوت تسلیم کر لینا جس نے ہمارے اندر اخلاق کی حس و دیعت کر دی ہے ضمیر کی شمع روشن کر دی ہے درست نہیں کیونکہ یہ سب کچھ ہم کو تلخ تجربوں کے بعد حاصل ہوا ہے لور کسی دوسری قوت کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

انسان فطرتاً" تمدن پسند واقع ہوا ہے لور قبیلہ و خاندان کی زندگی بسر کرنے پر طبعاً" مجبور ہے' پھر اگر کسی خاندان' قبیلہ یا قوم کے افراد اجتماعی مسرت کا باعث ہوا کرتے ہیں تو ان کی

تعریف کی جاتی ہے ورنہ برائی اور یہی وہ چیز ہے جو ایک قوم کی زندگی اور اس کے تمدن کا مخصوص معیار مقرر کر دیتی ہے اور اس میں کوئی مافوق الفطرت بات نہیں پائی جاتی۔

فرض کیجیے کہ خدا موجود ہے جو غیر محدود و لاانتہا ہے پھر ظاہر ہے کہ جو چیز غیر محدود ہو گی وہ کیفیت و کم سے بے نیاز ہو گی اور جو کیف و کم سے بے نیاز ہے وہ نفع و مضرت سے بلند ہے اس کو نہ کسی چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے اور نہ اس پر کوئی تاثر طاری ہو سکتا ہے اس لیے اگر انسان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایک غیر محدود خدا کو حمد و تعریف کی ضرورت ہوتی ہے یا وہ انسانی تعریف سے خوش ہوتا ہے تو اس کو سوا حماقت کے اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

کیا نظام عالم کسی کی دعا سے بدل سکتا ہے' کیا ہم عبادت سے سمندر کے مدوجزر کو روک سکتے ہیں کیا قربانیوں سے ہوا کا رخ بدلا جا سکتا ہے۔ کیا سر بسجود ہو جانے سے کسی کو دولت مل سکتی ہے اور کیا التجاو زاری سے کوئی بیمار اچھا ہو سکتا ہے؟

مذہب کی بنیاد اس عقیدہ پر قائم ہے کہ نظام عالم کا کوئی مدبر ضرور ہے اور وہ مدبر یا مالک انسانی التجاؤں کو سنتا ہے اپنے بندوں کو انعام و سزا دیتا ہے اور عبادت و تعریف سے خوش ہوتا ہے لیکن کیا یہ عقیدہ کسی واقعہ و حقیقت پر مبنی ہے کیا' کوئی ایسا نظریہ موجود ہے جو ہم کو ایسا باور کرنے پر مجبور کر دے' یقیناً" نہیں ہے اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے محض وہم و قیاس کا ظن و تخمین کا یا پھر ان مصالح کا جن کی بناء پر لوگوں کی تخویف یا تشویق ضروری سمجھی گئی۔

اب اس کے مقابلہ میں لا مذہب دہریہ کو دیکھیے کہ اس کا نظریہ کیا اور کیسا ہے اور اس کے اعتقاد کی تعمیر کن چیزوں پر قائم ہے۔ پہلی چیز مادہ ہے جو زوال پذیر نہیں دوسری چیز قوت ہے اور یہ بھی فنا نہیں ہو سکتی تیسری چیز ہے کہ مادہ اور قوت دونوں جدا نہیں ہو سکتے یعنی نہ مادہ بغیر قوت کے پایا جا سکتا ہے نہ قوت بغیر مادہ کے اور چوتھی یہ ہے کہ جو چیز فنا نہیں ہو سکتی وہ کبھی پیدا بھی نہیں ہوئی۔ اور اس طرح گویا یہ ثابت ہو گیا کہ مادہ اور قوت ازلی و ابدی چیزیں ہیں اور ان کا خالق کوئی نہیں پھر جب کائنات کا وجود صرف مادہ و قوت کا ممنون ہے تو ظاہر ہے کہ خدا کے ماننے کی کوئی وجہ نہیں اور یہ سلسلہ تخلیق اسی طرح ازل سے ابد تک جاری رہے گا۔ اور انسان کی تخلیق بھی اسی سلسلہ کی چیز ہے جس کا تعلق کسی خاص ارادہ خداوندی سے نہیں ہے۔ جو کچھ ممکن تھا وہ قوت و مادہ کے امتزاج سے واقع ہوا

جو ممکن ہے وہ واقع ہو رہا ہے اور جو ممکن ہو گا وہ ظہور میں آئے گا اجرام فلکی کی تخلیق موسموں کا تغیر و تبدل' نباتات و حیوانات کا وجود' قوت ذہن و ادراک' اور تمام وہ باتیں جو عالم کیف و کم سے تعلق رکھتی ہیں۔ سب نتیجہ ہیں مادہ کے فعل و انفعال کا اور اسی سے یہ تمام تنوع کائنات میں نظر آتا ہے اور ابد آلاباد تک نظر آئے گا۔

ہزاروں سال سے نوع انسانی کی اصلاح کے لیے کوشش ہو رہی ہے اور اسی اصلاح کے لیے لوگوں نے خدا کا خیال پیدا کیا' مذہب کی بنیاد ڈالی' صحف الہامی پیش کیے دوزخ و جنت پر یقین دلایا معابد معابد تعمیر کیے عبادتیں کرائیں لیکن اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی کیوں؟ صرف اس لیے کہ جس چیز کا وجود ہے یعنی مادہ کا وہ بالکل بے حس ہے۔ نہ اس کے سامنے کوئی تصور ہے نہ ارادہ نہ تاثر ہے نہ ادراک بغیر قصد کے وہ پیدا کرتا ہے اور بغیر کسی وجہ کے ہلاک کر ڈالتا ہے۔

اس لیے اب سوال یہ ہے کہ نوع انسانی کی نجات کیونکر ممکن ہے یعنی اصلاح اخلاق و تمدن جسے مذاہب عالم اب تک پورا نہ کر سکے کیونکر تکمیل تک پہنچ سکتی ہے؟ اس کے جواب میں صرف سائنس کو پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ اسی کے ذریعہ سے مادہ پر فتح پا سکتے ہیں اور اسی کی روشنی میں ہم پر یہ حقیقت واضح ہو گی کہ نیک کام خود آپ اپنی جزا ہے۔اور برا کام آپ اپنی سزا۔

یہاں تک کہ جو کچھ بیان کیا گیا وہ خلاصہ ہے ان لوگوں کے خیالات کا جو خدا اور مذہب کے قائل نہیں ہیں۔ اب آپ اس پر ایک بسیط تبصرہ کر کے دیکھیں کہ اس میں کوئی حقیقت پائی جاتی ہے یا نہیں۔

جس حد تک دلائل کا تعلق ہے خدا کے اثبات و انکار کا مسئلہ اتنا الجھا ہوا ہے کہ شاید ہی انسان کبھی اس گتھی کو سلجھا سکے۔ اس شخص سے جو خدا کا ماننے والا ہے دریافت کیجیے کہ وہ کن دلائل کی بنا پر خدا کے وجود کا قائل ہوا ہے تو وہ سوا اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آج بڑا عالم بغیر کسی صانع کے آپ ہی کیوں کر وجود میں آسکتا ہے بہ ظاہر یہ دلیل اتنی صاف و صریح اتنی روشن و واضح ہے کہ اس میں چون و چرا کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی' لیکن ایک منکر خدا سوال کرتا ہے کہ جب بغیر وجود و صانع کے کائنات کا پایا جانا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا تو خدا کا آپ ہی آپ ظہور میں آجانا کس طرح سمجھ میں آجاتا ہے تو اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا جا سکتا اور عقل انسانی گم ہو کر رہ جاتی ہے۔

اسی طرح منکر خدا سے پوچھا جاتا ہے کہ مادہ اور قوت کیونکر وجود میں آئے تو وہ جواب دیتا ہے کہ ازخود پیدا ہو گئے۔ اور جب اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ "خدا کا از خود پیدا ہو جانا تو تمہاری سمجھ میں نہیں آتا" لیکن مادہ و قوت کا آپ ہی آپ ظہور میں آجانا سمجھ میں آجاتا ہے یہ کیا بات ہے تو وہ بھی گھبرا جاتا ہے اور اس کے پاس بھی اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ہوتا۔

الغرض وہ خدا ہو یا مادہ آپ ہی آپ پیدا ہو جانا ہم کو اس قدر عجیب و غریب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک انسان خود تو آنکھ بند کر کے بغیر کسی دلیل و حجت کے شاید مان بھی لے اگر اس کا ضمیر اس یقین کی طرف رہبری کرتا ہے لیکن کسی ایسے شخص کو باور کرانا جو ہم سے قطعی والزامی دلیل کا طلب گار ہو بالکل محال ہے۔

اس لیے جس حد تک دلائل عقلی کا تعلق ہے اس مسئلہ کی نوعیت صرف یہ قرار پائی ہے کہ اگر آپ ہی آپ کسی چیز کا ظہور میں آنا سمجھ میں آسکتا ہے تو خدا اور مادہ دونوں پر منطبق ہو سکتا ہے ورنہ ایک پر بھی نہیں اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس باب میں دونوں جماعتیں اس درجہ کمزور واقع ہوئی ہیں اور بہ لحاظ وجود خدا اور مادہ دونوں ایک حیثیت کی مانی جاتی ہیں تو خدا کے ماننے والے کیوں مادہ کی قدامت پر ایمان نہیں لے آتے یا مادہ پرست جماعت کیوں خدا کے ماننے سے احتراز کرتی ہے۔

اس کا جواب اہل مذاہب کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ اگر خدا کو چھوڑ کر صرف مادہ کی قدامت پر ایمان لایا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انسان کو اخلاقی لحاظ سے بالکل درندہ بنا دیا جائے اور وہ کسی قوت برتر و اعلیٰ کے خوف باز پرس سے مطمئن ہو کر جو جی میں آئے کرتا پھرے۔ ایک ملحد و منکر کہتا ہے کہ اگر خدا کا ماننا انسان کی درستی اخلاق و اصلاح تمدن کو مستلزم ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہوا اور اگر خدا واقعی قادر مطلق ہے تو اس نے کیوں اس وقت تک تمام بربادیوں ہلاکتوں' مصیبتوں اور بدعنوانیوں کو روا رکھا۔ اس کا جواب اہل مذاہب زیادہ سے زیادہ یہی دے سکتے ہیں کہ وہ مالک و مختار ہے اور اپنے مصالح کو وہی خوب جانتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ فریق مخالف کو اس جواب سے تسکین نہیں ہو سکتی اور اس طرح گویا دونوں فریق ایک دوسرے کو مطمئن کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

منکرین خدا کی جماعت تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک تو وہ پکا منکر و ملحد گروہ ہے جو

انتہائی یقین کے ساتھ خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے مثلاً فیورباش Feuer Bach جو کہتا ہے کہ خدا رات یا دن کی طرح واضح اور آفتاب کی طرح روشن نہیں یا فلورنس Flourence جس نے ایک جگہ صاف صاف لکھ دیا کہ خدا کے وجود کا خیال نوع انسانی کے ساتھ سخت دشمنی ہے دوسرا گروہ مشرکین کا ہے جن کا کہنا یہ ہے کہ انسان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آسکتی کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں اور یہ ارتیابیت اس کی کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ تیسرا گروہ ملحدین کا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کے وجود کا جو ثبوت پیش کیا جاتا ہے وہ مفید علم و یقین نہیں۔

اول الذکر گروہ تو خارج از بحث ہے کیونکہ انکار محض کا ثبوت آج تک نہ کوئی دے سکا ہے۔ نہ دے سکتا ہے' علاوہ اس کے جب تک تمام کائنات اور اس کے موجودات کا استقصار نہ کر لیا جائے کیونکہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے وجود کی کوئی دلیل نہیں لائی جا سکتی بالکل ممکن ہے کہ مادہ کی قدامت پر ایمان لانے والے اب آئندہ کوئی ایسی دلیل پا سکیں جو ان کے نظریہ کو بدل دینے والی ہو اور وہ مادہ و قوت کی ازلیت و ابدیت سے انکار کرنے پر مجبور ہوں۔ مواخرالذکر باقی دو جماعتیں ضرور قابل لحاظ ہیں اور اس وقت مغرب کا بڑا حصہ انھیں دو میں سے کسی ایک خیال کا موید ہے پھر دیکھنا یہ ہے کہ اہل مذہب یا خدا کے ماننے والے ان کے تذبذب کو دور کر سکتے ہیں یا نہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو کیونکر؟

جواب کی بظاہر دو ہی صورتیں ہوا کرتی ہیں' یا تو کوئی شخص اپنے دعوے کو دلیل و برہان سے ثابت کر دے یا مخالف پر بھی اسی قسم کا اعتراض کر دے اول الذکر صورت جواب کی اثباتی ہے جو یقیناً" بہترین صورت دوسرے کو قائل کرنے کی ہوا کرتی ہے لیکن دوسری صورت جواب کی الزامی ہے جو مخاطب کو خاموش تو کر سکتی ہے لیکن مطمئن نہیں کر سکتی۔

یقیناً" ہم ایک منکر خدا کے مقابلہ میں کوئی ایسا بدیہی ثبوت تو پیش نہیں کر سکتے جو اسے بدوباری کے یقین پر مجبور کر دے لیکن اگر ہم خود اسی کے نظریوں سے یہ ثابت کر سکیں کہ وہ باوجود انکار خدا کے کسی نہ کسی طرح خدا کا قائل ہے تو شاید ایک حد تک کامیاب ہو سکتے ہیں۔

آپ کسی بڑے سے بڑے منکر خدا سے سوال کیجیے کہ کیا اس کا خدا سے انکار کرنا اس بنا پر ہے کہ وہ خدا سے نفرت کرتا ہے یعنی اگر واقعی کسی خدا کا وجود ہو تو وہ اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا ظاہر ہے کہ اس کا جواب وہ نفی میں دے گا کیونکہ نفرت و اکراہ کی کوئی

وجہ موجود نہیں اس لیے خدا سے انکار کرنے کا سبب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے وجود کی دلیل اس کے پاس نہیں ہے۔ یا یہ کہ اس کی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک چیز اپنے آپ کیونکر پیدا ہو گئی لیکن اسی کے ساتھ طرفہ تماشہ ہے کہ وہ خدا سے انکار کرنے کے باوجود خدا ہی کی طرح ایک دوسری چیز مادہ کے ازخود پیدا ہونے کا بھی قائل ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ حقیقی معنی میں منکر خدا تو کوئی نہیں ہے بلکہ خدا کو جس مفہوم میں پیش کیا جاتا ہے وہ بعض کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اس کو تسلیم نہ کر کے وہ دوسرے نام اور دوسرے مفہوم کے ساتھ خدا کو پیش کرتے ہیں اس لیے حقیقتاً دنیا میں یہ اختلاف خدا کے وجود یا عدم وجود میں نہیں ہے بلکہ صرف اس تعبیر یا اس مفہوم میں ہے جو خدا کے تصور سے متعلق ہے یعنی ایک اگر اس کا تصور اس طرح کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ وجود میں آیا ہے' قادر مطلق ہے' خلاق عالم ہے' ہر وقت ہر آن اختیار کامل کے ساتھ بنانے بگاڑنے کی قدرت رکھتا ہے' نیکی پر انعام دیتا ہے' برائی پر سرزنش کرتا ہے' اس سے باز پرس نہیں کی جا سکتی وغیرہ وغیرہ تو دوسرا بھی جو بجائے خدا کے مادہ و قوت کا ماننے والا ہے کم و بیش اسی خیال کا موید ہے کیونکہ وہ بھی مادہ کو ازخود پیدا ہو جانے والا تسلیم کرتا ہے' اسی کی تخلیق عالم کا سبب قرار دیتا ہے' اسی کو مختلف کیفیات کو وہ اشیا کے بننے بگڑنے سے تعبیر کرتا ہے پھر بھی اگر کوئی فرق ہے تو صرف اس قدر کہ ایک اپنے خدا کو ارادہ کا مالک سمجھتا ہے اور دوسرا نہیں یعنی ایک کا خدا اگر جاننے بوجھنے والا ہے' سمیع و بصیر ہے تو دوسرے کا ایسا نہیں ہے لیکن اگر ہم اہل مذہب میں سے اس جماعت کے اعتقاد کو اپنے سامنے رکھیں جو مقادیر الہیہ میں تغیر و تبدل کا قائل نہیں ہے تو یہ فرق بھی دور ہو جاتا ہے کیونکہ اگر ایک مقدرات کو بدلنے کی قدرت رکھنے کے باوجود نہیں بدلتا لن تجد لسنة الله تبدیلا تو دوسرا بدل نہیں سکتا اور ان دونوں کا نتیجہ وہی ایک نکلتا ہے۔

اب رہ گیا سوال انعام و سرزنش کا سو میری رائے میں یہاں بھی باہم کوئی اختلاف نہیں ہے۔ میں اس کو ذرا وضاحت کے ساتھ سمجھانا چاہتا ہوں۔

اہل مذاہب کہتے ہیں کہ خدا کی عبادت کرو کہ نجات اسی سے متعلق ہے ملحدین کہتے ہیں کہ علم حاصل کرو کیونکہ ترقی اسی سے وابستہ ہے' اس لیے اب مقابلہ ہوا درمیان عبادت و علم کے اور نجات و ترقی کے۔ پھر آیئے غور کریں کہ کیا ان دونوں میں واقعی کوئی اصولی تضاد پایا جاتا ہے۔ یا صرف تعبیرات کا اختلاف ہے۔

اگر آپ عبادت کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ خدا کی محض ظاہری پرستش یعنی خاص مراسم و حرکات کی پابندی کبھی کسی مذہب کا مقصود حقیقی نہیں رہا ہے۔ کیونکہ خدا کو بے نیاز مطلق سمجھنے والے یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خدا کو نہ عبادت سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ ترک عبادت سے کوئی نقصان اس لیے ظاہر ہے کہ عبادت کا مقصود اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ ہمیں کو اس سے فائدہ پہنچے اور یہ فائدہ اسی وقت مرتب ہو سکتا ہے جب عبادت سے خود ہمارے اندر کوئی ذہنی تبدیلی ہو اور ذہنی تبدیلی سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ ہم اپنی حقیقت کو سمجھیں اور اپنی اس اہلیت کو بروئے کار لائیں جو مظاہر قدرت اور نوامیس فطرت سے استفادہ کا باعث ہوا کرتی ہے اس لیے آپ دیکھیں گے کہ عبادت کے ساتھ ہی ساتھ اچھے کام کرنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے اور غور و فکر تدبر و تعقل کا بھی حکم دیا گیا ہے' تاریخ مذاہب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جو صورت عبادت کی متعین کی گئی وہ نوامیس طبعی سے متعلق تھی اور مظاہر قدرت ہی پر غور کرنے کا دوسرا نام عبادت تھا۔ چنانچہ آفتاب کی پرستش آگ کی پوجا' دریا کا احترام اور اسی طرح کی اور بہت سے معتقدات اسی لیے پیدا ہو گئے اور اب تک بعض قوموں میں پائے جاتے ہیں' ظاہر ہے کہ آفتاب کی پرستش مقصود صرف اس امر کا اعتراف تھا کہ وہ نہ صرف انسانی زندگی بلکہ انسانی ترقی کے لیے کس درجہ ضروری چیز ہے اور اسی طرح آگ اور دریاؤں کی پوجا سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ کار حیات انسانی میں' کیسے زبردست ممد و معاون ہیں اس کو سالہا سال کے تجربوں نے بتا دیا تھا کہ اگر سورج نہ ہو تو کھیتیاں بار آور نہیں ہو سکتیں' اگر دریا اور چشمے نہ ہوں تو امساک باراں کے وقت نہ زراعت کی آبپاشی ہو سکتی ہے نہ مویشیوں کو پانی میسر آسکتا ہے اسی طرح وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ آگ کتنی اہم و ضروری چیز ہے' الغرض مظاہر قدرت کی پرستش بھی اسی اصول فطرت کے تحت جاری ہوئی کہ انسان کو ان کا علم حاصل کر کے اپنی ترقی میں کام لینا تھا۔

اب اس کے بعد آپ اس زمانہ کو لیجیے جب انسان آہستہ آہستہ ترقی کر کے پختگی عقل و دماغ کو پہنچا اور اس نے خدا کا ایک بلند مفہوم پیش کر کے پرستش قرار دیا تفکر و تدبر کو جو تمام کائنات کو محیط تھا اور انسان کی عظیم الشان اہلیت کو جس کا دوسرا نام خلافت خداوندی تھا' وراثت الٰہی تھا اور جس کو صاف صاف کھول کر یوں کہہ دیا کہ علم آدم الاسماء کلہا اسماء سے مراد یہاں چیزوں کے نام نہیں ہیں بلکہ تعینات و فکر و دماغ مقصود ہیں۔ (یعنی آدمی کو ہم

نے سب کچھ بتا دیا ہے) یہ بڑی زبردست پیشین گوئی تھی انسان کے دماغی ارتقا اور ذہنی استعداد کی جو آخر کار پوری ہو کر رہی اور جس کا ثبوت عہد حاضر کے اختراعات سے بخوبی مل سکتا ہے۔

اس بیان سے غالباً یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ مادہ و قوت کے ماننے والے جس چیز کو علم و سائنس کہتے ہیں مذہب اس کو لفظ عبادت و پرستش سے تعبیر کرتا ہے یعنی اگر وہ کہتے ہیں کہ انسانی فلاح علمی جستجو پر منحصر ہے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان کی نجات وابستہ ہے تفکر و تدبر سے اور مظاہر قدرت کے اس عمیق مطالعہ سے جو انہماک و انقیاد کی کیفیت انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے' البتہ نجات کے مفہوم میں تھوڑا سا فرق وہاں پر آکر ضرور پیدا ہو جاتا ہے جہاں سوال تمام نوع انسان کی اجتماعیت کا ہے۔ اور مذہب قومیت کے تنگ مفہوم سے بلند تر انسانیت کا مفہوم پیش کرتا ہے۔

یقیناً جو مفہوم نجات کا ہے وہی ترقی کا ہے اور یہ سب کچھ اسی دنیا سے متعلق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان نے تمام موجودہ ترقیوں کے ساتھ اس مقصود کو حاصل کر لیا ہے جسے حقیقتاً نجات یا ترقی کہا جا سکتا ہے' غالباً نہیں۔ کیونکہ نجات یا ترقی کے مفہوم میں سب سے پہلے جو چیز ایک متمدن انسان کے سامنے آسکتی ہے وہ دنیا کا امن و سکون ہے۔

کیونکہ جب تک یہ حاصل نہ ہو مادی یا ذہنی ترقی کی کوئی غایت متعین نہیں ہو سکتی اور دنیا کے امن و سکون کی جو حالت اس زمانہ میں ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں کہ ایک ہی قوم ایک ہی مسلک و مشرب' ایک ہی ذوق و معاشرت والی جماعتوں میں کتنا اختلاف نظر آتا ہے اور بظاہر کوئی صورت اس کے دور ہونے کی نظر نہیں آتی۔

علمی ترقیاں بجائے اس کے کہ نوع انسان کے تمام افراد کو کسی ایک مرکز پر لائیں آپس میں جنگ و جدال کی نئی نئی راہیں پیدا کر رہی ہیں اور خدا کی عطا کی ہوئی وہ اہلیت جو رشتہ اخوت و محبت استوار کرنے کے کام میں آنی چاہیے تھی۔ فساد و ہلاکت کی اشاعت میں صرف ہو رہی ہے' اور اسی نقطہ پر پہنچ کر ہم کو مذہبی نجات اور دنیاوی ترقی کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ مذہب کہتا ہے انسانی نجات منحصر ہے پر امن ترقی پر اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ نجات نام ہے صرف فراہمی زر و دولت کا' مذہب بتاتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت و خلوص کا برتاؤ کرو' ان کا کہنا ہے کہ دوسرے کی ہلاکت پر اپنا قصر حیات تعمیر ہوتا ہے مذہب کی ہدایت یہ ہے کہ نوامیس فطرت کی تحقیق کرو افادہ عالم کے لیے اور ان کا عمل یہ ہے کہ

قوت ایجاد و اختراع صرف کرو بربادی و ویرانی پھیلانے کے لیے۔

یقیناً" فن پرواز انسانی ترقی کا قابل فخر کارنامہ ہے' لیکن کیا اس کے ذریعہ سے بم گرا کر خدا کی بے گناہ مخلوق کو ہلاک کرنا ترقی کی علامت قرار دیا جائے گا' عناصر کی تحقیق اور کیمیائی اختراعات کے افادہ سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن کیا اس سے زہر آلود گیس پھیلا کر ہزاروں بندگان خدا کو موت کی آغوش میں دے دینا انسانی ترقی کہلائے گی صنعت و تجارت کو ترقی دے کر مال و دولت حاصل کرنا یقیناً" پسندیدہ امر ہے لیکن کیا جذبہ مسابقت سے مغلوب ہو کر ایک قوم کا دوسری قوم کو لوٹ لینے کی فکر میں رہنا اور مسئلہ زر کو اتنا پیچیدہ بنا دینا کہ خود انسانی دماغ بھی اس کو نہ سلجھا سکے' ترقی و فلاح کا باعث ہو سکتا ہے۔ الغرض اس وقت کی تمام اختراعات و ایجادات' جملہ اقتصادی اور معاشرتی مسائل نے ایک ایسا اضطراب دنیا میں پیدا کر دیا کہ امن و سکون تو کجا' انسان کو جینا بھی دشوار ہو گیا ہے اور دنیاوی ترقی کا یہی وہ نقصان رساں پہلو ہے جس سے بچنے کے لیے خدا اور مذہب کا وجود ضروری ہے اور بقول والٹیئر "اگر خدا نہیں ہے تو بھی ہمیں خدا پیدا کرنا پڑے گا۔"

منکرین خدا کا ایک زبردست اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر خدا رحیم و کریم ہے' شفقت ورافت والا ہے تو وہ طوفان و سیلاب سے وبائی امراض سے کیوں لاکھوں بندگان خدا کو ہلاک کر ڈالتا ہے' ایک ظالم کو ظلم کرنے کے لیے کیوں زندہ رکھتا ہے دنیا میں محکومی و غلامی کو کیوں قائم رہنے دیتا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔

یہ امر تمام اہل مذاہب کے نزدیک مسلم ہے کہ انسان نتیجہ ہے عالم خلق کی تدریجی ترقی کا اور اس کے ذہن و دماغ کا ارتقاء بھی اسی تدریج کا پابند رہا ہے اور رہے گا فرض کیجئے کہ خدا ایک ایسا عالم پیدا کرتا جہاں سب کو ہر وقت راحت ہی راحت ہوتی خلش و اضطراب' خوف و اندیشہ کا نام نہ ہوتا' تو ظاہر ہے کہ ایک انسان اس جانور سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا جسے ایک جگہ پابند رکھ کر دونوں وقت بہترین غذا دی جا رہی ہے اور کیا اس صورت میں خدا پر یہ اعتراض نہ ہوتا کہ انسان کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

پھر جب انسان تدریجی ترقی کے لیے پیدا کیا گیا تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے ہی ویسے اسباب پیدا کرنا بھی ضروری تھے اور وہ اسباب سوا اس کے کچھ نہ ہو سکتے تھے کہ اس کی راہ میں موانع پیش کیے جاتے اور وہ ان کے دور کرنے کی تدبیریں سوچنے میں دماغ سے کام لیتا۔

اگر سیلاب نہ آتے تو انسان اپنی اور اپنی کھیتیوں کو محفوظ رکھنے کے لیے بند اور پل

وغیرہ کی تعمیر کیونکر معلوم کرتا۔ اگر امساک براں نہ ہوتا تو اس کا دماغ چاہ و نہر کی تعمیر کی طرف کس طرح متوجہ ہو سکتا۔ اگر بیماریاں نہ ہوتیں تو ان سے بچنے کے لیے علم العقاقیر و علم الکیمیا کے وجود میں آنے کی کیا صورت تھی۔ اگر دنیا مستبد بادشاہ اور ظالم آقا سے خالی ہوتی تو آزادی و حریت کے جذبات کیونکر پیدا ہوتے۔ الغرض عہد حاضر کی کسی علمی و دماغی ترقی کو لے لیجیے، وہ یقیناً" نتیجہ ہو گی کسی نہ کسی ایسی کیفیت کا جو ناموافق حالات سے پیدا ہوئی تھی، اور اس لیے موجودہ ترقیاں ممنون ہیں، صرف انھیں چیزوں کی جن کے پیدا کرنے کا الزام خدا پر قائم کیا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قدرت کے اس نظام میں تعمیر کے ساتھ تخریبی پہلو بھی شامل ہے یعنی پہلے تخریب ہے اور پھر تعمیر، لیکن یہ بھی محض ہم اپنے تاثرات کے لحاظ سے کہتے ہیں ورنہ وہاں یہ بھی کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ خدا جسے بے نیاز مطلق سمجھا جاتا ہے عالم تاثر سے بہت بلند واقع ہوا ہے اور جو اصول رحم و کرم کے ہم نے اپنے دنیاوی تعلقات کی بنا پر قائم کر لیے ہیں وہ اس پر منطبق نہیں ہو سکتے۔

اس بیان سے قطعاً" یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ حقیقتاً" مذہب و سائنس دونوں ایک چیز ہیں اور جو چیز ملوئین کے نزدیک علم و ترقی سے تعبیر کی جاتی ہے وہی اہل مذہب کی زبان میں عبادت و نجات ہے البتہ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ منکرین خدا کی علمی ترقی میں اخلاق کو نظر انداز کر کے اس کی اجتماعی حیثیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اہل مذاہب اس ترقی میں اخلاق کو بھی شامل کرتے ہیں کہ بغیر اس کے نوع انسانی کی نجات یا دنیا کا امن و سکون کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

○ ○ ○

بقائے روح و معاد
مسٹر عبدالمجید حیرت بی' اے شملہ کے جواب میں

محترمی السلام علیکم

(1) آپ یہ باور نہیں کرتے کہ (فعال لمایرید) ہے اور عالم کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک ذرے کی نگرانی کرتا ہے۔

(2) آپ بقائے روح' حیات بعدالموت یا معاد کے قائل نہیں' بہر حال آپ اس کے تو قائل ہیں کہ اسلام دنیا کا آخری اور فطری مذہب ہے' پھر اگر یہ وہی اسلام ہے جسے قرآن مجید پیش کرتا ہے تو کیا آپ قرآن مجید سے نمبر(1) و (2) پر کوئی دلیل پیش کر سکیں گے۔

بقائے روح کے باب میں آپ غالباً" مغرب کے تازہ اکتشافات سے بے خبر نہ ہوں گے۔

میں آخرت کا قائل ہوں' اس لیے کہ۔

(1) لفظ دنیا آخرت پر دلالت کرتا ہے۔

(2) آخرت دنیا کے لیے انتہائی بے نفسی کے ساتھ نیکی کیے جانے کی تعلیم ہے پھر جب یہ نہیں کہا جا سکتا اور یقیناً" نہیں کہا جا سکتا کہ ہر طاعت کا ثواب اور گناہ کا عذاب یا آپ کے رنگ میں ہر طاعت کا واقعی عذاب اور ہر گناہ کا واقعی ثواب انسان کو اسی دنیا میں مل جاتا ہے' تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس شک کو یقین سے بدلنے کے لیے ایک یوم آخرت تسلیم نہ کر لیا جائے۔

بلا اجر آخر آخرت پر جناب علی کرم اللہ وجہ کے اس منطقی استدلال کو دیکھیے جسے سن کر ایک یہودی حلقہ بگوش اسلام ہوا یعنی اگر اس دنیا کے بعد کچھ نہیں تو نیک و بد کی جزا و سزا میں مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر ہیں لیکن اگر آخرت ایک امر واقعی ہے تو پھر نقصان میں کون رہتا ہے اور نفع میں کون۔

چنانچہ میں اگر آخرت کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہوں تو اس میں کیا "حرج" ہے میں حیران ہوں کہ اس عقیدہ کے رکھنے والے پر بیچے اور چاقو کی دوراز کار مثال کیونکر چسپاں ہو

سکتی ہے۔

(نگار) :- میرا یہ کہنا ہے کہ۔ "خدا ایک ایک چیز ایک ایک ذرہ کی نگرانی نہیں کرتا" صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ انفرادی طور پر (IN DIVIDUALLY) کائنات کی ہر ہر چیز کے لیے اپنی قوت کو منقسم نہیں کرتا' بلکہ مجموعی طور پر تمام نظام عالم کے لیے چند اصول و ضوابط مقرر کر دیے ہیں اور انہیں کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

آپ کپڑا بننے کے کسی بڑے کارخانے میں ضرور کبھی نہ کبھی تشریف لے گئے ہوں گے اور آپ نے دیکھا ہو گا کہ وہاں ہزاروں "کرگھے" خود بخود چل رہے ہیں کپڑا بنا جا رہا ہے۔ رولر اپنے کپڑے کو لپیٹ رہے ہیں۔ درآں حالیکہ وہاں کوئی انسانی ہاتھ موجود نہیں پھر یہ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ کارخانہ کا انجینئر بجلی یا بھاپ کی مدد سے مشین کو حرکت دے کر عموی طور پر ہر کام کی نگرانی کر رہا ہے لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مشین کے ہر ہر پرزے کی جنبش کرگھے کے ہر ہر تار کا اوپر نیچے ہونا' ایک ایک بنولے کا روئی سے علیحدہ ہونا' ایک ایک پونی کا تیار ہونا ان سب پر انجینئر کی نگاہ ہے۔

پھر چونکہ انجینئر کے ہاتھ میں بھاپ یا بجلی کی وہ قوت موجود ہے جس سے تمام کام انجام پا رہے ہیں اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام کارخانوں کا نگران ہے لیکن یہ کہنا کہ کارخانہ کے ہزاروں لاکھوں چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھی علیحدہ علیحدہ اس کی نگاہ ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

(2) بقائے روح اور معاد کے متعلق آپ کا مجھ سے مطالبہ ہے کہ اگر میں اسلام کو دنیا کا آخری فطری مذہب تسلیم کرتا ہوں تو مجھے قرآن مجید سے ثابت کرنا چاہیے کہ بقائے روح اور معاد دونوں خیال صحیح نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے نمبر1 کا بھی ثبوت قرآن پاک سے طلب کیا ہے۔

میرے عزیز دوست' آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں تو ان باتوں کا منکر ہوں۔ یعنی میں آپ کے اس دعوی کو نہیں مانتا کہ خدا ہر ہر ذرہ پر انفرادی طور سے نگرانی کرتا ہے اور اسے بھی تسلیم نہیں کرتا کہ روح باقی رہتی ہے اور حیات بعد الممات کوئی چیز ہے اس لیے اصولاً" پہلے آپ کو اس دعوی پر دلیل پیش کرنا چاہیے نہ کہ مجھے آپ جس سے پوچھیں گے تو بتا دے گا کہ ثبوت پیش کرنا اس شخص کا کام ہے جو کسی بات کا اقرار کرتا ہو یہ کرانا چاہتا ہو' منکر یا آپ کی دلیل سے قائل ہو کر آپ کا ہمنوا ہو جائے گا یا آپ کے دلائل کی

کمزوری کو ثابت کر کے دوسرا ثبوت آپ سے چاہے گا اس لیے براہ کرم پہلے آپ ہی کلام مجید پہ ثابت کیجیے کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں وہ درست ہے' پھر بتاؤں گا کہ آپ کے دلائل کن وجوہ کی بنا پر ناقابل تسلیم ہیں۔

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ روح کے باب میں مغرب کے تازہ انکشافات سے یقیناً میں بے خبر نہ ہوں گا۔ یقیناً" میں بے خبر نہیں ہوں اور نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مکرو فریب کا اتنا بڑا جال شاید ہی دنیا میں کبھی پھیلایا گیا ہو اگر سائنٹیفک امریکن کی شائع کی ہوئی وہ رپورٹ آپ کے سامنے ہے جو ایک کمیشن نے تمام بلاد یورپ کی سیاحت کرنے کے بعد مرتب کی تھی تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت تک جتنے روحا یئن یورپ میں پائے جاتے ہیں' ان میں سے 90 فیصدی مکار و شعبدہ باز ہیں اور باقی دس فیصد وہ ہیں جو اس فریب میں مبتلا ہونے کے بعد قصور فہم کی وجہ سے فریب کو حقیقت باور کرنے لگے ہیں۔

(2) آپ نے آخرت کے وجوب پر تین دلیلیں پیش کی ہیں اور معاف فرمایئے اگر میں یہ کہوں کہ ان میں سے ایک دلیل بھی ایسی نہیں جو فریق ثانی کو قائل کر سکے۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ لفظ دنیا' آخرت پر دلالت کرتا ہے اس لیے آخرت کا ماننا ضروری ہے لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ لفظ دنیا کا وہ مفہوم جو آخرت پر دلالت کرتا ہے کس کا متعین کیا ہوا ہے۔ کیا آپ ہی اس کے واضع اور آپ ہی اس کے مفسر نہیں میرے سامنے اگر لاکھ مرتبہ لفظ دنیا بولا جائے تو کبھی ایک بار بھی اس کو سن کر آخرت کا یقین نہیں ہوتا۔ آپ دنیا کو آخرت کا نقیض بتاتے ہیں۔ میں اسے انعدام کا نقیض سمجھتا ہوں یعنی جس طرح لفظ دنیا بول کر آپ کا خیال اس کے نقیض و آخرت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ یوں مردے اٹھیں گے' اس طرح ان کا حساب و کتاب ہو گا یوں عتاب میں مبتلا کیے جائیں گے وغیرہ وغیرہ اسی طرح لفظ دنیا بول کر میرا خیال اسی کے نقیض انعدام محض کی طرف جاتا ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو حالت عدم میں چلا جاتا ہے گویا کہ وہ کبھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔

آپ کی دوسری دلیل اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "آخرت انتہائی بے نفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم دیتا ہے" درآں حالیکہ آخرت کا جو مفہوم پیش کیا جاتا ہے اس میں سوائے غرض و طمع کے کچھ اور ہے ہی نہیں۔ کیا اچھے کاموں کے عوض میں سونے چاندی کے محلوں دودھ شہد کی نہروں حسین و جمیل دوشیزہ حوروں اور بے ریش و بروت لڑکوں کے دیئے جانے کا وعدہ کرنا بے نفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم ہو

سکتی ہے اور کیا برے کاموں کی پاداش میں شعلہ زار جہنم کا منظر پیش کرنا ایک شخص کو بے نفسی کے ساتھ نیکی کی طرف مائل کر سکتا ہے جبکہ بے نفسی کا تعلق نہ لالچ سے ہونا چاہیے نہ خوف سے اگر ہم کسی کے ساتھ کچھ احسان کرتے ہیں اس ڈر سے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہم کو قید بند میں ڈال دیا جائے گا یا اس لالچ سے کہ اس احسان کا معاوضہ زیادہ بہتر صورت میں ملے گا۔ تو کیا دنیا میں کوئی شخص ہمارے اس فعل کو بے نفسی پر محمول کر سکتا ہے؟ اسی نکتہ کو غالب نے اس طرح بیان کیا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اگر آپ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ جنت و دوزخ کا بیان صرف تشبیہی بیان ہے اور حقیقت کچھ اور ہے تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس بیان میں ترغیب و تخویف ضرور پائی جاتی ہے' جو بے نفسی کے بالکل منافی ہے' میں کہتا ہوں کہ مطلق جزا و سزا کا خیال ہی بے نفسی کو محو کر دینے والا ہے اور جب تک عذاب و ثواب کی تمام کارگاہ کو باطل ٹھہرا کر یہ اصول نہ قرار دیا جائے کہ "نیکی ایک فرض انسانی ہے جو بلا خیال مزد یا بغیر اندیشہ تعزیر ظاہر ہونی چاہیے" بے نفسی کا خیال کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

اس ضمن میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب ہر طاعت کا ثواب اور ہر گناہ کا عذاب اس دنیا میں نہیں ملتا تو کیا وجہ ہے کہ یوم آخرت نہ تسلیم کیا جائے۔

اس میں بھی آپ نے خود ہی ایک بات فرض کر لی ہے اور خود ہی اس کو دلیل بنا کر پیش کر دیا میں تو کہتا ہوں کہ کوئی طاعت ایسی نہیں جس کا ثواب یہاں نہ مل جاتا ہو اور کوئی گناہ ایسا نہیں جس کی سزا انسان کو یہاں نہ بھگتنا پڑتی ہو بشرطیکہ آپ طاعت کا مفہوم "اچھا کام" قرار دیں اور گناہ کا مفہوم برا کام کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ فرض شناسی و ادائے فرض کے بعد ضمیر انسانی کو جو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے اس سے زیادہ مسرت کسی اور چیز میں ہو سکتی ہے اور حق تلفی و ناحق کوشی کے بعد جو اضطراب نفس انسانی میں پیدا ہوتا ہے اس سے زیادہ عذاب کوئی اور ممکن ہے لیکن اگر کسی کا ضمیر بالکل محو ہو چکا ہے اور حق و باطل کی تمیز کسی میں باقی نہیں رہی تو تاریخ عالم اٹھا کر دیکھیے کہ اسی دنیا میں اس کا کیا انجام ہوا' افراد کو چھوڑیے میں تو قومی و اجتماعی زندگی میں بھی اسی اصول کو کار فرما دیکھتا ہوں اور قرآن پاک کی اس آیت پر پوری طرح ایمان لاتا ہوں کہ

هل یہلک الا القوم الفاسقون

پھر بتایئے کہ کیا اس آیت میں جس ہلاکت قومی کا ذکر کیا گیا ہے وہ کسی اور دنیا سے متعلق ہے' اور کیا یہ عذاب آپ کی مفروضہ اخروی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

ممکن ہے ابھی آپ کی تسکین نہ ہوئی ہو' لیکن اگر میں خود کلام مجید سے یہ ثابت کروں کہ عذاب و ثواب کا تعلق اسی دنیا سے ہے تو پھر آپ کیا کہیں گے۔ اچھا تکلیف تو ہو گی کلام مجید اٹھایئے اور سورۃ ہود کی آیات 106 اور 107 اور 108 ملاحظہ فرمایئے ارشاد ہوتا ہے۔

فاما الذین شقوا ففی النار لھم فیھا زفیر و شھیق خلدین فیھا مادامت السموات والارض واما الذین سعدوا ففی الجنۃ خلدین فیھا مادامت السموات ولارض۔

جن لوگوں نے شقاوت کی' وہ آگ میں پڑے کراہ رہے ہوں گے اور اسی حالت میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین کا وجود ہے اور جن لوگوں نے اچھے کام کیے وہ جنت میں رہیں گے' جب تک آسمان و زمین کا وجود ہے۔

کیا عذاب و ثواب کو اس دنیا سے متعلق سمجھنے کے لیے اس سے زیادہ روشن و واضح الفاظ کی ضرورت ہے کیا مادامت السموات والارض کے الفاظ اس بات کا ثبوت نہیں کہ جنت و دوزخ اس دنیا سے علاوہ کسی اور عالم سے متعلق نہیں کیونکہ اگر آپ عذاب و ثواب کو عالم آخرت سے متعلق کریں گے تو پھر مادامت السموات والارض کہنا کوئی معنی رکھے گا۔

عالم آخرت تو آپ کے نزدیک قیامت یا ماوراء عالم دنیا سے واسطہ رکھتا ہے جب یہ زمین و آسمان کچھ نہ ہوں گے۔

آپ کی تیسری دلیل جس میں آپ نے جناب امیر اور یہودی کی گفتگو کا حوالہ دیا ہے اس کے متعلق سوا اس کے کیا عرض کروں کہ۔

ہر تمنا ہائے عرفی خندہ می آید مرا

اسی قسم کا ایک واقعہ جناب امام جعفر صادق کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کسی ملحد نے آپ سے سوال کیا کہ مرنے کے بعد روح کہاں چلی جاتی ہے آپ نے جواب دیا چراغ گل ہونے کے بعد روشنی کہاں چلی جاتی ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ جواب سننے کے بعد وہ ایمان لے آیا۔

در آں حالیکہ نہ جناب امیر کے جواب پر یہودی کو آخرت پر ایمان لانے کی ضرورت تھی اور نہ ملحد کو جناب امام جعفر صادق کے استدلال پر مسلمان ہونے کی۔

میرے نزدیک یہ دونوں روایتیں نا درست ہیں اور میں کبھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ جناب امیر یا جناب امام جعفر صادق نے ایسی بچوں کی سی باتیں کہ ہوں گی' کیونکہ تھوڑی دیر کے لیے ہم مان بھی لیں کہ جناب امیر کا جواب مسکت تھا اور یہودی بھی جنت پر ایمان لے آیا تو کیا اس کا آخرت کے وجود کو تسلیم کرنا حقیقتاً" اطمینان قلب کے ساتھ تھا یعنی اس دلیل سے کوئی اذعانی کیفیت اس کے دل میں پیدا ہو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں' اس نے اگر مانا بھی تو صرف اس لیے کہ ایسا ماننے میں کوئی حرج نہیں اور مصلحت اسی میں ہے پھر مصلحت و یقین میں جتنا فرق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

فرض کیجیے میں آپ کے پاس آؤں اور کہوں کہ مجھ میں اتنی قوت موجود ہے کہ چاہوں تو آپ کے کپڑوں میں آگ لگا دوں اور واقعی میں آگ لگا دوں گا۔ اگر آپ نے میری اس قوت کا اعتراف نہ کیا' آپ کو اس کے ماننے میں تامل ہوتا ہے' لیکن آپ کا ایک دوست آتا ہے اور کہتا ہے کہ مان بھی لو تمہارا کیا حرج ہے' اگر اس میں ایسی قوت نہیں ہے تو مان لینے میں تمہارا کیا نقصان ہے' لیکن خدا کے لیے بتایئے کہ کیا آپ کا یہ اعتراف تصدیق قلب کے ساتھ ہو گا' ہرگز نہیں۔ پھر اگر جناب امیر کی اس دلیل پر وہ یہودی ایمان لے بھی آیا تو کیا واقعی وہ مسلمان ہو گیا ہو گا۔ جبکہ اسلام و ایمان کے لیے تصدیق بالقلب ضروری ہے'۔

یہی حال جناب امام جعفر صادق کی دلیل کا ہے۔ ایک ملحد جو روح کی بقا کا منکر ہے' آپ سے سوال کرتا ہے کہ مرنے کے بعد روح کہاں جاتی ہے آپ چراغ کی روشنی کا حوالہ دے کر خود اسی سے پوچھتے ہیں کہ بتا وہ کہاں چلی جاتی ہے' آپ ہی انصاف فرمایئے کہ اس میں بقائے روح کے لیے کون سی دلیل پیش کی گئی بلکہ اس سے تو اسی ملحد کے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ جس طرح چراغ گل ہونے کے بعد اس کی ضو فنا ہو جاتی ہے اسی طرح مرنے کے بعد روح بھی فنا ہو جاتی ہے' اکابر اسلام سے اس قسم کی روایتوں کو نسبت دینا حقیقتاً" ان کی توہین کرنا ہے اور یہ نتیجہ صرف ان ادنی درجہ کی ذہنیتوں کا جو اپنی دماغی اپج کو اہمیت دینے کے لیے خواہ مخواہ بڑے بڑے لوگوں سے اس کو منسوب کر دیتے ہیں۔ جناب امیر اور جناب امام جعفر صادق کا کیا ذکر ہے' احادیث اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ خود رسول اللہ کی

ذات گرامی سے ایسے افعال منسوب کیے جاتے ہیں کہ آج ان کو دیکھ کر شرم آتی ہے اور عقل حیران رہ جاتی ہے کہ کیا ایک رسول کے اخلاق واقعی ایسے ہو سکتے ہیں اور کیا ایک ملہم من اللہ ہستی سے ایسی باتوں کا اظہار ہونا کسی طرح ممکن ہو سکتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ میں آخرت کو کیوں نہیں مانتا یعنی قیامت اور جزا و سزا کے نظریہ کو کیوں قابل قبول نہیں جانتا۔ اس کے متعلق آپ مجھ سے کوئی استفسار نہ کیجیے۔ بلکہ خود ان تمام روایات کا تفصیلی طور پر مطالعہ کیجیے جو اس باب میں بیان کی جاتی ہیں کہ مرنے کے بعد سے لے کر دوزخ یا جنت میں پہنچنے تک کیا کیا مراحل و منازل سامنے آتے ہیں اور پھر خود ہی اپنی عقل سے کام لے کر فیصلہ کیجیے کہ باور کرنے کے لائق ہیں یا نہیں۔

○ ○ ○

بعد المشرقین

جناب ملک محمد سمیع اللہ خانصاحب تحصیل دار کالپی

کے ایک خط کا جواب

معاف فرمایئے یہ چند سطور جذبہ دل سے متاثر ہو کر آپ کو لکھ رہا ہوں۔

یوں تو آپ کا نام کافی عرصہ سے سنتا تھا۔ مگر اس سے قبل نہ تو آپ کے متعدد و مسلسل مضامین دیکھے تھے اور نہ کبھی شرف نیاز کا موقعہ حاصل ہوا تھا۔ ایک شوق تو پورا ہو رہا ہے دوسری تمنا دیکھیے کب بر آئے اخباروں میں آپ کے علم و عقائد کے متعلق بہت پراپیگنڈا ہوتا رہا اگر میں نے آپ کے مضامین دیکھنے کی طرف کبھی توجہ نہیں کی اتفاق سے میرے ایک دوست نے جو یہاں ڈاکٹر ہیں نگار کا ایک مضمون دکھلایا اس کا پڑھنا تھا کہ شوق و جستجو کا یہ عالم ہوا کہ بہت سے پرانے پرچے نگار کے منگوا کر اور چن چن کر آپ ہی کے مضامین دیکھے۔ اس میں شک نہیں کہ لطف بیان آپ کا حصہ ہے اور واقفیت عامہ سے اکثر مضامین آپ کے لبریز ہوتے ہیں۔ آپ کے بعض بعض اصول اور عقائد سے گو مجھ کو اتفاق نہیں۔ تاہم پھر بھی جو کچھ آپ کر رہے ہیں وہ بہت ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں کہوں کہ جس طرح ایک طرف مولویوں کی جماعت اپنی کوتاہ نظری میں نقطہ بعد پر ہے' اسی طرح وسعت خیال اور آزاد روی میں جناب دوسرے کنارے پر ہیں۔ اگر کاش بین بین کے نیک اصول پر آپ اتر آئیں تو شاید مسلم سوسائٹی کے واسطے جوہر بے بہا ثابت ہوں' اس میں شک نہیں کہ آپ کا علم' آپ کی فراست آپ کی ذہانت اور آپ کی قوت استدلال ایسی ہے کہ آپ جو چاہیں ثابت کر سکتے ہیں۔ مگر خدا را یہ تو فرمایئے کہ صحیح راستہ سوائے ایک کے دوسرا کیسے ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ آپ کا خیال ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اعمال حسنہ اچھی چیز ہیں لیکن بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر رہبر صحیح ہے تو منزل مقصود پر آدمی پہنچ جائے گا ورنہ باوجود کوشش اور محنت کے بھٹک جائے گا۔ بہرطور میرے خیال میں قرب الہی بھی ضروری ہے' معاف کیجیے گا میری اس جسارت کو کہ آپ جیسے جدید عالم متبحر کے مضامین پر ایک قسم کی رائے زنی کرتا ہوں' لیکن یہ الفاظ محض ایک رو میں قلم

سے نکل گئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میرے دل کو آپ کی طرف سے نادیدہ انسیت کیوں پیدا ہو گئی ہے۔

○ ○

مجھے یہ معلوم کر کے ازبس مسرت حاصل ہوئی کہ آپ نے میرے عقائد اور مقاصد نگار کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ نگار کا مطالعہ کرنے کے بعد قائم کی ہے اور آپ نے عوام کی طرح محض مولویوں کے غلط پراپیگنڈے پر اعتماد کر کے مجھے کافر و ملحد سمجھنے کا ثواب حاصل نہیں کیا۔

آپ اپنی تحریر میں ایک جگہ ظاہر فرماتے ہیں کہ میرے بعض اصول و عقائد سے آپ کو اتفاق نہیں' بہتر ہوتا اگر آپ ان کی صراحت فرما دیتے کیونکہ تحریر گرامی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کا جو اعتقاد میں نے معلوم کیا ہے بعینہ وہی اعتقاد میرا بھی ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اصولاً آپ کو میرے کس خیال سے اختلاف ہے۔

ممکن ہے کہ آپ نے بعض فروعی مسائل کو اصول میں شامل کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہو یا کہ میری بعض تعبیرات کو ناپسند فرماتے ہوں۔ بہر حال آپ ہی کے دو مقرر کردہ اصول کو سامنے رکھ کر خیال کی اجازت چاہتا ہوں ممکن ہے کہ یہ پردہ اٹھ جائے اور پھر آپ مجھے بھی اسی جگہ میں پائیں جہاں آپ کا پائے ثبات قائم ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اعمال حسنہ اچھی چیز ہیں لیکن بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی کیسے ہو سکتی ہے دوسرے یہ کہ آپ کے خیال میں قرب الٰہی بھی ضروری چیز ہے معاف فرمائیے اگر میں سب سے پہلے آپ سے یہ سوال کروں کہ "بارگاہ میں رسائی ہونے" کا کیا مفہوم ہے اور "قرب الٰہی" سے آپ کا کیا مقصود ہے اگر قرب الٰہی اور بارگاہ کی رسائی سے آپ کا مدعا ایک ہے (اور غالباً" ایسا ہی ہو گا) تو آئیے سب سے پہلے اسی مسئلہ پر غور کر لیں کہ مذہبی زبان میں یہ الفاظ بول کر کیا مفہوم مراد لیا جاتا ہے اور حقیقت کے لحاظ سے یہ کیا ہیں؟ اتنا تو غالباً" آپ بھی تسلیم کرتے ہوں گے کہ "قرب الٰہی" سے وہ نزدیکی یا مواصلت مراد نہیں ہو سکتی جیسی اس دنیا میں دو انسانوں یا دو مادی اشیاء کے درمیان پائی جاتی ہے اور نہ "بارگاہ کی رسائی" سے اس نوع کا قرب مقصود ہو سکتا ہے جیسا ایک غریب کسان کو کبھی کبھی آپ کے حضور میں حاصل ہو جاتا ہے پھر جب حقیقت یہ نہیں ہے تو غور کرنا چاہیے کہ اہل مذہب کی اس سے کیا مراد ہے اور وہ اس پند و موعظت سے کس نتیجہ پر پہنچنا

چاہتے ہیں۔

میں اس وقت ذات باری کی حقیقت سے بحث نہیں کروں گا اور نہ اس الجھن میں پڑوں گا کہ اس کی ذات و صفات میں تفریق ممکن ہے یا نہیں! بلکہ نہایت سادگی کے ساتھ صرف اس تعلق پر غور کروں گا جو خدایا قدرت کے ساتھ نوع انسانی کو حاصل ہے یہ امر یقیناً" محتاج صراحت نہیں کہ خدا جس کو بے نیاز مطلق کہا جاتا ہے' وہ آفرید گار جو اپنی ذات سے کامل و اکمل ہے اور وہ قدرت جو بلا کسی رعایت کے ہر وقت مصروف کار ہے' کسی فانی مخلوق کی کبھی محتاج نہیں ہو سکتی اور نہ ہمارا کوئی فعل اس کو کسی طرح متاثر کر سکتا ہے پھر جب حالت یہ ہے تو ظاہر ہے ہمارے اعمال کا اثر ہماری ہی ذات پر ہونا چاہیے ہماری ہی زندگی کو ان سے متاثر ہونا چاہیے اور ہماری اچھائیوں یا برائیوں کا دائرہ اثر ہماری معاشرتی و تمدنی زندگی سے آگے نہ بڑھنا چاہیے یعنی اگر ہم اچھے کام کریں گے تو اس کا نتیجہ ہمارے ہی لیے بہتر ہو گا اور اگر معاصی و بداخلاقی میں مبتلا ہوں گے تو ہم خود تباہ و برباد ہوں گے یہی ہے وہ نکتہ جس کو کلام مجید میں کہیں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ

ان الله لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا واما بانفسهم

کسی جگہ ان الله یهدی من یشاء (عام طور پر اس کے یہ معنی لیے جاتے ہیں کہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے حالانکہ یهدی کا مفعول پورا فقرہ من یشاء واقع ہوا ہے اور یشاء کا فاعل من ہے اس لیے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ ہدایت دیتا ہے اس کو جو خود اپنی ہدایت چاہتا ہے۔) کہہ کر اس کے توضیح کی گئی ہے اور کہیں طرز بیان بدل کر اسی حقیقت کو اس طرح ظاہر فرمایا ہے کہ فهل یهلک الا القوم الفسـاسقون اور کسی جگہ ان الارض یرثها عبادی الصلحون سے اس راز کو کھول دیا گیا ہے۔

بہر حال آپ تمام کلام مجید کا مطالعہ کر جایئے۔ کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملے گی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ہمارے اعمال خدا کو بھی کسی طرح متاثر کر سکتے ہیں اور اس کی برہمی یا خوشنودی کا مفہوم ہماری تباہی یا فلاح کے علاوہ کچھ اور ہے اس لیے قرب الٰہی یا رسائی بارگاہ کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ٹھہرتا کہ اگر ہم اچھے اعمال کے پابند ہوں گے تو فلاح و ترقی کی صورت میں جو نتیجہ پیدا ہو گا۔ اسے مذہبی زبان میں قرب الٰہی سے تعبیر کریں گے اور اس کے برعکس اگر ہمارے اخلاق ذلیل اور ردی ہوں گے تو تباہی و بربادی میں مبتلا ہو جائیں گے اور یہی ہے خدا سے دوری یا اس کی برہمی و ناخوشی۔ پھر اگر آپ

اس خیال کو اور زیادہ وسیع کریں اور خدا و انسان کے تعلق پر زیادہ غائر نگاہ ڈالیں تو باسانی یہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ دوزخ و جنت بھی اپنی اسی اہلیت و نااہلیت سے متعلق ہے اور قومی خوش حالی و بربادی کے اظہار کے لیے "جنات نعیم" اور "اسفل السافلین" سے بہتر الفاظ کوئی اور ہو ہی نہ سکتے تھے۔

بہر حال اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں کہ انسان کو عقل و ہوش عطا کیے جانے کا اقتضا یہی ہونا چاہیے کہ اس سے اچھے کاموں کی توقع کی جائے جو مقصود آفرینش ہے پھر جب اصل چیز صرف اعمال حسنہ قرار پائے تو یہ کہنا کہ بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی کیسے ہو سکتی ہے صرف یہی معنی رکھ سکتا ہے کہ ہم کو درستی اخلاق کے لیے کوئی صحیح و موثر طریقہ ضرور اختیار کرنا چاہیے لیکن اس طریقہ یا وسیلہ کو اصل مقصود نہ قرار دینا چاہیے۔

الہیات کا مشہور مسئلہ ہے کہ آلہ یا ذریعہ صرف ایک آلہ یا ذریعہ ہونے کی حد تک قابل اختیار ہوتا ہے نہ کہ اصل مقصود کی حیثیت سے اور یوں بھی روز کی زندگی میں ہم اس حقیقت کا مطالعہ کر سکتے ہیں کہ وسیلہ و مقصود یا جادہ و منزل میں کتنا فرق ہے۔

اگر آپ نے اس حد تک میرے صحیح مدعا کو سمجھ لیا ہے تو باآسانی آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ میرے اور مولوی کے اعتقادات میں کیا فرق ہے میں کیا کہتا ہوں اور وہ کیا سمجھانا چاہتا ہے اصول مذکورہ بالا کی بناء پر میرا کہنا یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم کا مقصد انسان کے اخلاق کو درست کرنا تھا۔ اور ان میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ وقت و زمانے کے لحاظ سے ہر نیا دین اپنے پہلے دین کے لحاظ سے زیادہ مربوط و مستحکم آئین لے کر آتا تھا' حتیٰ کہ اسلام کا ظہور ہوا اور اس نے ایک حرف آخر کی صورت سے ہمیشہ کے لیے انسان کو کسی اور مذہب کی استمداد سے بے نیاز کر دیا لیکن اسلام کا مذہب کیا تھا' اسلام کی تعلیم کیا تھی؟ (یہاں ایک بہت باریک نکتہ ہے جسے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں) صرف یہی کہ محض اخلاق حسنہ پیدا کرنا ہی اصل مذہب ہے' اور کسی مذہب کی پابندی صرف اس خیال سے کہ محض اس کی پابندی نجات و فلاح کے لیے کافی ہے بالکل بے اصل چیز ہے یہی وہ راز تھا جس کو غالب نے یوں بیان کیا ہے کہ

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یعنی اصل ایمان نام ہے مذہب "ترک مذہب" کا محض درستی اخلاق کا اور اس بنا پر کہا جانے کہ اب اسلام کے ظہور کے بعد کسی مذہب کی ضرورت دنیا میں باقی نہیں رہتی'

کیونکہ اس کا مفہوم ہی یہ ہے کہ بغیر کسی پابندی رسوم و رواج یا شعائر ظاہری کے صحت اخلاق کو مطمح نظر قرار دیا جائے۔

پھر اگر حقیقت یہ نہیں ہے تو بتایئے کہ اسلام کا فطری مذہب ہونا کیا معنی رکھتا ہے' رسول اللہ کا رحمۃ اللعالمین ہونا کیا مفہوم رکھ سکتا ہے اور مسلمان کیونکر اخوت عامہ کے عالمگیر رشتہ سے مشرق و مغرب کے تمام انسانوں کو باہمہ دگر وابستہ کر سکتے ہیں۔

میں نے کبھی نہیں کہا کہ نماز روزہ بری چیز ہے بلکہ ہمیشہ یہی ظاہر کیا کہ اگر ان سے درستی اخلاق مقصود ہو تو ان کا اختیار کرنا ضروری ہے' لیکن میں اس کا قائل کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہوں کہ محض نماز پڑھ لینا یا ایک مہینے کے روزے رکھ لینا ہی اصل ایمان ہے یہ سب ذرائع و وسائل ہیں مقصود حقیقی تک پہنچنے کے اس لیے اگر یہ منزل تک پہچانے والے ثابت نہ ہوں تو ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور ہماری تمام عبادات جسد بے روح ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر عبادات اسلام بجائے خود ضروری نہ ہوں اور محض اخلاق حسنہ ہی پر انحصار ہو نجات کا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ غیر مسلم افراد بھی جو پاکیزہ اخلاق رکھتے ہیں ناجی نہ ہوں اور اس طرح اسلام کی خصوصیت پھر کوئی باقی نہیں رہتی میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ بے شک یہی ہونا چاہیے کیونکہ میں نجات کا مفہوم وہ لیتا ہوں جو اسی دنیا کی فلاح و ترقی سے متعلق ہے اور وہ یوم آخرت یوم میثاق وغیرہ سے متعلق کرتے ہیں جن کا میں قائل نہیں ہوں اور نہ کوئی عقلی دلیل ان کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے علی الخصوص اس وقت جب کہ خود کلام مجید سے میرے قول کی تائید ہوتی ہے۔

آپ اگر تعلیمات اسلام کی روح پر غور کریں گے (اور یقیناً" آپ نے غور کیا ہو گا) تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس سے زیادہ سادہ چیز کسی مذہب نے پیش نہیں کی رہا اس کا روح کو پیدا کرنا سو اس کے لیے بے شک عوام کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر ایک خاص لٹریچر پیدا کرنا پڑا اور اس طرح آخرت' معاد' عذاب' ثواب' دوزخ' جنت' قرب الہی وغیرہ کی سینکڑوں اصطلاحات جاری ہو گئیں ورنہ۔

حسنک واحد و عبارا تنا شتی

اس میں کلام نہیں کہ میں بھی وسعت خیال کے لحاظ سے انتہائی نقطہ پر ہوں اور مولوی

بھی اپنی تخیّل خیال میں جواب نہیں رکھتا' لیکن یہ "بین بین" کیا چیز ہے- اگر مذہب نام اسی چیز کا ہے جو مولوی بتاتا ہے سو اس کو آج نہیں تو کل مٹ جانا ہے اور پھر اس کے بعد اس کی بقاء کی صورت صرف وہی ہے جو میں پیش کر رہا ہوں- پھر اب یہ آپ کی خوشی ہے جو چیز کل مٹنے والی ہے اسے آج ہی ترک کر دیں یا کل پر اٹھا رکھیں-

جاں بجاناں دہ دگرنہ از تو بستاند اجل
خود تو منصف باش اے دل ایں بکن یا آں بکن

○ ○ ○

دشمن اسلام کون ہے؟

مذہب یا دین اگر کوئی ایسی حقیقت ہے جو خدا کی طرف سے ظاہر کی گئی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حقیقت کبھی بدل سکتی ہے اور کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ حقیقت تک پہنچنے میں وہ موانع حائل کرتا رہے۔

آپ کسی پابند مذہب شخص سے سوال کیجیے تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گا کہ مذہب یقیناً" خدا کی ظاہر کی ہوئی حقیت ہے اور وہ کبھی اس کو پسند نہیں کرتا کہ انسان کو حقیقت تک پہنچنے سے باز رکھا جائے۔

اچھا اب آپ مختلف مذاہب والوں سے علیحدہ علیحدہ پوچھیے کہ جب مذہب خدائی حقیقت ٹھہرا تو اس میں تنوع کی کیا ضرورت تھی اور اس نے مختلف مذاہب پیدا کر کے انسان کو کیوں الجھن میں ڈال دیا اس کا جواب ایک آتش پرست یہ دے گا کہ حقیقت تو ایک بار زردشت کے ذریعہ ظاہر کی جا چکی ہے ایک یہودی کہے گا کہ حقیقت تو صرف موسوی تعلیم کا نام ہے' ایک عیسائی دعویٰ کرے گا کہ صداقت کی تبلیغ تو صرف عیسیٰ نے کی' اسی طرح بودھ مت والا بودھ کی تعلیمات کو' ایک ہندو کرشن کی ہدایت کو ایک اور مسلمان محمد کے بتائے ہوئے معتقدات کو حقیقت و صداقت سے تعبیر کرے گا اور باقی تمام مذاہب کو حقیقت سے دور ظاہر کر کے لغو و باطل قرار دے گا۔

اب غور کیجیے کہ ایک شخص جو مذہب کے خیال سے بالکل خالی الذہن ہے یہ سن کر کیا اثر قبول کرے گا۔ وہ اگر زیادہ آزادی سے کام لے کر سب کو لغو نہ کہہ دے گا تو وہ تحقیق و جستجو ضرور کرے گا تاکہ کوئی فیصلہ کر کے کسی ایسے نتیجہ پر پہنچے جو اس کے قابل قبول ہو۔

اچھا آیئے ہم آپ بھی بالکل خالی الذہن ہو کر جستجو کریں کہ صداقت کس مذہب کی تعلیمات میں پائی جاتی ہے اور مذہب کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ کسی مذہب کو خدا کی بتائی ہوئی حقیقت و صداقت کہنا کیا معنی رکھتا ہے اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں' ایک یہ کہ خدا

براہ راست اپنے خدائی الفاظ اور اپنی السنہ زبان میں اس کی تلقین فرمائے یا اپنے کسی خاص بندے میں غور و تامل کی غیر معمولی کیفیت پیدا کر کے اصول مذہب وضع کرنے کی طرف مائل کرے' بہرحال جو صورت بھی ہو' اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب کی صداقت کا تعلق ماحول و زمانہ سے ہوا کرتا ہے اور وقت و حالات کے لحاظ سے اس میں تغیر و تبدل ہونا ضروری ہے کیونکہ مذہب نام ہے ان اصولوں کا جو اصلاح اخلاق و معاشرت کے کام آئیں اور چونکہ اخلاق و معاشرت کے معیار کا اختدلو زمانہ کے ساتھ بدل جانا ضروری ہے اس لیے وقتاً" فوقتاً" اصول مذہب کا تغیر بھی لازم ہے۔

انھیں اصول زندگی پر لوگوں کو مستحکم کرنے کے لیے بعض معتقدات دینی وجود میں آئے جو لوگوں کو معاشرتی قانون کی پابندی پر مجبور کرنے کے لیے ذریعہ و وسیلہ کا کام دیتے تھے' مثلاً یہ کہ جو قانون پیش کیا جاتا ہے وہ خدا کا نازل کیا ہوا ہے اور جس شخص کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے وہ خدا کا خاص بندہ ہے اور معجزات کا مالک ہے یا یہ کہ جو شخص اس کی پابندی کرے گا اسے مرنے کے بعد طرح طرح کے نعائم ولذائذ حاصل ہوں گے اور جو پابندی نہ کرے گا وہ ایک آگ میں ڈالا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ ایک شخص جو صرف ان معتقدات کا ماننے والا ہے اور ان سے آگے بڑھ کر اپنے اخلاق کو متاثر نہیں ہونے دیتا' بہ لحاظ نتیجہ اس کے یہ دینی عقائد بالکل بیکار ہیں' کیونکہ مقصود تو شارع کا جسے آپ نبی' رسول' مرشد' رشی' دیوتا وغیرہ کے نام سے پکارتے ہیں' پورا ہی نہیں ہوا اور عقائد محض عقائد ہونے کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

الغرض اصل مقصود صرف اصلاح اخلاق و معاشرت ہے اور اس کے حصول کے لیے بعض غیر معمولی دماغ رکھنے والے لوگوں نے دین یا شریعت کو رائج کر کے بعض مخصوص عقائد پیدا کیے تاکہ لوگوں کو ترغیب و تخویف سے حقیقی مدعا کی طرف لا سکیں۔

اس جگہ یہ سوال اٹھانا کہ اگر عقائد دینی کوئی حقیقت نہیں رکھتے تو کیا انبیا نے ان کو حقیقت ظاہر کر کے غلط بیانی سے کام لیا' درست نہیں' کیونکہ اول تو اس امر کا امکان ہے کہ ان میں سے اکثر نے ان عقائد کو واقعی حقیقت باور کر کے پیش کیا ہو اور دوسرے یہ کہ اگر بعض نے ایسا نہیں سمجھا تو دوسروں کی اصلاح کے لیے ایسا کرنا قرین مصلحت جانا ہو گا اور مصلحت کے لحاظ سے کوئی بات ایسی کہہ دینا جو واقعہ کے خلاف ہو کبھی مورد الزام نہیں ہو

سکتا۔

وہ عقائد دینی جو آج معرض بحث میں ہیں' زیادہ تر مابعد الطبیعات سے متعلق ہیں یا خدا کے مفہوم سے یعنی اہل مذاہب ایک بات تو یہ کہتے ہیں کہ حقیقی زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہو گی اور وہاں عذاب و ثواب' دوزخ و جنت وغیرہ کے معاملات پیش ہوں گے اور دوسری یہ کہ خدا نام ہے ایک ہستی کا جس نے تمام عالم کو اس طرح پیدا کیا جس طرح ایک صناع اپنے قائم کیے ہوئے ارادہ کے ساتھ کسی چیز کو تیار کرتا ہے اور وہ خدا اقادر ہے' جس وقت جو چاہے تغیر و تبدل کر کے کائنات کے نظام کو بدل دے۔

آپ اگر جستجو کریں گے تو معلوم ہو گا کہ یہ عقائد معہ تمام جزئیات کے کسی ایک قوم یا ملک سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ کم و بیش ہر اس قوم یا ملک میں پائے جاتے ہیں' جہاں کوئی مذہب پایا جاتا ہے' اس لیے یہ امر غور طلب ہے کہ مسلمات عقائد دنیا کی تمام مذہبی قوموں میں کیوں تقریباً" ایک ہی پائے جاتے ہیں اور وہ کون تھا جس نے اول اول ان کو حقائق جان کر پیش کیا ہرچند امرثانی کی تعیین دشوار ہے لیکن امراول کی نسبت یہ کہنے میں قطعاً" تامل نہیں ہو سکتا کہ ہر جدید مذہب نے ماسبق مذہب کے منعقدات سے فائدہ اٹھایا اور یہ سلسلہ عہد قدیم تک پہنچ کر اس زمانہ وحشت تک پہنچ جاتا ہے جب انسان کے تجربات دنیا میں بہت تھوڑے تھے اور اس کا علم حد درجہ ناقص و ناکمل تھا۔

مثلاً آپ جنت اور حور و غلمان کو لیجئے۔ کیا کوئی مسلمان دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسلام سے قبل یہ خیال یا عقیدہ کسی اور مذہب میں نہ پایا جاتا تھا۔

اگر آپ قدیم ایرانی اور آرین لٹریچر کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ تقریباً" یہی عقیدہ اس زمانہ میں بھی پایا جاتا تھا۔ فارسی زبان میں ایک لفظ پری ہے جو قدیم ایرانی زبان میں "پیرک" تھا اور پیروان زردشت کا عقیدہ تھا کہ یہ آسمانی دیویاں ہیں جو ہوا میں رہتی ہیں اور اس قدر جمیل ہیں کہ ان کے دیکھتے ہی انسان فریفتہ ہو جاتا ہے چنانچہ خود عربی لفظ فردوس ایرانی لفظ ہے۔

لفظ حور کے متعلق ہمارے علماء کا خیال ہے کہ وہ خاص عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی میں سفیدی و پاکیزگی کا مفہوم غالب ہے' درآنحالیکہ اس کا ماخذ اوستا کا لفظ "ہورہ" ہے جسے پہلوی زبان میں ہورا اور موجودہ فارسی میں خور کہتے ہیں جس کے معنی نور روشنی اور مجازاً" آفتاب کے ہیں۔ حور و غلمان کا عقیدہ ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے اور ان کے لیے "

اپسرا" اور "گندھرب" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

کسی غزوہ میں مارے جانے پر شہید ہونے اور جنت میں جانے کا خیال بھی آرین خیال ہے' چنانچہ دھرم شاستر میں لکھا ہے کہ "جنگ میں جو لوگ بہادری سے لڑتے ہیں اور' پیٹھ نہیں دکھاتے وہ بہشت میں جاتے ہیں" اسی طرح اندر راجہ نل سے جس وقت خطاب کرتا ہے تو بہشت کا ذکر کرتا ہے۔

اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ازل میں تمام روحیں پیدا ہو چکی تھیں اور انھوں نے "قالو بلٰی" کہا تھا پارسیوں کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اوستا میں اس کے لیے لفظ "فروشی" پایا جاتا تھا' اور پہلوی زبان میں اس کو "فیروہر" کہتے ہیں۔ الغرض یہ عقیدہ کہ روحیں پہلے سے موجود ہیں' مجوس کے یہاں پایا جاتا ہے۔

اسی طرح ملک الموت کا خیال بھی مجوس کا خیال ہے اور ان کے یہاں بھی ایک فرشتہ "استو وید ہوتوس" کے نام سے پایا جاتا تھا جو روح کو جسم سے جدا کرتا تھا۔

عزرائیل کے متعلق مسلمانوں میں جو روایات پائی جاتی ہیں وہ بھی بہت کچھ قدیم ایرانی روایات سے ملتی جلتی ہیں اور آدم و ابلیس' سانپ اور طاؤس کے متعلق جو کچھ مسلمانوں میں بیان کیا جاتا ہے وہ بھی مجوسی روایات میں نظر آتا ہے' اسی طرح' میزان' صراط' نور محمدی' حشر و نشر' حساب و کتاب' دوزخ و جنت' وغیرہ کے متعلق جو اعتقادی مسائل اسلام میں پائے جاتے ہیں وہ قبل اسلام بھی بعض مذاہب میں پائے جاتے تھے اور اگر تمام مذاہب کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہو گا کہ ایک وقت نامعلوم سے یہ خیالات نوع انسانی میں پرورش پاتے چلے آرہے ہیں اور انسان کی بالکل ابتدائی ذہنی نشو و نما کی یاد گار ہیں۔

ابتدائے عہد انسانی میں جب کوئی شخص غیر معمولی عقل و ذہانت رکھنے کی وجہ سے اپنے قبیلہ کا سردار بن جاتا تھا تو اس پر دو فرض عائد ہوا کرتے تھے' ایک یہ کہ وہ قبیلہ کے تمدنی و معاشرتی نظام کو قائم رکھے' اور دوسرے یہ کہ وہ افراد و قبیلہ کے دل میں پیدا ہونے والی الجھنوں کو دور کرے۔

لوگ رات کو خواب دیکھتے تھے اور اس سے آکر پوچھتے تھے کہ اس کا کیا مطلب ہے کوئی مرجاتا تھا تو اس سے دریافت کیا جاتا تھا کہ وہ کہاں گیا کسی کو کوئی مرض لاحق ہوتا تھا تو اس سے استصواب کیا جاتا تھا" الغرض ان کی ہر خواہش و جستجو کا مرکز سردار قبیلہ ہوا کرتا تھا اور اسے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی جواب دینا پڑتا تھا کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو

اس کی قائدانہ حیثیت ختم ہو جاتی اور قبائلی نظم و نسق میں وہ کامیاب نہ ہو سکتا۔

پھر چونکہ مرنے والوں کے ساتھ زندگی میں محبت و رفاقت کا جذبہ متعلق ہوتا تھا اور ان جدائی سے لوگوں کو تکلیف پہنچا کرتی تھی اس لیے بجائے روح کے خیال نے ان کو تسکین دی گئی اور روح کو عذاب و ثواب کا محل قرار دے کر ترغیب و تخویف کی وہ صورتیں اختیار کی گئیں جو اصلاح قبائل اور اصول معاشرت کے قیام کے لیے ضروری تھیں۔

اس میں شک کرنے کی گنجائش نہیں کہ جتنے معتقدات دنیا میں پیدا ہوئے وہ سب نتیجہ ہیں قیاس کا اور چونکہ قیاس کا تعلق موجودات کے تصورات سے ہوا کرتا ہے اس لیے حیات مابعدالموت کے متعلق بھی ایک انسان نے اپنے قیاس سے کام لے کر وہی باتیں کیں جو دنیاوی زندگی میں پیش آتی ہیں۔

خدا کا وہی قہرمانی تصور جو دنیاوی بادشاہوں کا ہوا کرتا ہے' اس کا وہی مختار کل ہونا جو ایک مستبد حکمران انسان کی خصوصیت ہے۔ بہشت میں انھیں لذائذ و نعائم کا ذکر کرنا جن کی خواہش دنیا میں ہوا کرتی ہے اور دوزخ کے وہی دل ہلا دینے والے مناظر بیان کرنا جن سے عالم آب و گل میں ایک انسان پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ سب اسی قیاس کی بنا پر تھے جو تجربات دنیا کے سلسلہ میں قائم کیے گئے اور جس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

مثلاً آپ اسلام کو لیجیے کہ جس سرزمین میں اس کا ظہور ہوا وہاں کے باشندوں کی کیا حالت تھی دنیاوی لذائذ و نعائم میں عورت' شراب' دودھ' شہد اور فواکہ' ان کا انتہائی نقطہ نظر تھا اور ان کی قساوت و سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ گرم پتھروں پر لٹا لٹا کر ایک آدمی کو مار ڈالنا ان کا روز کا مشغلہ تھا' جہل ولاعلمی کا یہ عالم تھا کہ اپنی بے علمی و بے خبری پر فخر کیا کرتے تھے اور بڑھ کر معمولی معمولی باتوں پر سالہا سال تک کشت و خون جاری رہنا وہاں کا معمولی منظر تھا' باوجود ایک ہی سرزمین میں سانس لینے کے ہر قبیلہ کا معبود جدا تھا اور افتراق کی وہ تمام مکروہ صورتیں جو بھائی کو بھائی سے اور گوشت کو ناخن سے جدا کر دیا کرتی ہیں ان میں بدرجہ کامل پائی جاتی تھیں۔

ظاہر ہے کہ اس حالت میں ایک مصلح یا ریفارمر کا اولین فرض یہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ ان کو ایک مرکز پر لائے اور سب کو ایک خیال مشترک سے وابستہ کر دے چنانچہ سب سے پہلے ان کو خدا کی توحید کی طرف دعوت دی گئی۔ ہرچند اللہ اور اللہ کی توحید کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے اہل عرب واقف نہ رہے ہوں لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ اس چیز کو بالکل

بھلا چکے تھے اور اسی لیے ان کا شیرازہ درہم و برہم ہو چکا تھا۔

ظاہر ہے کہ محض خدا کو ایک کہنا تو سود مند نہ ہو سکتا تھا اس لیے اصلاح معاشرت کے لیے اور وہ صورتیں بھی اختیار کی گئیں جو اس سے قبل مفید ثابت ہوئی تھیں اور عذاب و ثواب' بہشت و دوزخ' حشر و نشر وغیرہ کے وہ عقائد علی حالہا قائم رکھے گئے۔ جن کے بغیر اصلاح نا ممکن تھی' اگر جاہل عربوں کے سامنے اظہار حقیقت کے طور پر بہشت و دوزخ کا مفہوم صرف روحانی مسرت یا روحانی اذیت بتایا جاتا تو ظاہر ہے کہ ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا کیونکہ اس مفہوم سے وہ آشنا ہی نہ تھے اور ان کے ذہن اس قدر ترقی یافتہ نہ تھے کہ وہ اس کی بلندی کو سمجھ سکتے۔

لیکن جب ان کو بتایا گیا کہ نعائم فردوس میں وہی تمام لذتیں شامل ہیں جن کے لیے وہ بے چین رہتے ہیں اور عذاب دوزخ اس قسم کی سخت گیریوں کی انتہائی صورت ہے جن سے انھیں یہاں واسطہ پڑتا ہے تو ان کی سمجھ میں مذہب کی اہمیت بھی آئی اور وہ ان اصول کے بھی پابند ہو سکے جن کی تبلیغ ایک مصلح کا حقیقی مقصد ہوا کرتا ہے۔

اس لیے مذہبی معتقدات کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ وہ حقیقتاً" لغو و باطل تھے ان معتقدات کی اہلیت کو کم نہیں کر سکتا کیونکہ ان سے جو کام لینا مقصود تھا وہ پورا ہو کر رہا اور آج اگر ان معتقدات سے ہٹ کر کوئی دوسرا ذریعہ اصلاح اعمال و اخلاق کا اختیار کیا جا سکتا ہے تو مذہب کے حقیقی مقصود کے منافی نہیں۔ اور یہ ایسا باریک نکتہ ہے جس کو سب سے پہلے اسلام اور بانی اسلام نے ظاہر کیا۔

جیسا کہ ہم نے ابتدائی سطور میں بیان کیا ہے' ایک مذہب والا ہمیشہ دوسرے مذہب والے کو گمراہ کہنے کا عادی ہے لیکن قرآن کی تعلیم یہ نہیں ہے اور اس نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہوا کرتا ہے جو اس قوم کی خصوصیات اور زمانہ کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر تمدن و معاشرت کے اصول قائم کرتا ہے اور لوگوں کو امن و سکون کی طرف بلاتا ہے۔ آنحضرت نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں تم لوگوں کے لیے کوئی نئی چیز نہیں لایا' آپ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ آپ سے مافوق الفطرت معجزات کا ظہور ہو سکتا ہے آپ مذہب کے باب میں کبھی جبر و تشدد کو پسند نہیں کیا اور آپ نے اگر بہشت و دوزخ کا وہ عام مفہوم پیش کیا جو جاہلوں کے لیے قابل قبول تھا دوسری طرف اہل علم و فضل کے لیے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ سب تشبیہات و استعارات ہیں اور حقیقت سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔

پھر آپ تمام مذاہب عالم کی تاریخ ڈھونڈ ڈالیے اور بتایئے کہ کیا محمد کے سوا کوئی اور نبی یا مصلح ایسا ہوا ہے جس نے انسان کی فطری سطح پر آ کر کسی مذہب کی بنیاد ڈالی ہو، جس نے اپنے آپ کو انا بشر مثلکم سے زیادہ اہمیت نہ دی ہو جو معجزات اور خرق عادات پیش کرنے سے انکار کرتا ہو، جس نے مذہب کے لیے تلوار اٹھانا حرام قرار دیا ہو جو تمام دوسرے مذاہب کی عزت کرتا ہو جو واہمہ پرستی دلا یعنی مراسم عبودیت کا مخالف ہو اور جو مذہب کا مفہوم صرف اخلاق کی پاکیزگی اور ذہنی ترقی و آزادی قرار دے۔

اگر انصاف کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ محمد کی ذات اس باب میں بالکل منفرد نظر آتی ہے اور اس لیے مذہب ہونے کے لحاظ سے تکمیل کا دعویٰ صرف اسلام ہی کر سکتا ہے۔

یہ ہیں وہ اصلی خط و خال اسلام اور اس کی تعلیمات کے جو ہر شخص کو غائر مطالعہ کے بعد نظر آ سکتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج اگر میں ان کو ایک مسلمان کے سامنے بیان کروں تو وہ بھی ان کو صحیح باور نہ کرے گا چہ جائیکہ غیر مسلم کیونکہ آج خود ہمارے علماء کرام اور واعظان ذی احترام کے نزدیک رسول اللہ انسان نہ تھے بلکہ ایک دیوتا تھے جن کے جسم کا سایہ نہ تھا جن کی پشت پر مہر نبوت ثبت کر کے خدا نے بھیجا تھا جن کے ہاتھ میں سنگریزے بولنے لگتے تھے۔ جن کی رسالت کا اقرار درخت بھی ایک انسان کی طرح کیا کرتے تھے جب وہ جنگ کرتے تھے تو مدد کے لیے آسمانوں سے فرشتے اتر آیا کرتے تھے اور جب آپ کسی مجمع میں ہوتے تھے تو ہمیشہ آپ سب سے بلند نظر آتے خواہ ان سے زیادہ لانبے قد کے آدمی کتنے ہی وہاں موجود ہوں وہ ایک براق پر سوار ہو کر ساتوں آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے عرش اعظم تک پہنچے اور ذات خداوندی سے ہمکلام ہوئے۔ جبرئیل نے آپ کا سینہ چیر کر دل سے خون کی پھٹکی نکال لی تاکہ معاصی کی اہلیت باقی نہ رہے۔ اور آپ ایک اشارہ سے پہاڑ کے پہاڑ سونے چاندی میں تبدیل کر سکتے تھے پھر یہ واہمہ پرستی یہیں تک پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی بلکہ صوفیائے کرام نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ احمد اور احد میں تو میم کا پردہ مصلحتاً رکھا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ محمد اور خدا میں کوئی فرق نہیں اور اس طرح صنمیات کا پورا لٹریچر اسلام میں داخل ہو گیا۔

آپ کسی مجلس میلاد میں جا کر شریک ہوں تو آپ کے لیے اس قسم کے معجزات و خوارق عادت سننا ناگزیر ہو گا اور پوری صحبت میں مشکل ہی سے دو چار واقعات اخلاق محمدی

کے سننے میں آئیں گے اس لیے موجودہ زمانہ میں جبکہ مذہب کے خلاف ایک عام تحریک دنیا میں پیدا ہو رہی ہے۔ اسلام کے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ وہ اغیار کے حملہ سے کیونکہ محفوظ رہے بلکہ سوال یہ ہے کہ خود اسی کے حامی و علمبردار جو دشمنی اس کے ساتھ کر رہے ہیں اس کو کیونکر دفع کیا جا سکتا ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ ترکی و ایران کی طرح حکومت اپنی ہو اور بزور شمشیر مولویانہ ذہنیت کو ختم کر دیا جائے۔ یا خود عوام میں علم کی اشاعت اتنی ہو کہ وہ نقد و نسیہ میں تمیز کر سکیں لیکن چونکہ ہندوستان میں اول الذکر صورت کا امکان نہیں اس لیے صرف دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے' جو دیر طلب تو یقیناً" ہے لیکن کسی نہ کسی دن بہرحال اسے پورا ہو کر رہنا ہے۔

○ ○ ○

میرے مذہبی خیالات

جناب سید عبدالحکیم صاحب گجرات کے جواب میں

آپ کا یہ خیال با نتیجہ مطالعہ بالکل صحیح ہے کہ میرے مذہبی خیالات میں رفتہ رفتہ تغیر پیدا ہوا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اب اس تغیر نے ایسی مستقل صورت اختیار کر لی ہے کہ بعض حضرات اس کو کفر و ارتداد سے تعبیر کرنے لگے ہیں لیکن آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ ابتداء اجرائے نگار سے تا ایندم کبھی ایک لمحہ بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اپنے خیال کے مطابق حق و صداقت سے دیدہ و دانستہ اعراض کیا ہو یا میری نیت خدمت اسلام کے علاوہ کچھ اور رہی ہو البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ پہلے میں اسلام کے مفہوم کو زیادہ محدود سمجھتا تھا اور قدر متعصب تھا' لیکن اب اس کو زیادہ وسیع سمجھتا ہوں اور کیش و مسلک کے امتیاز سے گزر گیا ہوں۔

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگ رہ ما بود
رفتیم و صنم بر سر محراب شکستم

اس میں شک نہیں کہ میں ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوا اور نہایت سخت مذہبی ماحول میں میری تعلیم و تربیت ہوئی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کافی زمانہ اسی تقشف و تعصب میں بسر ہوا' لیکن اب اس کو عقل و ضمیر کی رہنمائی کہیے یا طاغوتی کارفرمائی کہ مذاہب عالم کی تاریخ' حکومتوں کی داستان فتح و ظفر' اور اسی کے ساتھ طبیعات و فلکیات کے مطالعہ نے ایک عجیب انقلاب ذہن میں پیدا کر دیا اور سب سے پہلے حجاب دور ہونے کے بعد جو منزل سامنے آئی وہ ماعرفناک حق معرفتک کی تھی۔

پہلے میں یقین رکھتا تھا کہ خدا ایک متبھر و جبار ہستی ہے جو سوائے مسلمانوں کے کسی اور کو نجات دینے والی نہیں۔ وہ ہمارے دنیاوی سلاطین ہی کی طرح ایک قہرمانی قوت ہے جو سزا و عطا کے لحاظ سے مسئول نہیں ہو سکتی اور جو ہماری عبادت سے (بشرط آنکہ اسلامی طریقہ سے ادا کی جائے) خوش ہوتی ہے اور ترک عبادت سے برہم لیکن جوں جوں کائنات کا

مطالعہ وسیع ہوتا گیا اور علم و عقل کی نا رسائیاں واضح ہونے لگیں تو مسلمانوں کی اس تنگ ذہنیت کو رفتہ رفتہ خدا کی توہین سمجھنے لگا ۔یقیناً" دیگر مذاہب بھی اس عصبیت میں مبتلا ہیں لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے کم ازکم اسلام کو میں اس داغ سے پاک دیکھنا چاہتا تھا اور آخر کار اس احساس کی شدت نے میرے ضمیر اور میرے علم و یقین کو جس اقدام کی طرف مجبور کیا وہ یہ تھا کہ

بیا کہ روئے بہ محراب گلہ اور نیم بنائے کعبہ دیگر زسنگ طور نیم
حلیم کعبہ شکست و اساس قبلہ بریخت بتازہ طرح کجے قصر بے قصور نیم

پھر یہ "کعبہ دیگر کیا تھا" یہ قصر بے قصور کیا ہو سکتا تھا؟ یہی تنگ نظری کی زنجیروں کو توڑنا' تفریقات شعار و رسوم کی خلیج کو پر کر دینا اور ایک ایسی بلند چوٹی پر اسلام کا جھنڈا نصب کرنا جس سے زیادہ رفعت اور کسی مذہب کے پرچم کو میسر نہ آسکے پھر چونکہ میں اسلام کو حقیقت کے لحاظ سے اخلاق کی دنیا میں آخری آواز سمجھتا ہوں اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ اسلام نام مخصوص وضع و شکل بنانے کا نہیں ہے' چند متعین حرکات کی پابندی کا نہیں ہے۔ بلکہ وہ مسمی ہے ارتقاع نوع انسانی کا" عروج فضل و کمال کا اور اخلاق کی انتہائی' رفعت کا" اس لیے میں مجبور تھا کہ موجودہ مزعومات مذہبی و مفروضات دینی کی تنگ و تاریک فضا سے بلند ہو کر کوئی نصب العین ڈھونڈھتا' اور شکر ہے کہ میری عقل نے اس باب میں رہبری کی اور جوں جوں حجابات دور ہوتے گئے۔ میری آواز میں بلندی۔ میرے عزائم میں پختگی اور میرے مسلک میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ آج خدا میرے نزدیک نام ہے ایک ایسی قوت غیر متاثرہ کا جو کافر و مسلمان کی بے معنی اصطلاحوں سے کوئی سرو کار نہیں رکھتی' جو مسجد و کلیسہ' کاشی و کعبہ' اذان و ناقوس' طواف اور پیکرماں سب سے بے نیاز ہے اور وہ انعام و انتقام جزا و سزا کے لیے یہ نہیں دیکھتا کہ فلاں اسے اللہ کے نام سے پکارتا ہے اور فلاں رام کے نام سے' یا وہ مندر میں گھنٹہ بجا کر اس کی یاد تازہ کرتا ہے یا یہ کان میں انگلی دے کر اذان کی آواز سے اسے پکارتا ہے اگر وہ خدا ہے تو سب کا خدا ہے اور اس نے ہر شخص کی جزا و سزا۔ ہر قوم کی دوزخ و جنت خود اسی شخص یا قوم کے اندر پنہاں رکھ دی ہے خواہ اسے اختیار کرے یا اسے۔

پھر جو شخص تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لانا چاہتا ہو اور جو صرف صحت اخلاق کو غرض مشترک قرار دے کر دنیا سے عصبیت کو مٹا دینا پسند کرتا ہو اس کے خیالات و عقائد

میں اگر آپ یہ تغیر محسوس کریں تو جائے عجب نہیں اور پھر یہ منزل تو ابھی صرف قیل و قال اور حجت و استدلال کی ہے۔ کسے خبر ہے کہ کل اگر میں اس منزل سے گزر کر صرف عمل کی منزل میں آگیا تو میرے منہ سے کیا نکلے گا اور آج جو صرف کافر و مرتد کہہ کر مجھ سے نفرت کرتے ہیں کل مجھ دیوانہ و مجنون جان کر پتھر نہ ماریں گے۔

اجد الملامة فی ہواک لذیذة
حبا لذکرک فلیلمنی اللوم

○ ○ ○

گذشتہ و آئندہ

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

آفتاب کا طلوع و غروب، روز و شب کا تسلسل، اور اسی طرح کے تمام فطری مناظر زمانہ نامعلوم سے یکساں طور پر رونما ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اور اگر کائنات نام صرف انھیں نقوش کا ہو تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کسی انقلاب و تغیر کو قبول نہیں کرتی لیکن حقیقت امر شاید اس کے خلاف ہے کیونکہ اہل علم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ عالم حادث ہے، متغیر ہے۔

پھر کیا اس حدوث و تغیر کا علم ہم کو بغیر کسی غور و فکر کے الہامی طور پر حاصل ہوا ہے، غالباً نہیں۔ پھر اس بات کے تسلیم کرنے میں کیوں تامل ہو کہ اہم ترین تغیر عقل انسانی کا تغیر ہے جو ہر آن و ہر لحظہ حجابات دور کرتا جا رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ کس نقطہ پر پہنچ کر اس کو اپنی تگ و دو ختم کرنا ہے۔

انسان فطرت کی طرف سے اپنے اندر وہ حس لے آیا ہے جسے "حس اجتماعی" (HERD INSTINCT) کہتے ہیں اور اسی احساس کا نتیجہ نظام تمدن ہے جس کا آغاز "عہد حجری" سے ہوا اور اب "عہد برق و شعاع" کہلاتا ہے، یعنی جس کی ابتدا زمین کے جلوات سے ہوئی تھی وہ اب آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ الغرض اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ذہن انسانی برابر ترقی کرتا جا رہا ہے اور کل کے بوڑھے آج صرف بچوں کی صف میں جگہ پا سکتے ہیں جس طرح آج کے بوڑھوں کا شمار کل کے بچوں میں ہونے والا ہے۔

پھر کیا یہ انسان کی توہین ہے کہ اسے ہزار سال قبل جو تحقیق جو جستجو اس نے کی تھی وہ آج غلط ثابت کی جا رہی ہے۔ اگر ہمارے، اسلاف کے علمی، اخلاقی و تمدنی نظریے آج کے مشاہدہ و ضروریات کے لحاظ سے ناقص و ناکمل نظر آتے ہیں تو کیا اس کا اظہار ان کی تنقیص ہے؟

نظام بطلیموس کا ماننے والا آج کوئی نہیں۔ لیکن بطلیموس کی عزت و عظمت اسی طرح قائم ہے۔ نیوٹن کا نظریہ کشش ممکن ہے "آئنسٹین" کے نظریہ اضافیت کے سامنے غلط ثابت

ہو جائے۔ لیکن نیوٹن کا نام تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زریں حروف میں نظر آئے گا۔

جس طرح ازمنہ قدیمہ میں انسانی ذہن و دماغ نے اپنے حاسہ اجتماعی کے اقتضا پر اور بہت سی باتیں دریافت کیں۔ اسی طرح اس نے مذہب کی بنیاد ڈالی اور اس میں شک نہیں کہ اس سے اس کا مقصود نوع انسانی کی خدمت اور تشکیل تمدن کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ پھر اگر ضروریات زمانہ اور انسان کی عقلی ترقیوں کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام علمی نظریے تبدیل ہوتے رہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہبی عقائد میں تغیر نہ پیدا ہو لیکن اس تغیر کا مطالبہ و احساس یقیناً" کسی پیمبر کی توہین نہیں' کیونکہ جس عہد و زمانہ میں جو مذہب پیدا ہو وہ اس وقت کے لحاظ سے واقعی آخری لفظ کی حیثیت رکھتا تھا۔ قرآن پاک میں بھی ارتقاء خیال کے لحاظ سے اصول مذاہب کی تبدیلی کی ضرورت کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

ماننسخ من آیۃ اوننسھانات بخیر منھا اومثلھا۔

جب حقیقت یہ ہے تو میں حیران ہوں کہ عقائد مذہبی میں تغیر و تبدل کی خواہش پر لوگ کیوں چراغ پا ہوتے ہیں خصوصیت کے ساتھ مسلمان کہ ان کے مذہب کی بنیاد ہی اس اصول پر قائم ہوئی ہے کہ "خذما صفا" پر عمل کیا جائے اور زمانہ کا ساتھ دینے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کی جائے۔

مذاہب عالم کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز تو وہ تھی جسے ہم پیمبرانہ روح (SOUL) کہتے ہیں اور دوسری جو اس کے بعد پیدا ہوئی وہ "نفس مولویانہ" (PRIESTMIND) تھا۔ یعنی ایک تو وہ نفوس پاکیزہ تھے جن کے ذہن خلاق نے انسانی سوسائٹی کی فلاح کے لیے کچھ اصول وضع کیے اور دوسرے وہ تھے جو ان کے غلط کرنے والے تھے' اور پھر ان میں اکثر وہی تھے جنھوں نے اس پیمبرانہ روح کے حقیقی منشاء سے نا آشنا رہ کر محض الفاظ کو لے کر ان کی پرستش شروع کر دی اور کمتر ایسے تھے جن کے دماغوں نے ہادی اول کی عقل سلیم کے متوازی چل کر اس کی تعلیم کی حقیقت کو دریافت کیا۔ یہی رونا پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے اور اسی لیے اس سے قبل بھی عقل و مذہب میں جنگ جاری رہی اور اب بھی جاری ہے' فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ پہلے ذہن و عقل کی آزادی کو بزور شمشیر فنا کر کے اسے زیادہ ابھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا اور آج یہ مجبوری اٹھ جانے سے عقل انسانی زیادہ سنگین محاذ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اب آیئے اس جنگ پر ذرا اور وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالیں۔

نقل سائنس کہتے ہیں کہ سائنس ہمیں صرف ان باتوں کا یقین کرنے پر مجبور کرتی ہے جن کو ہم صحیح ثابت کر سکتے ہیں' بر خلاف اس کے مذہب مشتمل ہے۔ چند مزعومات پر جن کا کوئی علمی یا استقرائی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر نقل مذاہب سے سوال کیا جاتا ہے کہ ان کی باتوں پر ایمان لانے کے کیا اسباب ہیں تو وہ تین دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے اسلاف ایسا ہی یقین کرتے تھے دوسرے یہ کہ ہمارے اسلاف جو دلائل پیش کر چکے ہیں وہ کافی ہیں اور تیسرے یہ کہ اصول مذہب پر گفتگو کرنا ناجائز و ممنوع ہے کیا یہ دلائل واقعی کوئی وزن رکھتے ہیں؟

اگر دو ہزار قبل مسیح کے اکتشافات علمیہ کو عقل انسانی نے آج بالکل بدل کر رکھ دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس وقت کا مذہب جوں کا توں باقی رہے اور اس کے اصول اب بھی مفید و کار آمد ثابت ہوں۔ پھر اگر تمام دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہوتا تو بھی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کبھی اختلاف پیدا ہی نہیں ہوا لیکن جب دنیا میں سینکڑوں مذاہب قائم ہوئے اور ہر ایک نے اپنے سوا تمام دیگر مذاہب کو جھٹلایا تو ایک طلبگار حق کے لیے چارہ کار صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ ان سب کو عقل کی کسوٹی پر کسے اور کسی ایک کی صحت پر ایمان لائے۔ اس لیے یہ کہنا کہ مذہب کا تعلق عقل سے نہیں' کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ سائنس اس وقت تک کسی ایسی حقیقت راسخہ تک نہیں پہنچ سکی جس سے آگے بڑھنے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جو دن گذرتا ہے وہ حقیقت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اور اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کے باب میں اصول ارتقاء کو نظر انداز کر دیا جائے۔

سائنس واقعات کی جستجو کر کے حقیقت تک پہنچنا چاہتی ہے اور مذہب چند باتوں کو پہلے ہی حقیقت باور کر کے واقعات کو ان پر منطبق کرنا چاہتا ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے اگر ہم کسی مذہب کے پیرو ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ ہمارے آباء و اجداد اس مذہب کے ماننے والے تھے لیکن سائنس کے یہاں باپ و دادا کوئی چیز نہیں' وہ ہر انسان سے انفرادی طور پر عقل و تمیز کے صرف کا مطالبہ کرتی ہے۔

عقل انسانی نے عقائد مذہب میں جس جس تغیر کو قبول کیا وہ نقل علم سے مبنی تھی۔ ابتدائی حالت میں جب انسان وحشی و جاہل تھا وہ خدا کو ایک ایسی ہی خود مختار فرمانروا ہستی

سمجھتا تھا جیسی کسی دنیاوی صاحب جبروت بادشاہ کی ہوتی ہے یعنی نہ وہ کسی قانون کا پابند ہے نہ کسی اصول پر کار بند' جو اور جس طرح چاہتا ہے بناتا بگاڑتا ہے اس کے بعد جب سترھویں صدی میں ڈیکارٹ' کپلر' گیلیلو اور نیوٹن پیدا ہوئے اور انھوں نے کائنات کو ایک بڑی مشین کی طرح نظم و اصول کے ساتھ چلتے ہوئے تسلیم کیا تو خدا کے اس قدیم عقیدہ میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور لوگوں نے باور کیا کہ دنیا کا کاروبار بے شک خدا چلاتا ہے لیکن مخصوص مشینری کے ذریعہ سے جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔ مدعا یہ کہ خدائی کسی قانون و اصول کی پابند ضرور ہے جب یہ دور بھی ختم ہوا اور اٹھارہویں صدی آئی تو اس مشینری میں کسی خارجی قوت کی مداخلت کو بھی تسلیم نہ کیا گیا۔ مدعا یہ کہ حکمراں تو ہے لیکن نظم و نسق سے اسے کوئی واسطہ نہیں زمانہ حال کی جو کیفیت ہے وہ سب پر ظاہر ہے کہ سرے سے خدا کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ گیا ہے بہر حال یہ واقعہ ہے کہ دیگر علوم و فنون کے ساتھ مذہبی نظریوں میں بھی غیر معمولی تغیر پیدا ہوا اور وہ وقت آنے والا ہے جب اس کی انتہا کچھ اور ہو گی یعنی مذہب کا نام لینا ہی گناہ سمجھا جائے گا۔ اور جس طرح کسی وقت دین نے بے دینی کا استیصال تیغ و تبر سے کیا تھا۔ بالکل اسی طرح بے دینی دین کو محو کر دینے کی کوشش کرے گی کیونکہ اس وقت مذہبی اہمیت صرف سیاست کے رجحان پر قائم ہے اور اس کی حیثیت سرمایہ دارانہ پراپیگنڈا سے زیادہ کچھ نہیں۔

جس حد تک روحانیت کا تعلق ہے مذہب جس میں ظاہری مراسم و شعائر کی پابندی ضروری ہے' کوئی معنی نہیں رکھتا' مادی نظر سے اس کی ناکامی کسی سے مخفی نہیں کہ آج تک وہ قوی کے مقابلے میں ضعیف کو پامال سے نہ بچا سکا نفسیاتی زاویہ نگاہ سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ اس کی خصوصیات علمی و تمدنی ترقی کے لیے بہت حارج ہوئیں۔ رہی وجدانی و مابعد الطبیعاتی تسکین سو یہ علم اخلاق کی وسعت سے حاصل ہو سکتی ہے جو عالم "اخوت انسانی" کے رشتہ کو قائم کرنا چاہتی ہے الغرض اس وقت مغرب کی علمی دنیا میں جو جدید مذہب پھیلتا جا رہا ہے وہ "اشتراکیت" ہے جس کا پیغمبر لینن اور جس کی شریعت سائنس ہے۔

پھر مذہبی نظام کے خلاف یہ ہیجان صرف یورپ و امریکہ ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ ایشیا میں بھی پایا جاتا ہے' ترکی اپنی قومی ترقی و اصلاح کے لیے اسلام کو پس پشت ڈال چکا ہے۔ چنانچہ 1927ء میں مصطفیٰ کمال نے اپنی تقریر کے دوران میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "کانسٹی ٹیوشن میں اس امر کا اظہار کہ ترکی' اسلامی حکومت ہے ایک ایسی بات کا اظہار ہے

جس کو لولین مناسب فرصت میں کالعدم ہو جانا چاہیے" یہی حال تقریباً" ایران و مصر کا ہے۔ چین و ہندوستان میں بھی اس انقلاب کے آثار پوری طرح نمایاں ہیں کیونکہ اس وقت دنیا کے سامنے اہم ترین فکر یہ نہیں ہے کہ انسان گناہوں سے کس طرح باز رہے' بلکہ یہ ہے کہ تمدنی و معاشرتی نظام میں کون سی ایسی تبدیلی پیدا کی جائے کہ انسان بھوکا نہ مرے لور چونکہ مذاہب عالم کا موجودہ نظام' انسانیت کے اس دکھ درد کا علاج لب تک نہیں کر سکا' اس لیے لامحالہ یا تو اس کو پس پشت ڈالنا پڑے گا یا اس میں کوئی ایسا تغیر پیدا کیا جائے گا جو اس گتھی کو سلجھا سکے بہر حال اس دور انقلاب میں مذاہب کو ضرور صدمہ پہنچے گا لور اگر حامیان مذہب نے اپنے اصول کار میں اقتضاء زمانہ کے لحاظ سے کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تو ان کا منصب شریعت سے ہٹ جانا ناگزیر ہے۔

اگر محض ثالث کی حیثیت سے فیصلہ کیا جائے تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب موجودہ انقلاب میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بشرط آنکہ اس کی اصل روح کو پیش کیا جائے لور ظاہری شعائر و مراسم کی پابندی پر زور نہ دیا جائے۔

اس وقت اصولاً" تقریباً" تمام ممالک نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ حکومت و سلطنت کی بہترین صورت جمہوریت ہے لور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے جو مصائب دنیا پر توڑ رکھے ہیں ان کا علاج سوا اشتراکی اصول کے لور کوئی نہیں ہو سکتا پھر کیا سوا اسلام کے دوسرا مذہب کوئی لور ہے جو اس بات کا حامی ہو۔ سوال نہ بنو عباس کا ہے نہ بنو امیہ کا نہ دولت فاطمیہ کا نہ ہندوستان کے دور مغلیہ کا؟ بلکہ غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اسلام کی اصل تعلیم کیا ہے۔ اگر عہد رسالت کے بعد اس پر عمل نہ کرکے لوگوں نے بجائے جمہوریت کے مستبدانہ حکومتوں کی بنیاد ڈالی ہو تو اسلام مورد الزام نہیں ٹھہرتا۔ لور اگر آج بھی اس تعلیم کو پیش نہیں کیا جاتا تو اس میں قصور ہمارے قائدین مذہب کا ہے نہ کہ اسلام کا۔

تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لانے کے لیے جو جذبہ عملاً" کوئی خدمت کر سکتا ہے وہ "اخوت عامہ" کا جذبہ ہے۔ لور اگر اس کے خلاف کوئی تعلیم پیش کی جاتی ہے (خواہ وہ اصول سے تعلق رکھتی ہو یا فروع سے' شعائر سے وابستہ ہو یا عقائد سے' کبھی صحیح اسلامی تعلیم نہیں ہو سکتی)۔

اس وقت اسلام کے اصطلاحی معنی خواہ کچھ ہی کیوں نہ قرار دیئے گئے ہوں۔ لیکن حقیقتاً" وہ ایک بسیط مفہوم رکھتا ہے لور اس کو ہم کسی طرح محدود کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ

اسلام نام ہے صرف استعلاء کا عروج و ترقی کا جدوجہد کا کردار و عمل کا ایک ایسی " لاالٰہیت" کا جو تمام مذاہب کو ایک مرکز پر لانے کی اہلیت رکھتی ہے اور شعائر و مراسم سے بے نیاز ہو کر صرف پاکیزگی اخلاق اور تکمیل تمدن کی حامی ہے۔

پھر چونکہ اس نکتہ کو مسلمان فراموش کر چکے ہیں اور مذہب کی صحیح تعلیم کو انسان کی خود غرضانہ ذہنیت خراب کر چکی ہے اس لیے عام طور پر یہی باور کیا جاتا ہے کہ یہ ساری خرابیاں تعلیم مذہب کی ہیں اور اسی بناء پر تمام اسلامی ممالک میں وہ رد عمل ظاہر ہو رہا ہے جس کا دوسرا نام کفرو ارتداد رکھا گیا ہے لیکن باور کیجئے کہ یہ حالت عرصہ تک قائم نہ رہے گی اور اس انقلاب کا نتیجہ استیصال مذہب کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ اگر اس کے اصلی خط و خال پیش نہ کیے گئے۔

ممکن ہے جو مفہوم میں نے اسلام کا پیش کیا ہے وہ اس وقت تعجب و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے' لیکن وہ وقت آنے والا ہے جب ایک ایک شخص وہی کہے گا جو میں کہہ رہا ہوں اور اسلام دنیا پر حاوی ہو کر رہے گا۔

پھر ہو سکتا ہے کہ اس کی صورت دوسری ہو۔ اس کا نام کچھ اور ہو لیکن اس کا مفہوم وہی ہو گا جو آج میں کہہ رہا ہوں اور اس کے خدوخال وہی ہوں گے جنھیں آج میرا قلم پیش کر رہا ہے۔

○ ○ ○

خدا نے دنیا کو کیوں پیدا کیا

یہ ایک سوال ہے جو ایک ہندو سوسائٹی نے مجھ سے کیا ہے؟

یہ سوال خالص مذہبی ہے۔ یعنی یہ جستجو اسی شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جو خدا کے وجود کا قائل ہے اور ایشور کا پایا جانا تسلیم کر چکا ہے۔ لیکن جو منکر خدا ہے وہ کون' اور کس نے کی گفتگو نہیں کرتا بلکہ اس کی تلاش یہ ہوتی ہے کہ یہ عالم کیونکر ظہور میں آیا' اور اس کے اندر انسان کی حیثیت کیا ہے؟

ایک پابند مذہب انسان چونکہ خدا کو بالکل اسی طرح صناع و خلاق مانتا ہے جس طرح ایک کمہار یا بڑھئی کو کہ جو برتن اس کے جی میں آیا بنا دیا جس طرح کی چوکی چاہی اس نے تیار کر دی۔ اس لیے اصولاً اس کے سامنے کیونکر کا سوال نہیں' آسکتا کیونکہ ایک قادر مطلق اور مختار کل ہستی کو ہر وقت قدرت و اختیار حاصل ہے کہ جب چاہے بغیر کسی ذریعہ و سبب کے اپنے ارادہ سے ہیژدہ ہزار عالم پیدا کر دے اور جب اس کے جی میں آناً فاناً محو کر دے۔ لیکن ایک منکر چونکہ دنیا کی پیدائش کو کسی ہستی کے ارادہ سے متعلق نہیں سمجھتا بلکہ اس کو مخصوص اسباب سے وابستہ جانتا ہے اور تدریجی ارتقاء کا قائل ہے اس لیے لامحالہ اسے غور کرنا چاہیے کہ اصول آفرینش کیا ہیں اور کن اسباب کے تحت کائنات نے موجودہ شکل اختیار کی ہے۔

بہر حال اس بات میں ایک مذہبی انسان کا نقطہ نظر' منکر کے نقطہ نظر سے بالکل علیحدہ ہے اور اس لیے اگر مندرجہ بالا عنوان سوال دونوں کے سامنے پیش کیا جائے تو ظاہر ہے کہ دونوں کا جواب ایک دوسرے سے مختلف ہو گا۔ لیکن گفتگو اس میں ہے کہ کیا واقعی دونوں اس سوال کا جواب دینے کے اہل ہیں۔ ایک مذہبی شخص جو پیدائش عالم کے لیے کسی علت و سبب کے وجود کو ضروری نہیں سمجھتا وہ نتیجہ و غایت پر غور کرنے کا مستحق کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی جب اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ خدا قادر مطلق ہے وہ جو چاہے پیدا کر دے اور جب چاہے فنا کر دے تو پھر کیوں کا سوال کیسا' "یہ چون و چرا" تو اسباب و علل سے متعلق ہوا کرتی ہے اور جب وہاں سرے سے اسی کا انکار کیا جاتا ہے تو استفسار کیوں؟ البتہ

ایک منکر کے متعلق خیال ہو سکتا ہے کہ اس نے اس پر غور کیا ہو گا۔ لیکن اگر انصاف سے پوچھیے تو کہنا پڑے گا "کیوں" کا جواب نہ خدا کا اقرار کرنے والا دے سکتا ہے نہ انکار کرنے والا۔ کیونکہ جس طرح مذہب آج تک غایت آفرینش کو نہیں سمجھ سکا۔ اسی طرح سائنس بھی اس معمہ کو حل نہیں کر سکی۔ یعنی اگر ایک پابند مذہب شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ کائنات کے پیدا کرنے سے خدا کا کیا مقصود ہے تو بڑے سے بڑا سائنس داں بھی نہیں کہہ سکتا کہ مادہ و قوت کے اس ہیجان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے لیکن کس قدر حیرت ناک امر ہے کہ باوجود اس نااہلی کے دونوں اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اصرار کرتا ہے کہ وہی حق پر ہے درآنحالیکہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی ادنیٰ دلیل بھی اس دعوے کے لیے موجود نہیں ہے اہل مذاہب میں ایک جماعت تو علماء ظواہر کی ہے جو اپنے آپ کو مخصوص شریعت کا پابند کہتے ہیں اور جو مذاہب کو صرف ان کتابوں سے سمجھنا چاہتے ہیں جو ان کے اسلاف لکھ گئے ہیں اور جن کی بناء پر سوسائٹی کا نظام مقرر کیا گیا تھا۔ دوسری جماعت اہل تصوف کی ہے جنھوں نے اپنے مسلک کا نام شریعت نہیں بلکہ طریقت رکھا ہے۔ اور جو تمام مسائل کو روحانیت سے سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں' مسلمانوں میں اول الذکر جماعت کے پاس اس سوال کا کھلا ہوا جواب موجود ہے اور ان کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں کیونکہ قرآن نے کھلے ہوئے الفاظ میں اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے کہ "ماخلقت الانس والجن الا لیعبدون" یعنی ہم نے انسان و جنات کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت کریں۔ اس لیے اگر آج عبادت کی کیفیت و ہیئت متعین ہو جائے تو ایک مسلمان کے پاس اس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں عام طور پر عبادت کا مفہوم نہ صرف اسلام بلکہ تمام دیگر مذاہب میں وہی ہے جسے پوجا یا پرستش سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ دنیا میں کوئی فعل ارادہ و نتیجہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہر شخص کا خواہ وہ کسی مذہب سے متعلق ہو' فطری حق ہے کہ وہ ان دونوں باتوں پر غور کرے یعنی یہ کہ وہ کس ارادہ و نیت سے خدا کی پوجا کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ جو غرض و غایت اس نے سمجھ رکھی ہے وہ عبادت سے کس حد تک پوری ہوتی ہے۔ مذہبی اقوام میں بلا استثناء کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اس ارادہ و نیت سے عبادت نہ کرتی ہو کہ اس سے خدا خوش ہو گا' اور وہ ہماری مشکلات کو دور کرے گا پھر اگر واقعی کبھی کسی کے مصائب دور ہو جاتے ہیں تو وہ اس کو اسی عبادت کا نتیجہ خیال کرتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ پر الزام قائم کرتا ہے کہ

جو حق عبادت کرنے کا تھا وہ ادا نہ ہوا اور خدا کی خوشنودی حاصل نہ ہو سکی اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک انسان کے جذبات و تاثرات کا تعلق ہے اس خیال سے اس کو کافی تسکین ہو جاتی ہے اور وہ مایوسی کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا ہے لیکن جب جذبات کی دنیا سے علیحدہ ہو کر سوال صرف علمی تحقیق کا ہوتا ہے یا کسی ایسے شخص کی تسکین کا جو کسی معلول کا وجود بغیر علت سے ماننے کے لیے تیار نہیں تو لا محالہ غور کرنا پڑتا ہے کہ عبادت سے خدا کا خوش ہونا کیا معنی رکھ سکتا ہے اور خدا کی خوشی یا رضا مندی کا ہمارے دنیاوی حالات و اسباب سے کیا تعلق ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلے علم حقیقت خدا کا مسئلہ سامنے آتا ہے یعنی یہ کہ جب تک ہم کو پہلے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ خدا کیا ہے۔ اس کے وجود کی حقیقت کیا ہے اس وقت تک نہ ہم عبادت کی کوئی علمی توجیہہ کر سکتے ہیں اور نہ اس سے کسی نتیجہ کے پیدا ہونے پر حکم لگا سکتے ہیں خدا کے متعلق انسان کا اولین تصور بالکل وہی ہے جو دنیا کے کسی مستبد بادشاہ و حکمراں کے متعلق ہو سکتا ہے یعنی خوشامد و تملق سے خوش ہونا۔ تحائف و نذرانہ قبول کر کے نظر التفات صرف کرنا اور سرتابی و نافرمانی سے غضب آلود ہو کر سزائیں دینا۔ اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ نفس خدا کی ماہیت و حقیقت پر بعض مذاہب کے خیالات زیادہ بلند و لطیف ہو گئے ہیں۔ لیکن جس حد تک پرستش کا تعلق ہے خدا کی ہستی اب بھی وہی خوش یا ناخوش ہو جانے والی بتائی جاتی ہے اور اپنے بندوں کو سزا یا انعام دینے سے بدستور وہی دلچسپی اس کو باقی ہے۔

ایک طرف تو یہ بتایا جاتا ہے کہ خدا زمان و مکاں سے علیحدہ احساس و تاثیر سے بیگانہ اور بے نیاز مطلق ہے' اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ وہ برہمی و خوشنودی کا محل ہے اور انعام و انتقام کا جذبہ اس کے اندر پایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ہی وقت میں خدا کو دو متضاد صفات کے ساتھ متصف کرنا کیونکر ممکن ہے اور اس کی خوشنودی یا برہمی کیا معنی رکھ سکتی ہے جبکہ وہ خود نہ کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے اور نہ اسے پوجا یا پرستش کی ضرورت ہے بعض اہل مذہب کہتے ہیں کہ عبادت سے خدا کو خوش کرنے کا مفہوم صرف یہ ہے کہ خود عبادت کرنے والا اس سے فائدہ اٹھائے یعنی خدا کی پرستش کا مفہوم خود اپنی اصلاح ہے' بالکل درست' لیکن یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ عبادت سے جو اپنی اصلاح وابستہ ہے وہ ہمارے اعمال و افعال سے بھی کوئی تعلق رکھتی ہے یا نہیں یعنی محض ہمارا عبادت کر لینا کافی ہے یا اسی کے ساتھ اپنی زندگی میں بھی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی

ہے۔

ظاہر ہے کہ محض عبادت خواہ کسی صورت میں ہو بے کار ہے اگر وہ ہمارے اخلاق و اعمال پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس لیے نتیجہ یہ نکلا کہ عبادت کا مدعا اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنا ہے اور اسی کو خدا کی خوشنودی سے تعبیر کیا گیا تاکہ لوگوں کو اس طرف توجہ ہو اور وہ اسے ترک نہ کر بیٹھیں بظاہر یہ بیان بہت قرین عقل و صواب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ انسان کی گمراہی و شقاوت کا بڑا سبب ہی ہے چونکہ اہل مذاہب نے ہمیشہ یہی لوگوں کو سمجھایا کہ خدا کی خوشنودی ہی حاصل کرنا عین مدعا ہے اس لیے یہ بات کبھی ان کے ذہن میں نہ آئی کہ عبادت کا تعلق خود اپنی اصلاح اعمال سے ہے اور اگر ہم اپنی زندگی میں کوئی تغیر نہ پیدا کریں تو عبادت بے کار ہے۔ اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوا کہ عبادت نام قرار دیا گیا صرف چند مخصوص حرکات و مراسم کا اور دوسری طرف لوگوں کے اخلاق پر یہ خراب اثر پڑا کہ خدا کو عبادت سے خوش رکھنے کے اعتماد پر وہ دنیاوی معاملات میں ہر قسم کے بے عنوانی پر آمادہ ہو گئے۔ اور اخوت و ہمدردی کا جذبہ جو نظام تمدن کی جان ہے۔ ان کے اندر ضعیف ہونے لگا۔

اگر ابتداء ہی سے اس امر پر زور دیا جاتا کہ خدا تمہاری عبادت سے خوش نہیں ہوتا بلکہ تمہاری اصلاح و ترقی سے خوش ہوتا ہے اور عبادت کا مدعا بھی یہی ہے تو شاید دنیا کی حالت آج دوسری ہوتی ہرچند بعض مذاہب نے عبادات کی ماہیت و غایت بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعلان بار بار کیا ہے لیکن چونکہ عبادت و پرستش میں حیات بعد الموت کی راحت کا خیال بھی شامل کر دیا گیا ہے اس لیے اس دنیاوی زندگی میں اس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہیں ہوا اور عام طور پر لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اصل زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہو گی اور چونکہ اس کے متعلق عبادت کے بعد اطمینان ہو ہی گیا ہے اس لیے دو روزہ زندگی کی اصلاح میں کیا سر کھپایا جائے۔ میری رائے میں مذاہب کی سب سے زیادہ خطرناک تعلیم یہی ہے کہ دنیا فانی ہے انسان فانی ہے اور بقا اس زندگی کو حاصل ہے جو مرنے کے بعد شروع ہو گی اور اسی کو سنوارنے کی ضرورت ہے گویا انسانوں کا یہ اجتماع سرائے کے مسافروں کا اجتماع ہے جسے صبح یا شام منتشر ہو جانا ہے پھر ظاہر ہے کہ جب تعلیم یہ ہو گی تو باہم گر کیا ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے اور دنیاوی زندگی کی ترقی و اصلاح کے لیے کون سا جذبہ کام کر سکتا ہے مسلمانوں میں نماز کا طریق عبادت اس میں شک نہیں کہ بڑی اجتماعی کیفیت

لیے ہوئے ہے لیکن چونکہ وہاں بھی آخرت و معاد کا خیال ساتھ ہی ساتھ آتا ہے اس لیے مسلمان اگر یکجا جمع ہوتے ہیں تو صرف انفرادی طور پر اپنی اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے اور اجتماعی زندگی کی اصلاح و ترقی کا کوئی سوال ان کے سامنے نہیں ہوتا چنانچہ آپ کسی بڑی سے بڑی مسجد کا اجتماع جا کر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ بہت سے جانور کسی احاطہ کے اندر جمع کر دیئے گئے ہیں اور ایک ہی صف میں پاس پاس بیٹھنے والوں کو بھی ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر نہیں ہے' اگر مسجدوں کا یہ اجتماع بجائے روزانہ پانچ مرتبہ کے ہفتہ میں صرف اک ہی بار ہوا درسجدہ و رکوع کی جگہ وہ آپس میں بیٹھ کر تبادلہ خیال کریں اور اپنے اپنے محلہ کے بچوں کی تعلیم' بیواؤں کی پرورش' ضعیفوں اور بیماروں کی نگرانی' مفلسوں اور ناداروں کی امداد جماعتی تنظیم' اقتصادی مشکلات اور سیاسی مسائل پر گفتگو کر کے لائحہ عمل بھی تیار کرتے رہیں تو کتنا فائدہ عظیم مرتب ہو سکتا ہے ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کی مسجدیں ان کے دارالاجتماع تھے' جہاں قوم کے تمام معاملات پر گفتگو ہوتی تھی لیکن آج مولوی کہتا ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر کوئی بات دنیا کی نہ کرو یعنی صرف اس دنیا کی بات کرو جس کا علم تمہیں تو نہیں ہے لیکن اس مولوی کو ضرور ہے جو خدا کے "مخلوتیان راز" میں سے ہے اور جس کے اختیار میں ہے خواہ تم کو جہنم میں ڈال دے یا فردوس بریں میں بھیج دے علماء ظواہر کے مفہوم عبادت نے جو مذموم صورت اختیار کر لی ہے اس کا حال تو آپ کو اس بیان سے واضح ہو گیا ہو گا۔ اب رہ گئے اہل دل جو بجائے شریعت کے طریقت پر کار بند ہیں تو اسمیں شک نہیں کہ جس حد تک خدا کے تصور کا تعلق ہے وہ زیادہ کامیاب ثابت ہوئے اور انھوں نے عقیدہ' ہمہ اوست' سے خدا کی تعبیر بڑی حد تک قابل قبول صورت میں پیش کی' لیکن عبادت کے مسئلہ کو وہ بھی نہ حل کر سکے اور چونکہ معاد و آخرت کی زندگی ان کے یہاں بھی اصل چیز تھی۔ اس لیے باوجود گانے بجانے کا شوق رکھنے کے وہ عبادت کے مسئلہ میں علماء ظواہر کی پابندیوں سے علیحدہ نہ ہو سکے اور شریعت کے مقابلے میں ان کی طریقت اپنا کوئی مستقل ادارہ جداگانہ قائم نہ کر سکی الغرض مسلمانوں کی طرف سے اس سوال کا جواب دینا کہ خدا نے انس و جن کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ اس کی عبادت کریں عام متبادر معنی کے لحاظ سے انسانی دنیا کے لیے مفید ثابت نہیں ہوا دنیا میں ترقی یافتہ مذاہب دو طرح کے ہیں ایک وہ جنھوں نے زندگی یا مذہب کا کوئی فلسفہ پیش کیا اور دوسرے وہ جنھوں نے صرف عملی زندگی کو سامنے رکھ کر چند اصول سوسائٹی کی اصلاح کے مرتب کرنے پر اکتفا کی۔ ہر چند اول

الذکر مذاہب کی تعلیم کا بھی حقیقی مقصود وہی سوسائٹی کی اصلاح تھا لیکن جس طرح براہ راست علمی زندگی کا درس دینے والے مذاہب حیات بعدالموت کے قائل ہو کر مراسم و شعائر میں الجھ کر رہ گئے۔ اسی طرح فلسفہ پیش کرنے والے مذاہب بھی نفسیاتی گتھیوں کے سلجھانے میں محو ہو کر ایسے دور از کار قیاسات میں جتلا ہو گئے کہ سوسائٹی کا مفاد بالکل نظر انداز ہو گیا اور ان کی فلسفیانہ عقل آرائیاں مادی حقیقتوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی لائحہ عمل بنی نوع انسان کے سامنے پیش نہ کر سکیں اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ مذہب کا تعلق کسی قومی عروج و ارتقاء سے نہیں ہے جس کے لیے تیغ و تفنگ کا جارحانہ یا مدافعانہ استعمال ضروری ہو بلکہ صرف فلسفہ حیات پر غور کرنے اور خاموشی سے رموز زندگی حل کرنے سے ہے تو بتایئے کہ ہندوؤں کے فلسفہ و ویدانیت' نروان' اہنسا اور مکتی نے دنیا کو کیا فائدہ پہنچایا۔ یعنی اگر تلوار ہاتھ میں لے کر دنیاوی جاہ و حشم کو اپنے لیے مخصوص کر لینے سے دنیا کو نقصان پہنچا تو بودھ کی طرح کاسہ گدائی لے کر در در کی بھیک مانگنے سے نوع انسانی کو کیا نجات حاصل ہوئی۔

اگر کسی قوم نے اسے تلوار سے مجروح کیا تو دوسری نے اسے اپاہج بنایا۔ اگر ایک نے نفس پرستی و خود غرضی کو رواج دیا تو دوسری نے نفس مدعا اور غرض مشترک کو محو کر کے انسانی عزائم کو سرد کر دینے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا۔ الغرض نوع انسان کو نہ ان مذاہب سے کوئی فائدہ پہنچا جو یکسر عمل ہونے کے مدعی ہیں اور نہ ان مذاہب سے جو صرف عقائد پیش کرنا منتہائے نظر سمجھتے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا سبب مسئلہ "روحانیت یا مابعد اللطبیعیات" ہے جس نے انسان کی دنیاوی زندگی کو بالکل پس پشت ڈال دیا اور حقیقی زندگی کو اس عالم سے متعلق ہی نہ سمجھا۔ اگر یہاں کی زندگی کو اہمیت دی جاتی تو اس کی اصلاح کی طرف توجہ بھی کی جاتی لیکن بلا استثناء تمام مذاہب نے مادی حیات کی تخفیف کی اور اس کو ناقابل اعتناء سمجھا۔ اس لیے اصولاً کوئی مذہب دنیاوی لحاظ سے کامیاب نہ ہوا اور انسان کے نفسیاتی میلان نے جو ہنگامہ یہاں برپا کر رکھا ہے اس کا کوئی علاج کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

یہی تلخ تجربہ تھا جس نے دنیا میں مادہ پرست جماعت پیدا کر دی اور دنیا کو دنیا کے اصول سے سمجھنے اور کاربند ہونے پر مجبور کر دیا۔

پھر ہرچند ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مادئین نے جو کچھ سمجھا وہ بالکل درست ہے یا ان

کے مقرر کیے ہوئے اصول دنیا کے امن و نجات کے ضامن ہو سکتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا مقصود بالکل بر محل ہے اور "قضیہ زمین بر سر زمین" کے اصول پر کار بند ہوتے ہوئے وہ انسانی دماغ کی بہت سی تشویشوں کو دور کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے نہ ایسے خدا کا سوال ہے جس نے قادر مطلق اور فعال لما یرید ہونے کی حیثیت سے انسان کو دنیا میں عضو بیکار بنا رکھا ہے اور نہ وہ اپنا وقت اس مسئلہ پر غور کرنے میں ضائع کرتے ہیں کہ دنیا کیوں پیدا کی گئی وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا پیدا ہو چکی ہے اور اس میں ہم کو زندگی بسر کرنا ہے اس کے بعد کچھ نہیں ہے اس لیے ہم کو ہر ممکن کوشش کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور ترقی کی جتنی راہیں ہیں ان پر چل کر دنیا کو اپنے لیے جنت بنا لینا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ مادی تحریک اخلاق کی ضامن نہیں ہے اور اس سے خود غرضی کا جذبہ قوی ہو کر ایک قوم کا دوسری قوم کو ہلاک کرنا مستبعد نہیں لیکن اگر صرف اس دلیل پر اس تحریک کو رد کر دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کی حمایت کی جائے جبکہ اس نے بھی یہی کیا اور اس کے ہاتھ بھی ہمیشہ خون سے رنگین نظر آئے فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ ایک نے خدا کا نام لے کر تلوار اٹھائی اور دوسرا خدا کو بدنام نہیں کرتا اور اپنی ہی اغراض کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

علاوہ اس کے ایک مسئلہ اور اس جگہ قابل غور ہے وہ یہ کہ ملاحدین کا مذہب ہنوز ارتقاء کی حالت میں ہے اور بالکل ممکن ہے کہ آئندہ کوئی صورت ایسی پیش آئے کہ انسان خونریزی سے باز رہنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ حالت موجودہ نظام تمدن نے جو ہمیشہ مادی ترقی پر قائم ہے وسیع ہو کر ایسی عجیب و غریب صورت اختیار کر لی ہے کہ آہستہ آہستہ تمام قومیں تمام جماعتیں بلکہ جملہ افراد ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے جاتے ہیں یعنی اغراض کی تکمیل روز بروز باہمی تعاون پر منحصر ہوتی جا رہی ہے پھر کیا یہ امر خلاف عقل ہے کہ ایک ایسا وقت آئے جب باہمی تصادم کی تمام صورتیں مسدود ہو جائیں اور تمام نوع انسانی ایک نظام سے وابستہ ہو کر ایک قوم' ایک جماعت ایک ہیئت اور ایک سوسائٹی بن جائیں اور باہمی جنگ' خونریزی کا امکان باقی نہ رہے۔ اس وقت جس چیز نے دنیا میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کی جنگ ہے' یعنی دنیا اب اس کو برداشت نہیں کر سکتی کہ انسان انسان میں تفریق صرف اس بناء پر قائم ہو کہ ایک کے پاس دولت کا انبار ہے اور دوسرا اس سے

محروم ہے' دولت انسان ہی کی پیدا کی ہوئی ایک مفروضہ قوت ہے جس سے اس وقت تک کام لیا جا سکتا ہے جب تک سب یکساں طور پر اس سے مستفید ہوتے رہیں لیکن اگر یہ مساوات مفقود ہو جائے اور دولت انسانیت کو پامال کرنے میں صرف ہونے لگے تو اس کو مٹ جانا چاہیے چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت یورپ کا ہر ملک اس جذبہ سے متاثر ہو رہا ہے اور تمام وہ حکومتیں جو سرمایہ دارانہ استبداد و استعمار پر قائم تھیں ایک ایک کر کے اشترا کی اصول پر کاربند ہونے کے لیے مجبور ہو رہی ہیں پھر اگر ساری دنیا میں اشتراکیت پھیل جائے اور دولت مندی و افلاس کا مفہوم ہی بالکل بدل جائے تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت بھی ایک انسان دوسرے انسان سے اور ایک جماعت دوسری جماعت سے برسر پیکار ہو گی؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ سارا اختلاف تو اسی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ فلاں سرمایہ دار ہے اور فلاں تہی دست لیکن اگر یہ اختلاف مٹ کر تمام انسان ایک سطح پر آجائیں تو مخالفت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اور اس امن و سکون کو حاصل کر سکتی ہے جسے مذاہب عالم اس وقت تک حاصل نہیں کر سکے۔

اس لیے بہ حالات موجودہ ہمارا سوچنا کہ خدا نے کائنات کو کیوں پیدا کیا۔ سد درجہ تضیع لوقت ہے' سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ جب ہم اس دنیا میں آگئے ہیں تو ہم کو زندگی کیونکر بسر کرنا چاہیے اور اپنا وقت کس طرح صرف کرنا چاہیے۔

خدا کی حقیقت کیا ہے دنیا سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اس تعلق کی بناء پر ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں' یہ سب ایسے دور ازکار سوالات ہیں کہ نہ اس وقت تک ان کا کوئی شافی جواب دیا جا چکا ہے اور نہ آئندہ ممکن ہے۔ انسان واقعات و حوادث کا بندہ ہے۔ اسباب و علل کی دنیا میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے' اس لیے اسے انھیں باتوں پر غور کرنا چاہیے جس سے اس کی زندگی متعلق ہے اگر خدا دنیا میں آکر ہمارے کاموں میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹاتا تو ہم کو کیا حق ہے کہ اس کے متعلق گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع کرتے رہیں۔ اگر اس نے کن کہہ کر دفعتاً" عالم کو پیدا کر دیا تو کیا اور تدریجی ارتقاء کے ساتھ عالم کو سنوارا تو کیا انسانی درد و دکھ کا علاج ان میں سے کسی اعتقاد سے متعلق نہیں۔ پھانس اگر چبھی ہے تو اس کی تکلیف نکالنے ہی سے دور ہو سکتی ہے نہ کہ اس بات پر غور کرنے سے کہ پھانس کی حقیقت کیا ہے اور وہ کیونکر گوشت کے اندر پہنچ گئی۔

گھر میں جس وقت آگ لگتی ہے تو اس کا سبب دریافت کرنے سے پہلے اس کے

بجھانے کی فکر ہوتی ہے۔

اس لیے وہ لوگ جو حقیقی معنی میں نوع انسانی کے خیرخواہ ہیں۔ ان کو نہ خدا کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور نہ یہ سوچنے کی کہ اس نے دنیا کو کیوں پیدا کیا بلکہ صرف ان تدابیر پر غور کرنے کی کہ تمام انسان باہم مل کر صلح و آشتی کی زندگی کیونکر بسر کرتے ہیں۔

مذاہب تو اس تجربہ میں ناکام رہے اس لیے لامحالہ ہمیں ان سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرنا پڑے گی۔ خواہ وہ اشتراکیت ہو یا کچھ اور پھر اب دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ زمانہ کا رخ کیا ہے۔ سیلاب کا بہاؤ کس طرف ہے اگر ہم نے اس کا ساتھ دیا تو بے شک ہم کو نجات حاصل ہو سکتی ہے ورنہ خس و خاشاک کی طرح بہہ جانا یقینی ہے اور مذاہب کا تنکا ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

○ ○ ○

مسلمانوں کا یوم النبی

مسلمانوں میں 12 ربیع اللاول کو (حالانکہ ولادت نبوی کی صحیح تاریخ 9 ربیع اللاول ہے) وہی اہمیت حاصل ہے جو ہندوؤں کے یہاں جنم اشٹمی کو۔ یعنی جس طرح ان کے یہاں کرشن جی کی ولادت پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی جماعت' ولادت نبوی پر جذبات مسرت ظاہر کرتی ہے۔

لیکن ان دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ جنم اشٹمی کے منائے جانے پر ہندوؤں کے اکابر کی طرف سے نہ کوئی تحریک کی جاتی ہے نہ اخباروں میں نشرو اعلان ہوتا ہے اور یوم النبی کے لیے علماء اسلام کو کافی پراپیگنڈا کرنا پڑتا ہے تاکہ مسلمان اس تقریب کی پذیرائی میں زیادہ جوش ولولہ سے کام لیں۔

یوم النبی کی تحریک مسلمانوں میں کوئی قدیم تحریک نہیں کیونکہ اس کا پتہ قرون اولی میں کہیں نہیں چلتا۔ خاص کر لفظ "یوم النبی" تو بالکل مغربی تتبع میں اختیار کیا گیا ہے جو ترجمہ ہے (PROPHET DAY) کا ورنہ اب سے کچھ زمانہ قبل اس کو ذکر میلاد "میلاد النبی اور عوام میں "مولود شریف" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا لیکن یہ تحریک قدیم ہو یا جدید' اس کا نام "یوم النبی" قرار دیا جائے یا کچھ اور' اس کے مفید ہونے سے بہر حال انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر واقعی اس سے ہماری عملی زندگی میں کوئی تغیر پیدا ہو۔ لیکن سوال یہی ہے کہ کیا کبھی اس سے کوئی فائدہ اس قسم کا مرتب ہوا ہے اور کیا آئندہ کوئی توقع اس کی کی جاتی ہے۔ مجھے اس باب میں سخت مایوسی ہے اور میرا یقین ہے کہ اگر مسلمان بجائے سالانہ احتفال و اجتماع کے ہر مہینے اور ہر ہفتہ یوم النبی منائیں تو بھی کوئی فائدہ ان کو نہیں پہنچ سکتا اور جس اسلوب سے اس تقریب میں اظہار جذبات کیا جاتا ہے وہ بجائے مفید ہونے کے اور نقصان رساں ہے۔

کسی مذہب میں تہواروں یا خاص تقریبوں کا پیدا ہو جانا حقیقتاً اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے دورانحطاط سے گذر رہا ہے اور اب اس کے پاس سرمایہ عمل صرف یہ رہ گیا کہ وہ اپنے اسلاف یا اپنی گزشتہ تاریخ عروج کے بعض واقعات کبھی کبھی یاد کر لیا کریں۔ آپ کسی

مذہب و قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ اس کے ابتدائی زمانہ عروج میں نہ کوئی خاص تہوار تھا نہ کسی واقعہ کی یاد میں کوئی تقریب منائی جاتی تھی' لیکن جوں جوں اس میں انحطاط پیدا ہوا اس قسم کے مراسم بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ مجموعہ روایات سے زیادہ کوئی چیز نہ رہ گیا اور صرف انھیں روایات کا زبانی تحفظ اصل مذہب قرار پایا۔ جب کوئی قوم اول اول کسی مقصد کو لے کر پورے جوش کے ساتھ اٹھتی ہے تو اس کے سامنے سوا اقدام و عمل کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی لیکن جب وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اس کی فتوحات انتہا کو پہنچ گئیں یا یہ کہ منزل مقصود اس کو حاصل ہو گئی تو اس کے قواء میں اضمحلال عزائم میں کمزوری اور عملی زندگی میں ضعف پیدا ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ چند دن تک وہ اسی سطح پر قائم رہنے کے بعد پھر نیچے کی طرف گرنے لگتی ہے اور تن آسانیوں کی عادت اسے محسوس نہیں ہونے دیتی۔ کہ وہ کس طرح تیزی سے مائل بہ انحطاط ہے کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ہر کمال کے لیے زوال ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس حالت کو کمال سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ حقیقت کمال ہے بھی یا نہیں دنیا میں ترقی و عروج کی انتہا نہیں۔ تکمیل و ترقی کی راہیں غیر محدود ہیں اس لیے کمال کی تعیین محال ہے اور زوال کمال کے لیے لازم نہیں ہے بلکہ وہ اس احساس کا نتیجہ ہے کہ ہم نے کمال حاصل کر لیا یا بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ انحطاط نام ہے تعیین منزل کا' اور اس منزل تک پہنچ کر یہ سمجھنے کا کہ اب آگے ہم کو بڑھنا نہیں لیکن اگر کوئی مقصود متعین نہ کیا جائے یا یہ کہ ہر مدعا کی تکمیل کے بعد دوسرا مدعا پیش نظر رکھا جائے تو کبھی زوال ہو ہی نہیں سکتا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں خیر عہد رسالت کو تو چھوڑیئے کہ وہ تو بالکل ابتداء کی بات تھی اور اصولاً اس وقت نہ تعیین منزل کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ نہ تکمیل مدعا کا لیکن اس کے بعد جب فتوحات وسیع ہوئیں سلطنت کی حدود میں وسعت پیدا ہوئی تو کیا ہوا؟ عہد عباسیہ کو عربوں کی فتوحات کا دور زریں کہا جاتا ہے لیکن کیا اس دور زرین کے معنی یہ تھے کہ جو کچھ ان کو کرنا تھا کر چکے اور کیا اس احساس میں ان کا زوال پنہاں نہ تھا۔

اسی طرح ترکوں کو لیجیے کہ ان کا انتہائی نقطہ نظر قسطنطنیہ فتح کر لینا تھا اور جب محمد خاں ثانی اس میں کامیاب ہو گیا تو ان کی فتوحات کا بڑھتا ہوا سیلاب اسی جگہ رک گیا اور اسی دن سے ان کا زوال شروع ہو گیا ورنہ اگر وہ کسی منزل کی تعیین نہ کرتے اور اپنے اقدامات کو برابر اسی طرح جاری رکھتے تو آج سارا یورپ مسلمان ہوتا اور سرزمین مغرب کا کوئی حصہ

ایسا نہ رہ جاتا جہاں ہلالی پرچم نہ لہراتا۔

الغرض قومیں جب آگے بڑھتے بڑھتے ایک جگہ ٹھہر جاتی ہیں اس وقت سے ان کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور پھر جب وہ انحطاط کے اس دور میں پہنچ جاتی ہیں کہ خود ان میں کوئی قوت عمل باقی نہیں رہ جاتی اور نکبت و ذلت کا احساس شروع ہو جاتا ہے تو وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو فخریہ بیان کرنے لگتے ہیں اسی کو ذریعہ ترقی سمجھتے ہیں۔

یہ ہے حقیقت قوموں کے تہواروں اور تقریبوں کی اور یہی وہ جذبہ ہے جس کے تحت مسلمانوں میں بھی بہ سلسلہ "یوم النبی" اظہار مسرت کیا جاتا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ کی ذات گرامی جن صفات کی حامل تھی وہ کبھی فراموش کیے جانے کے قابل نہیں۔ یہاں تک کہ اگر آج تمام مسلمان دنیا سے محو ہو جائیں تو بھی ان کا ذکر کیا جائے گا۔ اور تاریخ کے صفحات ان کے ذکر سے لبریز نظر آئیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ جس اصول و انداز پر ان کے یوم ولادت کی یاد ہر سال تازہ کی جاتی ہے وہ واقعی ہمارے لیے مفید ہے یا نہیں اور اس وقت تک مسلمانوں کو اس سے کیا فائدہ پہنچا ہے۔

یہ تقریب آج نہیں بلکہ صدہا سال قبل اس وقت سے منائی جا رہی ہے جب مسلمانوں کی حکومت تھی لیکن کیا ذکر "میلاد النبی" کے جلسے اس قوم کو انحطاط سے روک سکے اور اب جبکہ زوال کی انتہا ہو چکی ہے تو کیا پھر اسے ابھارنے کے ضامن ہو سکتے ہیں۔

تمام عالم اسلامی کے علمائے کرام کی طرف سے اعلان شائع ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو "یوم النبی" حد درجہ جوش و اہتمام سے منانا چاہیے۔ چنانچہ اس ارشاد کی تعمیل میں اونچے اونچے دروازے نصب کئے جاتے ہیں۔ رنگین جھنڈیوں سے درو دیوار کی آرائش ہوتی ہے بجلی کے قمقمے لٹکائے جاتے ہیں۔ شیرینی کا انتظام ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے گروہ ہاتھوں میں جھنڈیاں لیے۔ سینے پر ریشمی کپڑوں کے بیج لگائے اللہ اکبر کے پرزور نعرے مارتے ہوئے نکلتے ہیں اور رات کو جب واعظ اپنا وعظ ختم کر چکتا ہے تو شیرینی لے لے کر لوگ اپنے گھر واپس آتے ہیں۔ اس حال میں کہ رات بھر وہ اس جنت کا خواب دیکھتے رہتے ہیں جس کا ذکر واعظ نے کیا تھا اور صبح کو جب بیدار ہوتے ہیں تو کاہلی و بے کاری کا وہی جمود ان پر طاری ہوتا ہے اس سے قبل طاری تھا اور کسی قسم کا کوئی اضافہ اپنی ہمت و جرات میں نہیں پاتے۔

اسلاف پرستی یقیناً اچھی چیز ہے۔ اور قوموں کو ابھارنے کے لیے یہ ذریعہ بلاشک

کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اسلاف پرستی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا سکندر کے مرنے کے بعد محض اس کی یاد سلطنت رومہ کو تباہی سے بچا سکی' کیا سلطان محمد ثانی اور سلیمان اعظم کے کارناموں کا ذکر سلطنت ترکی کو زوال سے بچا سکا۔ کیا عبدالرحمان کی جرات و ہمت کی داستانیں ہسپانیہ میں مسلمانوں کی حکومت کو زوال سے روک سکیں اکاسرہ عجم کی شوکت و جبروت کا ذکر ہر ایرانی کے لب پہ تھا لیکن ایران تباہ ہو کر رہا۔ رام و کرشن کے ولولہ و عزم کی کہانیاں ہمیشہ سے ہندوؤں کی یاد تھیں لیکن مسلمانوں نے ان کو مغلوب کر کے چھوڑا سطوت مغلیہ کے آوازہ سے فضا گونج ہی رہی تھی کہ انگریزوں نے آکر ان کا تختہ الٹ دیا۔ پھر یاد رکھو کہ تم ہر سال کیا معنی اگر ہر مہینے "یوم النبی" منا کر رسول للہ کی ولادت پر اظہار مسرت کرتے رہو گے تو بھی مٹنے سے نہیں بچ سکتے کیونکہ قوموں کے عروج و زوال کا ہمیشہ ایک فلسفہ رہا ہے اور جب تک کوئی نپولین وہنی بال پیدا نہ ہو جائے محض ان کی یاد کوئی معنی نہیں رکھتی پھر یہ وقت رستم و سہراب کی داستانیں دہرانے کا نہیں بلکہ رضا شاہ کے پیدا کرنے کا ہے' باب عالی کی گذشتہ سطوت و جبروت بیان کرنے کا نہیں' بلکہ مصطفیٰ کمال کے وجود میں لانے کا ہے اور اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی روح پھونکنے کی ضرورت ہے تو اس لیے کسی نہ کسی خالد و عمرؓ حسین و علی کا ظہور میں آنا ضروری ہے اور یہ نہ کسی احتفال اجتماع سے پیدا ہو سکتی ہے نہ وعظ و تبلیغ سے' بلکہ اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینے سے ، آگ کے اندر کود جانے سے اور ہتھیلی پر سر لے کر باہر نکل آنے سے۔

رسول کی ولادت و سیرت کا ذکر کیا جاتا ہے اس رسول کا جس کی زندگی یکسر عمل سراپا ایثار و قربانی تھی۔ اس ہستی کا جس میں سوائے صداقت و خلوص کے نمود و نمائش کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس ذات گرامی کا جو صرف ہمدردی و محبت کے لیے وضع ہوئی تھی لیکن حال یہ ہے کہ سوا قول کے عمل کا کہیں نام نہیں بجز نمود و نمائش کے صداقت کا کوسوں پتہ نہیں سوا خود غرضی و طمع نفس کے ایثار و قربانی سے کوئی واسطہ نہیں پھر خدارا کوئی بتائے کہ یہ کیا تماشہ ہے' یہ کس قسم کی یادگار ہے یہ کس انداز کا اجتماع ہے اور ہمارے قائدین عظام اس سے کس فائدہ کی توقع رکھتے ہیں۔

اگر اسوۂ رسول کی عظمت کو ہم صرف رنگین جھنڈیوں سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ اگر اس کی پاکیزہ سیرت کے اظہار میں صرف بجلی کے قمقموں کا روشن کرنا کافی ہے۔ اگر اس کی

مقدس تعلیم کا نشرو اعلان محض شیرینی تقسیم کرنے سے پورا ہو سکتا ہے اور اگر ہم اس کے باطنی و اخلاقی علو کو جھنڈیاں لے لے کر سڑکوں پر گشت لگانے سے ثابت کر سکتے ہیں۔ اور اگر اس کی صداقت عمل کی تبلیغ میں ظاہری نمود و نمائش کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں تو بے شک یہ سب کچھ درست ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ لہو لعب کا مظاہرہ نا مناسب نہیں لیکن اگر خود رسول نے کبھی وہ نہیں کیا جو ہم کر رہے ہیں اور کبھی اس کی اجازت نہیں دی جو ہماری طرف سے ظاہر ہو رہا ہے تو پھر اس کو "یوم النبی" کی یادگار کہنا یقیناً رسول اللہ کی توہین ہے۔ اسلام کی تذلیل ہے' اور مسلمانوں کے اندر ایک ایسے جذبہ کی پرورش کرنا ہے جو بت پرستی کی طرف تو منجر ہو سکتا ہے لیکن خدا پرستی سے اسے کوئی تعلق نہیں۔

یہ تو ہوئی عملی پہلو کی کمزوری یا اس کا فقدان جو یوم النبی کے سلسلہ میں مسلمانوں کی طرف سے ظاہر ہوتا' اب رہ گئی تاریخی یا مذہبی حیثیت جس کو سامنے رکھ کر ہمارے علمائے کرام ذکر میلاد فرماتے ہیں۔ سو اس کا حال اس سے بھی بد تر ہے۔ کیونکہ ان کا مقصود رسول اللہ کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کرنا کبھی نہیں ہوتا' بلکہ ایک مافوق الفطرت ہستی کی صورت سے پیش کرنا ہوتا ہے وہ ابھی پیدا نہیں ہوئے کہ ان کا نور لاکھوں سال قبل سے خدا جانے کہاں کہاں چکر کھاتا پھرتا ہے۔ وہ جس وقت پیدا ہوتے ہیں تو اکاسرہ کے محل اور صنم کدوں کے بت سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ وہ ابھی عالم طفلی میں ہوتے ہیں کہ فرشتہ ان کا سینہ چاک کر کے آلائش سے پاک کر دیتا ہے وہ دعوائے نبوت کرتے ہیں تو سنگریزے سے اس کی شہادت دیتے ہیں۔ جب آپ چلتے ہیں تو جسم کا سایہ نظر نہیں آتا۔ اور کبھی جوش نبوت میں انگلی کا اشارہ کر دیتے ہیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر میں حیران ہوں کہ جب ذکر میلاد کے سلسلہ میں قولاً و عملاً کوئی بات بھی کام کی نہیں ہوتی تو کیوں اس پر ہزاروں روپیہ ضائع کیا جاتا ہے اور کیوں اس طرح کے ظاہری مراسم و شعائر کی طرف متوجہ کر کے ان کے قوائے عمل کو اور ضعیف بنایا جاتا ہے۔

اس وقت سب سے ضروری امر جس کی طرف اکابر اسلام کو توجہ کرنا ہے وہ مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری ہے جو نہ نمازیں پڑھنے سے دور ہو سکتی ہے نہ یوم النبی منانے سے بلکہ صرف ایک ایسی تنظیم سے جو ان کی معاشرت و معیشت کو اجتماعی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور نہایت آسانی سے ممکن ہے اگر ہمارے یہاں کے علماء و اکابر صرف زکوٰۃ کے مسئلہ

پر توجہ کر کے ایک قومی بیت المال قائم کر سکیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ان کی تن آسانیاں اور خود غرضیاں کبھی اس کی اجازت نہ دیں گی اور وہ یوم النبی کی تقریب میں مثلاً خرافات کا ایک طو مارا اور عملاً لہو و لعب کا دلچسپ پروگرام ضرور پیش کر سکیں گے لیکن کام کی کوئی بات کبھی نہ کریں گے۔

اس وقت مسلمانوں کی کروڑوں آبادی میں سے اگر ایک کروڑ مسلمان بھی اوسطاً" ایک روپیہ سالانہ دینے والے مل جائیں اور یہ رقم ایک جگہ جمع ہو کر قومی اداروں میں صرف ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ربع صدی کے اندر کتنا عظیم انقلاب برپا ہو سکتا ہے اور فقرو فاقہ و بیکاری جس میں مسلمانوں کی اکثر تعداد مبتلا نظر آتی ہے۔ کتنی آسانی سے دور ہو سکتی ہے۔

یوم النبی کی تقریب ہندوستان کے ہر گاؤں۔ ہر قصبہ اور شہر کے ہر محلّہ میں منائی جاتی ہے اور اس لیے اس سے بہتر کوئی موقعہ عام تنظیم کے لیے نہیں ہو سکتا۔ ہر محلّہ میں ایک ایک کمیٹی چند آدمیوں کی بنا دی جائے جو ماہوار وصولی زکواۃ کے ذمہ دار ہوں اور ان کمیٹیوں کا تعلق شہر کی صدر کمیٹی سے ہو۔ اسی طرح شہروں کی کمیٹیاں صوبہ کی مرکزی کمیٹی سے متعلق ہوں اور صوبائی کمیٹیاں بیت المال عمومی سے وابستہ ہوں جو سارے ملک کا ایک ہو۔ اس کا سالانہ جلسہ ہر جگہ یوم النبی کی تقریب میں منعقد کیا جائے اور رپورٹ پیش کی جائے کہ سب کمیٹیوں نے سال بھر میں کیا کام کیا اور یہ تمام رپورٹیں بیت المال عمومی کے صدر کے پاس جائیں گی۔ جو ایک بورڈ کے مشورہ سے ہدایات جاری کرے گا۔ ہر محلّہ کے مستحقین امداد کی فہرست باقاعدہ مرتب کی جائے اور ایک خاص حد تک شہر کی کمیٹی کو خرچ و امداد کے اختیارات دیئے جائیں۔

الغرض یہ اور اسی طرح کی بہت سی صورتیں اس سلسلہ میں ایسی پیدا ہو سکتی ہیں جو مسلمانوں کے بہت سے نادار طلبہ کو تعلیم دلانے میں مدد دے سکتی ہیں اور خدا جانے کتنے صنعتی مدارس اور تجارتی ادارے قائم کر کے لاکھوں بے کار مسلمانوں کو کام میں لگایا جا سکتا ہے مگر ہمارے اکابر کو کیا غرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور ہمارے علمائے کرام کو کیا پڑی ہے کہ وہ یہ درد سر مول لیں۔

○ ○ ○

عالمگیر مذہب

تاریخ تمدن انسانی پر جس وقت غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر طلوع آفتاب کے ساتھ انسان کا قدم ترقی کی طرف اٹھ رہا ہے اور عقائد مذہبی کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب ترقی کے منافی ہے۔ کیا اس کے اصول انسان کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں اور کیا مذہبی تعلیم دماغی نشو و نما اور ذہنی ارتقاء کا ساتھ دینے سے عاری ہے۔

اس کا جواب ڈھونڈھنے کے لیے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ مذاہب عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ یقیناً مذہب انسان کی ترقی میں حائل ہے اور اسے حائل ہونا چاہیے تھا کیونکہ مذاہب عالم کی پیداوار نتیجہ تھی صرف مقامی و نسلی اقتضاء کا اور اس کے ذہن میں تمام نوع انسانی کی فلاح و ترقی کا سوال آہی نہ سکتا اگر کوئی مذہب ایشیا کے مغرب میں پیدا ہوا تو اسے مشرق کے باشندوں کا حال معلوم نہ تھا اور اگر مشرق میں اس کا نشوونما ہوا تو وہ اہل مغرب کی طرف سے خالی الذہن تھا۔ صرف ایک مخصوص جماعت ایک محدود ملک کی اصلاح کا مقصد ان کے سامنے تھا اور اس لیے قدرتاً وہ ایسے اصول بنا ہی نہ سکتے تھے جو کرہ ارض کے تمام باشندوں کے لیے ان کے ماحول۔ ان کی معاشرت اور ان کی طبیعت و مزاج کے لحاظ سے مناسب و ضروری ہوں۔ میری مراد مذہب سے یہاں صرف وہ چند معتقدات ہیں' جن کا تعلق نہ صرف خدا کی ہستی یا مابعد الطبیعیات سے ہے بلکہ اس شریعت یا اصول اخلاق و معاشرت سے بھی ہے جو ایک مذہب کے تحت کسی قوم میں رائج ہو جاتے ہیں اور جن کا اختلاف اصولی اختلاف قرار دیا جاکر باہمد گر کشت و خون کا باعث ہوا کرتا ہے۔

دنیا میں سب سے آخری قابل ذکر مذہب اسلام ہوا ہے جس کے متعلق کہا جاتا کہ وہ مذاہب کی دنیا میں آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن افسوس ہے کہ نہ اپنے منعقدات دینی کے لحاظ سے وہ سب کے لیے قابل قبول ہے اور نہ شریعت کے اعتبار سے اسے مکمل کہا جا سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا میں جتنے انبیاء ظاہر ہوئے ان سب نے یہی کہا کہ وہ نوع انسانی کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے ہیں لیکن عملاً وہ اس سے زیادہ کامیاب نہ ہوئے کہ ایک محدود جماعت و مخصوص ملک میں کچھ زمانہ تک تو بیداری ضرور پیدا ہوئی لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ فنا بھی ہو گئی۔ اس کا سبب صرف یہی تھا کہ زمانہ کی ترقی کا ساتھ کوئی مذہب نہ دے سکا اور انسان کے ذہن و عقل میں جو نشوو نما پیدا ہو رہا ہے اس کے اقتضا کو وہ پورا نہ کر سکا۔

مذہب نام نہ صرف خالص اصلاح اخلاق کا ہے اور نہ ترقی تمدن و معاشرت کا بلکہ اس میں وہ اعتقادات بھی شامل ہیں جو خدا کی ہستی۔ اس کی عبادت اور حیات بعدالموت سے متعلق ہیں اور اس لیے ایک مذہب صرف ہمارے اصول معاشرت و اخلاق منضبط کرنے کا مدعی نہیں ہے بلکہ وہ انسان کو اس بات پر بھی مجبور کرتا ہے کہ خدا اور اس کی ہستی کی نسبت بعض متعین و مخصوص عقائد کو تسلیم کرے یعنی وہ عقل انسانی پر بھی حکمرانی کرنے کا دعویدار ہے' درآنحالیکہ عقول انسانی میں جو تدریجی ارتقاء پیدا ہو رہا ہے اس کا ساتھ دینے کی اہلیت اس میں نہیں ہے اور غالباً یہی وہ کمی ہے جس کو یوں کہہ کر پورا کیا جاتا ہے کہ مذہب میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہے۔

ایک طرف ہم کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ مذہب فطری چیز ہے' یعنی عقل انسانی خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے مذہب کے اصول و عقائد متزلزل نہیں ہو سکتے اور دوسری طرف یہ تاکید بھی ہے کہ مذہب نام ہے بغیر استعمال عقل کے ان باتوں کے بے چون و چرا تسلیم کر لینے کا جن کو ہمارے اکابر و اسلاف تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور ان دونوں میں جو تضاد و تباین پایا جاتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ مذہب بالکل مقامی و تمدنی چیز ہے۔ یعنی ایک مخصوص قوم و ملک کے مفاد کو سامنے رکھ کر وضع کیا جاتا ہے اور اس کا قوی ترین ثبوت یہ ہے کہ دنیا میں ہر مذہب سوا اپنے دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے متبعین میں دوسری اقوام یا دیگر مذہب والوں سے نفرت کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں عالم کا امن و سکون اس سے کسی طرح وابستہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے برعکس وہ باہمی اختلاف و تصادم پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

ہر چند مذہب کی اس حقیقت کا انکشاف کوئی جدید انکشاف نہیں ہے اس سے قبل بھی

اس تلخی کا علم لوگوں کو تھا۔ لیکن چونکہ ترقی تمدن اس حد تک نہ ہوئی تھی کہ تمام کرہ ارض کے امن و سکون اور جملہ نوع انسانی کی مرکزیت کی طرف خیال منجر ہوتا اس لیے چنداں پروا بھی نہ کی جاتی تھی۔ لیکن اب کہ علمی اکتشافات و ذرائع نقل و حمل اور تجارتی و اقتصادی وسعت نے دنیا کے ہر ملک کو دوسرے کا محتاج بنا دیا ہے۔ سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ دنیا کا امن و سکون کیونکر قائم رکھا جائے اور باہمی جذبات مخالفت و منافرت کو دور کر کے کسی طرح تمام نوع انسانی کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر دیا جائے۔

یقیناً مذہب اس مقصد کو پورا کر سکتا تھا اگر اس کے عقائد و قانون میں اتنی لچک ہوتی کہ وہ ذہن انسانی کی ترقی کا ساتھ دے سکتا لیکن چونکہ مذہب نام ہے صرف قدامت پرستی کا انھیں اصول پر کار بند ہونے کا جو صدیوں اور ہزاروں سال قبل وضع کیے گئے تھے اس لیے وہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہو سکتا اور ایک مذہب پر کیا موقوف ہے اس وقت کوئی نظام عمل جو ذہن انسانی کی تشویش کو دور کرنے اور دنیا میں عام امن و سکون پیدا کرنے کے ناقابل ہے کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اب اسی کے ساتھ ایک سوال اور بھی غور طلب ہے۔ یعنی یہ کہ اگر آج دنیا سے مذہبیت یکسر فنا ہو جائے اور مذہبی عصبیت بالکل محو کر دی جائے تو کیا مدعا حاصل ہو جائے گا اور کیا کرہ ارض کے تمام باشندے ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بن کر رہنے لگیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً مدعا اس وقت بھی حاصل نہ ہو گا کیونکہ مذہبیت کے علاوہ دو بلائیں اور نوع انسانی پر نازل ہوئی ہیں۔ ایک امتیاز رنگ و نسل کی اور دوسری جذبہ سرمایہ داری کی یعنی جس طرح مذہب لوگوں میں جذبہ منافرت کی پرورش کر رہا ہے بالکل اسی طرح گورے کالے کا امتیاز اور فراہمی دولت کی حرص نے انسانیت کو پامال کر رکھا ہے چنانچہ امریکہ میں جو سلوک حبشیوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں اور سرمایہ داروں کی طرف سے مزدوروں کی محنت و عرق ریزی کا جو صلہ ملتا ہے وہ بھی دنیا کو معلوم ہے وہ اہل نظر جن کی نگاہ ان تمام مسائل پر ہے ان میں سے بعض کا خیال یہ ہے کہ رنگ و نسل کا امتیاز بھی مذہب ہی نے پیدا کیا ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت بھی نتیجہ ہے مذہبیت کا جس نے اخلاق کی آڑ میں سلطنت حکومت کی بنیادیں قائم کیں۔ اس لیے مذہبیت کے ساتھ ان کو بھی ختم ہو جانا ہے۔ مگر میں اس سے متفق نہیں ہوں اور ان کو جداگانہ امراض تصور کرتا ہوں جن کا علاج بھی بالکل جداگانہ ہونا چاہیے۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ جب تک

کلیتہ" تمام امراض کے دور کرنے کی صورتیں پیدا نہ ہو جائیں۔ کسی ایک مرض کا بھی مداوا نہ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کا اندفاع دوسری بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت ہم میں پیدا کر دے اور اس لیے اگر دنیا سب سے پہلے مذہبیت ہی کو دور کرنا چاہتی ہے تو بیجا نہیں جبکہ حقیقتاً سب سے زیادہ سخت و سنگین مرض یہی ہے۔

اس کے متعلق دنیا میں فی الحال دو قسم کے خیال رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو موجودہ مذاہب میں اصلاح کر کے کسی ایک عالمگیر مذہب کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو سرے سے مذہب کے خیال ہی کو محو کر دینا پسند کرتے ہیں۔

ان میں اول الذکر صورت یقیناً بہتر ہے لیکن تقریباً ناممکن العمل' دوسری صورت البتہ زیادہ آسان ہے۔ اور لوگوں کے موجودہ رجحان کو دیکھتے ہوئے یقین کرنا پڑتا ہے کہ چند صدی کے بعد مذہب تو یقیناً ختم ہی ہو جائے گا۔ گو سرمایہ و عمل کی جنگ اور رنگ و نسل کا امتیاز علی حالہ قائم رہے۔

پھر جب آثار یہ ہیں اور حالات کی نزاکت اس حد تک پہنچ گئی ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان جو اختلاف مذہب کے لحاظ سے دنیا کا حد درجہ بدنصیب ملک ہے' کیا کرنا چاہتا ہے اور اس کے اندر بسنے والوں نے اپنے وطن کو غلامی و ذلت پستی و نسبت سے نکالنے کی کیا تدبیریں سوچیں ہیں اس سے یقیناً انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ایک ملک کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا حق جو اس کے فرزندوں پر عائد ہوتا ہے' یہ ہے کہ وہ اس کو کسی اور کی غلامی میں نہ دے دیں۔ یعنی ایک ملک و قوم کا تنہا طرہ فخر و امتیاز صرف یہ ہے کہ اس کی گردن جھکی ہوئی نہیں ہے اور اس کی دولت پر دوسروں کا قبضہ نہیں ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے تمام افراد کسی ایک غرض مشترک سے وابستہ ہوں' ایک مرکز پر جمع ہو کر صرف ایک ہی نصب العین کی طرف ان کے متفقہ قدم اٹھتے ہوں' پھر کس قدر بدنصیب ہے وہ ملک جس کے فرزند ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں۔ صرف اس لیے کہ ان میں سے ایک مسجد میں جا کر عبادت کرتا ہے اور دوسرا مندر میں' اک کے ہاتھ میں تسبیح ہے اور دوسرے کے گلے میں زنار۔

دنیا میں اور بہت سے ملک ہیں لیکن اس باب میں ہندوستان سے زیادہ بدبخت کوئی نہیں اور مذہب و مذہبیت کا استعمال جس بری طرح یہاں کے لوگوں نے کیا ہے اس کی مثال اس وقت روئے زمین کے کسی حصہ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرف

توجہ کون کرے آیا پنڈتوں اور مولویوں کی وہ جماعت جس کے وجود نے یہاں کی فضا کو اس قدر گندہ کر رکھا ہے؟ یا ہماری موجودہ نسل کے وہ نوجوان جو مغربی علوم سیکھنے کے بعد اپنے آپ کو روشن خیال اور آزاد طبع کہلانا پسند کرتے ہیں؟

اصلاح خواص سے شروع ہوتی ہے یا عوام سے۔ یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ جب تک عوام میں بیداری پیدا نہ ہو اور پبلک کی اصلاح نہ ہو ہیئت اجتماعی کی تشکیل دشوار ہے۔ پھر غور کیجئے کہ عوام کا کیا حال ہے اور ان پر کس کا اثر غالب ہے اگر ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے طلبہ جدید تہذیب و ترقی کے تمام نظریوں سے آراستہ ہو کر اصلاح ملک کے لیے آمادہ ہو جائیں تو بھی مولوی کے اس ایک افسوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو ملک کی جاہل آبادی پر کسی واقعہ معجزہ و کرامت کی صورت میں پڑھ کر پھونک دے گا۔ عوام کی اس کورانہ ذہنیت کا بدل دینا جو صدیوں سے نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی چلی آرہی ہے آسان کام نہیں۔ اس کے لیے یا تو اپنی حکومت ہونی چاہیے جو بزور شمشیر اس تمام فاسد مواد کو دور کر دے جیسا کہ ترکی میں مصطفیٰ کمال' یا ایران میں رضا شاہ پہلوی نے کیا۔ یا پھر تعلیم اتنی عام اور صحیح ہونی چاہیے کہ پبلک خود دوست دشمن میں تمیز کر سکے جو یقیناً صدیوں کا کام ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصلاح کے سلسلہ میں تعمیری اور تخریبی دونوں پہلو سامنے آتے ہیں اور عام طور پر تعمیری پروگرام بنانا ہی زیادہ پسند کیا جاتا ہے حالانکہ اصولاً سب سے پہلے تخریبی فرائض سے سبکدوش ہونا ضروری ہے۔

اگر کوئی عمارت اس حد تک شکستہ و خراب ہو جائے کہ معمولی مرمت اس کے لیے کافی نہ ہو تو اس کا گرا دینا ضروری ہے اور جب تک اس کو پہلے زمین کے برابر نہ کر دیا جائے اس پر دوسری عمارت قائم نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کی تنظیمی حالت کا بھی بالکل یہی حال ہے کہ اس کے اصلاح کے لیے فی الحال تعمیری پروگرام پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جب تک پہلے اس سبب کو نہ محو کر دیا جائے جس نے اس کی بنیاد کو متزلزل کر رکھا ہے اور یہ سب مذہبیت کا وہ غلط مفہوم ہے جسے مولویوں اور پنڈتوں نے پیدا کیا اور جو ان کے فنا ہونے کے بعد ہی دور ہو سکتا ہے۔

دنیا میں جسمانی غلامی کو بہت برا سمجھا جاتا ہے درآنحالیکہ جسمانی غلامی نتیجہ ہے ذہنی غلامی کا۔ اس لیے ضرورت تو سب سے پہلے ذہنی غلامی کو دور کرنے کی ہے اور غالباً اس سے

انکار نہیں ہو سکتا کہ مذہبی عصبیت سے زیادہ ذہنی غلامی پیدا کرنے والی کوئی چیز نہیں۔

اس وقت زمانہ میں علم و عقل کا ایک طوفان بپا ہے۔ مادی ترقی کا سیلاب موجیں مارتا چلا آرہا ہے اور اس لیے اب اگر کوئی بات منہ سے نکالنے کی ہے تو صرف یہ کہ "مرغابی شو کہ کار باطوفان ست"

پھر اگر دنیا کا کوئی مذہب ایسا ہے جو ہماری نجات کا ذمہ دار ہو سکتا ہے تو سامنے آئے اور ہمیں اپنی دوش پر بٹھا کر ساحل تک پہنچا دے ورنہ خس و خاشاک کی طرح اس کا بہہ جانا بھی یقینی ہے' خواہ وہ آج ہو یا کل۔

○ ○ ○

حیات و ماوراء حیات

اس دور کے علاوہ طبیعیات میں سر آلیور لاج بڑے مرتبہ کا شخص سمجھا جاتا ہے اور اس نے حیات بعد الموت کے متعلق جو عملی تحقیقات کی ہے' وہ خواہ کتنی ہی ناقص و نامکن کیوں نہ ہو لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ "خیال و قیاس" کا اتنا عظیم دفتر اپنے بعد چھوڑ گیا ہے کہ اس کو ٹھکرا کر آگے گزر جانا آسان نہیں۔ وہ نہ صرف اس بات کا قائل تھا کہ مرنے کے بعد روح قائم رہتی ہے' بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ روح کا تعلق دنیا اور اہل دنیا سے باقی رہتا ہے اور وہ اپنے تاثرات سے بھی مطلع کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس کا دعوی تھا کہ اس نے اپنے مرنے والے بیٹے کی روح سے گفتگو کی۔

بہرحال اس نے کسی روح سے واقعی گفتگو کی ہو یا خود اس کا استہواء ذاتی ہو۔ (یہ عمل مقناطیسی یا مسمریزم میں ایک عمل کا نام (SU GGESTION) ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کی قوت ارادی سے اس حد تک متاثر کیا جائے کہ وہ عامل ہی کی خواہش کا پابند ہو جائے۔ اس کا اصطلاحی ترجمہ عربی میں عام طور پر استہواء کیا جاتا ہے جو اپنے معنی کے لحاظ سے پوری طرح اس لفظ کے مفہوم پر حاوی ہے (AUTO SUGGESTION) سے مراد خود اپنے ہی خیال سے متاثر ہو جاتا ہے اس لیے اس کا ترجمہ استہواء ذاتی کیا گیا۔) (AUTO - SUGGESTION) ہو اس کے نظریوں کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے اعتقاد و یقین کی کوئی ایسی علمی توجیہ نہیں کر سکتا تھا جو انکار کی گنجائش نہ چھوڑے' اور اس نے جو کچھ کہا اپنے ذوق و وجدان کے لحاظ سے کہا جس کا دوسرا نام (COMMON SENSE) ہے اس لیے بحث و نقد کے لیے اس سے زیادہ دلچسپ مشغلہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ دوسرے کے ذوق کا مطالعہ اپنے ذوق کے لحاظ سے کیا جائے۔

وہ بھی دوسرے منکرین کی طرح روح کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے سب سے پہلے کائنات کے معمہ کو حل کرنا چاہتا ہے اور جس وقت وہ اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ نوع انسانی نظام کائنات میں ایسے مختصر سیارہ کی رہنے والی ہے جس کو دوسرے اجرام سماوی کے مقابلہ میں کسی قسم کی کوئی اہمیت حاصل نہیں تو دفعتاً" اس کا خیال کائنات کی عظمت کے

ساتھ ہی ساتھ انسانی عظمت کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے اور اس کا دل قبول کرنا نہیں چاہتا کہ جس قوت نے یہ سب کچھ کیا ہے اوہ اسے یوں دفعتہ" فنا کر دے۔

اس رنگ کے سوچنے والوں کی رفتار خیال یہ ہوتی ہے۔

1- انسان باوجود اس قدرتی ترقی کر جانے کے' ہنوز انتہائی مدارج ارتقاء تک نہیں پہنچا لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ یقیناً اس کو منزل حقیقی تک پہنچنا ہے' کیونکہ اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے تو پھر غایت آفرینش کوئی نہ رہے گی اور یہ سب کچھ فعل عبث قرار پائے گا۔

2- اگر انسان کی دنیاوی زندگی کو دیکھا جائے تو وہ ستر اسی سال سے زیادہ نہیں ہے جو اوقیانوس زمانہ کو دیکھتے ہوئے ایک قطرہ کے لاکھویں حصہ سے بھی کم ہے' پھر کیا انسان کو یہ عقل و فراست صرف اس لیے دی گئی ہے کہ وہ چند سال تک زندہ رہ کر فنا ہو جائے اور مرنے کے بعد اس کا کوئی مستقبل متعین نہ ہو۔

3- زندگی آتی ہے کہاں سے؟ کسی کو معلوم نہیں۔ چلی جاتی ہے کہاں؟ اس کی بھی خبر نہیں' پھر کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کسی شخص کا وجود عبارت ہے' صرف اس مختصر مدت سے جو اس آنے جانے کے درمیان بسر ہوتی ہے یقیناً نہیں' بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیاوی حیات کوئی ایسا سلسلہ ہے جو دو چیزوں کو ملاتا ہے جن میں سے ایک ازل اور دوسری ابد ہے۔

4- عالم طبیعی کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ صرف اس کی صورتیں یا حالتیں بدلتی رہتی ہیں جن کو ہم اپنے حواس سے محسوس نہیں کر سکتے۔ اسی طرح انسان بھی مرنے کے بعد فنا نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کے وجود کی حیثیت بدل جاتی ہے جنہیں حواس ظاہری کے علاوہ کسی اور حس سے محسوس کیا جا سکتا ہے اور جب تجربہ سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مرنے کے بعد انسانی روح سے تخاطب ممکن ہے تو پھر یہ مسئلہ ظن و تخمین کا نہیں رہتا بلکہ واقعہ حقیقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

5- ہم ایتھر کے قائل ہیں۔ مادہ و قوت کے باہمی تفاعل کو مانتے ہیں۔ درآنحالیکہ ہم کو نہ ایتھر نظر آتا ہے اور نہ کیفیت تفاعل محسوس ہوتی ہے۔

آج حرارت و نور' برق و کہربا وغیرہ تمام طبیعی کیفیات حقائق مسلمہ میں داخل ہیں لیکن کیا کوئی شخص ان کی حقیقت کی علمی توجیہہ و تعلیل کر سکتا ہے؟

بعض علمائے حیات کا دعویٰ ہے کہ عقل و زندگی دونوں مادہ کے وظائف میں سے ہیں

پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد اس کی زندگی کی نوعیت بدل جائے جو اس وقت ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

الغرض وہ لوگ جو معاد کے قائل ہیں۔ ان کی طرف سے اسی قسم کے دلائل پیش کیے جاتے ہیں جن کا اگر تجزیہ کیا جائے تو سب کا عنصر مشترک اعتراف "جہل ولا علمی" کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ یا بالفاظ دیگریوں کہنا چاہیے کہ ان کے دلائل کی بنیاد صرف اس خیال پر قائم ہے کہ جس طرح ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ اس وقت یہ سب کچھ کیونکر ہو رہا ہے اسی طرح ہم نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ جو کچھ ہو گا کیونکہ ہو گا۔ یعنی اگر انسان اس دنیا میں اپنے مادی جسم کے ساتھ زندہ رہتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ جسم فنا ہونے کے بعد بھی اس کی زندگی کسی اور صورت سے قائم رہے۔

وہ سر آلیور لاج ہوں یا کینن ڈایل یا کوئی اور شخص، علمی دنیا میں اس کے علاوہ کوئی اور دلیل معاد کے ثبوت میں پیش ہی نہیں کی جا سکتی اور چونکہ اس نوع کے دلائل جن میں صرف امکان سے بحث ہوتی ہے، مخاطب کے لیے باعث تسکین نہیں ہوا کرتے اس لیے انھوں نے عملی طور پر بھی وجود روح کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس حد تک دعوے کر بیٹھے کہ وہ روحوں سے گفتگو کرتے ہیں، روحیں ان سے گفتگو کرتی ہیں اور حیات بعد الموت کا بھی تقریباً وہی نظام ہے جو اس دنیا کے عالم حیات کے ہے، یعنی جسم سے جدا ہونے کے بعد روحیں محبت کرتی ہیں۔ نفرت کرتی ہیں۔ کھاتی ہیں، پیتی ہیں، چلتی پھرتی ہیں اور جو تصویریں ارواح کی شائع ہوئی ہیں۔ ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریشمی کپڑے بھی پسند کرتی ہیں، ٹیڑھی مانگ بھی نکالتی ہیں اور اونچی ایڑی کا جوتا بھی پہنتی ہیں۔

اس لیے جب معاملہ عقلی نظریوں سے گزر کر اس حد تک حواس ظاہری کے تحت آجائے تو پھر سوا تسلیم کر لینے کے کیا چارہ ہے مگر سوال یہی ہے کہ کیا روحوں سے گفتگو کرنے اور ان کے ظاہر ہونے کے جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں وہ واقعی صحیح ہیں؟ کیا حقیقتاً جو صورتیں ہمیں نظر آتی ہیں یا جو آوازیں کان میں آتی ہیں وہ روحوں کی ہیں؟

اس باب میں کافی تحقیق ہو چکی ہے اور نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سو میں سے اسی دعویٰ کرنے والے تو بالکل جھوٹے ہیں۔ باقی بیس میں دس ایسے ہیں جو قوت مقناطیسی سے کام لے کر دوسروں کو فریب نظر میں مبتلا کر دیتے ہیں اور دس وہ ہیں جو خود اپنے اعتقاد و یقین سے مسحور ہو گئے ہیں۔

پھر اگر آلیور لاج وغیرہ کی استثنائی رعایت کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ ان کا شمار اسی آخر الذکر جماعت میں کیا جائے اور ان کو "سوادزدہ" سمجھ کر معاف کر دیا جائے۔

اگر روحوں کو جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی انھیں تمام منازل حیات سے گزرنا ہے جو تعلق جسم کی حالت میں ان کو پیش آئے تھے تو پھر اس تغیر و تبدل کے معنی کیا ہوئے۔ اس دنیا میں اس جسم کے ساتھ انھیں کیوں نہ باقی رہنے دیا گیا اور قدرت نے کیوں فضول اتنی زحمت گوارا کی۔

البتہ عقلی توجیہ کے سلسلہ میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ امر ضرور غور طلب ہے کہ جب مادی دنیا کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی بلکہ مختلف صورتیں اختیار کرتی رہتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ روح کو فانی کہا جائے۔ مگر گفتگو سب سے پہلے اس باب میں ہونی چاہیے کہ جس کا نام ہم نے روح رکھا ہے وہ بجائے خود کوئی جوہر ہے یا صرف عرض یعنی اس کا کوئی وجود علیحدہ پایا جاتا ہے یا اک کیفیت کا نام ہے جو عناصر کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے مثلاً یوں سمجھیے کہ ہم جس وقت پانی میں شکر حل کر دیتے ہیں تو پانی میں ایک کیفیت حلاوت و شیرینی کی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن شیرینی کوئی علیحدہ مستقل چیز تو نہیں۔ اگر ہم پانی سے شکر کو پھر علیحدہ کر دیں تو یہ کیفیت جاتی رہے گی۔ پھر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس حالت میں شیرینی کہاں چلی گئی تو اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ پانی اور شکر کے جدا جدا کر دیئے جانے سے فنا ہو گئی۔

بالکل یہی صورت روح کی ہے کہ بعض مادی اجزاء کے باہمی تفاعل یا عناصر کے امتزاج سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا نام زندگی یا روح ہے اور جب وہ امتزاج باقی نہیں رہتا تو کیفیت بھی فنا ہو جاتی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس میں کون سا استحالہ عقلی ہے اور ایسی معمولی بات کے سمجھنے میں کیوں پس و پیش ہوتا ہے۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ اگر انسان کی آفرینش کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ چند دن کی عارضی زندگی بسر کر کے فنا ہو جائے تو اس کے پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ سو یہ سوال بجائے خود اتنا لغو و مہمل ہے کہ ہر شخص ادنیٰ تامل کے بعد اس کی لغویت کو سمجھ سکتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ کائنات کی بنانے والی کوئی ایسی قادر مطلق ہستی ہے جسے خدا کہتے ہیں تو اس کی حقیقت و عظمت کو سامنے رکھ کر یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہو سکتا کہ اس کے

نزدیک ایک کیڑا جو فراست و تعقل سے بالکل بے بہرہ ہے اور ایک انسان جو فہم و عقل کا پتلا ہے دونوں برابر ہیں اور اگر روح کو فانی تسلیم کرنے کی حالت میں خدا پر یہ الزام عائد ہو سکتا ہے کہ اس نے انسان کو پیدا ہی کیوں کیا تو ایک کیڑے کی طرف سے بھی یہ احتجاج ہو سکتا ہے کہ اگر اسے عقل و فہم سے بیگانہ رکھنا تھا تو کیوں وجود سے عدم میں لایا گیا اس قسم کے دلائل حقیقتاً کوئی وزن نہیں رکھتے کیونکہ ان کا تعلق ان معتقدات و مزعومات سے ہے جو صرف "امکان" کی بنیاد پر قائم ہیں اور حقائق کی جستجو کرنے والوں کے نزدیک محض "ممکن ہونا" کوئی چیز نہیں کیونکہ امکان میں جتنی گنجائش اثبات کی ہے اتنی ہی نفی کی بھی ہے۔

اب رہ گیا بحث کا یہ پہلو کہ جب مادی دنیا کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی روح کو کیوں فانی مانا جائے۔ اس میں بھی سخت مغالطہ منطقی پایا جاتا ہے کیونکہ جب روح بجائے خود کوئی مستقل مادی چیز نہیں ہے تو پھر اس کا دوسری مادی اشیاء کے ساتھ کیوں ذکر کیا جائے۔ وہ صرف ایک کیفیت کا نام ہے اور کیفیات کا فنا ہو جانا ہر شخص کے نزدیک مسلم ہے۔

انسان میں مادی چیز اس کا جسم ہے سو اس کے اجزاء بے شک فنا ہونے والے نہیں۔ وہ ضرور کسی نہ کسی حالت و کیفیت میں پائے جائیں گے۔ جب تک انسان زندہ ہے اس جسم میں ایک کیفیت ایسی پائی جاتی ہے جسے زندگانی یا روح سے تعبیر کرتے ہیں اور جب وہ کیفیت باقی نہیں رہتی (خواہ اس کا کچھ سبب ہو) تو اجزاء میں انحلال ہو کر دوسری صورت قبول کر لیتے ہیں۔

جب جسم زیر زمین دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے اجزاء کیڑوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس کا جسم فنا تو نہیں ہوتا لیکن وہ صورت دوسری اختیار کر لیتا ہے پھر ان کیڑوں کو دوسرے بڑے کیڑے کھا لیتے ہیں' ان کیڑوں کو چڑیاں ہضم کر جاتی ہیں' چڑیوں کو دوسرے جانور کھا جاتے ہیں اور اسی طرح ازل سے یہ سلسلہ انحلال و تفاعل کا جاری ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں کوئی چیز ہمیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کرتی کہ روح کا وجود علیحدہ پایا جاتا ہے اور جسم سے جدا ہونے کے بعد اس کے لیے بھی زمان و مکان کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی دوسری مادی اشیاء کے لیے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس بقاء کے لیے مکان و زمان کی ضرورت نہیں تو پھر وجود کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا اور یہ لفظ مہمل ہو کر رہ جاتا ہے۔

بقائے روح و معاد کا خیال مذہب کا پیدا کیا ہوا ہے اور وہ صرف یہی نہیں کہتا کہ روح

باقی رہتی ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ روح پھر جسم انسانی میں داخل کی جائے گی اور قیامت کے دن وہ سب اٹھ کھڑے ہوں گے۔

آیئے ذرا ماضی کے نقطہ نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کریں۔

کرہ زمین پر انسانی آبادی کا وجود پانچ لاکھ سال سے پایا جاتا لیکن اگر اس میں مبالغہ سمجھا جائے تو آیئے ڈھائی لاکھ سال فرض کر لیں۔

اس وقت آبادی 17,47,00,00,000 نفوس پر مشتمل ہے اور اموات کی تعداد سالانہ 4,33,69,813 ہوتا ہے اگر گذشتہ ڈھائی لاکھ سال کی اموات کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس وقت عالم برزخ میں کم ازکم 1,08,42,55,32,50,000 روحیں چکر لگا رہی ہیں اگر روح کے لیے کم ازکم 1/8 انچ کے برابر جگہ درکار ہو تو اس وقت تک روحوں نے اتنی جگہ گھیر رکھی ہے کہ اگر ان کو برابر رکھ کر فیتہ تیار کیا جائے تو 21,39,079 میل ہو گا۔ اور اگر ان روحوں کو جمع کر کے کوئی ستون یا منارہ بنایا جائے تو 9.5 میل لمبا مینار بنے گا جس کا چاروں ضلع میں سے ہر ضلع 9.5 میل ہو گا۔

یہ حساب تو اس وقت تک کی روحوں کا ہوا۔ آئندہ معلوم نہیں کب تک کرہ ارض قائم رہے گا اور یہ ہجوم ارواح کس حد تک پہنچے گا۔

کہا جاتا ہے کہ بچھڑی ہوئی روحیں وہاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں لیکن کیا یہ کہنا بالکل ایسا ہی نہیں ہے جیسے آپ کسی ریگستان کے تمام ذروں کو ہوا میں منتشر کر کے کسی ایک ذرہ سے یہ کہیں کہ جاؤ اور اس ذرہ کے ساتھ مل جاؤ جس کے پاس سے تم کو اٹھایا گیا تھا۔

اب اسی کے ساتھ اس اعتقاد کو بھی شامل کیجئے کہ حشر بلا جسد ہو گا یعنی اس دنیا میں جس جسم کے ساتھ روح متصل تھی وہ جسم پھر پیدا کیا جائے گا تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے لیے کتنی وسیع فضا کی ضرورت ہو گی اور کتنی کروڑ زمینوں کے برابر چٹیل میدان اس کے لیے درکار ہو گا۔

حیرت ہے کہ بجائے روح کو مان کر اس قسم کے مضحک خیالات خدا سے وابستہ کرنے میں تو تامل نہیں ہوتا لیکن سیدھی سی یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ جو خدا ایک بار عدم سے وجود میں لایا ہے وہ پھر وجود سے عدم تک بھی پہنچا سکتا ہے۔

○ ○ ○

علم و یقین ـــــــ اعتقاد و مذہب

آپ روز سورج کو طلوع کرتے ہوئے دیکھتے ہیں' جتنا وہ افق سے بلند ہوتا جاتا ہے اس کی حرارت کو زیادہ محسوس کرتے جاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ آپ کے سر سے گزرتا ہوا دوسری سمت کی طرف ڈھل جاتا ہے اور رفتہ رفتہ نگاہوں سے غائب ہو جاتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ آپ اسے واقعہ کہتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ آپ کا مشاہدہ ہے۔ آپ اپنے حواس کے ذریعہ ایسا محسوس کرتے ہیں اور متواتر و پے درپے اتنی بار محسوس کر چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص آپ سے آکر یہ کہے کہ آج آفتاب نے طلوع نہیں کیا۔ یا یہ کہ طلوع کرنے کے بعد غروب نہیں ہوا تو آپ اسے جھوٹا کہہ دیں گے اور آپ باہر نکل کر اس کی تصدیق بھی نہیں کریں گے انسان کی اس کیفیت کا نام یقین ہے اور یقین بھی ایسا جس کے لیے کسی برہان و دلیل کی حاجت نہیں۔

انسان کی زندگی پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ وہ ایک سلسلہ ہے "بے شمار لمحات احساس" کا یہاں تک کہ اگر آپ اس کو "احساس مسلسل" کہہ دیں تو بے جا نہ ہو گا لیکن احساس محض بیکار ہے اگر دنیا میں محسوسات کا وجود نہ ہو۔ اس لیے انسان فطرتاً مجبور ہے کہ وہ اپنے ذوق احساس کو پورا کرنے کے لیے محسوسات کا مطالعہ کرے۔ انسان فطرتاً سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور سکون نام ہے صرف "یقین" کا ریب و شک ایک بے چینی ہے' ایک اضطراب ہے اور انسان اس الجھن کے دور کرنے پر قدرت کی طرف سے مجبور ہے اس لیے اگر اس کے "احساسات" مطمئن نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ "سکون یقین" کی منزل سے ناآشنا ہے۔ اور احساس کا اطمینان اگر ہو سکتا ہے تو صرف محسوسات کی جستجو کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنے سے۔

عام طور پر محسوسات کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں' ایک محسوسات خارجی دوسری محسوسات ذہنی۔ ایک وہ جو خارج میں موجود ہیں جیسے درخت' پتھر' پانی وغیرہ اور دوسرے جن کا بظاہر وجود نہیں پایا جاتا' لیکن ہم انھیں محسوس کرتے ہیں جیسے گرمی' سردی وغیرہ مگر میرے نزدیک یہ تقسیم صحیح نہیں کیونکہ محسوسات جتنی بھی ہیں تمام تر خارجی ہیں اور جن کو

"ذہنی" کہا جاتا ہے وہ بھی کسی نہ کسی واسطہ سے محسوسات خارجی ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ یقیناً گرمی، سردی کوئی مادی محسوس چیز نہیں لیکن جن اسباب کے تحت گرمی یا سردی محسوس کی جاتی ہے وہ خارجی محسوسات سے باہر نہیں بے شک محبت و نفرت کا احساس بالکل ذہن سے متعلق ہے لیکن کیا وہ چیز جن سے یہ جذبات متعلق ہیں خارج میں موجود نہیں؟ مادہ اور اعراض دو علیحدہ علیحدہ چیزیں بتائی جاتی ہیں، درآنحالیکہ عرض کا وجود مادہ سے کہیں علیحدہ نہیں، پھول ہے تو رنگ بھی ہے، بو بھی ہے، وہ نہیں تو یہ بھی نہیں،

یقین کے کئی مراتب و مدارج ہیں۔ ہم دور سے دھواں اٹھتا ہوا دیکھتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ وہاں آگ کا وجود ہے۔ لیکن آگ کی نوعیت کیا ہے۔ اس کی خبر نہیں ہوتی ہم چل کر وہاں جاتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کسی نے خس و خاشاک جمع کر کے اس میں آگ لگا دی ہے ہم وہاں سے واپس آتے ہیں لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ آگ کیسی ہے؟ ہم بتا دیتے ہیں وہ سن کر مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن کیا ان کا یہ اطمینان اس درجہ یقین کو پہنچ سکتا ہے جو ہمیں حاصل ہے۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ہم کہہ دیتے کہ کسی نے لکڑی جلائی ہے اور وہ یقین کر لیتے۔

ہمیں ایک گھڑا مٹی کا نظر آتا ہے۔ اس کی تازگی دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ اس میں پانی ہے، قریب جا کر پانی کو دیکھتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے۔ لیکن جب گلاس میں پانی لے کر پی لیتے ہیں تو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سرد ہے یا گرم،

غور کیجئے کہ یقین کے ان تمام مدارج میں "مطالعہ محسوسات" کو کتنا دخل ہے اگر خود اپنی سعی و کوشش سے کام لے کر خود اپنی عقل و احساس کو ذریعہ بنا کر کوئی علم حاصل ہو تو وہ ایک "یقین ذاتی" ہے جسے کوئی قوت متزلزل نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر ہم نے صرف دوسروں کی زبانی سن کر کسی بات کو باور کر لیا ہے تو وہ محض "یقین رواجی" ہے جس میں ریب و تزلزل کا زیادہ امکان ہے اور تصدیق قلب کا بہت کم۔

تصدیق کی یہ منزل اور سکون نفس کا یہ مرتبہ ازخود حاصل ہونے والی چیز نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے محسوسات و موجودات کے مطالعہ سے، پھر یہ مطالعہ جتنا غائر ہو گا اتنا ہی بلند ہو گا اور یہی وہ چیز ہے جس نے دنیا میں علوم و فنون کی بنیاد ڈالی اور انسان کے اقتدار کو تمام روئے گیتی پر قائم کر کے اسے خلافت الٰہی کی منزل سے روشناس کیا۔ آیئے ذرا مدارج خلافت پر بھی غور کر لیں۔

میں ایک وزنی گیند ہوا میں اچھالتا ہوں۔ وہ فوراً نیچے آجاتی ہے۔ بار بار پھینکتا ہوں وہ بار بار زمین پر آکر گرتی ہے۔ میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ بھاری چیز کبھی اوپر نہیں ٹھہر سکتی۔ دوسرا شخص اس پر زیادہ غور کرتا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ وزن خود کوئی چیز نہیں ہے بلکہ نام ہے صرف کشش زمین کا۔ تیسرا ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور سوچتا ہے کہ زمین کی کشش کا مقابلہ کیونکر ہو سکتا ہے' یہاں تک کہ وہ غبارہ اور ہوائی جہاز بنا کر اس مقاومت میں کامیاب ہو جاتا ہے' آج دنیا کا تمام ہنگامہ ترقی اس مطالعہ پر قائم ہے اور اسی یقین کی سرزمین سے ارتقاء کے چشمے پھوٹتے ہیں' ایک زمانہ وہ تھا کہ انسان کو خود اپنے ملک کی بھی خبر نہ تھی آج وہ نہ صرف کرہ ارض بلکہ فضا میں تیرنے والے کروڑوں اور اربوں میل دور کے کروں کا حال معلوم کر چکا ہے۔ یہ سب کرشمے ہیں یقین کے' جو نتیجہ ہے علم کا۔

ایک شخص سوال کرتا ہے کہ اس تمام جدوجہد سے فائدہ؟ جبکہ انسان کو بہرحال فنا ہونا ہے۔ سوال ممکن ہے صحیح ہو' لیکن استدلال غلط ہے۔ انسان انفرادی حیثیت سے فانی ہے لیکن اجتماعی حیثیت سے اس کو بقائے دوام حاصل ہے۔ انسان کی موجودہ صورت بدل سکتی ہے۔ اس کے عادات و اطوار میں تغیر ہو سکتا ہے۔ اس کے افراد یقیناً فنا ہوتے جائیں گے۔ لیکن بہرحال انسان باقی رہے گا۔ کرہ ارض پر نہ سہی کسی اور کرہ میں' انسان فطرت کی تخلیق کا مظہراتم ہے اور اگر آفرینش کو فنا ہے تو انسان کو بھی' ورنہ نہیں' اس لیے انفرادی نقطہ نظر سے گفتگو کرنا مقتضائے فطرت کے خلاف ہے۔ قدرت کی مرضی کے منافی ہے۔

آپ سمندر کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے موجوں کا در آنحالیکہ ہر موج اپنی جگہ اٹھ کر فنا ہو جاتی ہے۔ پھر کیا سمندر کا وجود ان موجوں کے فنا ہونے سے ختم ہو جاتا ہے۔ جو موج اس لمحہ میں نمودار ہو کر فنا ہوئی ہے۔ اسے پھر نہیں ابھرنا لیکن کیا اس سے سمندر کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے' بالکل یہی عالم انسان کا ہے کہ اس کے افراد مٹتے جاتے ہیں' لیکن وہ علی حالہ اپنی جگہ قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔

دنیائے مذہب کے اصول مگر کچھ اور ہیں وہاں علم و یقین کا نام اعتقاد ہے اور اس کی تعلیم کل شئی حادث" (ہر چیز فنا ہونے والی ہے) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے مذہب کے نزدیک انسان نہایت حقیر' حد درجہ بے بس و بے کس اور مجبور و لاچار مخلوق ہے۔ اس کی کوئی حرکت اور اس کا کوئی خیال اس کے اختیار میں نہیں۔ جو چاہتا ہے خدا کرتا ہے اور جو چاہے گا کرے گا۔ انسان کا کام صرف سرنگوں جھکا دینا ہے اور آنکھ بند کر کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ

کر دوسری دنیا کے اس عمیق و تاریک غار کی طرف چلا جاتا ہے جس کا علم صرف اس قدر حاصل ہے کہ کچھ معلوم نہیں۔

مذہب کہتا ہے کہ انسان دنیا میں صرف اس لیے آیا ہے کہ وہ عبادت کرے اور خدا کی پرستش میں رات دن مصروف رہے۔ لیکن اس سے پوچھیے کہ خدا کیا' اور اس کی پرستش کیوں؟ تو وہ کہتا ہے کہ خدا کی حقیقت پوشیدہ ہے کسی کی قدرت نہیں کہ اس کو سمجھ سکے اور عبادات اس لیے کہ اس نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے' اس نے جس کا حال معلوم نہیں۔ الغرض مذہب کے تمام عقائد کا عنصر عظیم "عدم علم" ہے اور اسے نہ سمجھ سکنے' نہ جان سکنے کا نام وہاں یقین رکھا جاتا ہے۔

پھر اگر یہ "عدم علم" کوئی مستقل تعلیم ہوتی تو بھی ایک بات تھی لیکن چوں کہ انسان کی فطرت جستجو پسند ہے اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک اس کی یہ خلش دور نہ ہو' اس لیے مذہب اس پر بھی قائم نہ رہ سکا اور باوجود اس کے کہ وہ خود خدا کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ لیکن لوگوں کو اس نے سمجھایا۔ باوصف اس کے کہ وہ دوسری دنیا سے بے خبر تھا لیکن دوسروں کو اس سے آگاہ کیا اور اس شان سے اس اعتماد و یقین کے ساتھ یہ سب کچھ گویا حقائق ثابتہ میں شامل ہے اور محسوسات ظاہری سے متعلق' چنانچہ وہی جس کی حقیقت کو وہ نہیں پا سکتا تھا' دفعتہ" خفا سے ظہور میں آجاتا ہے اور اس انداز سے کہ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ چاروں طرف اس کے خدام (ملا ئکہ مقربین) حضوری میں حاضر ہیں۔ وہ اپنے خاص خاص بندوں سے ہمکلام ہوتا ہے جس سے خوش ہوتا ہے اس کو باغوں میں بھیج دیتا ہے جس سے برہم ہوتا ہے اس کو آگ میں جھونک دیتا ہے وہ سنتا ہے لیکن کان نہیں رکھتا۔ وہ دیکھتا ہے مگر آنکھ سے نہیں' وہ بولتا ہے مگر زبان سے نہیں۔ الغرض وہ دنیا ہی کے بادشاہوں کی طرح ایک جلیل القدر بادشاہ ہے اور اس پر کوئی اور حکمران نہیں'

وہ بے نیاز مطلق ہے لیکن ہماری عبادتوں کی پروا ضرور کرتا ہے وہ احتیاج سے بلند و ارفع ہے لیکن ہمارے عجز و نیاز کی اس کو ضرورت یقیناً ہے وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا۔ لیکن نافرمانی سے اس کو غصہ یقیناً آتا ہے۔ وہ بے انتہا رحم و کرم والا ہے' مگر گنہ گار کو بغیر آگ میں جھونکے نہیں مانتا۔

وہ موجود ہے لیکن زمان و مکان سے بے نیاز' وہ ہر لمحہ میں قدیم ہے لیکن لمحہ فنا ہو جاتا ہے اور وہ نہیں۔ وہ عادل ہے لیکن عدل کا پابند نہیں۔ جس کو چاہے بخش دے اور جسے

چاہے سزا دے۔ علم کہتا ہے کہ یہ اجتماع اضداد کیسا؟ مذہب کہتا ہے کہ خدا کی مرضی، علم کہتا ہے کہ یہ تمام باتیں کیونکر معلوم ہوئیں، مذہب کہتا ہے خدا کے برگزیدہ بندوں کے کہنے سے، علم کہتا ہے کہ اس کے برگزیدگی کا علم کیونکر ہوا جواب ملتا ہے کہ انھیں کے قول سے علم سوال کرتا ہے کہ کیا انسان بغیر تحقیق کیے ہوئے محض دوسروں کے کہنے پر اپنے نفس کو مطمئن کر سکتا ہے۔ جواب دیا جاتا ہے "کیوں نہیں" علم پوچھتا ہے کہ کیا یقین اسی کا نام ہے مذہب کہتا ہے "بے شک"۔

مذہب کی تعلیم ہے کہ یہ دنیا جس میں انسان زندگی بسر کرتا ہے یعنی محسوسات کی یہ ٹھوس دنیا بالکل عارضی چیز ہے اور محض ایک پرتو ہے اس دوسری دنیا کا جو ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے مگر وہ دوسری دنیا کیسی ہے؟ اس میں بہشت ہے، دوزخ ہے، دیدار خداوندی ہے، یا اس سے مجبوری۔ باغ و راغ ہیں، حور و قصور ہیں، فواکہ و اثمار ہیں، دودھ اور شہد کی نہریں ہیں، کوئی فکر نہیں ہر وقت آزادی سے کھاؤ پیو اور وہ سب کچھ کرو جس سے اس دنیا میں باز رکھا جاتا ہے۔ یا پھر دہکتی ہوئی آگ کے غار ہیں، اژدہے ہیں، بچھو ہیں۔ خون و پیپ ہے، چیخ ہے کراہ ہے، پو چھیے۔

کیا وہاں رقص و سرور بھی ہے کیوں نہیں درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی ہوں گی کیا وہاں موٹر، ہوائی جہاز، ریل بھی ہے بے شک ہے، انسان نے کسی جگہ پہنچنے کا خیال کیا اور فوراً پہنچ گیا۔ یعنی۔

"آنکھ کی بند ہوا کوچہ جاناں پیدا"

کیا وہاں "زہرہ صبح و جام بلور" بھی میسر ہے اس کا کیا ذکر کیونکر وہاں تو ہر وقت صبح صلوۃ ہی رہے گی اور جام بلور کیا معنی، وہاں تو دنیا کے قیمتی سے قیمتی جواہر سنگریزوں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آئیں گے بالکل درست لیکن پوچھیے کیا انسان کو کسی شے کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا پڑے گی۔ کیا یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ ممکن ہے فلاں چیز ہم کو نہ ملے، یا ملنے کے بعد ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کا جواب بالکل نفی میں ملے گا۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ فطرت انسانی تو بدستور اس دنیا میں بھی یہی رہے گی لیکن لذت و الم کا مفہوم بالکل بدل جائے گا۔ گویا ان کا وجود، احساس انسانی اور اس کی فطرت سے علیحدہ قائم ہے۔

اب ذرا گہرائی کی طرف جائیے اور غور کیجیے کہ مرنے کے بعد انسان کا ایک زمانہ غیر معلوم تک عالم برزخ میں رہنا اور پھر بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز پل

صراط" پر چل کر دوزخ یا جنت تک پہنچ جانا کیا غایت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مصلحت خداوندی ہر جگہ اور ہر بات میں کارفرما ہے۔ لیکن موت کے بعد انسان کا تمام سخت و صعب مراحل سے گزر کر عذاب یا ثواب کی دائمی زندگی بسر کرنا کس نتیجہ کے لیے ہے۔ بہشت و دوزخ سے کسی کو لوٹ کر پھر دنیا میں جانا نہیں کہ وہاں کے لوگوں کو ان کے حالات معلوم کر کے تخویف یا ترغیب ہو' پھر خدا کی اس میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ کہ وہ انسان کو زندگی دوام عطا کر کے بقاء میں اپنا شریک تو بنا لیتا ہے لیکن دنیا والوں کے لیے مایہ عبرت و بصیرت بنانے کے لیے تیار نہیں'

صدیاں گزر گئیں کہ مذہب کی یہ تعلیمات بدستور اسی طرح اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے دنیا میں کار فرما ہیں۔ یہاں تک کہ علم نے بڑھ کر اس کو چیلنج دیا' ظاہر ہے کہ مشاہدات کا جواب قیاسات سے اور "یقینیات" کا مقابلہ "ممکنات" سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے عقاید مذہب کے ظاہری معنی سے عدول کر کے ایک باطنی مفہوم پیش کیا۔ اور بتایا کہ یہ صرف تشبیہات و استعارات ہیں لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے خطیبانہ انداز بیان ہے' لیکن افسوس ہے کہ وہ مراسم و شعائر میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کر سکا' اور اس جواب کی حقیقت جان چھڑانے سے زیادہ اور کچھ نہ رہی۔ علم کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا' سیلاب کی طرح اٹھا اور درمیان کی تمام چٹانوں کو کاٹتا ہوا چلا گیا' جن چیزوں کو ساتھ دینا تھا وہ ساتھ چلی گئیں۔ جن کو یہ منظور نہ تھا وہ اپنے منتشر اجزاء لیے ہوئے پیچھے رہ گئیں اور مذاہب عالم کا یہی حشر ہوا۔

مگر دنیا کے تمام مذاہب میں ایک مذہب ایسا تھا جو اس طوفان کا ساتھ دے سکتا تھا۔ علم کے اس سیلاب کا شناور بن سکتا تھا۔ لیکن اس کو دنیا فراموش کر چکی ہے خود اس کے ماننے والے اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور اگر انھیں کوئی یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے تو اسے باغی سمجھ کر نکال دیتے ہیں اس مذہب نے کبھی اس بات کی تلقین نہیں کی کہ تم بغیر سمجھے ہوئے لغو اعتقادات کا اتباع کرو بلکہ اس نے ہمیشہ اسی بات پر زور دیا کہ اپنی فکر و کوشش سے کام لو' غور و تدبر کرو۔ کائنات کا مطالعہ کر کے حقائق اشیاء کا علم حاصل کرو۔ دنیا میں ہمیشہ آگے قدم بڑھاؤ اور ترقی کی اس چوٹی تک پہنچ جاؤ جہاں سے نیابت خداوندی کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ نیابت خداوندی کیا ہے۔ وہ انسان کی انتہائی کامیاب تمناؤں کی بہشت ہے۔ استعلاء ترقی کی سکوں بخش جنت ہے کامرانیوں کی سلسبیل ہے'

مسرتوں کی جوئبار ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر انسان نے یہ سب کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی تو ذلت و نکبت کی آگ ہے' پستی و خسران کے دل جلا دینے والے شعلے ہیں اور پاتال کی وہ تکلیفیں ہیں کہ سانپوں کی پھنکار اور بچھو کے نیش بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

مگر ہے کوئی آج جو صرف اس تعلیم کو اساس مذہب بتائے اور ہے کسی میں ہمت جو پوست علیحدہ کر کے مغز پیش کرے۔ علم اپنے یقین کا پرچم لیے ہوئے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ کائنات کو فتح کر کے بہشتوں اور جنتوں کو اپنے لیے مخصوص کرتا جا رہا ہے نعائم ولذائذ کو سمیٹ سمیٹ کر دامن مراد بھر رہا ہے لیکن مذہب بدستور اپنے ممکنات کے اوہام میں مبتلا ہے قیاسات کی دلدل میں گرفتار ہے۔ اس نے منہ پشت کی طرف کر لیا ہے اور کہہ رہا ہے منزل اودھر ہے۔ وہ سکون کا طلبگار ہے۔ وہ سکون جس میں موت کی سی غفلت ہو' پتھروں کا سا جمود ہو وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کی پاتال دوسری دنیا کا عروج ہے یہاں کی ذلت وہاں کی عزت ہے حالانکہ بتانے والے نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ "هل يهلك الا القوم الفاسقون" سے اسی دنیا کی ہلاکت مراد ہے اور فاسق وہی ہے جس نے اسی آب و گل کی دنیا میں جدوجہد ترک کر دی۔

○ ○ ○

انسانی زندگی کا معیار اور ہمارے علماء کرام

عہد حاضر میں علوم ریاضیہ کی ترقی نے ذہن انسانی میں عجیب قسم کی جستجو پیدا کر دی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر چیز کی ناپ تول کر سکے۔ اس کے عرض و طول' بلندی و عمق کا اندازہ کر سکے اور جب اس سے سوال ہو کہ فلاں امر کی حقیقت کیا ہے تو وہ بتا سکے کہ اس کی حدود یہ ہیں۔ اس کے ابعاد ثلثہ کی پیائش یہ ہے اور اعداد و شمار کے لحاظ سے اس کو یوں بیان کر سکتے ہیں۔ پھر یہ ذوق انھیں چیزوں تک محدود نہیں جو مادی ہیں مرئی ہیں۔ جامد ہیں۔ بلکہ کیفیات وجدانیات کی تحقیق بھی انھیں خطوط پر کی جاتی ہے اور بالکل ریل کی رفتار کی طرح اخلاق انسانی اور تخیل دماغی کا بھی ایک مقیاس ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ حیات انسانی کا مقیاس کیا ہے اور عام طور پر جو نظریہ اس کی پیائش کا قائم کیا جاتا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے۔

ایک شخص کی زندگی پر جب گفتگو کی جاتی ہے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ اتنی مدت تک زندہ رہا اتنے سال اور اتنے مہینے جیا' جوان مر گیا' بوڑھا ہو کر مرا' لیکن کیا یہ معیار درست ہے؟ غالباً نہیں کیونکہ یہ معیار انسان کی زندگی کا نہیں بلکہ اس کے جسم کی زندگی کا ہے۔

سکندر صرف 33 سال تک اس دنیا میں زندہ رہا حالانکہ وہ 300 سال قبل مسیح سے اس وقت تک زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مسیح صرف 33 سال زندہ رہے لیکن اپنی زندگی کے اخیر تین سال میں وہ اس طرح جیئے کہ اپنے آپ کو خلعت دوام بخش گئے۔ اسی طرح دنیا کے اور بڑے بڑے مفکرین اور تاریخ کے بڑے بڑے لوگوں کو لیجیے کہ وہ آج موجود نہیں ہیں لیکن ان کے کام ہنوز باقی ہیں اور روزانہ ہزاروں لاکھوں زبان پر ان کا نام آجاتا ہے۔

ممکن ہے بعض کا خیال ہو کہ حیات انسانی کا معیار' لذت و عیش' جاہ و ثروت ہے یعنی زندگی کا نام لطف و نشاط کے ساتھ عمر بسر کر دینے کا' جاہ و ثروت کے حصول کا۔ لیکن محض ذاتی لذت اور زر و دولت کا انبار اپنے بعد کوئی نقش چھوڑ جانے والا نہیں اور اس لیے اجتماع

بشری کی تاریخ ایسی لوگوں کی زندگی سے اعتنا نہیں کرتی'

بنا برآں اگر صحیح معنی میں حیات انسانی کا کوئی معاریہ و مقیاس ہو سکتا ہے تو وہ مقیاس اجتماعی ہے یعنی یہ کہ ایک شخص نے قوم کی کیا خدمت انجام دی۔ ملک و ملت کی اصلاح و فلاح کے لیے کیا کیا قربانیاں کیں اور دوسروں کو اپنی ذہنی یا مادی اکتسابات سے کیا فائدہ پہنچایا۔

دنیا کے جدید اجتماعی نظریئے زر و دولت کے مسئلہ کو صرف اسی حد تک اہمیت دیتے ہیں کہ وہ نوع انسانی کو فائدہ پہنچانے والے ہیں کیونکہ دولت کا انبار بجائے خود بالکل مہمل چیز ہے۔ اگر اس کی اعتباری قوت کار برآری کو نظر انداز کر دیا جائے اور یہیں سے اختلاف کی دو راہیں پیدا ہوتی ہیں جن میں سے ایک کا نام سرمایہ داری اور دوسری کا مطالبہ محنت و عمل ہے۔ پھر جس رفتار کے ساتھ یہ احساس قوی ہوتا جا رہا ہے اس کو دیکھ کر یہ حکم لگانا دشوار نہیں کہ وہ وقت قریب ہے جب ایک تاجر کی تجارت۔ ایک سائنس داں کی ایجادات' ایک صناع کی صنعت گری سب کا مدعا صرف مفاد جمہور کے لحاظ سے متعین کیا جائے گا اور اکتساب زر یا فراہمی دولت کا کوئی سوال دنیا میں باقی نہ رہے گا۔ پھر آیئے اس سلسلہ میں غور کریں کہ مذہب اس امر میں کس حد تک نوع انسانی کا ساتھ دینے والا ہے؟

جس حد تک مقصود یا غایت کا تعلق ہے ہم کو ماننا پڑے گا کہ مذہب کی تعلیمات یکسر مفاد جمہور پر مبنی ہیں اور تمدنی نقطہ نظر سے وہ امن و سکون ہی کا خواہش مند ہے لیکن تاریخ مذہب بالکل اس کے برعکس ہم کو یہ بتاتی ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ بد امنی و خونریزی مذہب ہی کی بدولت ہوئی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ہم کو اصول مذہب کی جستجو تاریخ سے ہٹ کر صرف اس کی تعلیمات میں کرنی چاہیے اور اگر ایک بار یہ بات اصولاً متعین ہو جائے کہ دنیا کا امن و سکون یا نوع بشری کی فلاح صرف مذہب ہی کے ذریعے سے ممکن ہے اور یہ کہ مذہب سے زیادہ اس کا کوئی حامی نہیں۔ تو پھر اس کا فیصلہ چنداں دشوار نہیں کہ مذہب اپنے عمل یا تعلیمات زندگی کے لحاظ سے کسی ایک جگہ ٹھہر جانے والی چیز ہے۔ یا ترقی تمدن کی سطح کے ساتھ ابھرنے اور بلند ہو جانے والی۔

اس باب میں سب سے بڑی غلطی علمبرداران مذہب نے یہ کی ہے کہ انھوں نے عقیدہ' عمل اور مقصود کے باہمی ربط و تناسب کو بالکل پس پشت ڈال دیا اور بجائے اس کے کہ مقصود کی اہمیت کو سامنے رکھ کر عمل و عقیدہ کو اس کا تابع یا ذریعہ قرار دیں صرف فرع

کو اصل چیز سمجھ لیا اور مقصود کو اس کی تابعیت میں دے کر مذہب کو نیست و نابود کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ اگر مذہب سے اس کے عقائد کو علیحدہ کر دیں تو اس کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا اور وہ کوئی مرکز ایسا نہ پیدا کر سکے گا جس پر کسی جماعت کے افراد کا اجتماع ہو سکے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ "عقائد" ہی اصل چیز ہیں بڑی کم فہمی کی بات ہے۔ مثلاً یوں سمجھیے کہ مذہب کے عقیدہ کا اصل الاصول اک خدائے قادر مطلق کے وجود کو تسلیم کرنا ہے لیکن صرف ذہن میں ایسا سمجھ لینا یا زبان سے اس کا اقرار کر لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر اس عقیدہ کے تحت ہم اپنے اعمال و افعال میں کوئی تغیر نہ پیدا کریں اور یہ اعمال و افعال بھی بے کار ہیں' اگر ان سے ہمارے نظام تمدن یا ہماری اجتماعی زندگی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے یہی حال صوم و صلواۃ کا ہے کہ محض قیام و قعود یا صبح سے شام تک بے آب و نان بسر کر دینا فی نفسہ لایعنی حرکت ہے۔ اگر اس سے کوئی اخلاقی نتیجہ نہ برآمد ہو اور اخلاق کا تعلق چونکہ صرف انسان کی اجتماعی زندگی سے ہے اس لیے اعمال مذہبی اوراد و وظائف اور دعا و توبہ کے رد و قبول کا معیار صرف یہ ہونا چاہیے کہ سب سے زیادہ پابند صوم و صلواۃ نے سب سے زیادہ خدمت خلق کی انجام دی ہے یا نہیں اور وہ شخص جس نے تین لاکھ مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر اس کی زکواۃ ادا کی ہے اس نے سوسائٹی کے لیے کس قدر ایثار سے کام لیا دنیا کے تمام مذاہب کا مقصود عبادت ونمائش یہ رہا ہو یا کچھ اور' مجھے اس سے بحث نہیں لیکن اسلام کے متعلق مجھے یقین ہے کہ اس کا نصب العین صرف یہی تھا اور اس نے عبادت کو محض عبادت کے لحاظ سے کبھی اہمیت نہیں دی' اس نے نماز کی تعلیم دی۔ صرف اس لیے کہ باہمی اتحاد و تعاون پیدا ہو۔ اس نے روزہ فرض کیا محض اس غرض سے کہ ہم میں ابنائے جنس کی اقتصادی مشکلات کا احساس پیدا ہو۔ اس نے حج کی ہدایت کی صرف اس مقصود کے ساتھ کہ اسلام کو بین الاقوامی چیز بنایا جائے۔ اس نے لوائے زکواۃ کو لازم قرار دیا فقط اس مدعا کے ساتھ کہ قوم کا ایک مرکزی بیت المال قائم رہے۔ لیکن افسوس ہے کہ عہد رسالت قوم کے اس عظیم الشان تعمیری پروگرام کو پورا کرنے کے لیے بہت مختصر ثابت ہوا اور عہد خلفاء میں بھی سیاسی اختلافات کی وجہ سے اس کی بنیاد مضبوط نہ ہو سکی' یہاں تک کہ آخر کار بنو امیہ کا دور ملوکیت شروع ہو گیا اور اسلام کی روح اجتماعیت' انسان پرستی' ہوس ملک گیری اور تکمیل استبداد و سرمایہ داری میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

اسلام نے زعامت دینی و دنیوی Temporal and Spritiual Power کی تفریق

اسی لیے گوارا نہیں کہ کہ ملوکانہ استعمار و استحصال کی خواہش لوگوں میں پیدا نہ ہو اور ایک قائد و رہنما یا سلطان و فرمانروا کی خصوصیت یہ نہ قرار پائے کہ وہ ملک کا سب سے بڑا سرمایہ دار ہے بلکہ اس کے لیے وجہ امتیاز یہ ہو کر وہ ملک و قوم کا سب سے زیادہ جفاکش خادم ہے اور تقسیم دولت میں وہ اسی سطح پر نظر آتا ہے جہاں دوسرے افراد قوم پائے جاتے ہیں پھر تاریخ شاہد ہے کہ اس لحاظ سے رسول اللہ کی زندگی کیا تھی' اور ان کے بعد خلفاء راشدین نے کس حد تک اس اصول کی پابندی کی لیکن جب عہد امیر معاویہ شروع ہوا تو حکومت اسلام ختم ہو کر حکومت عرب قائم ہوئی اور اسلام کی ظاہری پابندی صرف اس لیے قائم رکھی گئی کہ مصلحت کا اقتضاء یہی تھا (امیر معاویہ نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اہل مدینہ سے جن الفاظ میں خطاب کیا تھا ان سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام سے امیر معاویہ کو کتنی محبت تھی وہ الفاظ ملاحظہ ہوں "ولقد ضیت لکم نفسی علی عمل ابی قحافه و ابی بکر" وارد تنہا علی عمل عمر فنفرت من ذلک نفاراً شدیداً علی ثنیات عثمان فابت علی و فسلکت بہا طریقالی ولکم فیہ نفعة ھوا کلمت حسنة و مشارکة فان لم تجدو فی خیراً لکم فانی خیر لکم ولایة) الغرض اسلام کی صحیح تعلیم سے روشناس ہوئے دنیا کو مشکل سے ایک ربع صدی کا زمانہ گزرا ہوگا کہ واقعات و حالات نے اسے محو کرنا شروع کیا۔ اور زعامت دنیوی کے ساتھ ساتھ زعامت دینی سلاطین اسلام کی اتنی ضعیف ہو گئی کہ آخر کار پبلک پر اثر قائم رکھنے کے لیے ایک جماعت علمائے مذہب کی علیحدہ ایسے پیدا کی گئی جو حکومت کا ساتھ دینے والی ہو۔ اور جس و ساطت سے دنیاوی حکومت کو مضبوط بنایا جائے۔ چنانچہ تاریخ کے صفحات ایسے واقعات سے لبریز ہیں کہ علماء مذہب نے سلاطین و امراء کی اغراض پوری کرنے کے لیے حدیثیں وضع کیں۔ واقعات تاریخ کو مسخ کیا اور شریعت میں بہت سی ایسی تبدیلیاں کیں جو فرمانروائے وقت کے اغراض و مصالح کی تکمیل کے لیے ضروری تھیں۔ ہر چند علمائے سلف میں بعض ایسے نفوس بھی تھے جنھوں نے اپنے ضمیر کے خلاف کہنا کبھی گوارا نہیں کیا (مثلاً جناب ابو حنیفہ کہ انھوں نے امویین و عباسیین دونوں کے کوڑے کھانا محض اس لیے گوارا کیے کہ وہ خلافت کا مستحق صرف علوئین کو قرار دیتے تھے) لیکن عنصر غالب انھیں علماء کا تھا۔ جن کا علم دین حاکم وقت کی خواہشوں کے مطابق سانچہ میں ڈھل جاتا تھا اور جن کے احکام و فتاوی کو شاہان وقت بہ جبر ملک میں رائج کرتے تھے۔ چنانچہ فقہ حنفی کا ابو یوسف کے فتاوی کے مطابق مدون ہونا اور

ان کے استاد ابو حنیفہ کے اقوال پر عملدر آمد نہ ہونا اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔

الغرض جب فرمانروائے وقت کی دینی کمزوریوں کے اثرات کو دور کرنے کے لیے علمائے مذہب کی خدمات حاصل کی گئیں تو اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ اسلام کی وہ روح فنا ہو جائے جو شاہ و گدا کے امتیاز مٹانے والی تھی' جو بنی نوع انسان میں حریت و مساوات کا ذوق پیدا کرنا چاہتی تھی اور جو سرمایہ داری کی اسی لیے مخالف تھی کہ اس سے افراد قوم میں بالکل غلط اصول پر تفریق مدارج قائم ہوتی ہے۔

اس کے بعد جب رفتہ رفتہ حکومت دنیوی ضعیف ہونے لگی اور اسی کے ساتھ علمائے مذہب کا وہ جاہ و جلال بھی مٹنے لگا جو حمایت حکومت کی وجہ سے انھیں حاصل ہوا تھا تو انھیں فکر لاحق ہوئی کہ اس سیادت کو کیونکہ قائم رکھا جائے اور اس طرح اسلام میں سب سے پہلے ادارہ کہانت کی بنیاد پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام رفتہ رفتہ مذہب کے حقیقی مفہوم سے بیگانہ ہو گئے اور دین اسلام نام رہ گیا صرف ان باتوں کا جو ہمارے علماء بتائیں اور مذہبی لٹریچر کو شجر ممنوع قرار دے کر عوام کو اس کے مطالعہ سے روکا گیا۔ تاکہ وہ ہمیشہ علمائے دین کے محتاج رہیں اور خود ان میں غور و فکر کی صلاحیت کبھی نہ پیدا ہو۔

اس وقت جو حالت ہمارے ہندوستان کے علمائے کرام کی ہے وہ اسی کا ہنانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے نہ صرف بہ لحاظ نفسیات بلکہ ظاہری وضع و صورت کے اعتبار سے بھی انھوں نے اپنے آپ کو قوم کے دوسرے افراد سے جدا کر لیا ہے اور اس طرح اپنے اور عوام کے درمیان بینہما برزخ الایبغیان کی ایسی زبردست حد فاصل کھینچ رکھی ہے کہ اس کے دور ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اس میں شک نہیں کہ ہر قوم اور جماعت کے لیے ایک قائد و رہنما کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور عوام کی ذہنیت کو گمراہی سے بچانے کے لیے کسی نہ کسی ایسے دماغ کا پایا جانا لازم ہے جو ان پر خاص اقتدار رکھتا ہو' اسی کے ساتھ یہ بھی بالکل درست ہے کہ ایک پابند مذہب جماعت کے لیے یہ خدمت بہترین طور پر وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو مذہبی اقتدار رکھتا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مذہبی سیادت کا کیا مفہوم ہے اور ہندوستان کے علمائے اسلام اس سے کیا کام لے رہے ہیں!

یوں مذہب بظاہر نام ہے صرف چند مخصوص عقائد کا۔ لیکن مقصود بالذات محض عقائد نہیں ہیں بلکہ ان کی وساطت سے ایک غرض مشترک ایک مرکز اجتماع پیدا کرنا ہے اور اس

حقیقت کو پیش نظر رکھ کر جب ہم اپنے علمائے کرام کے اعمال و افعال کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو یہ فیصلہ کرنے میں دشواری ہوتی ہے کہ انھوں نے اسلام کے مفہوم کو واقعتاً سمجھا بھی ہے یا نہیں ہمارے علماء مختلف مدارج و اقسام کے ہیں۔ ایک تو سب سے ادنیٰ قسم وہ ہے جو قرآن حفظ کر کے اور فقہ کی چند کتابیں پڑھ کر "امامت" کی حد سے آگے نہیں بڑھتی اور مسجد کے حجرہ میں بظاہر راہبانہ زندگی بسر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ ان علماء کا ہے جو درس و تدریس کی چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرتے ہیں اور تعلیم قدامت پرستی سے قوم کے بچوں کا دماغ خراب کرنے کے لیے ایسا زیادہ معاوضہ بھی نہیں لیتے۔ تیسرا درجہ ان معلمین و اساتذہ کا ہے جو قومی تعلیم گاہوں میں فضیلت کی پگڑی تقسیم کرنے کے ذمہ دار ہیں اور بہ سلسلہ مسائل شرعیہ وہ احکام صادر کیا کرتے ہیں جن کا تعلق صدہا سال قبل کے تمدن سے ہے۔ چوتھا درجہ ان علماء کا ہے جنھوں نے بیعت توبہ سلوک کے ادارے قائم کر رکھے ہیں اور جو خود تو "فنافی اللہ" ہونے کے مدعی ہیں لیکن اپنے مریدوں کو "فنافی الشیخ" کے درجہ سے آگے بڑھانا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں۔ پانچواں اور غالباً سب سے اعلیٰ درجہ ان علماء کا ہے جو سیاسیات میں حصہ لینے کے مدعی ہیں اور جنھوں نے اس غرض کے لیے جمعیتیں بھی قائم کر رکھی ہیں۔

خیر اول دو قسم کے مولویوں کو چھوڑیئے کیونکہ ممکن ہے ان کو علماء کے گروہ میں شامل ہی نہ کیا جائے لیکن غایت و نتیجہ کے لحاظ سے موخرالذکر تین قسم کے علماء بھی ہم کو ویسے ہی نظر آتے ہیں اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس نے مسلمانوں کی تمدنی و معاشرتی اقتصادی و اجتماعی زندگی کی اصلاح کو اپنے لائحہ عمل میں شامل کیا ہو اول تو خود ان میں باہم گر ایسی حریفانہ کش مکش پائی جاتی ہے کہ عوام کے لیے یہ فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کس کے خلوص پر اعتبار کیا جائے جمعیتہ العلماء کانپور کی ہدایت پر عمل کیا جائے یا جمعیتہ العلماء دہلی کے مشورہ پر لیکن اگر یہ اختلاف و تصادم نہ ہو تو بھی ان کے وجود کا کوئی افادی پہلو ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ اگر شہر کے بہشتی معمار اور کفش دوز باقی نہ رہیں تو لوگوں کو واقعی بہت تکلیف پہنچے لیکن اگر مولویوں کی جماعت فنا ہو جائے تو قوم کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا کہ نماز و روزہ کا رواج کم ہو جائے گا۔ مسجدیں ویران ہو جائیں گی۔ یا بالفاظ دیگر یہ کہ روحانیت مفقود ہو جائے گی لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روحانیت نام اسی نکبت و ذلت کا ہے جو اس وقت ہندوستان کے

مسلمانوں پر طاری ہے اور صوم و صلوٰۃ کا رواج یا مسجدوں کی آبادی و رونق موجودہ علمائے کرام کی کی سرکردگی میں اسی قسم کی روحانیت پیدا کر سکتی ہے تو عذاب الٰہی کس چیز کا نام رکھا جائے گا اور قہر خداوندی کی اور کیا صورت قرار پائے گی۔

یہ امر غور طلب ہے کہ قرون اولیٰ میں بھی جب مسلمانوں کی ترقی سیلاب کی طرح بڑھ رہی تھی بالکل یہی نماز تھی اور یہی قیام و تعود' یہی روزہ تھا اور یہی اسحار و افطار پھر اب کیا ہوا کہ اطاعت و گناہ کسی میں وہ لذت باقی نہ رہی۔ اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ پہلے نمازیں پڑھی جاتی تھیں اصلاح نفس و اعمال کے لیے احیائے قومیت کے لیے احساس اجتماعیت کے لیے اور اب طاعت و عبادت بے روح ہے بے مقصود ہے۔ کوئی منزل سامنے نہیں۔ کوئی ہدف پیش نظر نہیں۔ پہلے مسلمان نماز پڑھتا تھا تو دنیا ہی میں طرح فردوس ڈالتا تھا۔ اپنے لیے یہیں حور و قصور پیدا کر لیتا تھا اور اب وہ سب کچھ "وعدہ فردا" کی امید پر کرتا ہے اور اسلام کو اس دنیا سے بالکل علیحدہ کر کے اس آخرت سے متعلق سمجھتا ہے جہاں نہ سوال جدوجہد کا ہے نہ سعی و عمل کا۔ او یہ وہ ذہنیت ہے جو اسلام کے غلط مفہوم کی تبلیغ سے پیدا ہوئی ہے اور جس کے زمہ دار یقیناً ہمارے مذہبی علماء ہیں۔

بعض حضرات انسانی ترقی کو دنیاوی فتوحات سے بالکل علیحدہ سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اسلام کا مدعا کسی سلطنت کا قیام یا حکومت کی بنیاد ڈالنا نہ تھا لیکن ایسا کہنا نہ صرف واقعات کی تکذیب ہے بلکہ اسلامی تعلیم کی بھی مخالفت کرنا ہے۔ رسول اللہ اور خلفاء کا جنگ کر کے لوگوں کو مسلمان بنانا مال غنیمت کو مجاہدین میں تقسیم کرنا مفتوحہ ممالک کی آمدنی سے بیت المال قائم کرنا اسی لیے تھا کہ عربوں یا مسلمانوں کی حکومت دنیا میں قائم ہو اور غالباً یہ کوئی گناہ نہ تھا۔ کیونکہ ایک قوم کی ترقی کا کوئی مفہوم متعین ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کا کوئی خاص اقتدار قائم نہ ہو اور یہ اقتدار یقیناً اسی دنیا سے متعلق ہونا چاہیے ورنہ مرنے کے بعد نہ سوال مسابقت کا ہو گا نہ سعی و نتیجہ کا اگر محض عروج روحانی ہوا بھی تو بیکار ہو گا اور اس کی تعلیم و تلقین اس عالم میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ دنیا کے بعض مذاہب نے صرف روحانی پاکیزگی ہی کو اپنا اصل مقصد قرار دیا تھا اور اس دنیا میں تکلیفیں اٹھا اٹھا کر ختم ہو جانے کو حیات ابدی بتایا۔ لیکن اسلام کی تعلیم یہ نہ تھی' اس نے اپنا مذہبی آئین اسی دنیا سے متعلق رکھا اور تمام وہ تدابیر بتائیں جو ایک قوم کی زندگی کو من حیث القوم کامیاب بنا سکتی ہیں۔ اس نے اگر اخوت و

ہمدردی کی تعلیم دی تو دوسری طرف دشمنوں سے جنگ کرنے کا بھی حکم دیا اور اگر اس نے یہ بتایا کہ نجات روحانی کا ذریعہ اخلاق کی پاکیزگی ہے تو اسی کے ساتھ یہ راز بھی ظاہر کر دیا کہ۔

"جس نے اس دنیا میں اندھوں کی طرح زندگی بسر کی وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا"

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے تعلیمات اسلامی میں صرف روزہ و نماز کو تو لے لیا۔ لیکن اس جوش عمل اور اس ولولہ ترقی کو نظرانداز کر دیا جس کے پیدا کرنے کے لیے طاعت و عبادت کی پابندیاں پیدا کی گئی تھیں۔ انھوں نے دوزخ کے اژدہے اور جنت کی حوریں تو یاد رکھیں لیکن اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ جہنم میں جو چیز اژدہا بن کر ڈسنے والی ہے وہ اسی نکبت و ذلت کی دوسری صورت ہے جو اس دنیا میں کسی قوم پر مستولی ہو جاتی ہے اور جس لذت کو حور کہا جاتا ہے اسی عروج و ترقی کا نام ہے جس کے بدولت ایک جماعت اسی دنیا کو جنت بنا لیتی ہے۔

آج ہمارے علمائے کرام ہم سے نمازیں تو پڑھوالیتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ کس نعمت کے شکریہ میں ان متواتر سجدوں کا خراج ہم سے وصول کیا جاتا ہے روزے تو ہم پر ہر سال مسلط کر دیتے ہیں مگر اس کی کوئی تدبیر نہیں بتاتے کہ احترام ماہ صیام کے احساس کے لیے گذشتہ گیارہ مہینوں تک شکم سیر ہو کر کھانے کے ذرائع مسلمان کو کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حصول نعمت و رزق کا ذریعہ یہی ہے تو پھر ہم کو معلوم ہونا چاہیے کہ آج یہ ذریعہ کیوں بے کار ہو کر رہ گیا ہے اور علمائے کرام کو چھوڑ کر وہی لوگ کیوں زیادہ نکبت زدہ نظر آتے ہیں جو زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مذہبی رہنماؤں نے اسلام کے فلسفہ کو سمجھا ہی نہیں اور غالباً وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے کہ اسلام کا مفہوم یکسر سعی و عمل ہے اور اصل عبادت وہی ہے جو ہر وقت ہمارے دماغ و جوارح کو متحرک رکھ کر ہمیں اپنی زندگی کا ثبوت دینے پر مجبور کرتی رہے۔

اسلام نے عاقبت کے بوریے سمیٹنے کی تعلیم کبھی نہیں دی۔ اس نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ "نیکی کر اور دریا میں ڈال" اس نے زمین کی طنابیں کھینچ کر دنیا پر چھا جانے کا درس دیا۔ اس نے اچھے کام کر کے یہیں ان سے فائدہ اٹھانے کی ترکیبیں بتائیں اور یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ آخرت کی کھیتی اسی دنیا میں بوئی جاتی ہے اور فردوس کے قصور بلند بام کی بنیادیں بھی اسی عالم آب و گل میں استوار کی جاتی ہیں۔

پھر غور کرو کہ تمہارے علماء تمہیں کیا بتاتے ہیں اور ان کی تعلیم کیا ہے اگر وہ واقعی تمہارے اندر کوئی قومی احساس پیدا کر کے اس کارزار عالم میں تمہارے ساتھ رہ کر جنگ کرنے کے لیے تیار ہیں تو بے شک ان کی تقلید کرو اور کورانہ تقلید کرو' لیکن اگر وہ تمہاری دنیا کو مٹا کر صرف تمہارے دین کے رہبر بنتا چاہتے ہیں تو باور کرو کہ ان کی رہبری گمراہی ہے اور ان کی قیادت بربادی۔ ان کی طرف سے منہ موڑ لو ان کے بتوں کو توڑ ڈالو اور خود سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمہارے رسول نے تمہیں کیا بتانا چاہا تھا اور اب تم ان ہادیان غیر ہدایت یافتہ کے زیر اثر بگڑ کر کیا ہو گئے ہو۔

○ ○ ○

افسانہ روح و روحانیت

انسان کی زندگی اس میں شک نہیں کہ بہت سے معتقدات و مزعومات سے گھری ہوئی ہے اور ہر عقیدہ کے لیے وہ کوئی دلیل بھی ضرور رکھتا ہے۔ لیکن اگر ان دلائل کی قوت پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ سب سے زیادہ کمزور دلیل وہ ہے جو بقائے روح کے باب میں اس کی طرف سے پیش کی جاتی ہے قبل اس کے کہ آپ اس دلیل کو سنیں یہ معلوم کرنا مناسب ہے کہ بقائے روح کے معتقدین کہتے کیا ہیں؟

ان میں ایک جماعت تو کہتی ہے کہ صرف روح کو بقاء ہے یعنی انسان میں جس چیز کو احساس تشخص' حافظہ' اور تاثیر تعبیر کیا جاتا ہے' وہ مرنے کے بعد بھی قائم رہے گا دوسری جماعت جس میں زیادہ تر مذہبی لوگ شامل ہیں وہ بقائے روح کے ساتھ حشر اجساد کے بھی قائل ہیں۔ یعنی ایک دن ایسا آئے گا جب جسموں سے جدا ہو جانے والی روحیں پھر اپنے جسموں سے مل جائیں گی اور وہ تقریباً اسی قسم کی زندگی بسر کریں گے جیسی اس دنیا میں بسر کی ہے۔

حیات بعدالموت کا عقیدہ کوئی نیا عقیدہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی نوع انسانی اول اول جب انسان کی عقل بہت محدود تھی تو وہ اپنے مردہ عزیزوں اور دوستوں کو خواب میں دیکھ کر سمجھتا تھا کہ یہ ضرور کسی نہ کسی حیثیت سے اب بھی موجود ہیں اور پس ماندگان کے ساتھ ان کا وہی تعلق باقی ہے جو زندگی میں پایا جاتا تھا۔ اور یہیں سے یہ اعتقاد پیدا ہوا کہ روح اور جسم دو بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور جب روح جسم سے جدا ہوتی ہے تو اس کی ہستی کسی نہ کسی طرح قائم رہتی ہے چنانچہ اسی بناء پر ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی جاتی تھیں تاکہ اس کو حیات بعدالموت کے طویل سفر میں تشنگی و گرسنگی کی تکلیف نہ پہنچے (مسلمانوں میں مرنے کے بعد فاتحہ وغیرہ کی رسمیں سب اسی عہد وحشت اور اسی اعتقاد جاہلانہ کی یادگار ہیں)

خیر' اگر عہد قدیم کا جاہل انسان ایسا سمجھا جاتا تو جائے حیرت نہیں کیونکہ وہ غریب حیات کی حقیقت سے واقف ہی نہ تھا لیکن اب کہ آغاز حیات کے اسباب سے ہر شخص واقف ہو

گیا ہے روح کے بقا کا قائل ہونا سخت حیرت ناک امر ہے۔

حیات حیوانی کی تمام ترقی یافتہ شکلوں کی بنیاد ایک خلیہ یا کویا (CELL) ہے لیکن حقیقتاً حیات کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اس کا پیوند دوسرے خلیہ سے ہو۔ (نباتات میں عام طور پر کسی دوسرے خلیہ سے پیوند ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی خلیہ ترقی پاکر اور اپنے اندر سے کثیر خلایا پیدا کر کے نشونما کا باعث ہوتا ہے۔) اس پیوند کے بعد بے شمار خلایا بنتے رہتے ہیں یہاں تک کہ حیوانی صورت ظہور پذیر ہوتی ہے اور اسی وقت معینہ کے بعد وہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے پھر حیات دنیاوی میں بے شمار خلایا اس کے جسم میں پیدا اور فنا ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کسی بیماری یا حادثہ یا بڑھاپے کی وجہ سے خلایا کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر مناسب حالات کے تحت خلایا کا پیوند نہ ہو تو وجود حیات نہیں پایا جا سکتا یہ درست ہے کہ سب سے پہلا خلیہ جو حیات حیوانی کا باعث ہے خود جان رکھتا ہے لیکن وہ حیات ایسی نہیں ہوتی جو کسی دوسرے خلیہ سے ملے بغیر ظاہر ہو سکے۔

عورت میں تقریباً دس ہزار پہلی قسم کے خلایا موجود رہتے ہیں اور مرد میں ارب درارب (بلکہ بے شمار) خلایا دوسری قسم کے پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف چند خلایا کا پیوند ہو کر حیات رونما ہوتی ہے۔ پھر اگر ان غیر پیوند شدہ بیکار خلایا میں بھی روح کا وجود مانا جائے اور مرنے کے بعد حیات مابعد کی وہی صورت تسلیم کی جائے جو ان غیر نتیجہ خیز خلایا میں پائی جاتی ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی حیات سے کیا فائدہ ہے اور کیوں اس کی تمنا کی جائے۔

اگر وہ چیز جس کا نام "روح" ہے جسم سے بالکل علیحدہ کوئی شے ہے تو پھر لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کب کہاں اور کیونکر جسم کے اندر آگئی جب انسانی وجود عبارت ہے دو بے روح خلایا کے اتصال سے تو پھر روح ان میں کہاں سے آگئی اس کا جواب دینا ہمارا فرض نہیں۔

آپ نے سنا ہو گا کہ ایک جنین جس نے رحم مادر میں پوری پرورش پائی تھی اور جس میں جان پڑ گئی تھی کسی صدمہ سے بالکل بے جان پیدا ہوا۔ لیکن بجلی اور دیگر آلات کی مدد سے اس میں جان پھر عود کر آئی اور وہ اپنی طبعی زندگی پوری کر کے مرا اسی طرح آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ ایک شخص پانی میں ڈوب کر بالکل بے جان ہو گیا لیکن اس میں تنفس

دوبارہ پیدا کر دیا گیا۔ پھر اگر روح واقعی جسم سے بالکل علیحدہ کوئی دوسری چیز ہے تو بتایا جائے کہ اس مردہ جنیں اور اس غرق شدہ انسان میں اتنے عرصہ کے لیے روح کہاں چلی گئی تھی اور وہ کیوں ان تدابیر کا انتظار کر رہی تھی جو کہ اگر اختیار نہ کی جاتیں تو پھر روح کے واپس آنے کا امکان نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ محض حیات کا وجود' وجود روح کے لیے ضروری نہیں اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس کو ہم جسم انسانی میں حیات سے تعبیر کرتے ہیں اسی کا دوسرا نام روح ہے کیونکہ دیگرذی حیات مخلوق اور انسان کے درمیان مابہ الامتیاز یہی امر ہے کہ انسان میں روح پائی جاتی ہے اور ان میں نہیں۔ ایک درخت میں "حیات" ہے لیکن روح نہیں۔ ایک جانور میں "زندگی" ہے لیکن روح نہیں۔ پھر یہ تو صحیح ہے کہ زندگی کا آغاز ایک خاص وقت سے شروع ہوتا ہے اور اس لیے اس کی انتہا بھی ہونی چاہیے لیکن انسان کا حافظہ اور ادراک نفس مرنے کے بعد بھی قائم رہ سکتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے روح کہتے ہیں۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ دعویٰ کس حد تک درست ہے انسان میں وجود روح کو تسلیم کرنا اور دیگر مخلوقات کو اس سے محروم سمجھنا ایک ایسی بات ہے جس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی طرح اور ذی حیات اشیاء میں بھی ادراک و حافظہ نہ پایا جائے۔ گھوڑے' کتے اور بلی کا برسوں کے بعد اپنے مالک کو پہچان لینا اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ ان میں قوت حافظہ بھی پائی جاتی ہے اور ادراک بھی اور اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ ادراک و حافظہ صرف انسان ہی کو میسر ہوا ہے تو پھر انسان کو اس وقت کی باتیں کیوں یاد نہیں رہتیں جب وہ رحم مادر میں تھا۔ یا جب دنیا میں آنے کے بعد اس نے گھٹنوں چلنا سیکھا تھا۔ اسی طرح ضعیف ہونے کے بعد انسان کیوں اپنے شباب کی بہت سی باتیں بھول جاتا ہے۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ مرنے کے بعد یہ حافظہ و ادراک بھی ختم ہو جائے گا اور جس طرح پیدا ہونے سے پہلے عدم کی تاریکی تھی اسی طرح مرنے کے بعد طاری ہو جائے گی۔ نہ پہلے کچھ تھا نہ بعد میں کچھ ہو گا۔

عہد قدیم میں جب انسان نہ اپنے جسم کی تعمیری حقیقت سے واقف تھا اور نہ کائنات کی دوسری مخلوقات کا اسے علم تھا۔ اس کا روحوں کے وجود کو جسم سے علیحدہ سمجھنا ٹھیک تھا کیونکہ آسمانی جغرافیہ کی حقیقت اس کے نزدیک صرف یہ تھی کہ زمین کو آسمان گھیرے ہوئے ہے اور اس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں۔ آسمان کے اوپر بہشت ہے جہاں فرشتے

اوپر نیچے آتے جاتے رہتے ہیں لیکن اب کہ مکان و زمان کا مفہوم بہت وسیع ہو گیا ہے اور ہماری دور بینوں نے کرہ ارض سے بہت زیادہ عظیم المرتبت اجرام سماوی ہمارے سامنے پیش کر دیئے ہیں ہمارے لیے یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ لامتناہی فضا کی ان بے شمار دنیاؤں میں صرف کرہ ارض ہی کے باشندوں کو خاص اہمیت حاصل ہو اور انھیں کی روحوں کو بقائے دوام کی اور خلعت سے سرفراز کیا گیا ہے پھر اور کروں کو جانے دیجیے خود اسی زمین کی اور تمام مخلوقات کو لیجئے کیا وجہ ہے کہ انسان کی روح کو بقا حاصل ہو اور جانوروں کی روحیں فنا کر دی جائیں اور اگر اس کا جواب صرف مصلحت خداوندی ہو سکتا ہے تو کیا وہی رضائے الٰہی و مصلحت ربانی روح انسانی کو فنا نہیں کر سکتی ایسا کرنے سے اسے کون باز رکھ سکتا ہے اور اس میں کون سا استحالہ عقلی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد روح عالم برزخ میں رہتی ہے بعض کہتے ہیں کہ اسی وقت بہشت و دوزخ کی طرف لے جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عالم برزخ یا بہشت و دوزخ ہیں کہاں؟ روح کا یہ سفر کس ذریعہ سے ہوتا ہے اور اپنی منزل تک پہنچنے کے بعد وہ کہاں اور کیونکر رہتی ہے کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں عزیزوں اور دوستوں سے بھی ملاقات ہو گی۔ گویا کوئی جگہ ایسی ہے جہاں ان سب کا اجتماع ہو گا اور وہ اسی دنیا کی طرح آپس میں تبادلہ خیال کر سکیں گے اب اسی اعتقاد کے ساتھ ان علمی حقائق کو بھی سامنے رکھیے کہ زمین اپنے محور پر نہایت تیزی سے گردش کر رہی ہے اور چوبیس گھنٹہ میں پوری ایک گردش کر لیتی ہے۔ یعنی فی گھنٹہ ایک ہزار میل کی رفتار سے وہ گھوم رہی ہے اسی کے ساتھ اس کی دوسری گردش آفتاب کے گرد ہے جو تقریباً 9 کروڑ 30 لاکھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ گردش پورے ایک سال میں پوری ہوتی ہے یعنی فی منٹ ایک ہزار میل کی رفتار سے زیادہ زمین کو آفتاب کے گرد چکے لگانا پڑتا ہے پھر یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایک اور تیسری گردش ہمارے نظام شمسی کی ہے جو قطب کے گرد ہوتی رہتی ہے اور چوتھی گردش نظام قطبی کی ہے جو خدا معلوم کتنے نظامہائے شمسی کے ساتھ فضا کہکشاں میں کسی اور مرکز کے گرد چکر لگا رہی ہے پھر کیا ان تمام چکروں اور گردشوں میں باشندگان کرہ ارض کی روحوں کا جسم سے جدا ہو کر باہم گر ملنا یا کسی ایک جگہ' قرار پانا باور کیا جا سکتا ہے۔

بعض نہایت سخت مذہبی قسم کے لوگ باور کرتے ہیں کہ انسان قیامت کے دن مع اپنے

جسم کے اٹھایا جائے گا اب سے دو ہزار قبل اہل فلسطین جب وہ نہ زمین کی حقیقت سے آگاہ تھے نہ کائنات کی وسعت سے یقین کرتے تھے کہ زمین کی عمر چار ہزار سال کی ہے اور طوفان کے بعد دنیا کو بسے ہوئے صرف دو ہزار سال کا زمانہ گزرا ہے' اور جلد ہی اس کو پھر تباہ ہو جانا ہے لیکن آج یہ امر پایہ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ انسان کا وجود کرہ زمین پر لاکھوں سال سے پایا جاتا ہے اور اس دوران میں دنیا خدا معلوم کتنی مرتبہ بدل چکی ہے کم از کم تین چار صرف برفیلے دور ایسے آچکے ہیں جنھوں نے زمین کی تمام انسانی آبادی کو یا تو سمندر میں ڈبو کر رکھ دیا یا زمین کے اندر دفن کر کے ختم کر دیا۔ خدا جانے کتنی بار نوع انسانی جانوروں کی غذا بن کر ختم ہوئی اور پھر انھیں سے پیدا ہوئی الغرض موجودہ انسان میں معلوم نہیں کتنے گذشتہ انسانوں اور جانوروں کے اجزاء شامل ہیں اس لیے اگر حشر اجساد کو تسلیم کیا جائے تو وہ کون سا کیمیائی طریقہ ہو گا جو لاکھوں سال قبل کے انسانوں کے تقسیم شدہ اجزاء کو پھر فراہم کر سکے گا۔ اور اگر میرا حشر ہوا تو کن کن جانوروں' کن کن درختوں اور کن کن انسانوں سے میرے اجزاء فراہم کر کے میرا اصلی جسم تیار کیا جائے گا۔

فطرت کے وہ تمام تغیرات جو انسانی ہیولی میں نشو نما' بیماری ضعیفی اور موت وغیرہ کی صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں' بالکل ایسے ہی ہیں جیسے ہم ایک جلنے والے کوئلہ میں دیکھتے ہیں۔ آپ انگیٹھی میں کوئلہ ڈال دیتے ہیں اس کا کیا حشر ہوتا ہے ایک حصہ اس کا دھواں بن کر غائب ہو جاتا ہے' ایک حصہ حرارت میں تبدیل ہو کر آپ کے کمرے کو گرم رکھتا ہے اور کچھ حصہ راکھ بن جاتا ہے۔ بالکل یہی حالت انسان کی سمجھئے فطرت ہر وقت جوڑنے' توڑنے ملانے اور منتشر کرنے میں مصروف ہے۔ اور قوت و مادہ کو وہ اسی طرح نئی نئی صورتوں میں تبدیل کرتی رہتی ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسان جو اسی دنیا اسی نظام اور اسی مادہ سے متعلق ہے۔ اس عمل سے بچا رہے گا۔ اگر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر فانی سمجھے تو ایک چیونٹی بھی یہی دعوی کر سکتی ہے ایک گھاس کا تنکا بھی یہی کہہ سکتا ہے' روح ہم میں بھی ہے اور ان میں بھی۔ اور اگر ہماری روح کو بقا ہے تو ان کی روحوں کو بھی ہونا چاہیے۔

زندگی حقیقتاً نام ہے صرف اس توازن کا جو فطرت کی تعمیری و تخریبی دو متضاد قوتوں میں پایا جاتا ہے فطرت کی تعمیری قوت ہمیں قائم رکھنا چاہتی ہے اور تخریبی قوت مٹانے پر تلی ہوئی ہے جب تک ان دونوں میں توازن قائم ہے ہم صحیح و توانا کہلاتے ہیں' لیکن جب

رفتہ رفتہ تخریبی قوت غالب آنے لگتی ہے تو ہم ضعیف ہو جاتے ہیں اور جب اس کا بالکل تصرف ہو جاتا ہے تو ہم مرجاتے ہیں لیکن ہماری قوت کے بعد فطرت کا یہ عمل بند نہیں ہوتا بلکہ برابر جاری رہتا ہے اور ہماری تخریب سے پھر تعمیر شروع ہونے لگتی ہے۔ خواہ وہ تعمیر کیڑوں کی ہو یا نباتات و حیوانات کی۔ اس لیے اب پھر ہمارے انھیں اجزاء کا فراہم ہو کر یکجا ہونا اور اصل صورت و شکل سے رونما ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔

حشر و نشر یا بقائے روح کا عقیدہ صرف جذبہ محبت کی بناء پر پیدا ہوا ہے جس سے مقصود اپنے آپ کو تسکین پہنچانا ہے۔ اول اول جب انسان نے دیکھا کہ اس کے ماں باپ اس کے بچے۔ اس کے بھائی بہن۔ اس کے سردار اور بزرگ دفعتہ" مرگئے تو سے سخت صدمہ ہوا اور اسے کسی طرح یقین نہ آیا کہ واقعی ہمیشہ کے لیے فنا ہو گئے ہیں اس کے بعد جب اس نے انھیں خواب میں بھی دیکھا' خواب میں ان سے باتیں بھی کیں تو اس کو اور زیادہ یقین ہو گیا کہ ان کی روحیں موجود ہیں اور ہم سے وہی تعلق محبت کا رکھتی ہیں۔ پھر یہ عقیدہ برابر اس وقت تک قائم رہا جب تک انسان نے حیات کی حقیقت کو نہیں جانا اور اب بھی انھیں قوموں میں باقی ہے جو اس حقیقت سے ناواقف ہیں یا ناواقف رہنا چاہتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ وہ لوگ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کیا فی الحقیقت انھیں اس کا یقین بھی ہے ممکن ہے وہ اس کا اقرار کریں لیکن مجھے اس میں کلام ہے اس سے قبل میں عقیدہ و یقین کا فرق بتا چکا ہوں اور ثابت کر چکا ہوں کہ تمام وہ عقائد جن کا تعلق مابعد الموت سے ہے وہ سب مزعومات و قیاسات ہیں' حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں کیونکہ علم حقیقی کا تعلق صرف ہمارے حواس اور ہمارے ادراک سے ہے یا ان تجربات سے جو بنائے تواتر محسوسات کا حکم رکھتے ہیں اور یہاں ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں۔

اچھا اس فلسفیانہ موشگافی کو جانے دیجیے' وہ لوگ جو حیات بعدالموت کے قائل ہیں اور حقیقی سکون و آرام کی زندگی اسی کو سمجھتے ہیں' ان سے پوچھیے کہ باوجود اس علم کے کہ دنیاوی زندگی ناپائدار و مکلف ہے اور اخروی زندگی ابدی راحت' وہ کیوں یہاں کی زندگی پر جان دیتے ہیں جب بیمار پڑتے ہیں تو کیوں علاج کرتے ہیں۔ تپ دق اور سرطان میں مبتلا ہونے کے بعد انھیں موت کا یقین ہوتا ہے لیکن پھر بھی چارہ و علاج ضرور کرتے ہیں' اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انھیں اخروی زندگی کا صرف اعتقاد ہے' یقین نہیں اگر انھیں یقین

ہوتا تو وہ ایک لمحہ کے لیے اس دنیا میں رہنا پسند نہ کرتے اور جلد سے جلد اس عالم میں پہنچنے کی کوشش کرتے جہاں بہشت کی راحتیں ہیں۔ حوروں کی آغوشیں ہیں' بچھڑے ہوئے احباب ہیں' چھوڑے ہوئے اعزہ ہیں' جدا ہو جانے والی اولادیں ہیں اور وہ سب کچھ ہے جو یہاں میسر نہیں آسکتا۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے سے ڈر اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے گناہوں کی سزا وہاں ملے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اس خیال میں بھی وہی اعتقاد کام کر رہا ہے جسے یقین سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ اگر واقعی سزا کا یقین ہو تو قیامت تک کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ مرنے کے بعد نہ معاصی کی سزا کا یقین ہے اور نہ نیکیوں کی جزا کا ورنہ ممکن نہیں کہ یہاں کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو یا اس دنیا میں جیتے رہنے کی تمنا دل میں پائی جائے۔

وہ لوگ جو بقائے روح کے قائل ہیں وہ اپنے عقیدہ کے ثبوت میں امریکہ و مغرب کے ان روحانیین کے بیان کو بھی پیش کرتے ہیں جنھوں نے روحوں سے ہم کلام ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کی نسبت ہم اجمالاً پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ یہ دعوے بالکل جھوٹے ہیں اور ان مدعیان روح و روحانیت نے کس کس طرح لوگوں کو دھوکہ میں مبتلا کیا ہے اور جس چیز کو روحوں کا نام و پیام کہا جاتا ہے وہ کتنا بڑا مکر و فریب ہے۔

الغرض مسئلہ روح یا حیات بعدالموت منجملہ ان چند مسائل کے ہے جو صرف انسانی تمنا کی پیداوار ہیں اور ان عقائد سے متعلق ہیں جن کے لیے نہ صرف یہ کہ کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی بلکہ جو سراسر اصول فطرت و نظام عالم کے منافی ہیں۔ پس اگر مذاہب عالم کا انحصار صرف معاد یا حیات بعدالموت پر ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے تو اب کوئی امید نہیں کہ وہ عرصہ تک قائم رہ سکیں کیونکہ جوں جوں مادی و علمی ترقی بڑھتی جا رہی ہے انسان میں خود اعتمادی کی کیفیت زیادہ پیدا ہوتی جاتی ہے اور وہ کسی بات کو محض اس دلیل پر ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا کہ اب سے پہلے کے لوگ ایسا کہہ گئے ہیں لیکن اگر مذاہب کی زندگی کا تعلق کسی ایسے درس اخلاق سے بھی ہے جو اسی دنیا میں کام آنے والا ہے اور اسی عالم میں داعیات تمدن کو پورا کرنے والا ہے تو ان کے لیے لازم ہے کہ وہ صرف اسی پر اپنی بنیاد قائم کریں اور ان عقائد پر زور نہ دیں جو ان کی کمزوری کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ لیکن چونکہ اس کی بظاہر کوئی امید نہیں ہے اس لیے مذاہب عالم کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے اور ڈماکریسی و مشینری کی ترقی کے ساتھ ایک دن اس کو بالکل ختم ہو جانا

ہے کیونکہ اس وقت تک سب سے زیادہ دشمنی مذہب کے ساتھ انھیں دو چیزوں نے کی ہے
اور ان کی ترقی کا کھلا ہوا نتیجہ مذاہب کا زوال ہے۔

○ ○ ○

خود نمائی خدا شناسی ہاست

ہمارے علماء ہمارے قائدین ملت اور ہماری جماعت کے وہ تمام افراد جو محراب منبر کی بلندی سے صدائے موعظت بلند کرنے کا حق رکھتے ہیں' اگر ان سب کی پند و نصیحت میں کوئی چیز "قدر مشترک" کی حیثیت سے نظر آتی ہے تو صرف یہ تعلیم کہ مسلمان اس وقت تک صحیح مسلمان نہیں بن سکتا جب تک وہ بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے نہ ہٹے لیکن یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس سے کیا مقصود ہے۔

ظاہر ہے کہ اس تعلیم و تلقین کے سلسلہ میں سب سے پہلے "خیرالقرون قرنی" کی تصویر ان کے سامنے آتی ہو گی۔ اس کے بعد صحابہ کا دور پیش نظر ہوتا ہو گا اور پھر تابعین و تبع تابعین کا" لیکن آپ کسی مولوی سے دریافت کیجئے کہ وہ عہد نبوی کو تاریخ انسانی کا کیوں بہترین دور قرار دیتا ہے تو وہ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہ بتا سکے گا کہ اس وقت صدائے توحید بلند ہو رہی تھی۔ صنم کدے ویران کیے جا رہے تھے لوگ خشوع و خضوع سے نماز پڑھتے تھے' روزے رکھتے تھے اور محض رسول اللہ کا دیدار ہی نجات کے لیے کافی تھا۔ اس کے بعد وہ دور صحابہ کی برکات کا ذکر کرے گا۔ کیونکہ یہ زمانہ عہد نبوی سے زیادہ قریب تھا۔ پھر وہ تابعین کے زمانہ کی تعریف کرے گا اور صرف اس بناء پر کہ اس عہد کے لوگوں نے صحابہ کو دیکھا تھا اور پھر تبع تابعین کا ذکر کرے گا کیونکہ انھوں نے تابعین سے فیض صحبت حاصل کیا تھا۔ الغرض ایک مولوی کے سامنے وقت و زمانہ کی خوبی کا انحصار صرف اس پر ہے کہ وہ عہد رسول اللہ سے قریب تر واقع ہو اور اس کے بدترین ہونے کی صورت یہ ہے کہ عہد نبوی سے اس کا بہت زیادہ بعد ہو۔ چنانچہ دنیا جتنی آگے بڑھتی جائے گی اتنی ہی خراب ہوتی جائے گی۔ پھر حیرت ہے کہ جب ایک زمانہ کی سعادت و عدم سعادت صرف اس پر منحصر ہے کہ وہ کسی مخصوص انسان سے قریب واقع ہے یا دور' ہم پیچھے ہٹ کر کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جب کہ وہ کسی طرح واپس نہیں آ سکتا اور ہم اس کے دیدار سے دوزخ اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتے۔

میرا مقصود اس تمہید سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے جو تدابیر قائدین

مذہب کی طرف سے بتائی جاتی ہیں وہ مقلاً خواہ کتنی ہی شاندار امید افزا کیوں نہ ہوں لیکن معناً یکسر لغو و مہمل ہیں۔ ایک واعظ صدائے توحید کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کو ایک کہہ دینے سے انسان کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ وہ کفر و بت پرستی کے استیصال کا کارنامہ نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے مگر میں نہیں سمجھ سکتا کہ پتھر کی چند مورتوں کو توڑ دینا کیوں انسانیت کا منتہائے ترقی قرار دیا جائے وہ نماز و روزہ کی متضرعانہ کیفیت کا فسانہ دہراتا ہے لیکن میں حیران ہوں کہ جنبش اعضاء کی چند مقررہ صورتیں اور فقر و فاقہ کی تنگی کو کیوں سعادت انسانی سمجھا جائے۔ وہ صرف رسول اللہ کے دیدار کو کافی ذریعہ نجات قرار دیتا ہے درآنحالیکہ رسول کے دیکھنے والے اگر ایک طرف ابوبکر و علی تھے تو دوسری طرف جہل و بولہب بھی پائے جاتے تھے۔ گو یہ فرق ضرور تھا کہ جنھوں نے اخروی نجات حاصل کی ان میں شاید جذبہ مخلص پرستی موجود تھا اور جو گمراہ کہلائے وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔

مجھ سے اگر سوال کیا جائے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں سب سے بہتر زمانہ کون سا تھا تو میں بھی بلا تامل عہد نبوی کا نام لے دوں گا لیکن اس کا تعلق نہ رسول اللہ کی ذات سے ہو گا نہ ان کے دیدار سے بلکہ صرف اس روح سے جو اس انسان کامل نے پیدا کی اور اس عزم و ارادہ سے جس نے ایک پست و جاہل قوم کو دفعتہً قعرِ ذلت سے نکال کر بام ترقی پر پہنچا دیا۔

یقیناً رسول اللہ نے توحید کا درس دیا لیکن اس سے مراد محض خدا کو ایک کہنا یا سمجھنا نہ تھا کیونکہ صرف یہ عقیدہ انسانی ترقی یا فلاح کو مستلزم نہیں بلکہ اس سے مراد ایک عام جذبہ اتحاد و اخوت کو بیدار کرنا تھا' تمام نوع انسانی کو ایک رشتہ اجتماعیت سے وابستہ کرنا تھا اور اس موثر برتر اعلیٰ میں سے ہو کر (جو یقیناً ہر ہر ذرہ میں کار فرما ہے) ایک ایسی جمیل فضا پیدا کر دینا تھا' جہاں خدا سمٹ کر انسان اور انسان پھیل کر خدا بن جاتا ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ رسول اللہ نے کفر و بت پرستی کے خلاف پوری جدوجہد سے کام لیا لیکن کفر سے مراد خودی کا انکار تھا' انانیت کبریٰ سے اعراض تھا اور بت پرستی نام تھا اس کورانہ تقلید و جاہلانہ سرنگونی کا' جو ایک انسان سے احساس انسانیت و برتری چھین لینے والی ہے۔

اس میں بھی کلام نہیں کہ سرکار نبوت سے طاعت و عبادت کی بھی ہدایت کی گئی لیکن

اس کا مطمح نظر صرف اس قوت کو سراہنا تھا جو نظام کائنات کو تکمیل و تجمیل کی طرف لے جارہی ہے اور اس سے کسب فیضان کر کے خود اس وقت کا دست و بازو بن جانا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ زمین پر سر ٹیک دینے سے نہ خدا کے مرتبہ میں کوئی بلندی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اس عجز و فروتنی کی اسے ضرورت ہے۔

الغرض یہ بالکل صحیح ہے کہ عہد نبوی بہترین زمانہ تھا۔ لیکن اس کا تعلق نہ صرف روزہ نماز سے تھا نہ ظاہری مراسم نمائش و عبودیت سے' نہ زبانی تسبیح و تہلیل سے اسے کوئی واسطہ تھا' نہ مسواک و مصلی سے بلکہ وہ ایک زمانہ تھا جس نے سوتی ہوئی انسانیت کو جگایا جس نے فطرت کے قوائے کامنہ کو انسان کے لیے بے نقاب کیا اور جس نے نوامیس الہیہ کو دسترس انسانی سے قریب تر کر کے عالم کی ذہنیت کا رخ بدل دیا۔

پس یقیناً وہ عہد' نہایت مبارک تھا۔ جب آفتاب حقیقت نے اول اول اس طرح طلوع کیا اور لاریب وہ زمانہ سراہے جانے کے قابل ہے جب شاہد مقصود سب سے پہلے برا فگندہ نقاب سامنے آیا' لیکن اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس ابتداء کو کسی انتہا کی ضرورت نہ تھی' یہ آغاز و انجام سے بے نیاز تھا۔ اس آفتاب کا طلوع نصف النہار سے مستغنی تھا۔ تو یقیناً اس کا دعویٰ غلط ہو گا' کیونکہ دنیا کا کوئی تخم دفعتہً بار آور نہیں ہو سکتا۔ کوئی تغیر فوراً استوار نہیں ہوتی اور منزل تک پہنچنے کے لیے قطع سفر ضروری ہے رسول اللہ نے بے شک انسانیت کے دور جدید کی بنیاد قائم کی لیکن اس توقع کے ساتھ کہ آئندہ نوع انسانی اس کو عروج و کمال تک پہنچائے اور خدا کا وہ وعدہ جو "جنت عدن" کی صورت میں کیا گیا تھا پورا ہو کر رہے۔

پھر اب دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھو کہ کس قوم نے اس رمز کو سمجھ کر ان مدارج استعلاء کو حاصل کیا جو ایک سچے مومن کو حاصل کرنا چاہیے۔ اور وہ کون سی قوم ہے جو تعلیم کو نظر انداز کر کے "ہل یہلک الا القوم الفاسقون" کی تعزیز میں مبتلا ہوئی۔

یہ ہماری کوتاہ نظری ہے کہ ہم خدائی فیصلوں اور ربانی اصول میں ملک و ملت' رنگ و نسل' کفر و اسلام کی تفریق کو سامنے رکھ کر خطا و ثواب کا معیار قائم کرتے ہیں۔ جو فطرت مشرق میں جلوہ گر ہے وہی مغرب میں ہے۔ قدرت کی جو کارفرمائیاں شمال میں نظر آتی ہیں وہی جنوب میں بھی ہیں۔ شاہراہ صرف ایک ہی ہے جس کا دوسرا نام دین فطرت ہے اور یہ سب کے لیے یکساں کھلی ہوئی ہے۔ یہود و نصاریٰ کافر و مسلمان کی تفریق صرف ہماری بے

بصری کا نتیجہ ہے اور یہ نام وہ ہیں جو خدا کی لوح محفوظ یعنی صحیفہ قدرت کے اوراق میں کسی جگہ نظر نہیں آتے۔ وہاں ان سب کو صرف ایک ہی نام لفظ "انسان" سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے لیے صرف ایک ہی پہچان "کل مولود ولد علی فطرة الاسلام" بتائی گئی ہے اور یہ فخر صرف بانی اسلام ہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے اس نے اس راز کو ظاہر کیا اور اس طرح اس نے اول اول جملہ افراد نوع انسانی کو ایک ہی منزل کی طرف قدم بڑھانے اور ایک ہی مرکز پر جمع ہونے کی تعلیم دی۔ لیکن ہماری کوتاہ فہمیوں کی یہ داستان کتنی دردناک ہے کہ جس قوم پر سب سے پہلے اس راز کا افشا کیا گیا اسی نے سب سے زیادہ اس کو ٹھکرایا اور انسانیت کو جس جماعت سے سب سے زیادہ "توقع داد پانے" کی تھی وہی سب سے زیادہ خستہ تیغ ستم نکلی۔

اب سے اربوں سال قبل جس کرہ ارض کی تخلیق ہوئی تھی، ہر چند ہنوز تشنہ تکمیل ہے لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ اس کے شباب و بلوغ کا زمانہ آرہا ہے اس کی تحسین و تجمیل آہستہ آہستہ مکمل ہو رہی ہے اور اس شراب کے رسا ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے، علوم و فنون کے چشمے ہر طرف ابل رہے ہیں۔ کائنات کے تمام چھپے ہوئے راز کھلتے جا رہے ہیں۔ قدرت کی جملہ برکات ہمارے لیے یسیرالحصول ہوتی جاتی ہیں۔ عناصر عالم نے انسان کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا ہے "استخلاف فی الارض" کا وہ وعدہ ربانی جو یوم الست میں کیا گیا تھا بہت جلد پورا ہونے والا ہے اور دنیا ایک زمانہ دراز تک انتقام کے جہنم میں بھٹکنے کے بعد قرب و وصال کی فردوس سے ہم آغوش ہونے والی ہے لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سعادت و برکت ان کے لیے مقسوم نہیں ہے جنھوں نے دنیا کو "سجن المومن" سمجھ کر اس کو ٹھکرا دیا بلکہ ان خوش نصیب لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس قید خانہ کو اپنے لیے رشک فردوس بنا لیا خواہ اس کا نام آپ "جنت الکافر" ہی کیوں نہ قرار دیں۔

انسان اسی دنیا کا ایک جزو ہے۔ اور اسی کو آباد کرنے کے لیے وہ پیدا کیا گیا تھا۔ قدرت نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ وہ یہاں مفلوج و عاجز، بیکس و مفلس، نادار و ناچار، محتاج و بیمار بن کر زندگی بسر کرے۔ دنیا خدا کا ایک باغ ہے جس کو اس نے پھولنے اور پھلنے کے لیے نصب کیا تھا نہ کہ ویران و برباد ہونے کے لیے۔ پھر جن کو چشم بصیرت عطا ہوئی ہے وہ محسوس کر سکتے ہیں کہ موسم بہار کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں اور دور خزاں ختم ہو چلا

ہے' تازہ کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ گلہائے رنگا رنگ منصہ شہود پر جلوہ گر ہو رہے ہیں اور بہت جلد خود ذات ربانی اس کسوت نشاط و جمال میں رونما ہونے والی ہے جسے دست انسانی نے اپنے خالق کے لیے تیار کیا ہے' خدا غنی ہے اور وہ اس کا مہمان نہیں ہو سکتا جو محتاج و مفلس ہے' خدا غالب و قدیر ہے اس لیے وہ مغلوب و مقروح کی دعوت قبول نہیں کر سکتا۔ خدا پاکیزہ و طاہر ہے اس نے وہ کثیف و بد سلیقہ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ خدا اجمل و اکمل ہے اس لیے وہ ناقص بد صورت سے کبھی خوش نہیں ہو سکتا جس چیز کو اس نے پیدا کیا ہے اسے مکمل دیکھنا چاہتا ہے اسے نقص سے نفرت ہے بدصورتی سے احتراز ہے حزن و ملال سے اسکتراہ ہے۔ اور اس لیے وہ قومیں جو درماندہ و عاجز ہیں' مغموم و ملول ہیں یقیناً وہی ہیں جن کی طرف سے اس نے اپنا منہ پھیر لیا ہے اور جو قومیں غالب و فاتح ہیں۔ مسرور و شادکام ہیں بے شک وہی ہیں جن سے خدا خوش ہے اور جن کو وہ دوست رکھتا ہے۔

اس زمانہ میں ایک متشائم (PESSIMISTIC) قوم کو زندہ رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ وہ جماعت جو اپنی کاہلی اور قوت عمل کے فقدان کو "تقدیر و توکل" کے نام سے موسوم کر کے گدایانہ زندگی بسر کر رہی ہے' وہ یقیناً ہلاک ہو کر رہے گی اور اسے ہلاک ہو جانا چاہیے۔ دنیا فطرت کا وہ کارنامہ ہے جس میں اس کی انتہائی تمنائے نشاط صرف ہو رہی ہے اور اس لیے ایک حزین و مایوس ہستی کا اس میں گزر نہیں۔ باغ کے وہ تمام پودے جو بیمار ہو کر مضمحل ہونے لگتے ہیں ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے صحیح و توانا درخت متاثر نہ ہوں۔ بالکل اسی طرح وہ جماعتیں بھی فنا ہو جائیں گی جن کی قواء مضمحل' جن کے دماغ ضعیف اور جن کی ذہنیتیں بیمار ہیں تاکہ خدا کی یہ کھیتی لہلہا اٹھے' اور اس کی زمین تمام خس و خاشاک سے پاک ہو جائے۔

○ ○ ○

کیا مذہب فطری چیز ہے؟

ایک زمانہ انسان پر ایسا بھی گزرا ہے جب مذہب سے انکار تو خیر بڑی چیز ہے اس کی حقیقت پر غور کرنا بھی معصیت خیال کیا جاتا تھا اور اس قسم کی بحث گویا توہین خداوندی کے مترادف تھی چنانچہ انیسویں صدی کے وسط تک اس مذہبی گرفت اور ذہنی غلامی کا یہ عالم تھا کہ کائنات کو انسان نے خدا اور شیطان کے درمیان تقسیم کر رکھا تھا۔ یعنی تمام اچھی باتیں خدا سے منسوب کی جاتی تھیں اور بری باتیں شیطان سے' گویا انسان ایک نہایت ہی ذلیل قسم کا جانور تھا جو نہ خود کچھ کر سکتا تھا اور نہ کسی بات کا ذمہ دار قرار پا سکتا تھا۔

لیکن اب کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر کیفیت پر علمی تحقیقی نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے اور ایک ایک ذرہ سے لے کر پہاڑوں کی سربفلک چٹانوں تک کوئی چیز ایسی نہیں جو مطالعہ علم و تحقیق سے باہر ہو۔ مذہب کا بچنا دشوار تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ علم کی درازدستی سے محفوظ رہ سکتا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ علم یا سائنس کا تعلق صرف مادی چیزوں سے ہے اور مذہب چونکہ روحانی چیز ہے اس لیے سائنس کی رسائی وہاں ممکن نہیں' لیکن یہ غلط ہے کیونکہ سائنس کا تعلق جس طرح مادی چیزوں سے ہے اسی طرح غیرمادی اشیاء سے بھی ہے۔ اگر وہ کمیت سے بحث کرتا ہے تو کیفیت بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ چنانچہ نفسیات جس کا تعلق نفس سے ہے وجدانیات یا جمالیات جس کا تعلق حسن و جمال سے ہے اخلاقیات جو انسان کے اخلاق سے متعلق ہے اور اسی طرح کے دیگر علوم سب غیرمادی چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔

سائنس فی الحقیقت نام ہے ایک صحیح اور بے لاگ انتقادی مطالعہ کا خواہ اس کا موضوع کوئی مادی چیز ہو یا غیرمادی اور اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب جو ہزاروں سال سے انسانی رجحانات پر حکمرانی کرتا چلا آرہا ہے۔ محض اس لیے کہ اس کا تعلق روح و روحانیت سے ظاہر کیا جاتا ہے' تحقیق علمی کی حدود سے باہر رکھاجائے چنانچہ آج کی صحبت میں ہم اس موضوع پر خالص علمی نقطہ نظر سے غور کر کے دیکھیں گے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور

وہ انسانیت کے لیے ضروری ہے یا نہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ آیا مذہب واقعی کوئی الہامی چیز ہے' یعنی کیا خدا کی طرف سے اس کی پابندی انسان پر عائد کی گئی ہے اور اس کے بعد یہ کہ الہامی نہیں ہے تو اس کے وجود کے اسباب کیا تھے۔

اگر ہم اس کو تسلیم کر لیں کہ مذہب کا مقصود نوع انسانی کی فلاح و بہبود ہے تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا نے انسان کو آفرینش کے ساتھ ہی ساتھ مذہب بھی الہام کیا ہو گا ورنہ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا نے اول اول تو ہدایت کو ضروری خیال نہ کیا تھا' لیکن بعد کو اس کی ضرورت اس نے محسوس کی جو یقیناً" شان خداوندی کے منافی ہے اگر خدا کا مقصود انسان کی آفرینش سے کوئی بے معنی کھیل نہ تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اولین عہد کے انسان کی پروا نہ کرتا اور زمانہ بعد کے انسانوں کو قابل توجہ سمجھتا جبکہ اصولا" نووار و انسان کو حقیقتاً" زیادہ تنبیہ و ہدایت کی ضرورت تھی لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ عہد ما بعد کے تمام ترقی یافتہ مذاہب جن میں اسلام اور عیسویت کو زیادہ نمایاں درجہ حاصل ہے صرف اپنے ہی کو الہامی مذہب قرار دیتے ہیں اور قرون ماضیہ کو عہد تاریک اور جاہلیت زمانہ وحشت و بربریت کے ناموں سے یاد کر کے گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگ بالکل گمراہ تھے اور وہ کسی مذہب کے پابند نہ تھے پھر اس اعتراض کا جواب کہ خدا نے کیوں ایک طویل زمانہ تک انسان کو گمراہ رکھا اور کیوں نہ ان میں کوئی نبی یا پیغمبر بھیج کر صراط مستقیم سے آشنا کیا ہم پر عائد نہیں ہوتا ہے بلکہ ان پر جو اپنے آپ کو الہامی مذاہب کا پابند بتاتے ہیں۔

وہ حضرات جو اثریات سے دلچسپی رکھتے ہیں' انھیں معلوم ہو گا کہ انسان کے عہد حجری کی جو چیزیں (لاکھوں سال قبل کی) اس وقت تک زمین سے برآمد ہوئی ہیں وہ مشتمل ہیں صرف چند مخصوص آلات و اوزار پر ان کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی دستیاب نہیں ہوئی جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ خدایا مذہب کے وجود کا بھی قائل تھا۔ البتہ اب سے 20 ہزار سال قبل کی چیزوں میں ضرور ہاتھی دانت یا پتھر کے ایسے نقوش یا بت دریافت ہوئے ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے وہ مذہبی خیالات کے زیر اثر بنائے گئے ہوں اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کے وجود کے ساتھ مذہب کا وجود ظہور میں نہیں آیا اور اس لیے یہ دعوی کرنا کہ مذہب کا خیال بالکل فطری چیز ہے یا یہ کہ اس کا تعلق الہام خداوندی

سے ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

علوم جدیدہ کے مسائل میں مذہب کو سب سے زیادہ نقصان جس چیز نے پہنچایا ہے وہ مسئلہ ارتقاء ہے کیونکہ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ ہر چیز خواہ وہ مادہ سے متعلق ہو یا نفس سے ماحول کے زیر اثر تدریجاً آگے بڑھتی ہے اور پھر چونکہ مذہب کا خیال غذا یا لباس کی طرح فطری مجبوری کا نتیجہ نہ تھا اس لیے ظاہر ہے کہ اس کا وجود بھی اسباب' معیشت و ماحول کے زیر اثر ظہور میں آیا ہو گا اور ایک قوم پر جو زمانہ جس حال میں ہوا ہو گا اسی کے تحت اس کے مذہبی خیال میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی ہو گی قیام مذہب کی بنیاد' وجود خدا کے عقیدہ پر قائم ہے اور خدا کا تصور جس جس طرح مختلف اوقات میں انسان نے کیا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو انسان کا خالق کہنا شاید اتنا موزوں نہیں ہے' جتنا انسان کو خدا کا خالق کہنا۔

علم الانسان اور تاریخ مذہب کے ماہرین اس باب میں مختلف الخیال ہیں کہ خدا کا وجود ذہن انسانی میں سب سے پہلے کب اور کیونکر آیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کی ابتداء قوا فطرت اشیاء کے مطالعہ سے ہوئی ہے یعنی آسمان و زمین میں جو چیز یا جو قوت انسان کو مفید یا عجیب نظر آئی اسی کو وہ پوجنے لگا۔ چنانچہ درخت' پتھر' پہاڑ' ستارے' چاند' سورج وغیرہ مختلف مظاہر فطرت کو انسان نے خدا سمجھا' اور ان کی پرستش شروع کر دی۔ بعض کے نزدیک اس کا تعلق قبائل کے سرداروں اور اسلاف کی یاد سے ہے۔ یعنی قبائل کے جن لوگوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور آباو اجداد میں سے جو افراد مر گئے احتراماً" ان کو دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا کرنے لگے۔

قدیم روما و یونان میں بھی ایک جماعت مشککین و قائلین ارتقاء کی پائی جاتی تھی اور انھوں نے بھی قیاس آرائیوں سے کام لے کر عقیدہ خدا کے متعلق مختلف نظریئے قائم کیے تھے' چنانچہ انھیں میں سے ایک شاعر کہتا ہے کہ سب سے پہلے جس چیز نے زمین پر خدا کو پیدا کیا وہ انسان کا جذبہ خوف و ہراس تھا۔ بجلی کی کڑک طوفان کے شور' سمندروں کے تلاطم' آتش فشاں پہاڑوں کے خوفناک مناظر وغیرہ' یہ تمام وہ چیزیں تھیں جن سے ڈر کر انسان کو خیال پیدا ہوا کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور قوت بھی موجود ہے۔

ہربرٹ اسپنسر کا نظریہ یہ ہے کہ "انسان اول اول سمجھتا تھا کہ انسان کا سایہ یا ہمزاد اس کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے' اس لیے اگر کوئی سردار مر گیا ہے تو اس کا ہمزاد ضرور

باقی ہے اور یہیں سے دیوتا کا وجود اس کے ذہن میں آیا" الغرض خدا یا دیوتاؤں کا وجود خود انسان کا پیدا کیا ہوا ہے جس کو اس نے اپنے جغرافی و معاشرتی ماحول کے لحاظ سے مختلف شکلوں اور رنگوں میں پیش کیا چنانچہ اسپنسر کہتا ہے "اگر مثلث کا کوئی خدا ہوتا تو وہ اسے مثلثی شکل کا تصور کرتا" رہا یہ امر کہ خدا کے تصور میں خود انسان کا ذوق کس حد تک کارفرما ہے' سو مختلف قوموں کے دیوتاؤں اور بتوں کے دیکھنے سے اس کا حال بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔

حبشیوں کے دیوتا کا رنگ کالا ہوتا ہے اور ناک چپٹی۔ اہل تھریس کا دیوتا نیلگوں آنکھیں رکھتا ہے اور سرخ بال' اور ہو مروہیڈ کا خدا تمام وہ معائب رکھتا ہے جو خود اس عہد کے لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ مغرب میں زیادہ ارتقائی درجہ کا خدا دیکھنا ہو تو عہد عتیق کے خدا (JEHOVAH) کو دیکھیے جس نے دنیا کو چھ دن میں پیدا کیا اور پھر تھک کر آرام کرنے پر مجبور ہوا۔ آدمیوں ہی کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں ہیں اور انسان ہی کی طرح وہ جذبات سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اس نے آدم کے لیے جانوروں میں سے رفیق زندگی پیدا کیا۔ آدم و حوا کے لیے کھال کا لباس تیار کیا' برج بابل دیکھنے کے لیے وہ خود زمین پر اتر آیا۔ وہ ظالم وخونخوار ہے' رشک وحسد کرتا ہے۔ انسانی قربانیاں چاہتا ہے اور اپنے کیے پر پچھتاتا بھی ہے۔

الغرض خدا کا مفہوم ہمیشہ انسانی حالات کے تحت بدلتا رہا استبداد و ملوکیت کے دور میں اگر وہ ایک بادشاہ ہے تو عہد جمہوریت میں اس کی حیثیت ایک پریذیڈنٹ سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔ ترقی سائنس سے قبل وہ محیر العقول معجزے بھی دکھاتا تھا لیکن اب ترقی علوم کے زمانے میں وہ بالکل قانون فطرت کا پابند ہے۔

بعض اسے مہربان' محبت کرنے والے باپ کی طرح سمجھتے ہیں' بعض کے نزدیک وہ ایسا ظالم ہے کہ غیر بپتسمہ شدہ بچوں کو دوزخ میں ڈال دیتا ہے اور منکرین کو خواہ کتنے ہی اچھے اخلاق کے کیوں نہ ہوں ہمیشہ آتش جہنم کے عذاب میں مبتلا رکھے گا۔ پھر اس "خدا تراشی" کے ساتھ ہی جب ہم اس کے نتائج کو دیکھتے ہیں تو اور زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ انسانیت کیونکر اتنے عرصہ تک اسے برداشت کر سکی بے زبان جانوروں کی قربانیوں کے علاوہ انسانی بچوں اور عورتوں کا ذبح کیا جانا' سحر و جادو کے الزام میں ہزاروں ضعیف عورتوں کو آگ میں ڈال دینا منکرین کو بے دردی سے تہ تیغ کر دینا' یہ تمام وہ مظالم تھے جو مذہب کے پردے

میں روا رکھے گئے کیونکہ جن لوگوں نے خدا کے تصور کو دنیا کے سامنے پیش کیا ان کے دل یکسر نفرت و تعصب سے لبریز تھے اور خدا کا مفہوم ہی وہ اس طرح پیش کرتے تھے کہ انھیں اپنے جذبات کی تسکین کا موقع ملے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیوتاؤں کا وجود خود انسان کے احساس و ضروریات کی ایک مجسم صورت تھی' اور یہ کہنا بالکل درست ہو گا کہ خدا گویا ایک "مہیب سایہ" تھا خود انسان کے خیالات کا۔

اب اسی کے ساتھ اس کے ترقی یافتہ زمانہ کو دیکھیے کہ خدا کا مفہوم متعین کرنے کے لیے کس قدر عجیب و غریب ذہانت و انشا سے کام لیا گیا ہے۔

ایک فلاسفر کہتا ہے کہ خدا "عدیم التاثر قادر مطلق Absolute Passionless ہے۔

ایمرسن اسے کائنات کی روح و برتر و اعلیٰ Oversoul Of The Universe کہتا ہے۔

ہربرٹ اسپنسر اسے "ازلی و ابدی قوت Infinite and Eternal Energy سے تعبیر کرتا ہے۔ ولیم جیمس اسے Divine Force کے الفاظ سے سمجھنا چاہتا ہے۔ برگستان اسے "محرک جوہری" Vital Impulse کے الفاظ سے ظاہر کرتا ہے برنارڈ شا نے اسے قوت حیات Life Force کہا ہے۔ پروفیسر کرسٹاپ اسے ایک "غیر مادی حقیقت" Reality Immaterial in The World سمجھتا ہے۔ ہورلیس برجزاہ اسے "کائنات کا خیر کل" Totality Of Good بتاتا ہے بعض اسے فضائے کونی کی روح سے تعبیر کرتے ہیں بعض اسے دنیا کا انکل سام (Uncle Sam) یعنی امریکہ اور بعض اسی "روحانی ایتھر" سمجھتے ہیں جو وسعت زماں کو معمور کیے ہوئے ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان تمام تعبیرات کا واقعی کوئی مفہوم ہے' کیا کوئی شخص ان تعبیرات سے خدا کے مفہوم کو متعین کر سکتا ہے' کیا انکو پڑھنے کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس نے خدا کی حقیقت کو سمجھ لیا؟

اس سے قبل جب انسان جاہل تھا اور اس کا ذہن زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا اس نے خدا کو مادی و مرئی چیزوں کی صورت میں پیش کیا جو ہر چند قابل قبول نہ تھا لیکن قابل تصور و قیاس تو تھا' مگر اب اس دور علم و ترقی میں تو خدا کو اس قدر مبہم بنا دیا گیا ہے کہ سوائے ذہنی مالیخولیا کے ہم کسی اور چیز سے تعبیر کر ہی نہیں سکتے چنانچہ جو بیانات ابھی پیش کیے گئے ہیں' آپ ان کے سمجھنے کے لیے پوری قوت صرف کر دیجیے' لیکن آپ کسی متعین مفہوم تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ صرف الفاظ و تراکیب ہیں جو مفہوم سے بالکل بیگانہ ہیں

اور ان پر غور کرنا سوائے لایعنی ذہنی کشمکش کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ الغرض خدا صرف ذہن انسانی کی پیداوار ہے اور اختلاف ذہن کے ساتھ اس کا مفہوم بھی ہمیشہ بدلا ہے۔ جب انسان کی نگاہ مادی چیزوں سے ہٹ کر کسی اور طرف نہیں جا سکتی تھی تو اس نے درختوں' جانوروں' پہاڑوں' دریاؤں اور انسانی بتوں کی صورت میں خدا کو سمجھنا چاہا اور اب کہ عقول انسانی نے ترقی کر کے خالص کیفیات کی تحلیل شروع کر دی ہے خدا نام ہے صرف ان لغو مہمل تاویلات کا جو دماغ کو اور زیادہ تشویش میں مبتلا کر دینے والی ہیں۔

مذہب یا خدا کے وجود کا خیال الہامی چیز ہے' اس کی تردید خود الہامی مذاہب کے بیانات سے ہوتی ہے کیونکہ وہ عہد وحشت کے لوگوں کو گمراہ سمجھتے ہیں اور ان کی بت پرستی کو خلاف منشاء خداوندی قرار دیتے ہیں۔ اب رہ گیا یہ امر کہ وہ کوئی فطری چیز ہے اور انسان نے پیدا ہوتے ہی سمجھ لیا تھا کہ خدا کا وجود ضروری ہے' سو میرے نزدیک اصل مذاہب کا ثبوت بھی پیش نہیں کر سکتے۔

اس مسئلہ کی چھان بین کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ خود وحشی اقوام کی گذشتہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ وحشی اقوام کے زمانہ کو ہم زمانہ قبل تاریخ سے موسوم کرتے ہیں اور اس لیے ہمارے پاس کوئی ذریعہ ان کے ابتدائی حالات معلوم کرنے کا نہیں ہے لیکن چونکہ دنیا اس وقت بھی ان قوموں سے خالی نہیں ہے اس لیے ان کی موجودہ حالت سے ان کے گذشتہ حالات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

اس وقت انتہائی پست درجہ کی قومیں ٹراؤل گگو' برازیل' لنکا' جزائر' فلپائن' جزیرہ نمائے ملایا اور جنوبی افریقہ میں پائی جاتی ہیں' ان کی پستی کا یہ عالم ہے کہ ان میں قبائلی زندگی کا بھی کوئی نظام نہیں پایا جاتا اور دماغی پستی اس حد تک پائی جاتی ہے کہ ایک سے زیادہ گنتی بھی انھیں نہیں آتی اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ آگ کیونکر پیدا کی جاتی ہے۔

ٹراؤل گگو کی وحشی قوم یکان کے متعلق کامل دو سال تک فرانسیسی علماء نے تحقیق کر کے جو رپورٹ شائع کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ خدا کے وجود کے قائل ہیں۔ نہ ان کے نزدیک خیر و شر کا کوئی مفہوم ہے۔ امید و خوف کا بھی کوئی جذبہ ان کے اندر نہیں پایا جاتا اور موت کے بعد وہ کسی اور عالم کے قائل نہیں ہیں۔

وسط برازیل کی وحشی اقوام کے عقائد میں بھی کوئی مذہبی جھلک نظر نہیں آتی سوا اس کے کہ وہ سورج کو اچھا سمجھتے ہیں اور چاند کو برا جس کا سبب غالباً" صرف یہ ہو سکتا ہے کہ

چاند کا تعلق رات سے ہے جب درندے جنگل سے باہر نکل آتے ہیں اور سورج کا دن سے جب درندوں کا خوف نہیں رہتا۔ یہ کسی کی پوجا نہیں کرتے اور نہ ان کا کوئی بت ہے' لنکا کی قدیم وحشی جماعتوں میں بھی کسی مذہبی پرستش کا وجود نہیں پایا جاتا اور ان کی زندگی کے کسی شعبہ سے اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ خدا یا دیوتا کے قائل ہیں۔

تسمانیا کے صحرائی قبائل کے متعلق ڈاکٹر نکسن لکھتا ہے کہ ان میں کسی مذہبی رسوم کا پتہ نہیں چلتا اور یہ اپنے خیالات کے لحاظ سے بھی اتنے پست ہیں کہ ان کی زبان زیادہ تر اشارات پر مشتمل ہے' چنانچہ رات کے وقت تو یہ آپس میں باتیں کر ہی نہیں سکتے۔

جزائر انڈمان کے وحشی قبائل ہرچند دوسری قوموں سے بہت کچھ متاثر ہو چکے ہیں تاہم مذہب یا عقیدہ خدا کا وجود ان کے ہاں بھی نہیں پایا جاتا جزائر فلپائن میں جن سیاحوں کے جانے کا اتفاق ہوا ہے ان کو معلوم ہے کہ وہاں کے قدیم باشندے بھی کوئی مذہب نہیں رکھتے۔ الغرض تمام وحشی قومیں جو دوسری قوموں کی تہذیب سے متاثر نہیں ہوئی ہیں اب بھی خدایا مذہب کی قائل نہیں ہیں۔ اور اگر کسی قوم میں یہ خیال پیدا ہوا ہے تو وہ صرف دوسری قوموں سے ملنے جلنے کے بعد' اس لیے یہ کہنا کہ مذہب کا خیال انسانی فطرت میں داخل ہے کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا اب رہا یہ امر کہ ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ کس کس رنگ میں یہ عقیدہ ظاہر ہوا ہے سو اس بحث میں ہم کو ہر ملک و قوم کے جغرافیائی ماحول کو پیش نظر رکھنا ضرور ہو گا اور بنابراں یہ بحث کسی الہامی حقیقت سے متعلق نہ ہو گی بلکہ ماحول و اسباب ظاہری کی تاریخ سے تعلق رکھے گی اور اس صورت میں مذہبی مسئلہ کوئی خدائی مسئلہ نہیں رہ جاتا بلکہ صرف ترقی تمدن کی تاریخ کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔

چونکہ خدا اور مذہب صرف عقل انسانی کی پیداوار ہے اور عقل انسانی مختلف حالات کے تحت ہمیشہ مختلف رہی ہے اس لیے اگر آج عقائد مذہبی میں تمام افراد نوع انسانی ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ البتہ اگر دنیا یہ سمجھ لے کہ مذہب کا وجود انسانی زندگی کے لیے ضروری نہیں ہے اور ہم خدا کے ماننے بغیر بھی اچھی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو بے شک یہ ایک ایسے نقطہ کی طرف قدم بڑھانا ہو گا جو عقائد مذہبی کے تمام لغو اختلافات کو دور کر کے مذہبی رنگ اختیار کر سکتا ہے۔

○ ○ ○

مولوی و مولویت

جب کسی قوم کی اخلاقی حالت پست ہو جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ دور انحطاط سے گزر رہی ہے۔ جب اس کے اخلاق بلند ہوتے ہیں تو ہم حکم لگاتے ہیں کہ وہ عروج پر ہے اور ہماری تنقید زیادہ سے زیادہ اسی حد تک پہنچ کر رہ جاتی ہے' درآنحالیکہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کی پستی و بلندی کا تعلق کس چیز سے ہے یا بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ ہمارے عروج و زوال کا ذمہ دار کون ہے؟

قوم نہ نام کسی ایک فرد کا ہے نہ بہت سے افراد کا' بلکہ اس جماعت کا جو کسی ایک قانون' ایک ضابطہ زندگی کی پابند ہو' اور جس کے تمام افراد کسی ایک غرض مشترک سے وابستہ ہوں' اسی پابندی کا نام ہیئت اجتماعی ہے اور یہی ہم آہنگی دیگر گی سوسائٹی یا سماج کی جان ہے۔

دنیا میں جتنے مذاہب رونما ہوئے ان سب کی غایت سوسائٹی کی اصلاح تھی تاکہ اس کے افراد ایک شیرازہ سے بندھے رہیں اور ان میں انتشار پیدا ہو کر مقاومت کی قوت فنا نہ ہو جائے۔

یہاں اس بحث کی ضرورت نہیں کہ مذہب کوئی الہامی چیز ہے یا خود انسان کے دماغ کی پیداوار' اگر وہ خدا کا بنایا ہوا دستور ہے تو اور اگر ذہن انسانی کی اختراع' تو بھی۔ بہرحال اسے زمانہ کے حالات اور تمدن کی تدریجی ترقی کے لحاظ سے مرتب ہونا چاہیے تھا اور ہوا صنم پرستی سے لے کر صمد پرستی تک جتنے دور مذہب پر گزرے ہیں ان سے اس تدریجی اقتضاء کا حال پوری طرح واضح ہو سکتا ہے۔

ہرچند جس زمانے میں جو مذہب ہوا ہے اس نے بغیر کسی "اندیشہ فردا" کے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا کہ وہ ایک مکمل چیز ہے اور اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں لیکن زمانے نے ہمیشہ اس دعوے کو باطل کر کے دکھا دیا کہ دنیا کا کوئی قانون' کوئی شریعت' کوئی مذہب' مستقبل کے حالات پر حاوی نہیں ہو سکتا اور انسان مجبور ہے کہ "حال" کے لحاظ سے اپنے اصول زندگی میں تبدیلی کرتا رہے۔

اس سے شاید انکار ممکن نہ ہو کہ سب سے آخر میں مذہب اسلام کا ظہور ہوا اور گذشتہ ساڑھے تیرہ سو سال کے اندر کوئی تحریک اتنی قوی اور ایسی منظم رونما نہیں ہوئی جسے ہم مذہب کے لفظ سے موسوم کر سکیں' ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب صرف یہ ہو کہ اس دوران میں مذہب انسانی نے اتنی ترقی کر لی ہو کہ وہ مذہب کے وجود کو ضروری نہ سمجھتی ہو' لیکن مسلمانوں کا یہ دعوی بھی بالکل لغو و مہمل قرار نہیں دیا جا سکتا کہ ان کا مذہب اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اتنی مکمل چیز ہے کہ وہ ہر زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے اور اس میں اتنی اہلیت موجود ہے کہ اگر دنیا چاہے تو اسے ایک عالمگیر سماجی قانون کی حیثیت سے اختیار کر سکتی ہے۔ یہ ہوئی وہ بات جس کا یقین دوسرے کو صرف اسی وقت آسکتا ہے جب خود براہ راست تعلیم اسلام کا مطالعہ کرے اور مذہبی لٹریچر کے اس حشو وزواید کو نظر انداز کر دے جس نے اسلام کے چہرے کو تو برتو نقابات کے اندر چھپا رکھا ہے لیکن یوں بھی ہر شخص تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد معلوم کر سکتا ہے کہ جتنی جلد اور جس قدر وسعت اسلام نے حاصل کی اتنی کسی اور مذہب کو اتنے تھوڑے زمانے میں نصیب نہ ہوئی۔ پھر اجتماعی ترقی کے تمام نفسیاتی رموز و غوامض کو جانے دیجیے یوں بھی اس بات کے تسلیم کرنے میں کسی حجت و برہان کی ضرورت نہیں کہ کسی قوم کا یہ استعلاء و استیلا' بغیر معمولی جوش عمل اور ہم آہنگی کے ناممکن ہے۔

میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو صحیح اسلام کی عمر 33ھ پر ختم سمجھتے ہیں اور بنو امیہ و بنو عباس کے دور ملوکیت کو مذہبی ترقی سے علیحدہ کوئی اور چیز قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر فتوحات ملکی محض اس لیے کہ ان کا تعلق دنیا سے ہے خلاف مذہب قرار دی جائیں تو خود رسول اللہ اور خلفاء کے زمانہ کی فتوحات کی نسبت کیا کہا جائے گا۔ الغرض میرے نزدیک حکومت و ملک گیری قطعاً" روح اسلام کے منافی نہ تھی لیکن رسول اللہ کی رحلت کے بعد ہی ایک اور چیز ضرور نئی پیدا ہوئی جو یقیناً" بہت خراب تھی۔ اتنی خراب کہ آخر کار اس نے اسلام اور اہل اسلام کو تباہ کر کے رکھ دیا وہ چیز کیا تھی؟ مولویت۔

"مولویت" نام جزئیات مذہب سے آگاہی کا نہیں ہے اور نہ اس کا تعلق مہارت علم و فنون سے ہے بلکہ وہ عبارت ہے اس مخصوص ذہنیت سے جو سوا اپنے تمام دنیا پر عقل و فہم کا دروازہ بند کر دیتی ہے اور لوگوں کے ذہن و فراست پر قفل ڈال کر مذہبیت کے بہانہ سے اپنے بدترین اغراض نفسانی پورا کرنے میں تامل نہیں کرتی۔ یہ ایک عظیم بلا ہے جس نے

ابتداء عہد اسلام سے لے کر کرتا ایندم بے شمار ہلاکتیں دنیا میں پھیلائیں جن میں سب سے بڑی ہلاکت اجتماع قومی کے شیرازہ کو منتشر کرنا' بھائی بھائی کو لڑانا اور گوشت ناخن سے جدا کرنا ہے۔ چنانچہ حنبلی' مالکی' شافعی' حنفی مسالک کی تفریق' اشاعرہ و معتزلہ کی تقسیم' اہل قرآن و اہل حدیث کا باہمی اختلاف' شیعہ سنی کی جنگ اور اسی طرح کے اور بہت سے فتنے اسی "مولویت" کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ اور کتنا زہر اسے پھیلانا ہے۔

اسلام کی وہ خصوصیت جو یقیناً" دنیا میں کسی اور مذہب کو حاصل نہیں ہے۔ اور جس کا اعتراف ہر صاحب فکر نے کیا ہے' صرف یہ ہے کہ وہ کوئی خیالی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد صرف فلسفہ کی ہفوات پر قائم ہو بلکہ وہ یکسر حرکت و عمل ہے اور اس قدر سادہ و آسان کہ مسلمان ہونے کے معنی ہی صرف ایک صلح جو متمدن انسان ہونے کے ہیں' لیکن "خانہ مولویت خراب" اس نے اسلام کی جو راہ متعین کر رکھی ہے وہ اس قدر دشوار گزرا ہے کہ ایک ذی عقل و ہوش انسان دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن مسلمان کبھی نہیں بن سکتا کیونکہ ان "مفتیان شرع متین" کی مرضی کے مطابق کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ پہلے عقل و فراست کو خیرباد نہ کہہ دے۔ اور ظاہر ہے کہ اتنی بڑی قربانی کے لیے ہر شخص کیونکر تیار ہو سکتا ہے۔

اس جماعت کا سب سے بڑا حربہ "حربہ تکفیر" ہے جو اس سے قبل (اس لیے کہ لوگ زیادہ جاہل تھے) واقعی کوئی اہمیت رکھتا بھی تھا لیکن اب اس کی حیثیت بالکل ایسی ہی رہ گئی ہے جیسے آپ کسی متمرد گداگر کے سوال کو پورا نہ کریں اور وہ الٹ کر گالی دے بیٹھے۔ حال ہی میں ایک نہایت دلچسپ منظر تکفیر بعض علمائے دیو بند کی طرف سے پیش کیا گیا ہے جس کو دیکھ کر ممکن ہے بعض لوگوں کو افسوس ہوا ہو لیکن مجھے بہت مسرت ہوئی' کیونکہ "دیو بند" کی قبر اس سے زیادہ گہری کھودی جانی ممکن نہ تھی۔

سرائے میر (اعظم گڈھ) میں تقریباً" ربع صدی سے مدرسۃ الاصلاح کے نام سے ایک مدرسہ قائم ہے جس کا مقصد زیادہ تر "علوم قرآنیہ" کی تعلیم اور انھیں کی تحقیق و تفتیش ہے اس کے بانی مولانا حمید الدین اور روح رواں مولانا شبلی تھے۔ چونکہ اس کے کارکن نیک نیت ہیں اس لیے اس نے کافی ترقی حاصل کر لی یہیں سرائے میر میں مولویوں کی ایک دوسری جماعت کو اس مدرسہ سے بوئے نان و استخواں آئی اور انھوں نے جواب میں دوسرا

مدرسہ قائم کر کے یہ روٹی کا ٹکڑا چھین لینا چاہا حالانکہ مدرسہ الاصلاح کے کارکن اور مدرس جن حالات کے تحت اس درس گاہ کو چلا رہے ہیں وہ فاقہ کشی اور دشت پیمائی سے کم نہیں ہے لیکن فریق ثانی کی "ریزہ چیں" فطرت اس حقیقت کو کیوں سمجھنے لگی تھی اس نے فوراً محاذ جنگ قائم کر دیا اور آخر کار وہی ایک حربہ تکفیر جس سے غریب مولوی ہمیشہ کام لیا کرتا ہے اس جنگ میں بھی استعمال کیا گیا۔

اسباب تکفیر یہ بتائے گئے کہ اس مدرسہ میں مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کے خیالات کی اشاعت ہوتی ہے جو کافر تھے۔ مولانا شبلی اس لیے کہ وہ "کلام اور علم الکلام" کے مصنف تھے اور مولانا حمید الدین اس لیے کہ وہ قرآن پاک کی شرح و تفسیر میں اکابر سلف کی تقلید سے کہیں کہیں ہٹ جاتے ہیں۔

استفتاء شائع کیا جاتا ہے اور اس پر چالیس سے زیادہ علمائے کرام فتوے دیتے ہیں کہ شبلی و حمیدالدین کافر تھے اور وہ لوگ بھی کافر ہیں جو ان کے خیالات کی اشاعت کرتے ہیں ان فتوی دینے والوں میں مولوی اشرف علی صاحب ایسے جید عالم سے لے کر محمد علاء الدین ایسے معمولی مولوی تک شامل ہیں'

ٹھیک اسی زمانہ میں جب سرائے میر کے اندر یہ ہنگامہ دارو گیر برپا تھا مولوی حسین احمد صاحب دیو بند سے سرائے میر آئے اور وہ بھی اس فتوے کو دیکھ کر مدرستہ الاصلاح کے کارکنوں کی طرف سے بدظن ہو گئے لیکن جب ان کے سوالات کے جواب میں مدرستہ والوں نے سب کچھ وہی لکھ دیا جو مولوی حسین احمد صاحب سننا پسند کرتے تھے' تو انھوں نے پھر ان کے مسلمان ہونے پر مہر توثیق ثبت کر دی لیکن مولانا شبلی اور مولانا حمیدالدین کی طرف سے اب تک ان مولویوں کے دل صاف نہیں ہوئے اور ہونا بھی نہیں چاہیے کیونکہ یہ دونوں بزرگ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنی قوت ایمان دکھانے کے لیے اس سے بہتر موقعہ انھیں اور کیا مل سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی پر جو الزامات الحاد وزندقہ کے لگائے گئے ہیں وہ یکسر بے بنیاد ہیں کیونکہ علم الکلام کی جن عبارتوں کو مورد کفر قرار دیا جاتا ہے ان کا تعلق خود مولانا شبلی کے اعتقادات سے نہیں ہے بلکہ ان متکلمین کے عقائد سے ہے جن کا ذکر خود مولانا شبلی نے کیا ہے لیکن مخالف جماعت نے حددرجہ دسیسہ کاری و تلبیس سے کام لے کر ان کو مولانا شبلی سے منسوب کر دیا اسی طرح مولانا حمیدالدین مرحوم کے جو نوٹ متعلق بہ تفسیر

رسالہ اصلاح میں شائع ہوئے تھے وہ بھی ناکمل و نا تمام ہیں اور ان کی بنیاد پر ان کے عقائد سے بحث کرنا کسی طرح مناسب نہ تھا لیکن اگر اس رواوارانہ نقطہ نظر کا خیال نہ رکھا جائے تو بھی مولانا حمیدالدین کا صرف اتنا قصور ہے کہ تقسیم سور کو رکوعوں کے نام اور پاروں کی تفریق میں وہ اسلاف کی رائے سے کچھ ہٹے ہوئے ہیں اور اگر کلام پاک کے سمجھنے میں کسی کو رائے کی اتنی آزادی بھی حاصل نہیں ہے تو پھر اسلام خدا اور رسول کا تو نہ ہوا بلکہ صرف مولف شرح مقاصد کا ہوا' شارح فقہ اکبر کا ہوا' ابن حجر اور صاحب منبراس کا ہوا' ابن حزم اور سیوطی کا ہوا جن کے استدلات پر مولانا شبلی اور مولانا حمیدالدین کو کافر قرار دیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سرائے میر میں جو کچھ ہوا ہے اس کو مذہبیت اور للہیت سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا' بلکہ اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ لوگ مدرستہ الاصلاح کی طرف سے بدظن ہو کر اس کی امداد ترک کر دیں اور دوسرے مدرسہ کے مولویوں کی جھولیاں بھریں' یہ ہے ہمارے علمائے کرام کی ذہنیت اور یہ ہیں وہ ذلیل تدابیر جن سے وہ اپنا پیٹ پالنا چاہتے ہیں۔

○ ○ ○

ملاحدہ دور حاضر کے نقطہ نظر سے
(1) مذہب کی حقیقت

علم و مذہب کی جنگ کوئی چیز نہیں کیونکہ مذہب کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اسے بغیر چوں چرا تسلیم کر لینا چاہیے۔ اور اہل علم کی حجت یہ ہے کہ جب تک کوئی بات سمجھ میں نہ آجائے اس پر یقین لانا ممکن نہیں۔ اہل مذاہب اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ عقل انسانی بہت ناقص ہے اور اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی کامل شے کا تصور کر سکے۔ فریق ثانی ہوتا ہے کہ جس چیز کو تم "شے کامل" سے تعبیر کرتے ہو اسی کا ثبوت تمہارے پاس کیا ہے کہ ہماری عقل ناقص کو اس کے سمجھنے سے باز رکھتے ہو الغرض اہل علم و مذاہب کی یہ نزاع بہت قدیم چیز ہے اور باختلاف نوعیت اب بھی اسی طرح بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ نظر آتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے حکومت و مذہب دونوں ایک چیز تھے اور اس لیے اہل مذہب بزور شمشیر اپنے مخالفین کو خاموش کر سکتے تھے اب ایسا نہیں کر سکتے اور معاندین مذہب کی جماعت بڑھتی جا رہی ہے۔ یورپ اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ میں جہاں خدائے قادر مطلق کے بجائے (ALMIGHTY DOLLAR) کی پرستش کی جاتی ہے الحاد نہایت تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور اہل کلیسا حیران ہیں کہ "آسمانی بادشاہت" کے وجود کو کیونکر قائم رکھ سکیں۔

ہندوستان میں بھی یہ رو کافی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور یہاں کے حلقہ ہائے مسجد و خانقاہ میں بھی ان کی کفر سامانیوں کو نہایت تشویش کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ لیکن اس وقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس طوفان سے بچنے کی صورت کیا ہے۔

اہل مذاہب کی طرف سے جو تدبیر دفاع اختیار کی جاتی ہے وہ زیادہ تر اس لیے بے اثر رہتی ہے کہ انھیں یہی معلوم نہیں کہ ملاحدہ کہتے کیا ہیں اور وہ کن دلائل کی بناء پر خدا اور مذہب سے انکار کرتے ہیں امریکہ وغیرہ میں تو اہل مذہب ان کے لٹریچر کو شاید کبھی پڑھ لیتے ہوں لیکن ہندوستان میں تو اس کا دیکھنا ہی گناہ سمجھا جاتا ہے اور اس لیے یہاں کے اہل مذہب قطعاً" ناواقف ہیں کہ اس زمانہ کا الحاد کس قسم کا الحاد ہے اور اس کے مقابلے کے لیے

کن نئی تیاریوں کی ضرورت ہے؟

مسلمانوں میں اس وقت صرف دو چار رسائل ایسے ہیں جنھوں نے اپنا مقصود الحاد کی مخالفت اور اسلام کی حمایت قرار دے رکھا ہے لیکن حقیقتاً" ان میں کوئی ایک رسالہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس بیسویں صدی کے منکرین خدا کو خاموش کر سکے اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ جو راہ انھوں نے خدمت اسلام کی اختیار کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ بالکل غلط ہے بلکہ اور زیادہ دہریت پھیلانے والی ہے کیونکہ اگر ہم کسی کی بات نہ سنیں اور اپنی ہی کہے جائیں تو ظاہر ہے کہ ہم کو بہرا ہی سمجھا جائے گا۔ پھر چونکہ پیروان اسلام اپنے مذہب کو سب سے زیادہ مکمل اور عین فطرت کی مطابق کہتے ہیں اس لیے ان کی طرف سے جب اس نوع کی جاہلانہ کوششیں دیکھتا ہوں تو مجھے سخت حیرت ہوتی ہے۔

علماء اہل اسلام کی طرف سے ایک عام طریقہ جواب کا یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ مذہب کے خلاف جو اعتراض کیے جا رہے ہیں۔ وہ نئے نہیں ہیں بلکہ بہت پرانے ہیں اور ان کا جواب دیا جا چکا ہے۔ اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ ان پرانے اعتراضات کا کبھی رد کا گیا ہے یا نہیں اور اگر اسے مان بھی لیں تو انھوں نے یہ کیونکر جان لیا کہ موجودہ ذہنی انقلاب وہی ہے جو اس سے پہلے پایا جاتا تھا اور اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔

اگر اہل مذاہب واقعی الحاد کا سدباب کرنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض یہ ہے کہ پہلے ملحدین کے بیانات کو سنیں' بغیر کسی جذبہ غیظ و انتقام کے ٹھنڈے دل سے سنیں اور پھر غور کریں کہ ان کے دلائل کا کوئی مسکت جواب ان سے ممکن ہے' یا نہیں صرف گالیاں یا بددعائیں دینے سے کام نہیں چلتا چنانچہ میں ایک لامذہب (ملحد) کے پانچ مقالے سلسلہ وار پیش کر رہا ہوں تاکہ اہل مذہب کو معلوم ہو جائے کہ دنیا میں الحاد پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں اور پھر اگر ممکن ہو تو اس کا علاج سوچا جائے۔

مذہب کیا ہے؟

"خدا ہی نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں اور وہی ان کا مدبر ہے اس لیے مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کی مطیع رہے' یعنی اگر اس کی طرف سے کوئی حکم نافذ کیا جائے تو اس کی تعمیل کرنا ہر شخص پر لازم ہے"

یہ ہے اصل مفہوم مذہب کا جو صدیوں سے رائج چلا آتا ہے اور تمام قوموں نے اسی

اعتقاد کے تحت یقین کر لیا کہ خدا ہم سے قربانیاں چاہتا ہے چنانچہ اول اول لوگوں نے اپنی اولاد تک کو بھینٹ چڑھانے سے عذر نہ کیا اور پھر صرف بیل' بھیڑ' بکری کے خون سے خدا کو راضی رکھنے کی کوشش کی گئی کیونکہ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو خدا ان کی فصلیں خراب کر دیتا پانی برسانا بند کر دیتا' بیماریاں پھیلاتا' زلزلے لاتا اور قحط و وبا کی مصیبت میں مبتلا کر دیتا' اس اعتقاد قربانی کی آخری جھلک عیسوی مذہب میں بھی پائی جاتی ہے' اور اسلام میں بھی' وہاں خدا اپنے بیٹے کی قربانی قبول کر کے ہمیشہ کے لیے چین سے بیٹھ گیا۔اور یہاں ابراہیم خلیل اللہ کے تہیہ قربانی سے خوش ہو کر آئندہ کے لیے صرف جانوروں کی قربانی پر راضی ہو گیا!

اہل مذاہب کا یہ اعتقاد بھی بہت قدیم ہے کہ خدا ہماری التجائیں سنتا اور ان کو پورا کرتا ہے' اس لیے ان اعتقادات کے پیش نظر قدرتاً" چند سوال پیدا ہوئے ہیں جو اصل بنیاد ہیں لامذہبیت کی' اور چونکہ اس وقت تک اہل مذہب کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکے ہیں اس لیے ملحدین خود ہی اس سے ایک نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں اور اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

شبہات ملاحظہ ہوں:

کیا مذہب کی بنیاد کسی حقیقت معلومہ پر قائم ہے؟

کیا واقعی کوئی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جسے خدا کہتے ہیں؟

کیا واقعی خدا سب کا خالق ہے؟

کیا واقعی اس نے کبھی ہماری دعاؤں کو سنا ہے؟

کیا واقعی قربانیوں سے خوش ہو کر اس نے کسی قوم کے ساتھ کوئی خاص رعایت روا رکھی ہے؟

(1) اگر واقعی اسی نے انسان پیدا کیا ہے تو کیوں ایسے افراد اس نے پیدا کیے جو مسخ و قبیح ہیں' مفلوج و تشنج ہیں اور ذہنی حیثیت سے حد درجہ پست؟

مجرموں' دیوانوں اور بے عقل لوگوں کو پیدا کرنے میں اس کی کیا مصلحت تھی' کیا کوئی ایسی قوت کی طرف سے جسے فراست کل اور قوت مطلق کہتے ہیں۔ ان خائص تخلیق کی کوئی معقول توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے؟

(2) اگر خدا تمام امور کا مدبر و منظم ہے تو کیا وہ ان بادشاہوں کے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے جنھوں نے دنیا میں سوا ظلم کے اور کچھ نہیں کیا؟ وہ ان تمام لڑائیوں کا ذمہ دار

نہیں ہے جن میں لاکھوں بے گناہوں کا خون بہایا جاتا ہے؟

کیا وہ دور غلامی اس کی مرضی کے موافق نہ تھا جب صدیوں تک ہزاروں بے گناہ انسانوں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان بنی رہی اور بے شمار ماؤں کے مضطرب سینوں سے ان کے بلکتے ہوئے بچے جدا جدا کر کے قتل و ذبح کر دیے گئے؟

کیا وہ ان مذہبی تعذیبات کا ذمہ دار نہیں جو بے گناہ انسانوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دینے اور شکنجے میں تان تان کر ایک ایک جوڑ علیحدہ کر دینے پر مشتمل تھے؟

خدا نے کیوں ظالموں اور بدکرداروں کو مہلت دی کہ وہ بہادروں اور نیک کرداروں کو پامال کریں؟

خدا نے کیوں کافروں کو اس کا موقع دیا کہ اس کے خاص بندوں کو عذاب میں مبتلا کریں۔ اگر ایک رحم و کرم والا خدا واقعی کائنات کا مدبر ہے تو یہ آئے دن کے طوفان، زلزلوں، وباؤں اور خشک سالیوں کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ سل ودق سرطان وخناق اور اسی طرح کی سینکڑوں بیماریاں پیدا کرنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے، جس سے نہ معصوم بچے جانبر ہو سکتے ہیں نہ زاہد و مرتاض انسان؟

درندوں کا انسانوں کو پھاڑ کر کھاتے رہنا، زہریلے سانپوں کا لوگوں کو ڈستے رہنا اور خدا کا کچھ نہ کہنا عجیب معمہ ہے۔

کیا اس نے ناخن و چنگل اسی لیے پیدا کیے کہ وہ گوشت کے ریشے جدا کرتے رہیں، کیا اس نے پرو بال اسی لیے بنائے ہیں کہ معذور و بیکس آسانی سے گرفت میں آسکیں، کیا اس نے جراثیم اسی لیے پیدا کئے ہیں کہ وہ انسانوں کو اندھا کوڑھی، مسلول و مدقوق بنا کر اپنی بھوک مٹائیں؟

کیا کائنات کی تنظیم اسی طرح ممکن تھی کہ ایک جاندار کی زندگی دوسرے جاندار کے گوشت و خون پر منحصر ہو اور کیا تدبیر عالم آہ اور کراہ کا ہنگامہ پیدا کیے بغیر محال تھی؟ پھر ان واقعات و حالات پر غور کرو اور سمجھو کہ مذہب کیا ہے؟

دراصل وہ نام ہے صرف ایک بے بنیاد خوف کا جو خود ہی ایک قربانگاہ بناتا ہے اور خود ہی اس پر قربانیاں چڑھاتا ہے خود ہی ایک معبد تیار کرتا ہے اور خود ہی وہاں جھک جاتا ہے۔

مذہب ہمیں وہی باتیں سکھاتا ہے جو صرف غلام ہی کے لیے موزوں ہیں، یعنی اطاعت، فرمانبرداری، نفس کشی، صبر و تحمل، عدم مقاومت اور اپنے آپ کو مٹا دینا۔

خود مختاری' سرفرازی' خود اعتمادی' جرات و اقدام کا وہاں کوسوں پتہ نہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ خدا مالک ہے اور انسان اس کا غلام' لیکن مالک چاہے کتنا ہی بڑا ہو غلام' کو خوش گوار نہیں بنا سکتا۔

اگر خدا کا وجود ہے تو ہم کیونکر جان سکتے ہیں کہ وہ رحم و کرم والا بھی ہے' وہ دیکھتا ہے کہ لاکھوں کروڑوں غریب و جفاکش انسان ہل چلا رہے ہیں۔ کھیتیاں بو رہے ہیں اور ان کی زندگی کا انحصار صرف اسی محنت پر ہے لیکن وہ پانی نہیں برساتا کھیتیاں مرجھا رہی ہیں لیکن پانی کا ایک قطرہ نہیں گراتا' کروڑوں انسان اپنی مایوس و منتظر آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن سوا جھلسا دینے والے آفتاب کے بادل کا ایک ٹکڑا بھی انھیں کسی جگہ نظر نہیں آتا۔ خدا ان کے دل کے اضطراب کو دیکھتا ہے اور رحم نہیں کھاتا' ان کی اشک آلود آنکھوں کو دیکھتا ہے اور خاموش ہے' بچے ماؤں کی خشک چھاتیوں سے لگے ہوئے بلک رہے ہیں اور دودھ نہیں پاتے مائیں آنچل پھیلا پھیلا کر اپنے بھوکے بچوں کا واسطہ دے دے کر دعائیں مانگ رہی ہیں لیکن کوئی سننے والا نہیں۔ پھر کیا خدا کا رحم و کرم ثابت کرنے کے لیے بادسموم کے ان جھونکوں کو پیش کیا جائے گا۔ جو بستیوں کی بستیاں تباہ کر جاتے ہیں' اور میدانوں کو لاشوں سے بھر دیتے ہیں؟ کیا اس کی شفقت و محبت کے ثبوت میں زلزلوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جب زمین ہزاروں انسانوں کو نگل جاتی ہے؟ کیا آتش فشاں پہاڑوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کے شعلے بچے بوڑھے کی بھی تمیز نہیں کرتے؟

کیا اگر یہ تباہ کاریاں نہ پائی جائیں تو ہم کو یہ شک کرنے کا موقع ملے گا کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے غافل ہے کیا اگر زلزلہ و طوفان' قحط و وبا کی مصیبتیں نازل نہ ہوں تو ہم کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ خدا مہربان نہیں ہے؟

الہیات والے کہتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو یکساں پیدا نہیں کیا۔ اس نے قدوقامت' رنگ و صورت' ذہن و فراست کے لحاظ سے قوموں کو ایک دوسرے سے متمایز کر دیا ہے تو کیا بلند قوموں کو خدا کا شکر نہ ادا کرنا چاہیے کہ اس نے انھیں پست نہیں بنایا۔ یقیناً شکر کی بات ہے' لیکن اس صورت میں کیا پست قومیں اس بات کا شکریہ ادا کریں گی کہ خدا نے انھیں جانور نہیں بنایا؟

جب خدا نے بلند و پست قوموں کو بنایا تھا تو کیا یہ بات اس کے علم میں نہ تھی کہ بلند قومیں پست قوموں کو اپنا غلام بنائیں گی۔ ان کو ایذا پہنچائیں گی اور تباہ و برباد کر دیں گی؟

کیا وہ نہ جانتا تھا کہ یہ بلند و پست کا امتیاز دنیا میں کتنا خون بہائے گا؟ نوع انسانی کو کن کن مصائب میں مبتلا کرے گا' کتنے میدان لاشوں سے پٹ دے گا' کتنے غلاموں کے جسم کا گوشت کوڑوں کی ضرب سے پارہ پارہ کرے گا' کتنے ماؤں کے دل ان کے بچے جدا کر کر کے تڑپائے گا۔ پھر اگر یہ سب کچھ اس کے علم میں تھا تو کیا اس کا رحم و کرم اس سے زیادہ دلدوز مناظر کا منتظر تھا؟

وہ قید خانے' جن کی سنگین دیواروں سے سر ٹکرا کر دنیا کے بہت سے بلند اخلاق والے ' انسانوں نے اپنی جانیں دے دیں وہ سولیاں جو مقدس انسانوں کے خون سے رنگین بنائے جانے کے لیے نصب کی گئیں۔ وہ غلاموں کی جماعتیں جن کی پیٹھ کے زخموں کو خشک ہونے کا کبھی موقع نہیں دیا گیا' وہ مقدس ہستیاں جن کا ایک ایک جوڑ شکنجہ میں تان تان کر علیحدہ کیا گیا۔ جن کی کھالیں کھنچوا کھنچوا کر بھس بھروا دیا گیا وہ بے شمار انسان جو قحط و وبا کا شکار ہوئے جن کو زمین نے نگل کر ڈکار تک نہ لی جن کو سانپوں نے ڈسا' آتش فشاں پہاڑوں نے جھلسایا اور وہ لاتعداد بدکار ظالم انسان جنھوں نے دنیا میں مظالم توڑے اور کامیاب زندگیاں بسر کیں۔ کیا یہ اور اسی طرح کے تمام سمجھ میں نہ آنے والے واقعات رحم و کرم والے خدا کے علم سے باہر تھے اور یہ سب کچھ بغیر اس کی مرضی کے ہوا؟

انسان نے ہمیشہ کسی نہ کسی مافوق الفطرت ہستی کا دامن پکڑنا پسند کیا۔ اگر اس نے پتھر کو پوجنا چھوڑا تو ایک اور غیر معلوم قوت کے سامنے جھک گیا جس کو وہ صحیح راہ دکھانے والا باور کرتا ہے لیکن حقیقت کیا ہے؟

انسان فطرتاً" اقدام پسند واقع ہوا ہے وہ ہمیشہ آگے قدم بڑھاتا ہے اور تجربات اس کو بتاتے ہیں کہ اس نے جو قدم اٹھایا تھا وہ صحیح تھا یا غلط۔

ایک آدمی کسی جگہ کا ارادہ کر کے چل پڑتا ہے وہ ایک ایسی جگہ پہنچا ہے جہاں دو راستے پھٹتے ہیں' وہ بایاں راستہ اختیار کر لیتا ہے لیکن اسے کچھ دور چل کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستہ غلط تھا' وہ واپس آتا ہے اور داہنے ہاتھ کا راستہ اختیار کر کے منزل تک پہنچ جاتا ہے' اس کے بعد وہ اس جگہ پہنچنے میں غلطی نہیں کرتا اور ہمیشہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے۔ تو کیا یہ رہنمائی خود اس کی جستجو کا نتیجہ نہ تھی؟

ایک بچہ شعلہ کی چمک دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور جل جاتا ہے اس کے بعد پھر یہ جرات وہ کبھی نہیں کرتا۔ تو کیا یہ سبق اس کو اس قوت نے دیا یا خود اس کے تجربہ

نے؟

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے تجربات میں خود وہ قوت پنہاں ہے جو صحیح راستہ بتانے والی ہے' یہ قوت ادراک و ارادہ سے بالکل معرا ہے اور اس کا نام ہے تجربہ!

بہت سے لوگ ضمیر اور احساس اخلاق کے وجود کو وجود خدا کی دلیل بتاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرتاً تمدن پسند واقع ہوا ہے اور خانوادوں' قوموں اور قبیلوں کی صورت میں ہمیشہ زندگی بسر کرتا چلا آیا ہے' پھر قبیلہ کے جن افراد نے' خاندانی و عائلی مسرتوں میں اضافہ کیا وہ اس کے اچھے اعضاء شمار کیے گئے اور جنھوں نے تکلیفیں پہنچائیں انھیں برا سمجھا گیا اور یہیں سے اخلاق کے اچھے برے ہونے کا معیار قائم ہوا۔

وحشی قوموں میں ہمیشہ فوری نتائج پر غور کیا جاتا ہے' لیکن ترقی یافتہ قوموں میں نتائج بعیدہ کو سامنے رکھا جاتا ہے اور اس طرح اخلاق کا معیار بلند تر اور فرض شناسی کا احساس قوی تر ہوتا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی مافوق الفطرت قوت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

مذہب کیا ہے؟ انگرسول عیسوی مذہب کو سامنے رکھ کر پوچھتا ہے کہ عیسویت نے دنیا کو کیا فائدہ پہنچایا؟ جب اس کا اقتدار قائم کیا تھا تو کیا اس نے انسان کو زیادہ بہتر انسان بنایا؟ اس کا اثر اطالیہ' سپین' پرتگال' اور آئرلینڈ پر کیا ہوا؟ ہنگری اور آسٹریا کو کیا فائدہ اس سے حاصل ہوا؟ انگلستان' امریکہ' ہالینڈ و اسکاٹ لینڈ نے کیا تمتع اس سے حاصل کیا؟ اگر عیسویت کے سوا وہ کسی اور مذہب کے پیرو ہوتے تو کیا وہ اس سے زیادہ خراب ہو جاتے؟

اگر ٹورکمسڈ' زرتشتی مذہب کا پابند ہوتا تو کیا اور زیادہ خراب انسان ہو جاتا کیا کالون اور زیادہ خونخوار بن جاتا اگر وہ یہودی ہوتا؟ کیا ڈچ اور زیادہ احمق ثابت ہوتے اگر وہ تثلیث مسیحیت کے قائل نہ ہوتے؟ کیا جان ناکس اور زیادہ برے اخلاق کا ہو جاتا اگر بجائے مسیح کے وہ کنفوشش کا ماننے والا ہوتا؟

مذہب کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں بہت کافی تجربہ ہو چکا ہے اور اب اس کی ناکامی پر مزید حجت پیش کرنے کے لیے کسی اور جدید تجربہ کی ضرورت نہیں ہے۔

مذہب کبھی انسان کے دل میں جذبہ رافت والفت پیدا نہیں کر سکا اور اس کے ثبوت میں مذہبی تاریخ کے وہ اوراق پیش کیے جا سکتے ہیں جن کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے۔

مذہب علم و تحقیق کا ہمیشہ دشمن رہا ہے اور اس نے کبھی ذہنی آزادی کا ساتھ نہیں

دیا۔

مذہب کبھی انسان کو محنتی' جفاکش اور ایماندار بنانے میں کامیاب نہیں ہوا چنانچہ وحشی اقوام کی برائیوں کا سبب صرف ان کی مذہبی واہمہ پرستی ہے۔

وہ لوگ جو فطرت کی یکسانیت کے قائل ہیں ان کے لیے مذہب کا خیال کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

کیا انسان' فطرت اور صفات مادہ کو اپنی دعاؤں سے متاثر کر سکتا ہے' کیا ہم طوفان کو پوجاپاٹ کے ذریعہ سے کم و بیش کر سکتے ہیں' کیا ہم قربانیاں پیش کر کے ہواؤں کا رخ بدل سکتے ہیں کیا ہم الحاح وزاری سے بیماری کا علاج کر سکتے ہیں' کیا عزت و سربلندی ہمیں بھیک مانگنے سے مل سکتی ہے؟

وہ چیز' جسے نفس کہتے ہیں' کیا وہ قانون قدرت کا اسی طرح پابند نہیں جس طرح ہمارا جسم؟

مذہب کی بنیاد اس خیال پر قائم ہے کہ عالم فطرت کا کوئی ایک مالک ہے' جو دعاؤں کو سنتا ہے' اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے اور جزا و سزا دیتا ہے لیکن افسوس ہے کہ واقعات کی دنیا میں کوئی ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ہمیں ان اعتقادات کی تصدیق ہو سکے۔

جب ہم کوئی نظریہ قائم کرتے ہیں تو اس کے لیے کوئی نہ کوئی بنیادی حقیقت ضرور ہوا کرتی ہے' محض وہم و قیاس پر کوئی اصول مرتب نہیں ہو سکتا اس لیے اگر ہم لامذہبیت کا نظریہ پیش کرتے ہیں تو اس کے لیے چند بنیادی حقائق بھی اپنے پاس رکھتے ہیں۔

مثلاً یہ کہ مادہ و قوت فنا نہیں ہو سکتے' دوسرے یہ کہ مادہ و قوت ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے' تیسرے یہ کہ جو چیز غیر فانی ہے وہ غیر مخلوق ہے' قدیم ہے۔

دنیا میں ذہانت و ذکاوت کا وجود صرف قوت کی وجہ سے ہے اور قوت بغیر مادہ کے ممکن نہیں' اس لیے معلوم ہوا کہ ذکاوت صرف قوت و مادہ کی ممنون ہے اور اس باب میں کسی ایسی مافوق الفطرت ہستی کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے جسے مدبر کائنات کہا جائے۔

اگر مادہ و قوت ازلی و ابدی ہیں تو جو کچھ ممکنات میں تھا وہ واقع ہوا جو ممکنات میں ہے وہ ظاہر ہو رہا ہے اور آئندہ بھی رونما ہوتا رہے گا۔ کائنات میں اتفاق کوئی چیز نہیں جو کچھ ہوتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور پایا جاتا ہے۔ جس چیز کو ہم حال کہتے ہیں وہ ماضی کی پیداوار ہے اور جس کا نام مستقبل ہے وہ نتیجہ ہو گا حال کا۔ انسان سے لے کر رینگنے والے

کیڑے کی حرکت تک سب اسی قانون کے جکڑے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف کسی بات کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔

ہزاروں سال سے دنیا کی کوشش جاری ہے اور اس غرض کے لیے دیوتا' دیویاں' بہشت و دوزخ' الہامات و معجزات کلیسا و خانقاہ' قید خانے اور شکنجے' سینکڑوں چیزیں پیدا کی گئیں۔ ایک بادشاہ کو تخت سے اتار کر دوسرے کو بٹھایا' ایک ملکہ کی گردن مار کر دوسری کو تخت نشین کیا' آدمیوں کو زندہ جلایا۔ فوج کشیاں کی گئیں۔ دعائیں مانگی گئیں اور ڈرایا گیا لالچ دی گئی۔ الغرض مذہب نے سبھی کچھ کیا لیکن مقصد آج تک پورا نہ ہوا۔ لیکن مذہب غلامی ہے ذہن و دماغ کی' اور جب تک انسان کا ذہن آزاد و بیدار نہ ہو نوع انسانی کی فلاح مجموعی حیثیت سے ناممکن ہے۔

یہ ہیں وہ خیالات اس زمانے کے ملحد و لامذہب کے جو اخباروں رسالوں اور لیکچروں کے ذریعہ سے تمام دنیا میں اشاعت پا رہے ہیں اور ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم دہریت والحاد کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں تو ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دنیا کی اس ذہنی تشویش و تذبذب کو دور کریں۔ پھر اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ ہم منطق و فلسفہ کی پیچیدہ باتوں میں الجھا کر فریق مخالف کو خاموش کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اس طرح اس کی زبان تو بند ہو سکتی ہے' لیکن دل مطمئن نہیں ہو سکتا بلکہ ضرورت ہے اس مذہبی روح کی تلقین کی جو ظاہری شعائر و مراسم سے بے نیاز ہے اور جس میں سوا بلند تعلیم اخلاق کے کوئی اور چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو ہمیں الہام معجزات' بہشت و دوزخ' حشر و نشر' قیامت و آخرت کے تسلیم کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ یہی وہ تنگ نظری تھی جس نے اہل مذاہب کو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رکھا اور یہی وہ چیز ہے جو مذہب کے اقتدار کو مٹا کر رہے گی۔ دنیا میں اب کوئی ایسا مذہب نہیں چل سکتا جو تمدنی ضروریات' بین الاقوامی تعلقات' اقتصادی مشکلات' اخلاق اصول عامہ کو پس پشت ڈال کر صرف "امید فردا" پر اپنی کارگاہ تبلیغ قائم کرے۔ وہ وقت گزر گیا جب مذہب کسی ایک قوم کے لیے مخصوص ہوا کرتا تھا' اب کہ کرہ زمین کی 24 ہزار میل کی وسعت کو انسان چند دن میں طے کر لیتا ہے تخصیص نسلی و جغرافیہ کا سوال بالکل لا یعنی چیز ہے اور مذہب کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ کوئی ایسا لائحہ عمل پیش کرے جو تمام اقلیتوں کو کسی ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتا ہو اور یہ ممکن نہیں جب تک مذہب

کے اعتقادی حصہ کو علیحدہ کر کے اسے ہیئت اجتماعی کے اصول پر صرف "سوشل آرگنائزیشن" کی حیثیت نہ دی جائے۔

○ ○ ○

ملاحدہ دور حاضر کے نقطہ نظر سے!
(2) صراط مستقیم

ہمارے سامنے دو راستے ہیں' ایک وہ جو فطرت اور عالم کے اسباب کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے اور دوسرا وہ جو مافوق الفطرت باتوں کی جانب مائل کرتا ہے یعنی ایک وہ ہے جو ہمیں تحقیق و جستجو' اکتشافات و اختراع' سعی و کاوش اور رشتہ علت و معلول کی طرف متوجہ کر کے راحت و آسائش' امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے اور دوسرا وہ جو ہمیں بتاتا ہے کہ اصل دنیا یہ نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہے اور اسی غیر معلوم دنیا کے لیے بلا حیلہ و حجت ہم کو قربانیاں' دعائیں اور عبادتیں کرتے رہنا چاہیے۔

ان دونوں راستوں میں اور کیا فرق ہے؟

ایک بتاتا ہے کہ زندگی نام ہے اپنے اور دیگر ابناء جنس کے ساتھ ہمدردی رکھنے اور ان کے لیے اسباب راحت و سکون فراہم کرنے کا'

دوسرا کہتا ہے کہ حیات انسانی کا مقصد خداؤں اور دیوتاؤں کی پرستش ہے جو دوسری دنیا میں ہمارے اس تمام عجز و انکسار کا ابدی معاوضہ دیں گے ایک عقل و حقائق پر اعتماد کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور دوسرا صرف عقائد پر بھروسہ کرنے کی۔ ایک کہتا ہے کہ اپنے حواس و ادراک کی اس روشنی سے کام لو جو خود تمہارے اندر پائی جاتی ہے دوسرا کہتا ہے کہ اس مقدس روشنی کو گل کر دو۔

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

اس میں شک نہیں کہ ہمارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ اس سے زاید کچھ نہ کر سکتے تھے وہ ایک مافوق الفطرت قوت پر یقین رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر وہ طاقت و عبادت' دعا و قربانی نہ کریں گے تو نہ بارش وقت پر ہو گی اور نہ ان کی کھیتیاں بار آور ہوں گی۔ وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ایک مستبد بادشاہ ہے جس کو ذرا ذرا سی بات ناگوار ہو جاتی ہے اور جو برہم ہو کر سزا دینے پر اتر آتا ہے وہ خدائے خیر کے ساتھ' خدائے شر کے بھی قائل تھے اور انھیں دو خداؤں کے درمیان بیم و رجا کی "رعشہ براندام" زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ ان کی

حیات کا کوئی لمحہ خوف سے خالی نہ گزرتا تھا اور ہر وقت وہ اسی ڈر سے کانپتے رہتے تھے۔ کہ مبادا کوئی ان سے خفیف سی خفیف گستاخی سرزد ہو جائے اور خدا ناراض ہو کر انھیں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دے۔

طوفان آتا تھا تو وہ سمجھتے تھے کہ یہ نتیجہ ہے انھیں کی بداعمالیوں کا‘ زلزلہ آتا تھا تو وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ان پر برہم ہو رہا ہے۔ وبائی بیماریاں پھیلتی تھیں تو وہ اسے بھی اپنے ہی گناہوں کی پاداش جانتے تھے۔ اور جب چاند سورج کو گرہن لگتا تھا تو اسے بھی اپنی ہی خطاؤں کا نتیجہ باور کرتے تھے تمام فضا انھیں فرشتوں یا خبیث روحوں سے معمور نظر آتی تھی۔ اور شب و روز صرف اسی لیے الحاح و زاری کیا کرتے تھے کہ خدا ان سے خفا ہو کر تباہ و برباد نہ کر دے قدرت ان کے نزدیک گویا ایک سوتیلی ماں تھی جو پیشانی پر شکنیں ڈالے ہوئے ہر وقت انھیں خونچکاں آنکھوں سے دیکھتی رہتی تھی۔

آخر کار ایک زمانہ آیا جب بعض افراد سوچنے والا دماغ لے کر پیدا ہوئے اور انھوں نے تمام حوادث و واقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ انھوں نے سمجھا کہ طوفان اور زلزلوں کے اسباب طبیعی کچھ اور ہیں۔ سورج گرہن کے لیے ایک زمانہ معین ہے اور پہلے سے اس کے وقوع کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے‘ اسی طرح رفتہ رفتہ سیاروں کی گردش۔ کرہ زمین کے جغرافیائی حالات‘ آب و آتش کے خواص‘ مظاہر فطرت کے اسباب‘ حیات انسانی کی خصوصیات‘ اعضا جسم کے وظائف معلوم کیے گئے اور واہمہ پرستی کی زنجیر کی کچھ کڑیاں ٹوٹیں‘

اس کے بعد کچھ زمانہ اور گزرا یہاں تک کہ مدارس کی بنیادیں پڑیں۔ کتابیں تصنیف کی گئیں‘ مفکرین کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔ علمی اکتشافات نے انسان کے دماغ کو منور کرنا شروع کیا‘ فکر و خیال کی آزادی بڑھی اور مافوق الفطرت کی جگہ فطرت اور اصول فطرت نے لے لی۔ پھر روح کے اس احساس آزادی کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ظاہر ہو کر رہا۔ یعنی اختراع و ایجاد کے دروازے کھل گئے اور ارباب مذہب اپنی اور اپنے اعتقادات کی کمزوریوں کو بری طرح محسوس کرنے لگے۔

ظاہر ہے کہ مفکرین کے مقابلہ میں "معتقدین" کوئی علمی و عقلی دلیل تو پیش کر نہ سکتے تھے‘ کیونکہ یہی ایک چیز ان کے دسترس سے دور تھی۔ اس لیے وہ اہل علم کے خلاف ملک میں نہایت مکروہ پروپیگنڈا کی اشاعت پر اتر آئے اور واہمہ پرستی کے پاس جہل و تعصب کے

جتنے گندے حربے موجود ہیں ان سب کا استعمال بیک وقت شروع کر دیا گیا ان کو زیارت شیطان بتایا گیا۔ خدا کا دشمن ظاہر کیا گیا۔ ان کے مٹا دینے کا نام مذہب جہاد قرار پایا۔ اور استعمال آتش و زنجیر اور تعذیب و تذلیل کی جتنی مہیب صورتیں ہیں وہ سب بروئے کار لائی گئیں۔

پھر یہ سب کچھ چند دن کا ہنگامہ نہ تھا' بلکہ یہ خون آشامیاں صدیوں تک جاری ہیں اور اس سلسلہ میں کوئی جرم ایسا نہ تھا جس کا ارتکاب مذہب کے نام پر جائز و مستحسن نہ قرار دیا گیا ہو۔ ایک فریق کہتا تھا کہ جذبات انسانی کو فنا کر دو اور ضروریات زندگی کو کم' اپنے آپ کو معذور سمجھو اور آسمانی قوت پر اعتماد کامل رکھ کر تمام کام اسی پر چھوڑ دو' دوسری جماعت کہتی تھی کہ جذبات انسانی اسی لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ مناسب حدود میں ان کو تسکین پہنچائی جائے اور ضروریات زندگی کو بڑھانا بھی لازم ہے کیونکہ بغیر ان کے انسانوں کو اپنی قوتوں کا علم نہیں ہو سکتا اور دنیا میں کوئی ایجاد و اختراع معرض ظہور میں نہیں آسکتی'

ایک فریق کا فلسفہ حیات یہ تھا کہ مال و دولت کو ٹھکرا دیا جائے اور اسباب راحت سے نفرت کی جائے' یہ لوگ فنون لطیفہ کے دشمن تھے اچھی غذا' اچھے لباس' اچھے مکانوں سے متنفر تھے' گویا یوں سمجھئے کہ یہ حکماء تھے غربت و افلاس کے تشنگی و گرسنگی کے' جھونپڑوں کے چھپروں کے برہنہ پائی کے اور ایک ایسی آہستہ رو عمل خود کشی کے جو دفعتاً" نہیں بلکہ تدریجاً" قوم کی قوم ہلاک کر دینے والا ہے۔ ان کو اس دنیا میں سوا عذاب و مصیبت کے کچھ نظر نہ آتا تھا اور دوسری دنیا ہر قسم کے اسباب نشاط و راحت سے معمور نظر آتی تھی' وہ امرا اصحاب ثروت سے اور تمام ان لوگوں سے جو اپنی قوت بازو کی مدد سے راحت و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں نفرت کرتے تھے اور جنت میں سوا گداگروں اور بھکاریوں کے کسی اور کا درخور محال سمجھتے تھے'

الغرض یہ تھے وہ لوگ جنھوں نے دنیا کو ویران و غیر دلچسپ رکھنے کے لیے سینکڑوں سال تک جہاد کیا اور کچھ زمانہ تک انھیں کامیابی بھی حاصل رہی لیکن ذہنی و عقلی آزادی بجائے خود ایسی زبردست لذت ہے کہ ایک بار چکھ لینے کے بعد اس کا چھوڑنا محال ہے' اس لیے اس کا ذوق رفتہ رفتہ عام ہو تا گیا اور ذہن و خیال کی دنیا ہی بالکل بدل گئی۔

چنانچہ اب انسان اس جسم متحرک کا نام نہیں ہے جو ایک وقت معین تک حرکت کرتے رہنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے بلکہ انسان نام ہے قوائے عقل و دماغ کی ترقی کا جو حرکت و

عمل کا تحقیق و جستجو کا اعتقاد ذاتی کا اور آسمان سے لے کر زمین تک تمام مناظر قدرت پر چھا جانے کا۔ اب وہ اس کا قائل نہیں کہ کہ طاعت و عبادت بجائے خود کوئی تقدس و پاکیزگی ہے اور انعام خداوندی کی مستحق اب وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ جزا و سزا مافوق الفطرت سے متعلق ہے بلکہ وہ تقدس کا مفہوم صرف حرکت و عمل کو قرار دیتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ انسان کی دوزخ و جنت خود اسی کے اندر اور اسی دنیا میں موجود ہے اور اسے اختیار حاصل ہے خواہ وہ مجہول و بے کار زندگی بسر کر کے جہنم میں چلا جائے خواہ سعی و محنت سے کام لے کر فردوس حاصل کرے۔

یہ اعتقاد کہ بادشاہ کو خدا' بادشاہ بنا کر بھیجتا ہے اور رعایا کا کام صرف اس کی اطاعت ہے' اب ختم ہو گیا یہ عقیدہ کہ مذہب خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے اور اس کے بتائے ہوئے اصول و عقائد کو بغیر چون و چرا تسلیم کرنا ہمارا فرض ہے بہت کچھ مٹ گیا ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے بادشاہ بھی رفتہ رفتہ فنا ہو رہے ہیں اور مذہبی حکومتیں بھی محو ہوتی جا رہی ہیں۔

انگلستان میں بجائے خدا کے اب پارلیمنٹ کی حکومت ہے اور امریکہ میں مذہبی اقتدار کی جگہ رائے عامہ نے لے لی ہے۔ فرانس اپنی آبادی کے سوا کسی اور مافوق الفطرت قوت کو حکومت میں دخل دینے کا مستحق قرار نہیں دیتا اور روس میں سب سے بڑا جرم خدا اور مذہب کا نام لینا ہے۔ یورپ میں صرف ایک قیصر ولیم (شاہ جرمنی) ایسا بادشاہ تھا جو اپنے آپ کو فرستادہ خدا سمجھتا تھا سو گزشتہ جنگ میں وہ بھی ختم ہو گیا۔

انسان آزادی کامل کی اس منزل تک سخت صعوبتیں اٹھانے کے بعد پہنچا ہے اور استعمال عقل کے استحصال کو اب اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ جس وقت تک وہ اپنی فہم و فراست کو مشعل راہ بنانے سے باز رکھا گیا۔ بے شک وہ کہہ سکتا تھا کہ اصل نیکی صرف خوف جہنم سے کانپتے رہنا ہے اور حصول نجات کے لیے یہی کافی ہے لیکن جب اس نے دیکھا کہ تنہا یہ عقیدہ نہ اس کے لیے روزی فراہم کر سکتا ہے نہ تن پوشی کے لیے لباس تو اس کی نگاہیں آسمان کی طرف سے زمین کی جانب مائل ہوئیں اور وہ یہ دیکھ کر متعجب ہوا کہ جو لوگ اپنے آپ کو مذہب کا پابند کہتے ہیں وہ بھی اس کی طرح جرم معصیت کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ سقراط کو جس نے زہر کا پیالہ دیا وہ بھی مذہبی انسان تھا اور عیسیٰ کو جنھوں نے سولی پر چڑھایا وہ بھی خدا کے ماننے والے تھے اس لیے اس کی روح میں بغاوت پیدا ہوئی اور اس طرح سب سے پہلا جذبہ اختلاف جو مذہب کے خلاف رونما ہوا وہ

خود اہل مذہب ہی کا پیدا کیا ہوا تھا۔

آپ کسی مذہب والے سے دریافت کیجئے وہ اپنے سوا تمام دنیا کو گمراہ بتائے گا اور اسی خدا کو قابل پرستش قرار دے گا جو اس نے وضع کیا' دوسرے مذاہب و اقوام کے خداؤں کو وہ جھوٹا بتائے گا۔ وہ سوا اپنے معبد کے کسی اور کی عبادت گاہ کی عزت نہ کرے گا۔ سوا اپنے طریق عبادت کے وہ کسی اصول بندگی کا احترام نہ کرے گا وہ اپنی قربانیوں کے مقابلہ میں دوسرے مذہب کی قربانیوں کو لغو بیکار بتائے گا۔ گویا اسی کا خدا خدا ہے' اور اس کا پیغمبر' پیغمبر' اسی کی کتاب الہامی صحیفہ ہے اور اسی کی دعائیں مقبول'

اب خدا کے اس تصور کو دیکھیے جو الہامی مذاہب نے پیش کیا ہے' خدا کو قادر مطلق' بے نیاز اور کسی چیز سے متاثر نہ ہو سکنے والا بتایا جاتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ کتب مقدسہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو غصہ بھی آتا ہے' وہ انتقام بھی لیتا ہے اور اپنے بندوں میں سے ایک کے ساتھ رعایت اور دوسرے کے ساتھ ظلم بھی کر سکتا ہے!

عدن میں آدم و حوا کو خود ہی پیدا کرتا ہے اور نافرمانی و سرکشی نہیں بلکہ معمولی سی غلطی پر خود ہی اس قدر برہم ہو جاتا ہے کہ عدن سے انھیں اٹھا کر زمین پر پھینک دیتا ہے اور نہ صرف ان کے لیے بلکہ ان کی اولاد کے لیے بھی تمام عمر غم و غصہ میں مبتلا رہنا مقسوم کر دیتا ہے۔ خدا اور اتنا غصہ' خالق اور اپنی مخلوق پر اتنی برہمی! اگر وہ جانتا تھا کہ ان سے یہ غلطی سرزد ہو گی تو پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ غلطی نہ کر سکنے والی مخلوق پیدا کرتا۔ خود ہی ان کو پیدا کیا۔ خود ہی برہم ہو کر انھیں مبتلائے آلام کر دیا' عجیب تماشہ ہے'

الہامی صحائف خدا کے غصے اور جنگ و قتال کے احکام سے بھرے پڑے ہیں قوموں کو اس نے برباد کیا۔ بستیوں کو اس نے ویران کیا۔ وبائیں اس نے مسلط کیں' آسمانی عذاب اس نے نازل کیے۔ حالانکہ انسان کی سرکشی یا نافرمانی بھی اسی کی پیدا کی ہوئی چیز تھی اور خود اسی کی مرضی تھی کہ وہ ایسا کرے پھر سمجھ نہیں آتا کہ جب انسان کو (جن میں عورتیں اور معصوم بچے بھی شامل تھے) تباہ کرنا ہی مقصود تھا تو ان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ انھیں معصوم پیدا کرتا۔

ایک بار ساری دنیا کو سوائے آٹھ آدمیوں کے طوفان میں غرق کر دیتا ہے اور تمام زمین کو لاشوں سے پاٹ دیتا ہے اس کے بعد وہ صرف یہودیوں کو لطف و کرم کا مستحق سمجھتا ہے

اور باقی تمام مخلوق کو بغیر کسی سبب کے مردود قرار دیتا ہے' نہ وہ اہل مصر کی طرف متوجہ ہوتا ہے نہ اہل ایران کی طرف' نہ اسیروں کو قتل اتنا خیال کرتا ہے نہ یونانیوں کو(حالانکہ ان سب کا خالق بھی وہی تھا) اور صدیوں تک صرف ایک فرقہ کا خدا بنا رہتا ہے کیوں؟

خدا ایک قوم کو حکم دیتا ہے کہ وہ دوسری قوم سے جنگ کر کے ان کے مردوں عورتوں اور بچوں کو ہلاک کرے اور جو زندہ ہاتھ آجائیں انھیں لونڈی غلام بنائے۔ اس کے علاوہ وہ ادارہ غلامی قائم رکھنے کے لیے ان کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دیتا ہے۔ بادشاہوں کے جرائم کے عوض میں رعایا کو ہلاک کرنا مناسب سمجھتا ہے اور وہ بغیر کسی وجہ کے اپنے بندوں میں سے کسی ایک جماعت سے خوش ہو جاتا ہے اور دوسری سے برہم۔ اس کا سبب؟

حقائق عالم کے لحاظ سے صحف مقدسہ نے جو معلومات انسان کے سامنے کے پیش کی ہیں' ان کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے۔ زمین کا چپٹا و مسطح ہونا' طبقات للارض کا انتہائی درس ہے۔ اور تاروں کو آسمان میں جڑا ہوا ظاہر کرنا فلکیات کا بلند ترین نظریہ!

صحت و امراض کے متعلق دو نظریئے دنیا میں رائج ہیں' ایک مذہبی' دوسرا علمی' مذہبی نظریہ یہ ہے کہ بیماریاں ارواح خبیثہ سے پیدا ہوتی ہیں جو جسم انسانی میں حلول کر جاتی ہیں اور ان ارواح خبیثہ کو مذہب کے نفوس مقدسہ ہی دور کر سکتے ہیں۔

جب تک مسیح زندہ رہے ان کی عمر شیاطین اور ارواح خبیثہ کے دور کرنے میں بسر ہوئی اور بعد کو ان کے مقدس راہبوں نے صدیوں تک یہ خدمت انجام دی' چنانچہ ازمنہ وسطی میں لاکھوں کروڑوں شیاطین اسی طرح بھگائے جاتے رہے اور امراض کا علاج جھاڑ پھونک' دعا تعویذ اور گنڈوں سے ہوتا رہا۔ امراض کے طبیعی اسباب کا کوئی علم نہ تھا۔ مقدس اہل مذاہب دعاؤں کے بہانہ سے ہزاروں روپیہ کماتے تھے (فقیروں کی روزی کا مدار اسی پر ہے)

آخر کار جب علم بڑھا تو آہستہ آہستہ امراض کے طبیعی اسباب کا بھی علم ہوا اور ان کے دور کرنے کی طبیعی تدابیر بھی رائج ہوئیں چنانچہ اس وقت سوائے جاہل ممالک کے جن میں ہندوستان کا مرتبہ سب سے بلند ہے جنات یا شیاطین یا ارواح خبیثہ کا عقیدہ بالکل اٹھ گیا ہے اور جب کوئی بیمار پڑتا ہے تو دعا تعویذ کے علاج کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

مذاہب عالم اور کتب مقدسہ کے متعلق بھی دو خیال ہیں۔ ایک جماعت (اہل مذاہب) کی کہتی ہے کہ وہ بالکل الہامی ہیں اور انسانی فکر کو ان میں دخل نہیں اور دوسری جماعت

کہتی ہے کہ صحف مقدسہ سب انسانوں کے دماغ کا نتیجہ ہیں اور مذہب رونما ہوا ہے صرف اس جذبہ خوف سے جو حوادث طبیعی و مظاہر قدرت کو دیکھ دیکھ کر انسان کے دل میں پیدا ہوتا تھا چنانچہ دنیا میں کوئی قدیم قوم ایسی نہ تھی جس کا کوئی مذہب نہ رہا ہو اور طاعت و عبادت کو اس نے اپنی حفاظت و نجات کا ذریعہ خیال نہ کیا ہو لیکن رفتہ رفتہ یہ واہمہ پرستی کم ہوتی گئی یہاں تک کہ اب ہر ذی فہم انسان جانتا ہے کہ دنیا میں ہر واقعہ کا ایک فطری سبب ہوا کرتا ہے اور قدرت بغیر اس خیال کے انسان کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں۔ اپنے کام میں مصروف ہے'

اب منکرین اچھی طرح واقف ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب خود انسانوں نے وضع کیے تھے اور خدا و الہام خداوندی سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ جن کتابوں کو وہ الہامی کہتے ہیں وہ بھی انسان ہی کے دماغ کا نتیجہ تھیں اور اسی لیے ہر قوم و زمانہ کے لحاظ سے انہیں مختلف خیالات و تعلیمات پائی جاتی ہیں' نہ خدا کو طاعت و عبادت کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی کی دعا سنتا ہے۔ اہل دنیا پر ہزاروں مرتبہ قحط و وبا طوفان و سیلاب کی مصیبتیں نازل ہوئیں اور کوئی دعا انھیں دور نہ کر سکی' زلزلے آتے رہے' جو الامکھی آگ برساتے رہے۔ ہزاروں معصوم نفوس فنا ہوتے رہے اور انسان کی کسی گریہ وزاری نے خدا کو اس ہلاکت باری سے باز تو رکھا' کھیتیاں سوکھتی رہیں اور انسانوں کی دعائیں ایک قطرہ پانی کا نہ حاصل کر سکیں وبائیں پھیلتی رہیں اور خدا کے نام پر لکھے ہوئے تعویذ کسی ایک شخص کو بھی ہلاکت سے نہ بچا سکے غلاموں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان ہوتی رہی' عورتوں کی عصمت دری کو علی الاعلان جائز رکھا گیا۔ شیرخوار بچے ماؤں کی آغوش سے چھین چھین کر بازاروں میں فروخت کیے گئے' اور ان کی فریاد و زاری ایک لمحہ کے لیے خدا کو متوجہ نہ کر سکی کہ وہ ظالم بادشاہوں کی حکومت کے بجائے آسمانی بادشاہت قائم کرتا۔

اخلاقیات کے باب میں اہل مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے جس فعل سے باز رکھا ہے وہی برا ہے اور جس کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ اچھا ہے خود بندہ کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ خود کسی فعل کے مستحسن یا قبیح ہونے پر رائے زنی کرے گویا مذہبی انسان کسی اچھے کام کو خود اچھا سمجھ کر انجام نہیں دیتا بلکہ فرمان خداوندی کی تعمیل سمجھ کر اس کو اختیار کرتا اور صرف اس خوف سے کہ مبادا خدا برہم ہو جائے اور اسے عذاب میں مبتلا کرے۔

تقریباً" تمام اہل مذہب کا عقیدہ ہے کہ ایک انسان اچھے اخلاق کا ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ وجود خدا کا قائل نہ ہو اور اگر کسی میں یہ صفت پائی بھی جائے تو بغیر خدا کو مانے ہوئے وہ بالکل بے کار ہے۔

علماء اخلاقیات کا نظریہ یہ ہے کہ نیکی و بدی اشیاء کی فطرت میں موجود ہے بعض افعال ایسے ہیں جو انسانی مسرت کا باعث ہوتے ہیں اور بعض آزار و مصائب کا سبب بن جاتے ہیں چنانچہ اول الذکر افعال کو ہم اخلاق حسنہ کہتے ہیں اور موخرالذکر کو افعال قبیحہ یا معصیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

اخلاق انسانی کا تعلق اسی دنیا سے ہے اور یہیں ان کے نتائج دیکھ کر ان کے برے یا اچھے ہونے کا اصول قائم کیا گیا ہے۔ نہ خدا ان سے متاثر ہوتا ہے اور نہ دوسری دنیا میں ان کا محاسبہ کر کے جزا و سزا دینے کی ضرورت' چوری کو برا سمجھنے کے لیے کسی الہام کی ضرورت نہ تھی' انسان کے تجربہ نے اس کے نقصانات دیکھ کر خود اسے برا قرار دیا' تمام وہ جرائم جو انسان کو جسمانی اقتصادی و عمرانی نقصان پہنچاتے ہیں ان سے اپنے آپ کو محفوظ رہنے کا احساس ہر شخص میں فطری طور پر پایا جاتا ہے اور یہی وہ احساس تھا جس نے اسے بتایا کہ نیکی کسے کہتے ہیں اور بدی کس کو!

پھر جو چیز اس لحاظ سے بری ہے وہ یقیناً" بری سمجھی جائے گی خواہ مذہب کے نزدیک اچھی ہو' واقعات و تاثرات کو کوئی قوت بدل نہیں سکتی جس طرح قدرت ایک مربع کو دائرہ ثابت کرنے سے عاجز ہے اسی طرح وہ کسی بری بات کو اچھی اور اچھی کو بری نہیں بنا سکتی۔

الغرض اہل مذہب نے جو نظریہ اخلاق قائم کیا ہے اس پر ایک انسان کبھی فخر نہیں کر سکتا۔ ایک شخص نیک کام کرتا ہے صرف اس ڈر سے کہ خدا کا حکم ہے اور اس طمع سے کہ اس کا انعام دوسری دنیا میں ملے گا' دوسرا اچھے اخلاق اختیار کرتا ہے صرف اس بناء پر کہ یہ اس کا انسانی فرض ہے اور نیکی آپ اپنی جزا ہے اور دونوں کے فرق کو ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔

الغرض اس وقت دو راستے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک وہ جو مذہب کی طرف ہم کو لے جاتا ہے اور دوسرا وہ جو عقل کی طرف رہبری کرتا ہے۔ سو اول الذکر کا تجربہ بہت کافی ہو چکا ہے اور ہمیشہ اس کا نتیجہ ایک ہی نکلا ہے۔

فلسطین میں اس کا تجربہ کیا گیا لیکن اہل فلسطین کی مذہبیت ان کو تباہ و برباد ہونے سے

نہ بچا سکی' وہ مفتوح و مغلوب ہو کر خارج البلد کئے گئے صدیوں تک امداد خداوندی کا انتظار کرتے رہے اور اس توقع پر زندہ رہے کہ خدا انھیں پھر مجتمع کرے گا۔ ان کی بستیوں' ان کے معبدوں اور قربان گاہوں کو از سر نو تعمیر کرے گا۔ لیکن صدیوں پر صدیاں گزر گئیں اور ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔

اس کا تجربہ سوئٹرز لینڈ میں کیا گیا وہاں بھی سوا غلامی کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں اور صرف انھیں لوگوں کی آزادی کے ساتھ بولنے کا حق رہا جو صاحب جاہ و ثروت تھے' عوام سے ان کی معصوم مسرتیں چھین لی گئیں' ان کے لیے ہنسنا ممنوع قرار پایا اور سوائے رنج و غلامی کے کچھ نہ ملا۔ ان لوگوں نے اوراد و وظائف روزہ صلوٰۃ وعظ و پند کو بھی آزما کر دیکھ لیا لیکن کوئی چیز انھیں مسرت و راحت سے آشنا نہ کر سکی۔

اسکاٹ لینڈ میں بھی مذہب کا تجربہ ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی ماننے والی تمام آبادی کو خوش قسمت لیکن ظالم کرکوں کا غلام بن کر رہنا پڑا۔ پادری ہر خاندان میں گھس جاتے تھے' اور خوف و واہمہ پرستی پھیلا پھیلا کر لوگوں کی عقلیں سلب کر رہے تھے' وہ اپنی ہدایات کو الہام ربانی کہتے تھے اور ان سے انحراف کرنے والے عذاب خداوندی کا مستوجب قرار دیتے تھے' پھر اس مذہبی حکومت میں بھی وہی ہوا جو ہونا چاہیے۔ انسان غلام تھا اور غلامی کے ناقابل برداشت بار سے اس کی پیٹھ جھکی جا رہی تھی۔

انگلستان میں مذہبی حکومت نے جو گل کھلائے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں اس زمانہ کے قانون اس زمانہ کے اوہام و تعصبات اس قدر سخت تھے کہ خدا کی پناہ' پادری خدا کے بیٹے بنے ہوئے آسمان و زمین کی ملکیت کا دعویٰ کر رہے تھے۔ بہشت و دوزخ کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں تھیں اور جس کو جہاں جی چاہتا تھا دھکیل دیتے تھے۔ نہ ان کے دلوں میں رحم تھا۔ نہ آنکھوں میں مروت لوٹی لوٹی سی غلطیوں پر خارج البلد کر دینا۔ کوڑے لگوانا اور قید و بند میں ڈال دینا معمولی بات تھی'

ازمنہ مظلمہ میں مذہبی زندگی کا جو نتیجہ ہوا وہ اور زیادہ ہلاکت انسانیت تھا ہزاروں سولیاں ہر وقت خون سے تر رہتی تھیں اور بے شمار تلواریں انسانی سینے میں پیوست۔ قید خانے کھچا کھچ بھرے رہتے تھے اور سینکڑوں انسان دہکتی ہوئی آگ کے اندر پڑے ہوئے تڑپا کرتے تھے۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو خدا کے نام پر روا نہ رکھا گیا ہو اور کوئی معصیت ایسی نہ تھی

جس کا ارتکاب مذہب کے پردہ میں نہ ہوتا ہو۔ الغرض یہ تھا مذہبی حکومتوں کا رنگ جو اہل مذہب نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اب اس کے مقابلے میں اس راستہ کو دیکھو جس کی رہنمائی عقل نے کی ہے کیسا صاف و ہموار راستہ ہے کیسی کھلی ہوئی فضا ہے کیسی پر بہار زمین ہے۔ ہر شخص دوسرے کا بوجھ ہلکا کرنے کی فکر میں ہے۔ اور ہر دماغ اسی فکر میں ہے کہ بنی نوع انسان کی راحت و مسرت کا سامان بہم پہنچائے۔ نہ وہاں سولیاں ہیں نہ قید خانے۔ نہ جہنم کے اژدہے ہیں نہ فرشتوں کے کوڑے قدرت کی وسیع فضا ہے جس سے ہر شخص یکساں فائدہ اٹھا رہا ہے عقل و فراست کا ایک آفتاب ہے جو سب کو برابر مستفیض کرنا چاہتا ہے۔ انسانیت کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں غلامی کا داغ اشرف المخلوقات کی پیشانی سے ہٹ چکا ہے' ذہنی آزادی نے مختلف قسم کے چمن کھلا رکھے ہیں اور' ہر فرد دوسرے سے ہم آغوش و بغلگیر نظر آتا ہے۔

جس وقت میں تاریک ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو میرا ریشہ ریشہ کانپ اٹھتا ہے سب سے پہلے مجھے وہ تنگ و تاریک غار نظر آتے ہیں جہاں مقدس اژدہے کنڈلیاں مارے ہوئے قربانیوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے جبڑے کھلے ہوئے ہیں۔ ان کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ آنکھیں چمک رہی ہیں اور زہریلے دانت خون آلود ہیں۔ جاہل ماں باپ اپنے معصوم بچوں کو اس افعی دیوتا کے حضور پیش کرتے ہیں وہ اس چیختے تڑپتے ہوئے بچہ کو اپنے بل میں لپیٹ کر پیس ڈالتا ہے اور بے رحم والدین اس ہدیہ کے قبول ہونے پر خوش خوش واپس چلے جاتے ہیں اس کے بعد مجھے وہ عبادت گاہیں نظر آتی ہیں جن کو بڑے بڑے پتھروں سے تیار کیا گیا ہے لیکن یہاں ان کی قربان گاہیں بھی خون سے رنگین ہیں اور مقدس پجاریوں کے خنجر معصوم لڑکیوں کے سینوں میں یہاں بھی پیوست نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور معبد سامنے آتے ہیں جہاں مقدس آگ کی روشنی کو انسانی گوشت و خون سے قائم رکھا جاتا ہے پھر چند عبادت گاہیں اور' دکھائی دیتی ہیں جن کی قربان گاہیں بیلوں اور بھیڑوں کے خون سے تر ہیں اس کے بعد ہی مجھے کچھ اور معبد' کچھ اور پجاری' کچھ اور قربان گاہیں نظر آتی ہیں جہاں انسانی آزادی کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے خدا کے معبد تو نہایت عظیم الشان ہیں' لیکن کسانوں کے پاس جھونپڑا تک نہیں۔ پجاریوں اور بادشاہوں کے جسم زر کار عباؤں سے آراستہ ہیں لیکن رعایا کے پاس جسم ڈھانکنے کو بوسیدہ سا چیتھڑا بھی نہیں۔ اور کیا دیکھتا ہوں؟ یہ کہ قید خانے انسانوں سے بھرے ہوئے ہیں' خارج البلد خانماں برباد بوڑھے بچے' عورتیں

پہاڑوں' اور صحراؤں میں سر ٹکرا رہی ہیں۔ آلات تعذیب حرکت میں آ رہے ہیں اور لاکھوں انسانوں کی چیخ سے خانقاہیں گونج رہی ہیں الف وہ تاریک قید خانے' وہ زنجیروں کی جھنکار' وہ آگ کے بلند شعلے' وہ جھلسے ہوئے سیاہ چہرے' وہ اینٹھتے ہوئے اعضاء وہ شکنجوں میں کسے ہوئے ہزاروں معصوم انسان اور وہ ان رگوں کے ٹوٹنے کی آوازیں۔ اس کے بعد جو میری نگاہ اٹھتی ہے تو افق میں مجھے ایک نئی روشنی نظر آتی ہے انسانی جسموں کے راکھ کے ڈھیر سے ایک نیا آفتاب طلوع کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے یعنی عقل و مذہب آزادی' اب غلامی کی زنجیریں آہستہ آہستہ ٹوٹ رہی ہیں قربان گاہیں فنا ہوتی جاتی ہیں عبادت گاہیں مسمار ہو رہی ہیں۔ زبان کی بندشیں اٹھتی جاتی ہیں اور ذہن و عقل کے قفل ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ اب میں پھر دیکھتا ہوں لیکن ماضی کی طرف نہیں بلکہ مستقبل کی طرف اور فرط مسرت سے اچھل پڑتا ہوں۔ اس وقت مجھے کیا کیا نظر آتا ہے یہ کہ پجاری اور بادشاہ ختم ہو چکے ہیں۔ قربان گاہیں اور تخت و تاج خاک میں مل چکے ہیں۔ عمارتیں نیست و نابود ہو چکی ہیں اور تمام دیوتا مفقود ان کی جگہ ایک نیا مذہب رونما ہوا ہے' جس کا نام آزادی ضمیر ہے۔ اور ایک نئی سلطنت قائم ہوئی ہے جس کی ملکہ حریت فکر و رائے اور جس کی رعایا اخوت عامہ ہے۔ ہر جگہ امن و سکون ہے اور ہر شخص مطمئن' نہ کوئی قید خانہ ہے نہ بیمارستان' نہ عدالت گاہیں ہیں نہ جرم و معاصی کی داستان' ایک ایسی دنیا ہے جہاں سوا صداقت کے کسی چیز کا گذر نہیں۔ سوا حسن و جمال کے کوئی شے پیش نظر نہیں۔ جدھر دیکھو نور کی بارش ہے اور انسانی دماغ کی کھیتیاں لہلہا رہی ہیں عقبیٰ کا خوف دنیا کی مسرتوں میں تبدیل ہو چکا ہے اور خدا کا ڈر انسانیت کی محبت میں۔

○ ○ ○

ملاحدہ دور حاضر کے نقطہ نظر سے
(3) مذہب کا مستقبل

اس وقت دنیا مذہب کی طرف سے کافی بدگمان ہو چکی ہے اور اس کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے لیکن یہ خیال کرنا کہ یہ مغرب کے اسی عہد کی برکت ہے درست نہیں۔ مذہب کی طرف سے انحراف کب اور کیونکر شروع ہوا اس کا سراغ لگانے کے لیے ہم کو یورپ کی ذہنی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اس درجہ کو ہم دور "نشاۃ ثانیہ" (RENAISSANCE) یا یورپ میں تہذیب و تمدن کی دوبارہ پیدائش کے نام سے یاد کرتے ہیں' زندگی کے مختلف مسائل پر بحث کرنا ایک عام تفریح ہو گئی تھی۔ اس زمانہ میں علمی تحقیق و تجسس کا وہ جوش و ولولہ پایا جاتا تھا جو یورپ میں روم کی قیصریت کے فنا ہونے کے بعد پھر کبھی نہیں دیکھا گیا۔ لوگوں کو اس وقت یہ پتہ چلا کہ دنیا میں ایسے بھی مسائل پائے جاتے ہیں جن کا نہ انجیل میں تذکرہ ہے اور نہ جن کے متعلق پادریوں کی زبانیں کھلتی ہیں چنانچہ ایسے ہی مسائل زندگی پر لوگ اکثر آپس میں بحث کیا کرتے تھے۔ اس چیز کی ابتداء سب سے پہلے اٹلی میں ہوئی اور پھر یہ مباحث انگلستان اور فرانس تک پھیل گئے۔

اٹلی کا ایک مشہور اور سابق پادری گیارڈنبرورو (GIORDENS BRORU) جب تک قتل ہونے سے محفوظ رہا برابر پادریوں اور ان کی مہمل تعلیمات پر اعتراض کرتا رہا اور پھر اس نے لندن کو اپنا مستقل قیام گاہ بنا لیا۔ یہاں اس نے اور سرفلپ سڈنی نے (جسے انگلستان میں ایک "بے داغ ہستی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) منکرین کا ایک ایسا حلقہ بنایا جو انسان اور کائنات پر بحث کیا کرتا تھا۔

چونکہ اس دور کے اکثر افراد ملحدانہ خیالات کے بھی حامل تھے اس لیے وہ مذہب کے مستقبل پر بھی بحث کیا کرتے تھے ان میں سے مشہور ڈراما نویس کرسٹو فرمارلو اور ملکہ الزبتھ کا مشہور درباری سروالٹر ریلے ایک قسم کا کلب بنائے ہوئے تھے جہاں مذہب کے مستقبل پر انتقاد و تبصرہ ہوا کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ مذہب عیسوی باطل

ہے کیونکہ عملی و تاریخی تحقیقات عیسویت کے افسانوں کو جھٹلا رہی تھیں جہازراں ایسے ممالک دریافت کر رہے تھے جو کبھی عیسیٰ کے خواب میں بھی نہ آئے تھے۔ نجم کائنات کے بارے میں ایسے انکشافات کر رہے تھے جو عقل انسانی کی محدود چہار دیواری کی بنیادوں کو متزلزل کیے دے رہے تھے'

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ تحقیق وہ جستجو صرف ان لوگوں تک محدود تھی جن کے پاس فرصت تھی' دولت تھی اور جو تمام دنیاوی علائق سے بے نیاز ہو کر اپنا سارا وقت اسی قسم کی تحقیق و تجسس میں صرف کرتے۔ ورنہ قوم کے زیادہ افراد جاہل تھے وہ مطلق نہیں جانتے تھے کہ تحقیق جدید کیا ہے اور جب کسی بے دین یا ملحد کو زندہ جلتے ہوئے دیکھتے تو خوش ہوتے تھے الغرض تعلیم یافتہ لوگ تو مذہب کو ناپسند کرتے تھے اور اس کے اصول سے انھیں اختلاف تھا لیکن قومی مصالح کی خاطر انھیں اپنے مذہب پر قائم رہنا پڑتا تھا۔

مگر ان تمام مباحث کے دوران میں ایک چیز کا فقدان تھا اور وہ "ارتقا" کا خیال تھا کسی کو یہ تصور بھی نہیں تھا کہ نظام معاشرت کسی وقت بدل جائے گا حتیٰ کہ جب سرٹامس مور نے اپنی مشہور کتاب اٹوپیا (UTOPIA) لکھی تو بھی اسے "باغی" نہیں سمجھا گیا کیونکہ اس کتاب کے تجویز کردہ نظام معاشرت کے قوانین بالکل بعید از قیاس سمجھے گئے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے انگریزی میں وہی چیز لکھی تھی جو اٹھارہ صدی قبل یونانی زبان میں افلاطون لکھ گیا تھا۔ تہذیب جدید کے نئے قوانین لوح آسمان پر لکھے جا چکے تھے مگر انسان کی آنکھیں اتنی ضعیف تھیں کہ وہ انھیں نہیں دیکھ پاتی تھیں اور اوہام پرستی کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں'

لیکن اب ہماری نگاہوں میں زیادہ بصیرت پیدا ہو گئی ہے اور ہم ان مسائل کو ایسی صداقت کے معیار پر کھتے ہیں جس سے پہلے لاعلم تھے "اب قانون وقت" یا "حقیقت" کا لفظ "ترقی" (PROGRESS) میں مضمر ہے۔

اگر واقعی نظام اشیاء کا کوئی قانون ابدی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ ایک نظام کو دوسرے نظام میں تبدیل ہونا پڑے گا جیسے رات دن میں تبدیل ہوتی ہے۔ بہار خزاں سے بدلتی ہے اور بچپن جوانی سے بدل جاتا ہے ابھی تک ہم اپنے "بزرگوں کی عقل" کی مثالیں پیش کیا کرتے تھے مگر موجودہ زمانہ میں اس فقرہ کو جو استعمال کرے اسے بالکل احمق سمجھنا چاہیے۔

ہمارے آباؤاجداد نہ ہوائی جہاز بنا سکتے تھے نہ ریل چلا سکتے اور نہ موٹر تو پھر ہم انھیں اپنے سے زیادہ عقلمند کیوں تسلیم کریں۔

بہرحال مذہب کو بھی بدلنا ہے اور نصف سے زیادہ دنیا اس کو تسلیم کر چکی ہے وہ لوگ جن میں غور کرنے کی استعداد و صلاحیت موجود ہے اور ہمارے زمانے کے وہ تعلیم یافتہ مرد و خواتین جن کو پڑھنے اور تصویر کے دونوں رخ دیکھنے کا موقع ملتا ہے ان میں سے اکثریت کو اس امر کا یقین ہو چکا ہے کہ مذہب مٹ جائے گا۔ اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ انسانی آراء کی دوسری منزل کیا ہو گی۔

وہ پیشین گوئیاں جو ادبیات کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں۔ قابل تسلیم نہیں اٹھارویں صدی کے آغاز میں بالمیز (BALMES) نے کہا تھا کہ پروٹسٹنٹ تہذیب (جرمنی ہالینڈ وغیرہ) کی ختم ہو رہی ہے' دنیا کے لیے پروٹسٹنٹ مصلحین کا پیغام بے اثر ثابت ہوا ہے اور کیتھولک سلطنتیں مثلاً فرانس' اسپین' پرتگال' آسٹریلیا وغیرہ دراصل دنیا کی حکمران بن رہی ہیں مگر اس پیشین گوئی کے نصف صدی بعد یہ دیکھا گیا کہ کیتھولک ممالک تنزل پذیر ہیں یا یہ کہ وہ اپنے سابقہ مذہب کو ترک کر چکے ہیں عوام نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ پیس ثانی (PIUS II) آخری پاپائے رومہ ہے۔ اس کے نصف صدی بعد لارڈ میکالے نے لکھا کہ پاپائے روم کا جھنڈا اڑتا ہی رہے گا۔ آج سے بیس برس قبل ایک پیشین گوئی یہ کی گئی کہ کیتھولک مذہب سب سے پہلے نیست و نابود ہو گا۔ اس کے بعد ایچ۔ جی ولس نے یہ کہا کہ آج سے ایک ہزار برس کے بعد جدید شہروں میں بھی پیادہ پا راہب چلتے ہوئے دکھائی پڑئیں گے۔

لہٰذا اس قسم کی پیشین گوئیوں کو سچا تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ گزشتہ عہد کی پیشین گوئیاں سیاسی یا فوجی نقل و حرکت اور تحریکات کی وجہ سے غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اب جو پیشین گوئی کی جائے وہ بھی غلط ثابت نہ ہو مذہب کے بارے میں آج یہی نظریہ ٹوکیو میں بھی پایا جاتا ہے اور بیجنگ میں بھی' بمبئی میں بھی اور قاہرہ میں بھی۔ قسطنطنیہ میں بھی اور میکسیکو میں بھی۔

غرض کہ مقامی حالات کچھ ہوں اقوام عالم ان مسائل پر اس وقت تک رائے زنی کرتی رہیں گی جب تک ان کا منطقی حل نہ معلوم ہو جائے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس منطقی حل معلوم کرنے کے شرائط ہر دس برس کے بعد بدل جاتے ہیں ان میں سب سے بڑی شرط "

علم" ہے ہم جانتے ہیں کہ ہر عہد میں ایک الحاد پسند قلیل اقلیت یونان' روم' قرطبہ' فلورنس اور تقریباً" ہر مقام پر پائی گئی اور آخر میں اس اقلیت کا خاتمہ ہو گیا لیکن یہ نتیجہ تھا اس امت کا کہ "کلچر" صرف اعلیٰ طبقوں تک محدود تھا اور اب یہ "کلچر" جمہوری ہے آج 50 کروڑ انسان پڑھ سکتے ہیں اور 50 برس کے بعد ان کی تعداد دو چند ہو جائے گی'

پھر یہ تو درست ہے کہ دنیا ہمیشہ مذہب کے بارے میں بحث کرتی رہے گی لیکن یہی کیوں فرض کر لیا جائے کہ ان مباحث کا منطقی نتیجہ الحاد و بے دینی کی صورت میں ظاہر ہو گا اور یہ کہ کیا یہ چیز ان پیشین گوئی کرنے والوں کا رسمی "فریب" (FALLACY) نہیں ہے۔

ہر پیشین گوئی کی سب سے بڑی کمزوری پیشین گوئی کی خود سری ہے وہ اپنے آپ کو اتنا عقلمند تصور کر لیتا ہے کہ جو کچھ اس کے خیالات ہیں آنے والی نسل ان کو بے چون و چرا قبول کرلے گی خصوصاً" سیاسی و اقتصادی نظریات کی دنیا میں کہ کتابوں اور واعظوں کے لکچروں کو جب کوئی شخص دیکھتا اور سنتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ کیتھولک کو یہ یقین رہتا ہے کہ ساری دنیا اسی کی ہم خیال بن جائے گی' موحد کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ وقت آنے والا ہے جب وحدانیت تمام عالم کا ایمان بن جائے گا لیکن جب جارج برنارڈ شا آتا ہے تو وہ ان سب خیالات کو ٹھکرا کر ایک نئی بات کہتا ہے کہ مستقبل کا مذہب کیا ہو گا؟

الغرض ان معاملات میں صورت حال یکساں ہوتی ہے پیشین گوئی کے دلائل بہت سادہ ہوتے ہیں وہ سمجھتا ہے کہ حقیقت و صداقت سے میں آشنا ہوں اور چونکہ تمام دنیا میری ہی طرح صداقت پرست ہونے والی ہے لہٰذا میری بتائی ہوئی صداقت کو ضرور تسلیم کیا جائے گا۔

مگر میں اپنے نظریہ کو اس طرح نہیں ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ مذہب اپنی ہر شکل میں ایک دھوکا ہے۔ ایک وہم ہے اور میرا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اور انسانی فطرت کے پاس وہ ذرائع و اختیارات موجود ہیں جن کو مذاہب عالم نے ہم میں بڑھنے سے روکا ہے اور جب یہ تمام مظالم اور تمام دھوکے ختم ہو جائیں گے اور جب انسان کو اپنی صحیح طاقت کا اندازہ ہو جائے گا تو ایک ایسا نظام تیار ہو گا جو موجودہ نظام سے کہیں زیادہ خوش گوار اور دلکش ہو گا۔

میں یہ اس وجہ سے نہیں کہتا کہ میرا یہ عقیدہ مجھے "اصل صداقت" یا حقیقت معلوم ہوتا ہے بلکہ میں یہ اس واسطے کہتا ہوں کہ دنیا اسی سمت جا رہی ہے آگے چل کر میں "

مذہب" کی داستان مختصر الفاظ میں بیان کروں گا۔

تجربہ سابق

مذہب کی داستان کئی ہزار برس کی پرانی داستان ہے اور مذہب کی ابتداء تلاش کرنے کے لیے ہم کو عہد حجری سے بھی قدیم تر زمانہ کی طرف نظر دوڑانی پڑتی ہے لیکن یہاں کسی مدت پر بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ مدعا صرف یہ کہنا ہے کہ اپنے ابتدائی دور ہی سے مذہبی خیالات میں تدریجی ارتقاء ہوتا رہا ہے۔اس ارتقاء میں کوئی تحریک جذبات نہ شامل تھی بلکہ تفکر و واقعات کا ایک منطقی تسلسل تھا یا جیسا کہ اعتدال پسند مذہبی لوگ کہتے ہیں یہ ارتقا کسی بیرونی قوت کی طرف سے کوئی "الہام" نہیں ہے اور اقوام عالم کی معیار عقل کے مطابق خدا نے اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں ظاہر کیا ہے لیکن واقعات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب پہلے ایک معترت رساں خیال تھا اور رفتہ رفتہ بدتر ہوتا گیا۔

اگر تمام نسل انسانی برابر رفتار سے چلتی تو آج ہم مذہب کی ابتدا اور اس کے ارتقاء کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوتے مگر انسان نے اپنے تجربات صرف 5-6 ہزار برس پیشتر سے محفوظ رکھنا شروع کیے یہاں تک کہ فرضی داستانیں (LEGENDS) بھی بہت پرانی نہیں ہیں لیکن انسانوں کی یہ داستان ہر واقعہ سے اتنا متاثر ہوئی ہے کہ نسل انسانی کے مختلف حصوں نے عام ارتقا میں ہر منزل پر ترقی نہیں کی۔ بہرحال آج ہم دو انسانی سلسلے (SERIES) شمار کرا سکتے ہیں ایک تو ان قبل تاریخ (PRE-HISTORIC) قوموں کا سلسلہ جو لاکھوں برس پہلے گزر رہی ہیں۔ دوسرے وحشیوں کا زمانہ یہ دونوں مدتیں تقریباً یکساں ہیں کیونکہ دونوں زمانہ قبل تاریخ (PRE-HISTORIC) میں گزری ہیں' اور ان قوموں کے خیالات سے تفکر انسانی کے ارتقاء کے گذشتہ منازل ہم کو معلوم ہو سکتے ہیں اس کے بعد تہذیب قدیم کے مذہب کا پرانی عمارتوں سے پتہ چلتا ہے اور پھر ادبیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے بارے میں لوگوں کے کیا خیالات تھے ادب سے گذشتہ تین ہزار برس قبل کے مذہبی ارتقاء کا حال معلوم ہوتا ہے جو مختلف مذہبی مرکزوں مثلاً چین' ہندوستان' ایران' یونان' روم اور مصر وغیرہ میں عیسائیت کے قبل پایا جاتا تھا اور جو سبق اس سے ہم کو ملتا ہے وہ اس کے بالکل مطابق ہے جو اس وقت سے اس وقت تک ہوتا رہا اب بھی ہو رہا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ہر قسم کی آب وہوا اور ہر قسم کی اقتصادی حالت میں مذہب کا ارتقا اتنا یکرنگ و یکساں

رہا ہے کہ خود ایک مذہبی آدمی اس کا مستقبل دیکھ سکتا ہے جن واقعات نے انسانی ترقی کو (ایسے ممالک میں جہاں ترقی کے وسائل تھے) روک دیا وہ لڑائیاں یا ایسی غلطیاں تھیں جو ہمیشہ تہذیب کو مٹاتی رہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ الحاد اسی زمانہ میں پھیلا جب تہذیب اپنے انتہائی عروج پر ہوئی اور جب تخریبی قوتوں نے علم کو مٹا دیا در جہالت کا دور دورہ ہوا تو الحاد کا بھی خاتمہ ہو گیا یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب علم کی ترقی ہوتی ہے تو مذہب کی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں اور جو تہذیب مٹنے لگتی ہے تو اس میں پھر قوت آجاتی ہے۔

مذاہب اور فطرتِ انسانی

میری رائے میں مذہب کی ابتداء کا حال بالکل ایسا ہے جیسے پرانے زمانے کے حبشی کا تصور اپنے سایہ کے بارے میں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر کسی کتے کو عمر میں پہلی دفعہ ژالہ باری سے مرتبہ پڑے تو وہ بے انتہا حیرت زدہ ہو جاتا ہے یا اگر کوئی بلی پہلی مرتبہ کسی کچھوے کو رینگتے ہوئے دیکھتی ہے تو وہ بہت متعجب ہو جاتی ہے اسی طرح زمانہ قدیم کے انسان میں ممکن ہے ایسے رد عمل (REACTION) ہوئے ہوں مگر ان کا مذہب سے اس وقت تک کوئی تعلق نہیں ہوا جب تک وہ یہ خیال نہیں کرنے لگا کہ جو چیز ان کا باعث ہے وہ ایک غیبی طاقت ہے۔

اسی طرح یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ انسان نے پہلے ایک مبہم طاقت کا تصور کیا اور پھر یہی چیز مخصی روحوں (SOULS) میں تبدیل ہو گئی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ روح کا سب سے پرانا نام "سایہ" (SHADOW) ہے اور جب ہم اپنے آپ کو ایک قدیم وحشی کی جگہ دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ غالبا سایہ کا حیرت انگیز وجود پر غور و فکر پہلی چیز تھی جس نے قدیم انسان کے دماغ میں تصور کی جھلک پیدا کی۔ اب سے سو برس قبل جب مشنریوں اور سیاحوں نے وحشیوں کے خیالات کا ریکارڈ رکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کے خیالات اخلاق پر مبنی نہیں ہیں اور بعض کے تو مذہبی خیالات بھی نہیں ہیں بعض "ہمزاد" یا "سایہ" پر یقین کرتے ہیں اور بعض انسان کے "دوسرے حصے" پر جو موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے کامل اعتقاد رکھتے ہیں۔

دوسری منزل یا حیات بعد الموت کا خیال بھی تمام دنیا میں متوازی نظر آتا ہے' یعنی کہ مردوں کی روحیں زندہ رہتی ہیں اور ان کی سرگرمیاں زیادہ بڑھ جاتی ہیں نیز یہ کہ ارواح بہت رنجیدہ اور خشک مزاج ہوتی ہیں گویا زندگی ترک کرنے سے ان کو تکلیف پہنچتی ہے اس

کا اظہار خشونت سے کرتی ہیں یا یہ کہ چونکہ اب وہ کسی کو نظر نہیں آتیں اس لیے وہ ایسے کام کرنے لگتی ہیں جو پہلے گوشت و پوست کی زندگی میں راز کھل جانے کے ڈر سے نہ کر سکتی تھیں' بہرحال وجہ کچھ بھی ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب نے ایک وحشی زندگی کو کچھ عرصہ کے بعد تکلیف دہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان ارواح کو تمام بیماریوں اور مصیبتوں کا ذمہ دار سمجھا جانے لگا اور چونکہ ہر آدمی کے مرنے کے بعد ایک خبیث روح بڑھتی ہے لہٰذا انسانی آبادیاں انھیں ارواح سے معمور نظر آنے لگیں۔ بعد کو وہ زمانہ آیا جب ان ارواح کے لیے خاص جگہیں (مثلاً آسمان یا زمین) میں مقرر کر دی گئیں ان میں سے بعض ایسی بھی سمجھی جانے لگیں جو آدمیوں کی مدد کرتی ہیں لیکن عام نظریہ یہی تھا کہ وہ عموماً شریر ہوتی ہیں۔

مذہبی "مقدسین کا ظہور"

مذہب کے اس ابتدائی دور میں زیادہ اظہار خیال کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم نے انھیں مختصر الفاظ میں ہزاروں برس کے مذہبی ارتقا کا حال لکھ دیا ہے اب مذہب کے ارتقا کی دوسری منزل کو لیجیے جس میں "پادری" یا مذہبی عالم کا ظہور ہوا ہے یہ دور ہر حصہ دنیا میں یکساں طور پر پھیلا جاتا ہے۔ گو وہ ہر جگہ مختلف شکلوں میں آیا ہو' اور یہ جماعت گویا بری روحوں سے مقابلہ کرنے کے لیے پیدا ہوئی تھی اور اس کی پوزیشن بھی ابتداء ہی سے عجیب و غریب تھی ۔ ان ارواح خبیثہ کا مقابلہ کرنے میں مذہبی پیشواؤں کا طریق جنگ ایسا ہوتا تھا کہ بجز وحشیوں کے کوئی بھی اس پر ایمان نہیں لا سکتا تھا وہ معمولی قسم کے "ہپناٹزم" کی مدد سے کسی کو اچھا بھی کر سکتے تھے یا دشمن کو مار بھی سکتے تھے' مگر ان کے تمام کام کا محض اتفاقی واقعات کا نتیجہ ہوتے تھے۔

بہرحال جس وقت مذہبی "بزرگوں" کا یہ گروہ بڑھ رہا تھا اس وقت مذہبی خیال میں بھی وسعت ہونی شروع ہوئی۔ انسانی افراد قبائل میں منقسم ہونے لگے اور ہر قبیلہ کا ایک سردار ہونے لگا۔ یہ سردار دوسری دنیا میں بھی سردار گنا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انسان کی بڑھتی ہوئی قوت متخیلہ نے فطرت میں اور بھی کچھ طاقتور ہستیاں دیکھنا شروع کیں مثلاً سانپ، شیر وغیرہ اور آخر کار تمام نظام فطرت میں اسے ارواح ہی ارواح نظر آنے لگیں رفتہ رفتہ ان میں سے بعض "ارواح" دیوتا بن گئیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ مذہبی بزرگوں کی طاقت میں بھی

اضافہ ہونے لگا یعنی جتنا بڑا دیوتا ہوتا تھا اتنا ہی عظیم المرتبت اس کا پوجاری ہوتا تھا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر کسی دیوتا کے پجاری زیادہ طاقت ور ہوئے تو انھوں نے اپنے دیوتا کو نہ صرف دوسروں سے بڑھ کر ثابت کرنے کی کوشش کی بلکہ ان کو دوسرے دیوتاؤں کا یا تو سردار بنا دیا یا دوسروں کو شیطان ثابت کر دکھایا۔ مصر' بابل' اور چین میں بھی ہر جگہ یہی ہوا۔

گناہ کا بھوت!

لیکن وہ ترقی بھی بہت اہم تھی جو ان حالات کے ساتھ ساتھ مذہبی و اخلاقی خیالات میں الگ الگ نشو نما پا رہی تھی۔ اخلاقیات کا دور اس وقت سے شروع ہوا جب لوگوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ ان کے قبائلی مراسم ایک قانون ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہے یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ان کے گذشتہ سرداران قوم جو بہت عقل مند تھے مرنے کے بعد بھی دیکھ رہے ہوں گے کہ ہمارے قبائلی قوانین پر ہمارے جانشین کہاں تک عمل کرتے ہیں گویا مذہب یہیں سے "اخلاق" کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

اس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مذہب نے بہت جلد معلم اخلاقیات ہونے کی حیثیت حاصل کر لی لیکن تاریخ مذاہب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اس وقت تک اخلاقی نہیں ہوا جب تک کہ اس کا معیار بہت اونچا نہیں ہو گیا کہیں کہیں لوگ یہ خیال کر لیا کرتے تھے کہ ان کے دیوتا خرابی اخلاق سے ناراض ہو جاتے ہیں' مگر زیادہ تر مذاہب میں اخلاقی عنصر نہیں پایا جاتا تھا۔ انصاف ایک تمدنی چیز تھا۔ یعنی اگر ایک آدمی دوسرے کے ساتھ ناانصافی کرتا تو دوسرا اپنا انتقام لے سکتا تھا لیکن دیوتا عموماً" کاہل ہوتے تھے جن کو ہر بات میں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا اور ان کی بہترین خدمت یہی سمجھی جاتی تھی کہ وہ اوپر اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے اپنے بندوں کی قربانیوں کی خوشبو سونگھتے رہیں۔

شہوانی تعلقات سے بھی مذہب کو بہت عرصہ تک لگاؤ نہیں رہا پرانی سوسائٹی میں ایک انسان کسی شہوانی غلطی کا مرتکب اسی وقت سمجھا جاتا تھا جب وہ کسی دوسرے کی بیوی یا لڑکی کی عصمت خراب کرے اور اس کا یہ فعل صرف یہ حیثیت رکھتا تھا' گویا ایک آدمی نے دوسرے آدمی کے مال کو چرا لیا اس کو نقصان پہنچایا مگر تعدد ازدواج پھر بھی عام چیز تھی' عیسائی مبلغین کہتے ہیں کہ لوگوں کو گناہ کا خیال ہی نہیں ہوتا تھا اور یہ سچ ہے۔ ان کی سمجھ

میں یہ نہ آتا تھا کہ ہم اپنی روزی جاہے جس طرح پیدا کریں لیکن خدا ناراض نہ ہو اور انفسانی خواہشات کسی طرح پوری کریں تو وہ برہم ہو جائے۔ بہرحال نسل انسانی کا ایک حصہ سن عیسوی کی ابتداء تک اعضاء شہوانی کی پرستش کرتا رہا اور دوسرے حصہ کا مذہب اخلاقی رہا۔ 6 ہزار برس قبل جب مصر میں تہذیب کی ابتداء تھی تو اسیرس (ASSYRIS) مردوں کا جج سمجھا جاتا تھا اور اس کے قانون میں ناجائز شہوانی تعلقات کی سزا بہت سخت تھی اسی طرح شہنشاہیت بابل کے زمانہ میں بھی زنا وغیرہ کی سخت سزائیں تھیں'

غرض کہ گناہ کا خیال سن عیسوی کی ابتداء سے بہت قبل پیدا ہو گیا تھا ان کی داستان حسب ذیل پانچ حصوں مین منقسم ہو سکتی ہے۔ (1) پتھر کے اوزار معلوم ہونے سے قبل لاکھوں برس پیشتر کا زمانہ (2) پتھر کے زمانہ سے قبل تقریباً پانچ لاکھ برس پیشتر کا زمانہ (3) پتھر کا زمانہ (اب سے 4-3 برس ہزار پیشتر کا زمانہ) (4) نیا پتھر کا زمانہ (تقریباً 20 ہزار برس قبل مسیح سے 3500 برس قبل مسیح تک) (5) تاریخی زمانہ مذہب کی ترقی خاص طور پر نئے پتھر کے زمانہ سے ہونا شروع ہوئی ہے اور اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ مصر و بابل میں اخلاقی اور مذہبی خیالات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔

یہ ترقی بالکل قدرتی تھی۔ ایک طرف تو دیوتا تھے جو قوم کے اخلاق و عادات کی نگرانی کیا کرتے تھے دوسری طرف پادری یا مذہبی پیشوا تھے جو یہ ثابت کرتے تھے کہ خدا بدمعاشوں کو سزا دیتا ہے۔ بابلی یہ سمجھتے تھے کہ ہر مصیبت اور بیماری گناہوں کی پاداش ہے اور وہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک مذہبی پیشواؤں کی وساطت سے دیوتا گناہ گار کو معاف نہ کر دے' اسی طرح مصریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک اسیرس معاف نہ کر دے مرنے کے بعد گناہوں کی سخت سزا ملتی رہے گی۔ ایران میں یہ خیال تھا کہ مزدہ ایک دن تمام دنیا کو تباہ و برباد کر دے گا۔ عبرانیوں کا بھی اسی طرح عقیدہ تھا یونانیوں کا مذہب جزوی طور سے اخلاقی ضرور تھا مگر (OLD-TESTAMENT) تحریر کیے جانے سے قبل ان کا بھی یہ خیال تھا کہ اگر روح گندی ہو جائے تو انسان کو حیات ابدی اس وقت تک میسر نہیں ہوتی جب تک وہ توبہ اور بعض مراسم کر کے پاک نہ ہو جائے۔

رہا یہ سوال کہ مذہبی و اخلاقی قوانین و خیالات کا اختلاط قوم کے لیے مفید تھا یا نہیں؟ سو اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زیادہ مناسب یہ تھا کہ اخلاقی قانون پر مذہبی اثرات کے تحت عملدرآمد کرایا جائے۔ اور ایک شخص کی اخلاقی حالت کے مطابق

سزا و جزا دی جائے مگر واقعہ یہ ہے کہ انسان اپنے عقائد کے ساتھ اپنے چال چلن کے باب میں جتنا زیادہ غیر منطقی رہا ہے اتنا اور کسی معاملہ میں نہیں رہا۔ کہا جاتا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں عیسائی قوموں کے درمیان اخلاقی قوانین (خصوصاً جنسی تعلقات کے بارے میں) بہت سخت تھے مگر پھر بھی ہمیں کوئی خطہ (بجز مشرقی بحرروم کے جہاں اعضائے شہوانی کی پرستش ہوئی تھی) ایسا نظر نہیں آتا جو زمانہ وسطیٰ کی ان قوموں سے زیادہ خراب چال چلن رکھتا ہو اس لئے یہ نظریہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

گناہ کا خیال جنسی تعلقات کے علاوہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اخلاقی قانون کے مصنف دیوتا ہی ہیں مگر ایسے ثبوت کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ ان کے خیالات سے قوم یا نسل کی اخلاقی حالت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا' کنفوشش۔ بودھ' زینو (ZENO) اور اپی کورس (EPICURAS) سب نے ایسے اخلاق کا درس دیا جس میں خدا کا نام نہ تھا مگر پھر بھی اپنی قوم پر ان کا اتنا ہی اثر تھا جتنا کہ کسی اور مذہبی معلم اخلاق کا۔

ایک عیسائی جو اس مسئلہ پر بحث کرنا چاہے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ گناہ کے مذہبی و اخلاقی خیال نے جنسی تعلقات کو زیادہ خوش گوار بنا دیا حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے کیونکہ پانچویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی عیسوی تک جنسی اخلاقیات بہت آزاد رہا ہے جنسی تعلقات کے بارے میں اخلاقی درس کی بنیاد کا پتہ زمانہ قبل تاریخ میں ملتا ہے یعنی ان اوہام میں جن سے ہم کو اب تنفر ہے۔

ایک اور خیال یہ تھا کہ دیوتا چاہتے ہیں کہ ان کے لیے قربانیاں کی جائیں اور جتنی زیادہ قیمتی قربانیاں کی جائیں گی اتنا ہی وہ خوش ہوں گے دراصل یہ نہایت طفلانہ نظریہ ہے کہ دیوتا بھی اتنے ہی خود سر اور جابر ہوں جتنا ایک مطلق العنان اور ظالم بادشاہ۔ مگر پھر بھی یہ اصل ہے اس دوشیزگی کی جس کی حضرت عیسیٰ نے تعریف کی ہے اور ان مقدس قسموں کی جو مذاہب یا راہبہ آج بھی کیتھولک فرقوں میں کھایا کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس حصہ میں بھی (یعنی شاہی علاقہ میں) جو گناہوں کا مرکز تھا اور جہاں زنا کاری ایک قسم کی عبادت شمار کی جاتی تھی۔ ایک ایسی قسم کے زہد و اتقا کا دور دورہ ہوا جو راہبوں کی پرہیزگاری سے بڑھ کر تھا چنانچہ سائبل (SYBELE) کی پجارنیں اگر اپنے خوب صورت جسموں کو مندر میں پرستش کے لیے آنے والوں کے حوالے کر دیا کرتی تھیں تو دوسری طرف پجاریوں کو بھی اپنی انثیین کاٹ کر مندر پر چڑھانے پڑتے تھے۔ گویا ایک ہی آسمانی رحمت کے سایہ میں

انتہائی عیاشی اور انتہائی زہد و اتقاء دونوں پروان چڑھ رہے تھے۔

بے دینی یا الحاد کا عروج!

آخری اخلاقی مذہبی ترقی حضرت عیسیٰ کے ایک ہزار برس قبل ہوئی یہ زمانہ تاریخ کے لیے بہت اہم شمار کیا جاتا ہے اور یہاں مذہب کی داستان نہایت اہم ہو جاتی ہے۔

ہرچند زمانہ تاریخ کے آغاز میں .ب لوگوں کو لکھنا بھی آگیا تھا۔ مذہب میں کئی خداؤں کے ماننے کا رواج پیدا ہو گیا تھا۔ یعنی ہر قوم میں ارواح کے علاوہ دیوتا بھی کثیر تعداو میں پائے جاتے تھے اور ہر دیوتا کے الگ الگ پجاری اور مندر ہوا کرتے تھے اور ہر فرقہ کے مراسم بھی جداگانہ ہوتے تھے لیکن حضرت عیسیٰ سے دو ہزار قبل ہی روحانی خدا کا عقیدہ پیدا ہو گیا تھا چنانچہ عبرانی پادری جنھوں نے پرانی انجیل (OLD TESTMENT) ایرانیوں اور بابلیوں کے اثرات کے تحت لکھی تھی۔ اپنے مزقی بادشاہ سائرس (SYRUS) کو موحد مانتے ہیں۔ قر-بلی (CRETONS) بھی ہزاروں برس سے موحد تھے اور صرف زمین کو اپنا دیوتا تسلیم کرتے تھے۔ تعلیم یافتہ چینی بھی آسمان کو اپنا خدا مانتے تھے اور حضرت عیسیٰ سے پانچویں یا چھٹی صدی قبل جب یونانی فلاسفر ایک خدا کا ذکر کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ وحدانیت عام ہو چکی ہے۔

مگر اس خدا کی نسبت بھی انکار اور الحاد کا دور اسی وقت شروع ہو گیا جب سے علم میں اضافہ ہونے لگا اور یونانی مفکرین نے بھی بے دینی پھیلانی شروع کی' چنانچہ تھیلس (THALES) اناکس مندر (ANAX MANDER) دیما قرطیس (DEMA CRITUS) وغیرہ کے نزدیک خدا صرف نام ہی نام ہے اسی طرح تیسری صدی قبل مسیح کے اسٹوئک (STOIC) اور ا-پیکورین (EPICUREAN) طبقے پورے مادہ پرست تھے۔

اب ذرا غور سے دیکھیے مصر میں حضرت عیسیٰ سے ایک ہزار برس قبل زوال کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے اس کی علمی ترقی ختم ہو گئی اور وہاں بہت سے نئے نئے مذہب پیدا ہونے لگے۔ بابل کو اسی زمانے میں اسیریا (ASSYRIA) نے تباہ کر دیا تھا مگر ہندوستان اور چین نے اپنی اپنی تہذیب قائم رکھی اور اپنے الحاد سے تمام تعلیم یافتہ طبقہ کو منسلک کر لیا۔ البتہ ہندوستان میں ایک جابلانہ رد عمل ہوا اور گوتم بدھ نے جو تعلیم دی تھی وہ کالعدم ہو گئی۔ چین کے اعلیٰ طبقہ میں مذہب نے کبھی اقتدار نہیں حاصل کیا اور یہ اثر جاپان تک

پھیلا جہاں کہا تعلیم یافتہ طبقہ بھی بے دینوں میں شامل ہے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جہاں کہیں آزادی خیال لوگوں کو نصیب تھی وہاں مذہب خواہ وہ وحدانیت ہی کا کیوں نہ قائل ہو بے دینی میں بدلنے لگا تھا یونانیوں کے تجربات اولین سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے ان لوگوں میں تحصیل علم و اشاعت کا اس قدر شوق تھا کہ انھوں نے تین صدیوں میں سائنس اور فلسفہ کی اتنی اشاعت کی کہ مصر اور بابل تین ہزار برس میں بھی نہ کر سکے تھے۔ اور یہ سب کے سب بے دین یا منکر دین تھے۔ ہمارے پاس ان کی کتابیں موجود نہیں ہیں مگر بعد کے یونانیوں نے ان کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بالکل مادہ پرست تھے اور ان کی کائنات مادی کائنات تھی اور ساری طاقت جاہل عوام کے ہاتھوں میں تھی اس وقت وہاں ایک خاص مذہبی عصبیت کی لہر دوڑ گئی اور مفکرین کو بہت اذیتیں برداشت کرنا پڑیں حتیٰ کہ سقراط کو بھی جو خدا پرست تھا جان دینا پڑی اور افلاطون کی بھی کسی نے نہیں سنی مگر جب دوبارہ علم کی اشاعت ہوئی تو پھر بے دینی میں ترقی شروع ہوئی۔ اس کے بعد آخری زوال سے کچھ ہی زمانہ قبل ایتھنز میں تہذیب اپنے عروج پر تھی تو مذہب حتیٰ کہ افلاطون کی عقلی خدا پرستی کا بھی زوال ہو چکا تھا۔ اس کے بعد یونان کی تہذیب اسکندریہ کی طرف منتقل ہو گئی اور گو ہم اسکندریہ کے ماہرین سائنس و ماہرین ریاضی کے خیالات سے کم واقف ہیں مگر ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ وہ عموماً بے دین اور منکر تھے۔ اس کے بعد تہذیب روم میں پہنچی اور وہاں اگرچہ عوام مذہب کے پیرو تھے مگر تعلیم یافتہ طبقہ میں وہی بے دینی پائی جاتی تھی جو اپی کورئین کے الحاد اور اسٹوئک کے اخلاقیات سے مل کر پیدا ہوئی تھی۔

الغرض ایک ہزار سال کی مدت جو 600 برس قبل مسیح سے شروع ہو کر 400 برس بعد مسیح تک جاری رہی اور جس پر "پرانی دنیا" کا اختتام سمجھا جاتا ہے تاریخی اہمیت سے بھری ہے۔ ابھی تک علم صرف پادریوں اور پجاریوں تک محدود تھا اور "مندر" اور عبادت گاہوں کے لیے حاصل کیا جاتا تھا۔ البتہ بابلی نجوم میں ترقی کر رہے تھے مگر اس کے بعد دنیا کے ہر حصہ مثلاً چین، ہندوستان، ایران، یونان، مصر اور روم میں مفکر اور معلم پیدا ہونے لگے، اور الحاد کا پھر عروج ہو گیا۔ فیثا غورث اور افلاطون وغیرہ چند مفکرین نے مذہب کو بے دینی کی اس زد سے بچانا چاہا مگر ان کا اثر زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوا سن عیسوی کی ابتداء کے وقت تعلیم یافتہ لوگ عموماً بے دین تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر مغربی تہذیب مٹ نہ گئی ہوتی تو

تعلیم یافتہ چین اور جاپان والوں کی طرح مستقل طور پر بے دین ہو جاتے ہیں۔

خود دور آخر کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ طبقہ اوسط کی تہذیب کی وسعت گویا بے دینی کی وسعت تھی۔ رومیوں نے عوام میں تعلیم پھیلانی شروع کر دی تھی۔ ابتدائی تعلیم اور مدرسہ ہر شخص کے لیے عام تھا۔ اکثر کو ثانوی تعلیم دینے کی کوشش کی جاتی تھی اور چند کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں بھی مدد دینے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور اگر یہی سلسلہ جاری رہتا تو مذہب بے دینی پر جا کر ختم ہو جاتا مگر بدقسمتی سے اس کے بعد 15 سو برس تک ایک ایسا زمانہ گزرا جب کلچر دفن کر دیا گیا۔ غور و فکر کی آزادی سلب کر لی گئی اور انسانی دماغ کو معمولی کام کرنے سے بھی روک دیا گیا تھا۔

عیسائیت کی سچی داستان

یہ پندرہ سو برس کی مدت وہی ہے جسے عہد عیسویت کہا جاتا ہے یعنی چوتھی صدی عیسوی کے نصف آخر سے (جب یورپ میں عیسائیت بہ جبر پھیلائی گئی) انیسویں صدی کی نصف آخر تک (جب آزادی عقائد مل گئی تھی) سائنس کی اشاعت ہونے لگی تھی، عوام کو تعلیم دی جانے لگی تھی اور عیسائیت اکثریت کے مذہب کی حیثیت سے ختم ہو چکی تھی یہ وہ عہد تھا جب یورپ و امریکہ میں عظیم الشان اکثریت کا مذہب عیسائیت تھا۔

اس کے بعد وہ باہم گر بہت مختلف ہو گئے اور یہ اختلاف علمی و جذباتی دونوں طرح کا تھا کیونکہ ایک شخص کسی معاملہ کا بہت بڑا ماہر ہو سکتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ مذہبی مسائل میں اس کی معلومات بہت ہی ناقص ہو سکتی ہیں۔ ایک آدمی خاص علم کے باب میں ایک زبردست نقاد بن سکتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ مذہب کے متعلق بھی انتقادی اہلیت رکھتا ہو۔

غرض دو ہزار برس پیشتر بھی مختلف اسکول پائے جاتے تھے ایک ایپکوریس جو روحانیت یا مذہب کے خیالات کو پس پشت ڈال کر انسانی مسائل کو انسانی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اور دوسرا متصوفانہ (جس میں فیثا غورث، فلاطون، مارکس وغیرہ شامل تھے) دوسرے قسم کے مفکرین نئے مذاہب چاہتے تھے، چنانچہ کئی مذاہب قائم بھی ہو گئے حضرت عیسیٰ نے سب سے پہلے یہ "روحانی" تعلیم دی کہ عیش و عشرت سے نفرت کی جائے اور گناہ سے خوف کیا جائے، یہ نظریہ عیسیٰ کی پیدائش سے بہت قبل تمام دنیا میں پھیل چکا تھا اور سقراط، فیثا غورث،

فلاطون' مصر و ایران وغیرہ کے متعدد مفکرین کی بھی تقریباً" یہی تعلیم تھی۔ حتیٰ کے سائبل (محبت کی ایک دیوی) کا شہوت پرست مذہب بھی اپنے پادریوں (مذہبی پیشواؤں) کو خصی ہوجانے پر مجبور کرتا تھا۔

پہلی صدی قبل مسیح کی یونانی' مصری اور رومی دنیا اس قسم کی روحانیت سے بھری تھی۔ اس کے بعد عیسیٰ کے ماننے والوں کو تاریخ کے صفحات پر اس وقت آنے کا کوئی امکان نہ تھا جب تک پال (PAUL) نے عیسیٰ کو خدا نہیں بنا دیا اور ان کی موت کے افسانے تیار نہیں کروئے اس کے بعد یونانی عیسائیوں نے عیسیٰ کی ایسی سوانح عمریاں لکھنی شروع کیں جن میں مختلف مذاہب کے توہمات اور فرضی افسانے حضرت عیسیٰ سے منسوب کر دئے گیے اور اس صورت سے جو نیا مذہب تیار ہوا وہ یونان کے خیالات کا ایک مجموعہ تھا اس نئے تیار شدہ مذہب میں ایک بھی خلاقی خیال ایسا نہ تھا جو ان کا اپنا ہو۔ کیونکہ اس طرح کے افسانے اس وقت تک تمام مذاہب میں عام طور سے پائے جاتے تھے۔ اور اس لحاظ سے حضرت عیسیٰ کی تصویر تموز (TAMMUZ) اسیرس (ACRIS) اڈونس (ADONIS) وغیرہ کی روایات سے لی گئی تھی۔ مگر پھر بھی یہ نیا مذہب تین سو برس تک یونانی اور رومی دنیا میں کوئی اہمیت نہ حاصل کر سکا۔ البتہ اس میں ایک خاص بات یہ ضرور پیدا ہو گئی کہ حضرت عیسیٰ کے مفروضہ احکام اور مشن کے خلاف پادریوں نے مخصوص مذاہب (DOGMAS) پیدا کر لیے تاہم 500ء تک وہ اپنے حلقہ میں 10 لاکھ سے زیادہ حلقہ بگوش پیدا نہ کر سکے اور اب گذشتہ نصف صدی میں وہ 10 کروڑ عقیدت مندوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ عیسوی کی یہ داستان کہ عیسائیوں کا متعدد مرتبہ قتل عام ہوا یہ بھی اب غلط سمجھی جاتی ہیں اور تعلیم یافتہ لوگ ان قصوں کو نہیں مانتے صرف چند آدمیوں کے قتل کا حال بے شک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے ورنہ باقی افسانہ ہی افسانہ ہے۔

سب سے بڑا اور خاص "قتل عام" تیسری صدی عیسوی میں ہوا تھا۔ جب عیسائیوں نے شہنشاہ روم سے گستاخی کی تھی۔

اس گستاخی کی سزا میں جب قتل عام شروع ہوا تو اس وقت عیسائیوں میں صرف دو قسم کے طبقے تھے اور تمام روم میں ان کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ان کے علاوہ کچھ مغربی یورپ میں بھی پائے جاتے تھے چنانچہ اس سزائے عام میں کچھ لوگ تو اٹلی کے مارے گئے اور کچھ دوسرے حصوں کے۔ لیکن روم کے چند ہزار عیسائیوں کی اکثریت نے اپنا مذہب

بدل دینا منظور کر لیا اور جب چوتھی صدی کا آغاز ہوا تو عیسائیت کی حالت نہایت ذلیل و خوار تھی۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ مسلمان تو دو سو برس میں تین تہذیبوں کے مالک ہو گئے اور عیسائیت تین سو برس کے بعد بھی دیوالیہ ہی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی لٹریچر میں تاریخ کا حصہ انتہائی کذب بیانی پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد شہنشاہ قسطین نے جو ایک رومن افسر اور شراب خانہ کی ایک فاحشہ عورت کا لڑکا تھا جنگ کر کے تخت سلطنت حاصل کیا اور اس نئے مذہب کی سرپرستی کرنے لگا۔ یہ سوال کہ خود اس نے اس مذہب کو کہاں تک قبول کیا متنازع فیہ ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ اس نے اس مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ مراعات کیں' اس مذہب کے قبول کرنے والوں کی ہمت افزائی کی اور اپنے لڑکوں اور جانشینوں کو عیسائیت کی تعلیم دی۔ لیکن پچاس برس کے شاہی اثرات اور مشرق میں جور و ظلم کے باوجود عیسائیت صرف اقلیت تک محدود رہی اور روم کے تقریباً" تمام امراء "کافر" ہی رہے آخر کار قیصران روم کو اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ تمام روم کو بہ جبر عیسائی بنائیں چنانچہ اس طرح اور صرف اسی طرح صلیب نے اپنے حریفوں کے معبدوں پر فتح حاصل کی اور یہ ایسے تاریخی واقعات ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔

دوسری تاریخی غلطی کی تصیح یہ ہے کہ عیسائیت کے پھیلنے کے بعد اخلاقیات میں کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ سو برس کے اندر اندر یورپ میں زمانہ جاہلیت کی یاد پھر تازہ ہو گئی۔ یہ اس حقیقت کے بالکل منافی ہے کہ عیسائیت نے اسکول قائم کرائے غلاموں کو آزاد کرایا' عورتوں کے رتبہ میں اضافہ کیا یا خیرات و رحم و کرم کو رواج دیا' دراصل عیسائیت نے اس کے بالکل برعکس کیا۔ اس نے اسکولوں کا خاتمہ کر دیا عوتوں کو ذلیل و خوار کر دیا "کافر" رومیوں کی فیاضیوں کو ملیامیٹ کر دیا اور نفس پرستی اور ظلم و جفا کی سرپرستی کی۔

عیسائیت کے طرف دار کہتے ہیں کہ تہذیب کی بربادی گوتھ اور ونڈال اقوام نے کی نہ کہ عیسائیت نے لیکن جو مورخ ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ دعوی بالکل غلط ہے کیونکہ شہادتیں اس کے برعکس پائی جاتی ہیں یونان کی عیسائی مملکت پر کبھی ان وحشی قبائل نے حملہ نہیں کیا مگر پھر بھی اس نے کوئی ترقی نہ کی اور بداخلاقیوں ہی میں پڑی رہی خود سلطنت رومہ کے مغربی حصہ میں یہ "وحشی" اتنے درندہ اور بدتہذیب نہ تھے جتنا کہ ان کو پیش کیا جاتا ہے۔ تیھوڈرک (THEODORIC) اور شارلیمن۔ (CHARLEMAGNE) نے تہذیب میں اضافہ کرنا چاہا تھا مگر پادریوں نے صرف یہی نہیں کہ اس کی امداد نہ کی بلکہ اس کی ساری

اسکیم کو ناکامیاب کر دیا دوسری طرف عربوں نے جو قوم ٹیوٹن (TAUTON) ہی کی طرح شدت پسند اور جاہل تھے یونانی اور ایرانی کلچر کو حاصل بھی کیا اور اپنی شاندار تہذیب کو بھی رواج دیا لیکن اس کے بالکل برخلاف عیسائیت چھ صدی تک جہالت درندگی اور وحشت کا ایک مجموعہ رہی اور بہ حیثیت مجموعی یورپ کی بداعمالیوں' بدعنوانیوں' اور جہالت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس ختم ہو چکی تھی اور سو میں ایک شخص بھی تعلیم یافتہ نہ تھا فنون لطیفہ (بجز ایک قلیل مدت کے جب کہ جرمنی میں فن تعمیر میں کچھ ترقی ہوئی تھی) بارھویں صدی تک گوشہ گمنامی میں پڑے رہے۔ بارھویں صدی تک مشکل سے کوئی اسکول یا لائبریری دکھائی پڑتی تھی۔ شہروں کی آبادی 40 ہزار سے زیادہ نہ تھی اور بڑے سے بڑے قصبہ میں صفائی کا مطلق انتظام نہ تھا۔ انصاف کے ساتھ مذاق کیا جاتا تھا اور سزائیں انتہائی وحشیانہ ہوتی تھیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ گوتھ اور وینڈال کی تاراج کردہ زمین کو عیسائیت نے اس قابل بھی نہ بنایا کہ اس میں ایک پھول بھی نکل آتا۔ تاریخ عیسائیت کے اس دعوی بے دلیل پر ہنستی ہے کہ اس کے مذہب میں تہذیب کا عنصر موجود تھا عیسائیت کو تہذیب کی اشاعت کے لیے دوسرے مذاہب سے زیادہ موقع تھے مگر اس علمبردارانہ تہذیب نے دنیا کو غیر مہذب ہی رکھا۔

تہذیب کی تجدید

اس کے بعد بارھویں صدی سے یورپ میں تہذیب از سر نو قائم ہونے لگی۔ بارھویں صدی اس لیے کہا گیا ہے کہ یہیں سے تہذیب یورپ میں کئی چیزوں کی ابتدا ہوتی ہے مثلاً گوتھک آرٹ کی ابتداء یونیورسٹیوں کا قیام' تجارت کی ترقی' بڑے بڑے شہروں کا وجود غلاموں کی آزادی وغیرہ' لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ فراموش کر دینا چاہیے کہ ہرچند عہد وسطی دراصل انیسویں صدی تک قائم رہا لیکن تہذیب یورپ کی حالت دراصل بارھویں صدی سے سنبھلنا شروع ہو گئی تھی اور جو کچھ اصلاحات ہوئیں وہ یا تو عیسائیت سے قطعاً" بے نیاز ہو کر ہوئیں۔ یا اس کے علی الرغم مگر حیرت انگیز امر یہ ہے کہ تہذیب یورپ کی تمام تاریخ محض "چرچ" یا پادریوں کو خوش کرنے کے لیے بدل دی گئی حالانکہ عہد وسطی میں فنون لطیفہ کی ترقی جس پر "چرچ" فخر کرتا ہے اس وجہ سے ہوئی کہ صاحبان آرٹ نے پرانے معیار کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ غلاموں کی آزادی اقتصادی و معاشرتی وجوہ کی بناء پر

ہوئی اور پادریوں کا طبقہ ہی وہ طبقہ تھا جس نے اس پالیسی پر سب سے آخر میں عمل کیا۔ عملی زندگی کا احیاء اور دوسرے فنون کی ترقی اسپین میں مسلمانوں کی شاندار تہذیب کی بدولت ہوئی اور اس بنیاد پر جس پر یورپ کے اثرات نے یورپ کے کسی ملک میں کوئی عمارت قائم نہیں کی تھی۔ اسپین میں عربوں نے ایک صدی کے اندر تہذیب کا ایک لاجواب معیار قائم کر دیا تھا۔ غرض یہ کہ یورپ میں سائنس کی اشاعت مسلمانوں کی بدولت شروع ہوئی مگر عیسائی پادریوں نے ان حیرت انگیز ترقیوں کو آئندہ تین صدیوں تک ملتوی رکھا۔ یورپ میں تہذیب کی از سر نو پیدائش میں یونانی لٹریچر کو جو حصہ دیا گیا ہے وہ بھی بڑی حد تک مبالغہ آمیز ہے۔ اس تہذیب کا سب سے بڑا باعث اسپین کے مور مسلمان اور سسلی کے عرب ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یونانی اور لاطینی کتابوں نے اٹلی اور فرانس اور انگلستان میں تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات سدھارنے میں بہت مدد کی۔

عیسائیت کا طرف دار اکثر اپنے مذہب کی حمایت میں کسی خانقاہ یا کسی پادری یا کسی لائبریری کا (جو کہیں کہیں ایک آدھ صدی میں دکھائی پڑتی ہیں) نام لیتا ہے اور بڑے فخر سے کہتا ہے کہ دیکھو یہ سب مذہب کی برکت ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک دو صدی میں کسی ایک پادری کا کوئی فعل یا کسی لائبریری کا قیام مذہب کی حقانیت کو نہیں ظاہر کرتا بلکہ "عیسائی چرچ" کی پالیسی اس کے پادریوں اسقفوں اور پاپاؤں کی اکثریت کے افعال سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ پالیسی انسانیت کے نقطہ نگاہ سے انتہائی مہلک رہی ہے۔ پاپاؤں اور پادریوں کی کثیر تعداد ہمیشہ خود غرض اور اخلاقی اعتبار سے نہایت نفس پرست رہی۔ غرض کہ یورپ میں جن چیزوں نے تہذیب کے پھیلانے میں امداد دی ان میں مذہب کا ہاتھ بالکل نہیں اور جس قسم کی بھی یورپ میں ترقی ہوئی اسمیں عیسائیت ذرا ممد و معاون نہیں ہوئی' "اصلاح مذہب" کی تحریک جس نے پاپائے روم کی طاقت کو صدمہ پہنچایا۔ البتہ ایک مذہبی خدمت تھی مگر اس اصلاح نے بھی ایک ایسی خانہ جنگی کی بنیاد ڈالی جس کا اثر عرصہ تک قائم رہا اور انقلاب فرانس تک نہ زائل ہو سکا البتہ اس کے بعد یورپ میں جب ذہنی اصلاح شروع ہوئی تو وہ صرف اس نظریہ کی بدولت کہ علم مذہب کے لیے مہلک ہے اور ترقی تہذیب سے مراد ہے لامذہبیت کی ترقی اور اس تمام مدت میں جہالت اور شائستگی یا نور و نار میں برابر جنگ ہوتی رہی۔ مشرق یورپ میں "انکار عقاید" نویں صدی سے شروع ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ تھیوڈورا نے اسی صدی میں پال کے ایک لاکھ معتقدین کو ہلاک کرا دیا اور دسویں صدی میں ایک اور

بادشاہ نے ان کے 6 لاکھ آدمیوں کو بلگیریا کے ویرانوں میں جلا وطن کر دیا یہ لوگ اگرچہ انجیل نو کو مانتے تھے مگر۔ ان کی تحریک دراصل عیسائیت کے خلاف تھی' اس کے علاوہ اطالوی شہروں میں بھی مسلمان عربوں کے اثر کی وجہ سے ایک قسم کی تہذیب بے دینی عام ہو چلی تھی۔ پاپائیت نے ان منکرین کی خون کی ندیاں بہا دیں مگر پھر بھی یہ تحریک لوتھر کے زمانہ تک چلتی رہی۔ اس کے بعد اسی سلسلے میں لوسی فرکا فرقہ پیدا ہوا اور کئی زبردست بلوے بھی ہوئے جن میں لاکھوں آدمیوں کی جانیں کام آئیں۔ قصہ مختصر یہ کہ نشاۃ الثانیہ کی پوری مدت پاپائیت نے تقریباً" دس لاکھ سے زیادہ آدمیوں کی جانیں لیں اور لاکھوں کو مختلف صعوبتوں میں مبتلا رکھا اور اگر مذہبی جنگوں کے مقتولین بھی شامل کر لیے جائیں تو ان " شہدا" کی تعداد نہ معلوم کتنی لاکھ ہو جائے۔

یورپ کی تاریخ ان واقعات کی تصدیق کرتی ہے اور یہ امر پایہ تحقیق کو پہنچ جاتا ہے کہ جیسے جیسے علم میں ترقی ہوئی ایسے ہی انکار مذہب میں ترقی ہوئی حتی کہ موجودہ زمانہ کی ترقی تعلیم نے اس بے دینی یا انکار مذہب میں اور زیدہ اضافہ کر دیا اور جس قانون کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک صحیح ثابت ہوتا چلا آیا ہے۔

مستقبل کی لامذہبیت!

اس مضمون سے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ مذہب کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کسی مخصوص آدمی کی رائے پر منحصر نہیں ہے بلکہ ہم کو وہ قانون معلوم ہو گیا ہے جو ہر زمانہ میں سچا ثابت ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ سوال البتہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر علم کا نتیجہ الحاد ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اتنے تعلیم یافتہ لوگ مذہب کو اب بھی مانتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ عوام کے مذہب کا ارتقاء وحدانیت اور پھر بے دینی ہے دنیا جسمانی حیثیت سے ایک منزل سے دوسری منزل تک نہیں جاتی اور تعلیم یافتہ آدمیوں میں بھی مزاج کا اختلاف پایا جاتا ہے ایک آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ عیسائی ہے یعنی حضرت عیسیٰ کا مداح دوسرا حضرت عیسیٰ کی مدح کرنے کے باوجود اپنے آپ کو عیسائی کہنے سے اس حالت میں گریز کرے گا جبکہ وہ عیسائی مذہب کو نہیں پسند کرتا۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اور دوسرا کہہ سکتا ہے کہ اس کا خدا پر کوئی اعتقاد نہیں مگر پھر بھی ایک عالمگیر قوت کا دونوں کو احساس ہو سکتا ہے۔ ایک آدمی مختلف علوم کا ماہر ہو سکتا ہے مگر اس کا بھی امکان ہے کہ اس نے مذہب پر کبھی غور نہ کیا ہو۔

بہرحال یہ طے شدہ امر ہے کہ مذہب بحیثیت ایک مجموعہ عقاید کے تعلیم یافتہ طبقہ سے اپنا اثر زائل کرتا جا رہا ہے اور چونکہ آجکل تعلیم عام ہو چکی ہے۔ اس لیے یہ بھی صحیح ہے کہ گویا عوام پر سے اس کا اثر زائل ہو رہا ہے یہ مسئلہ مذہب میں اصلاح کرنے کا نہیں ہے کیونکہ اگر اس نظریہ کو مان لیا جائے تو پیغمبروں پر حرف آتا ہے نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصول مذہب سے انکار کر کے صرف اخلاقیات کو مانا جائے کیونکہ اس نظریہ کو ایک قلیل اقلیت کے علاوہ اور کوئی نہ تسلیم کرے گا۔ اور ان سب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مذہب کا زوال یقینی ہے'

اسی کے ساتھ واقعات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا پرستی کا زوال بھی لازمی ہے ہم دیکھ رہے ہیں کہ گزشتہ پچاس برس سے وحدانیت کس طرح اپنی جگہ پر قائم ہے اور الحاد کتنا پھیل رہا ہے لہٰذا اب جبکہ علم عام ہو رہا ہے مستقبل کا حال ظاہر ہے۔ خدا کے خیال کو خواہ کتنا ہی پاکیزہ کیوں نہ بنایا جائے مگر اب وہ باقی نہیں رہ سکتا۔

گزشتہ نصف صدی میں کئی مذاہب پیدا ہوئے اور ان کی معتقدین کی تعداد بڑھانے کی کوشش کی گئی مگر پھر بھی ان کی پیروؤں کی تعداد میں بیس لاکھ سے زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ حالانکہ 20 کروڑ آدمی ایسے ہو گئے ہیں جو مذہب سے بالکل بے پروا ہیں' ورآنحالیکہ ہمارے نصاب تعلیم میں مذہب پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ بہرحال مذہب کا خاتمہ اب کچھ مدت کی بات ہے۔ اس کے ساتھ ہی ذرا صورت حال پر نظر ڈالیے کہ (صرف عیسائی) ممالک میں مبلغین مذہب کی تعداد تقریباً" پانچ لاکھ ہے اور ان کے مقابلے میں بے دینی پھیلانے والے 500 کے تناسب سے زیادہ نہیں اس پر طرہ یہ کہ مذہب کی طرف سے کروڑوں روپیہ بھی ہر سال خرچ ہوتا ہے کیا اس حالت پر غور کرنے کے بعد بھی مذہب کے مستقبل کے متعلق کوئی شک باقی رہ جاتا ہے تعلیم یافتہ ممالک میں تو مذہب تقریباً" ختم ہو گیا ہے البتہ جاہل ملکوں میں اکثریت مذہب کی پابند ہے مگر وہ بھی اس وقت تک اسے مانتی رہے گی جب تک وہاں تعلیم عام نہیں ہوتی' بہرحال کچھ بھی ہو اس صدی کے آخر میں اگر کہیں مذہب قائم بھی رہا تو وہ انتہائی نفرت خیز چیز ہو گی۔

یاد رکھیے کہ مذہب کا خاتمہ وہ مبارک گھڑی ہو گی جب ہم مردہ انسانوں سے مدد مانگنے کے بجائے اپنی عقل سے امداد کے طالب ہوں گے اور ہم میں ایک ایسی زندگی پیدا ہو جائے گی جو تمام زندگیوں سے لطیف تر خوش گوار اور مرغوب تر ہو گی۔

ملاحدہ دورِ حاضر کے نقطہ نظر سے!
(4) روایت و معجزہ کی حقیقت!

زندگی کا صحیح مقصود حصول مسرت ہے اور ذہن انسانی مجبور ہے کہ وہ مسرت کے واقعی اسباب و شرائط معلوم کرے۔ واضح رہے کہ مسرت سے مراد میری صرف کھانا پینا نہیں محض جسمانی راحت و آسائش نہیں بلکہ بلند قسم کی وہ مسرت ہے جو ادائے فرائض کے بعد حاصل ہوتی ہے جو لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کے بعد محسوس ہوتی ہے جو فطرت کے مطالعہ اور حسن مجرد کے احساس سے پیدا ہوتی ہے اور جو آزادی ذہن و ضمیر کی پیداوار ہے۔

لیکن آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مسرت کی خواہش کو ٹھکراتا ہے جو حریت فکر و رائے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جس نے عقل انسانی کو شل کر دینا ہی اپنی مقصود زندگی قرار دے رکھا ہے یہ گروہ اپنے آپ کو اہل مذہب اور روحانیت پرست کہتا ہے یہ گروہ وہ ہے جو احساسات مسرت کو وسوسہ شیطانی کہتا ہے یہ اس دنیا کی زندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کی تمام خواہشات کا تعلق کسی دوسری دنیا سے ہے جس کا اصطلاحی نام اس نے حیات بعد الموت رکھا ہے وہ کہتا ہے کہ خدا نے اس کو اپنی تسبیح و تہلیل کے لیے منتخب کر لیا ہے پیام ربانی کے لیے اس کی زبان مخصوص ہے اور صداقت و حقیقت کا نام ہے صرف اس چیز کو جو اس کے دل و دماغ سے پیدا ہو۔

اس جماعت نے ہمیشہ عقل و علم سے دشمنی کی ذہن انسانی کو اس نے ہمیشہ کند رکھنا چاہا اور اس نے علم و یقین کا ماخذ ہمیشہ غیر فطری کرامات و معجزات کو قرار دیا ہے اس لیے دنیا میں صرف نفرت و تعصب اور خوف کی اشاعت کی۔ اس نے منکرین کو ہمیشہ اپنا دشمن سمجھا اس نے محنت و عمل سے ہمیشہ جی چرایا اور اسی کو برگزیدہ قوم سمجھا جس کے لیے غیب سے من و سلویٰ نازل ہو سکتا ہے۔

یہ جماعت اپنا ایک لٹریچر بھی رکھتی ہے جسے مختلف ناموں سے مختلف قوموں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اس لٹریچر میں وہ سب کچھ ہے جسے عقل انسانی کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔ اس میں تخلیق کائنات کا بھی ذکر ہے اور آفرینش انسان کا بھی اس میں تاریخ قدیم کے

ٹکڑے بھی نظر آتے ہیں اور اخلاق کے درس بھی لیکن باایں ہمہ یہ محض روایت و داستان ہے جس کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں یا پھر ان ہدایات کا مجموعہ ہے جو محض تعصب و تنگ نظری کی پیداوار ہیں۔

انھوں نے ہمیشہ خدا کا ڈر دکھا کر اپنا اثر قائم کیا۔ انھوں نے ہمیشہ دنیا کو یہی یقین دلایا کہ اگر ان کی دعائیں شامل حال نہ ہوں تو بارش بند ہو جائے کھیتیاں برباد ہو جائیں دنیا قحط و وبا سے فنا ہو جائے اور جب کبھی کوئی مصیبت نوع انسان پر نازل ہوتی تو انھوں نے اس کو اپنی ہی دعاؤں کا نتیجہ بتایا۔ پھر انھوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ جب کبھی انھیں اقتدار حاصل ہوا۔ علم کو روندا گیا عقل پامال کی گئی آزادی کو مٹایا گیا مفکرین عالم کو قید میں ڈالا گیا۔ ارباب فضل و کمال کو ذبح کیا گیا اور خدا کے نام پر وہ سب کچھ کیا گیا جسے شیطان بھی گوارا نہ کر سکتا تھا۔

لیکن مذاہب کا ظہور مذہبی کتابوں کی پیداوار خانقاہوں کی تعمیر اور اہل خانقاہ کا وجود کوئی غیر فطری بات نہ تھی بلکہ عہد وحشت کے غاروں سے لے کر موجودہ دور تہذیب تک انسان نے جو تدریجی ترقی کی ہے اسی کے یہ لازمی مظاہر تھے دنیا کی تاریخ میں اتفاق کوئی چیز نہیں ہے نہ اس میں معجزہ و خرق عادات کو کوئی دخل ہے اور نہ غیبی مداخلت کو ہر شے اور ہر حالت واقعات سے پیدا ہوتی ہے تو بالکل فطری خیال تھا کیونکہ ان کی عقل زیادہ سے زیادہ یہیں تک پہنچ سکتی تھی اور وہ اس کو سچ سمجھ کر پیش کرتے تھے۔

تمام زمانوں میں انسان نے اپنے اور اپنے ماحول کے سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ دیکھتا تھا اور تعجب کرتا تھا کہ پانی کیوں برستا ہے درختوں کا نشو و نما کیوں ہوتا ہے بادل کیونکر معلق فضا میں اڑتے ہیں ستاروں کی چمک کہاں سے آتی ہے چاند سورج کو کون ادھر سے ادھر لے جاتا ہے۔ وہ سوچتا تھا کہ زندگی کے بعد موت کا سکون کیا۔ بیداری کے بعد نیند کیسی روشنی کے ساتھ تاریکی کیا معنی۔ بجلی اور کڑک کو دیکھ کر وہ سہم جاتا تھا۔ زلزلوں اور پہاڑوں کی آتش فشانیاں دیکھ کر وہ لرزہ بر اندام ہو جاتا تھا اور چونکہ وہ ان کے طبعی حدوث کے اسباب سے ناواقف تھا اس لیے وہ سمجھتا تھا کہ ان تمام حوادث کے پیچھے کوئی عظیم الشان ذی حیات ہستی ضرور ایسی موجود ہے جو ان تمام مناظر و مظاہر کی پیدا کرنے والی ہے اور انھیں کو وہ دیوتا یا دیوی سمجھ کر ان سے مدد لینے لگا اور ان کی پوجا کرنے لگا۔

طلوع صبح کو وہ سمجھنے لگا کہ یہ کوئی نہایت ہی حسین و جمیل دیوی ہے آفتاب کو اس

نے ایک جگنو عاشق مزاج دیوتا فرض کرلیا۔ رات کو اس نے سانپ یا ناگ سمجھ لیا اور ہوا کو مغنی، جاڑے کو اس نے ایک ایذا رساں درند سے تعبیر کیا اور خزاں کو ایسی دیوی سے جو دنیا کے سب پھول چن کر لے جاتی ہے۔ الغرض اسی طرح کہ سیکڑوں تعبیریں ہزاروں تفسیریں اس نے مناظر فطرت اور حوادث طبع کی اپنی ذہانت سے پیدا کیں اور ان کو حقیقت جان کر پھیلانا شروع کیا اقوام عالم کی روایات مذہبی یا اساطیر اللاولین پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ ان کی بنیاد یکسر انھیں شاعرانہ تفسیروں اور اسی قسم کے قیاسات ضعیفہ پر قائم ہے چنانچہ باغ عدن کی روایت کو دیکھیے کہ وہ دنیا کی ہر قوم میں پائی جاتی ہے کیونکہ وہ مصائب سے گھبرا اٹھی تو اپنی تسکین کے لیے اس نے ایک ایسی دنیا کا تخیل پیدا کیا جہاں راحت ہی راحت ہے۔

اسی طرح طوفان کی روایت ایشیا و یورپ کے تمام قدیم قوموں میں پائی جاتی ہے انھوں نے گھونگھے سیپیاں اور لہروں کے نشانات پہاڑوں وادیوں اور میدانوں میں دیکھ کر خیال کیا کہ کسی وقت ضرور ساری دنیا پر طوفان آیا تھا جس سے سوا چند مقبول بندوں کے کوئی جانبر نہ ہو سکا توریت انجیل اور کلام مجید کے علاوہ ہندوؤں میں بھی یہ روایت موجود ہے کہ منو نے ایک بار گنگاہ میں کوئی ظرف ڈبو کر پانی لیا اس میں ایک مچھلی بھی آگئی مچھلی نے التجا کہ مجھے بھر پانی میں چھوڑ دیجئے منو نے رحم کھا کر اسے چھوڑ دیا۔ لیکن مچھلی نے اس احسان کے عوض میں ان کو بتایا کہ ایک بڑا زبردست طوفان آنے والا ہے آپ ایک کشتی بنا کر اس میں اپنے ساتھیوں کو معہ مویشیوں کے بٹھا لیجئے میں بر وقت پہنچ کر آپ کی مدد کروں گی چنانچہ منو نے اس کی تعمیل کی اور جب طوفان آیا تو مچھلی حاضر ہوئی لیکن اب وہ بڑی مچھلی ہو گئی تھی جس کے سر پر ایک سینگ بھی نکلا ہوا تھا منو نے ایک رسی اس کے سنگ سے باندھ کر کشتی میں اٹکا دی اور وہ طوفان سے کشتی کو بچا کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے گئی اور طوفان کے ختم ہونے تک منوجی یہیں ٹھہرے رہے ان تمام روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے زندگی اوز موت کے اسرار کو کس کس طرح سمجھنے کی کوشش کی اور ان کوششوں میں اس کے کتنے اندیشے کتنی امیدیں کتنی مسکراہٹیں اور کتنے آنسو شامل تھے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا اولین مذہب آفتاب پرستی تھا اور بالکل فطری بات تھی کیونکہ روشنی ہی زندگی ہے اور اس سے زندگی میں حرارت قائم رہتی ہے اپالو بھی سورج تھا جو رات کے ناگ کو شکست دے کر بھگا دیتا تھا اگنی بھی سورج تھا جو انسان کے ہر ہر جھونپڑے کی حفاظت کرتا تھا کرشن بھی سورج ہی تھے کہ ان کی ولادت کے وقت تمام درخت ہرے بھرے ہو گئے

ہر قلس بھی سورج دیوتا تھا جونا دیونس بھی وہی تھا اور یہ سب کے سب 25 دسمبر کے لگ بھگ پیدا ہوئے سب نے چالیس دن کا روزہ رکھا سب غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے اب مسیح کے حالات کا ان روایات سے موازنہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ وہاں بھی سب کچھ یہی ہے 25 دسمبر کو ایک غار میں پیدا ہوئے ہیروڈ نے بہت سے بچوں کو ان کے دھوکہ میں ہلاک کیا (چالیس کا عدد مذاہب کی تاریخ میں بہت نظر آتا ہے طوفان سے پہلے چالیس دن بارش ہوتی رہی موسیٰ چالیس دن کوہ سینا پر رہے چالیس سال تک بنی اسرائیل صحراوں میں پھرتے رہے) چالیس دن کا روزہ رکھا غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے عیسیٰ بھی سورج تھے اور یقیناً" تمام مذاہب کی ابتدا آفتاب پرستی ہی اسے ہوئی چنانچہ اس وقت بھی عبادت کے وقت لوگوں کا آنکھیں بند کر لینا اسی زمانہ کی یادگار ہے کیونکہ وہ سورج کو نہ دیکھ سکتے تھے اور آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ وہ جب ہم امم سابق کی دیگر مذہبی روایات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مذاہب میں کوئی نئی بات نہیں پائی جاتی ان کے تمام مراسم و عبادات کا رشتہ عہد قدیم کے مذاہب ہی سے جا کر مل جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ عیسائیوں میں بپتسمہ یا اصطباغ نوع کی رسم پائی جاتی ہے لیکن یہ عیسویت سے بہت پہلے کی چیز ہے ہندوں مصریوں' یونانیوں اور رومیوں میں بھی پانی کا وجود پایا جاتا تھا صلیب کا خیال بھی نہایت قدیم خیال ہے یہ علامت تھی غیر فانی ہونے کی زندگی کی آگہی کی۔ قبرانسانی کی اٹلی کی قدیم آبادی (رومیوں سے بہت پہلے کی) قبروں پر صلیب ہی کا نشان قائم کرتی تھی۔ وسطی امریکہ کے قدیم معبدوں میں صلیبی نشان کثرت سے دریافت ہوئے ہیں بابل کی سرزمین سے جو اسطوانے یا ٹکے دریافت ہوئے ہیں ان پر بھی صلیب کا نشان موجود ہے اسی طرح تثلیث کا خیال بھی بہت پرانا ہے اور قدیم مصر میں پایا جاتا تھا۔

ہم کو سمجھ لینا چاہیے کہ اساطیر و معجزات میں بہت فرق ہے اساطیر نام ہے کسی بات کی خیالی تصویر پیش کرنے کا اور معجزہ کہتے ہیں کوئی بات گھڑ کر بیان کرنے کو۔

اگر تم کسی سے کہو کہ دو ہزار سال قبل مردے زندہ ہو گئے تھے وہ غالباً" کہے گا ہاں ہوا ہو گا۔ اگر تم اس سے کہو کہ ایک لاکھ سال بعد تمام مردے زندہ ہو جائیں گے تو وہ کہے گا دیکھو کیا ہوتا ہے لیکن اگر تم یہ کہو گے کہ کیا تم نے خود قبر کے اندر سے کسی مردے کو باہر

نکلتے ہوئے دیکھا تو وہ تمہیں دیوانہ سمجھ کر کوئی جواب نہ دے گا۔

مذہبی کتابیں اسی قسم کے بیانات سے معمور ہیں خدا نے یہودی کے لیے جتنے معجزات سے کام لیا وہ سب کو معلوم ہیں انکو غلامی سے آزاد کرنا بھی معجزہ ہی کے ذریعے سے ہوا جب وہ مصر سے باہر نکلے ہیں تو دن کو بادل اور رات کو روشنی کا ایک ستون آگے رہنمائی کے لیے ہوتا تھا دریائے نیل ان کے لیے مشق کیا گیا من وسلوی ان کے لے آسمان سے نازل کیا گیا لیکن یہودیوں نے ان میں سے کسی معجزہ کی پروا نہیں کی اور جب تک بچھڑا بنا کر پوج نہیں لیا انہیں چین نہ آیا۔

اسی طرح مسیح نے بہت سے معجزے پیش کیے لیکن بالکل بے نتیجہ وہی مردے جن کو انھوں نے زندہ کیا وہی اندھے جن کو انکھیارا بنایا اور وہی کوڑھی جنہیں اچھا کیا ان پر ایمان نہ لائے آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا سبب تھا صرف یہ کہ معجزے کبھی ظاہر ہی نہیں ہوئے بلکہ یہ سب داستانیں ہیں جو صدیوں بعد گھڑی گئیں۔

پانی کو شراب بنا دینا سینکڑوں آدمیوں کو صرف روٹی سے سیر کر دینا اندھے کو مٹی لگا کر بینا بنا دینا طوفان کو خاموش کر دینا پانی پر چلنا یہ سب باتیں ہیں جنہیں انسان سوچتا تھا جیکے پورا ہونے کی تمنائیں رکھتا تھا اور انہیں کی تکمیل کو سب سے بڑی نعمت سمجھ کر اظہار عظمت و تقدس کے لیے اس نے پیغمبروں سے منسوب کر دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا جہل و خوف سے معمور تھی اور اپنی ہر مشکل میں مافوق الفطرت ہستی سے امداد کی توقع رکھتی تھی چنانچہ انھوں نے ان مفروضہ غیر انسانی ہستیوں کو خوش کرنے کے لیے مندر بنائے قربان گاہیں تیار کیں ان کے سامنے ناک رگڑی قربانیاں چڑھائیں اور وہ سب کچھ کیا جس سے وہ خوش ہو سکتے تھے لیکن ان آسمانی قوتوں نے ایک نہ سنی ان میں سے کوئی انسان کی فریاد کو نہ پہنچا طوفان بھی آئے کھیتیاں بھی برباد ہوئیں وبائیں بھی پھیلیں جن کو برے حال جینا تھا وہ برے حال ہی جیے اور جنہیں مرنا تھا وہ مر ہی گئے۔

انسان یہ سمجھتا تھا اور اب بھی مذہبی انسان یہی سمجھتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ اسی کے لیے ہے اسی کی ضرورت پورا کرنے کے لیے کائنات وجود میں آئی چنانچہ وہ ہر چیز پر قابض ہونا چاہتا تھا اور جب ناکام رہتا تھا تو سمجھتا تھا کہ خدا ضرور اس کی مدد کرے گا حالانکہ اگر دنیا میں ایک انسان نہ ہوتا تو بھی سورج کا یہی طلوع و غروب ہوتا یہی بہار و خزاں ہوتی گلاب اسی طرح کھلتا انگور کی بیلیں اسی طرح پھل لاتیں وہی سمندر کا مدوجزر ہوتا اور

وہی رات دن وہی طوفانی ہوائیں ہوتیں اور وہی رعدو برق۔

جب ایک زمانہ' ایک غیر محدود زمانہ انسان پر اسی جہل و بے بصری کی حالت میں گزر گیا تو کچھ لوگ سوچنے والے پیدا ہوئے اور انھوں نے ان روایات و معجزات کو شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا انھوں نے غور کیا کہ کسوف و خسوف کیوں مقرر وقفہ کے بعد ہوتا ہے اور آخرکار انھوں نے اس کی وجہ معلوم کر کے سمجھ لیا کہ اجرام فلکی کی گروش اولاد آدم سے بالکل بے نیاز ہے اور انسان خود بھی مظاہر طبیعی کا ایک معمولی مظہر ہے۔

گیلیلو کوپر نکس اور کپلر نے مذہب کی بتائی ہوئی ہیت کو درہم برہم کر دیا زمین چپٹی ہونے کے بجائے گول اور ساکن ہونے کی بجائے متحرک ہو گئی آسمان بجائے ٹھوس ہونے کے خلا محض بن گیا اور سارا بنا بنایا کھیل مذہب والوں کا بگڑ گیا۔

ظاہر ہے کہ مذہب اپنی روایات کی اس تکذیب و توہین کو برداشت نہ کر سکتا تھا وہ تاریکی جو زمانہ معلوم سے دماغوں پر مسلط تھی یوں آسانی سے دور نہ ہو سکتی تھی آخرکار جہل نے علم کے خلاف ایک محاذ جنگ قائم کیا اور مذہب کے درندہ نے جس کے پنجے ہمیشہ خون سے رنگین رہے برونو (BRUNO) کے خلاف اپنا چنگل بڑھایا اور محض اس خطا پر کہ وہ اس کرہ کے علاوہ اور کروں کا بھی قائل تھا۔

اسے کافر ملحد قرار دے کر سات سال کے لیے قید کر لیا گیا کہ اگر وہ اپنے الحاد سے باز آجائے تو رہا کیا جا سکتا ہے لیکن اس نے کہا کہ ایک حق بات سے انکار کیونکر ممکن ہے اور آخر کار پابہ زنجیر اسے قصاص گاہ میں لے گئے اور بہت سے لکڑیاں جمع کر کے چتا میں آگ لگا دی گئی اور وہ جل کر راکھ ہو گیا الغرض مذہب نے عقل و علم کو شکست دینے کی ہر امکانی کوشش کی لیکن جہل کے پاؤں جب ایک بار اکھڑ جاتے ہیں تو مشکل سے جمتے ہیں عقل کی روشنی پھیلتی رہی اور مذہب کی تاریکی سمٹتی رہی۔

جانبازان علم اٹھے اور انھوں نے سمندروں پہاڑوں اور وادیوں میں جانیں دے دے کر وہ وہ باتیں دریافت کیں جو مذہب کی دسترس سے باہر تھیں انھوں نے بخار و برق کی قوت دریافت کر کے انسان کو دیوتا بنا دیا لیکن اہل مذہب بدستور دیوتاؤں کے غلام ہی بنے رہے مذہب والے مفروضہ معجزے بیان ہی کرتے رہے اور انھوں نے انہیں پورا کر دکھایا۔ یعنی انسان کو جن تمناؤں کو دیوتا پورا نہ کر سکے تھے اسے علم و عقل نے پورا کر دیا۔

سائنس بتاتی ہے کہ نہ تخلیق کوئی چیز ہے نہ فنا کوئی چیز ایک لامحدود ہستی کا وجد ایک

لامحدود واستحالہ عقلی ہے کائنات کے تمام مظاہرو ماثر اسباب و نتیجہ سے وابستہ ہیں اور اشیاء کے اسی فطری رابطہ کو ایک نے نہ سمجھا اور مذہب بن گیا دوسرے نے سمجھ لیا اور علم کہلایا۔

مذہب کا تجربہ انسان نے ہزاروں سال کیا لیکن کوئی آسمانی مدد اسے نہ پہنچی خدا کا رحم حاصل کرنے کے لیے ماؤں نے اپنے بچوں کی قربانیاں پیش کیں لیکن اسے ان پر رحم نہ آیا برہنہ وحشی انسان کو لاکھوں کی تعداد میں درندوں نے کھایا سانپوں نے ڈسا طوفان نے ڈبویا زلزلوں نے تباہ کیا لیکن خدا نے اپنا اصول کار نہ بدلا۔ انسان نے لاکھوں مندر بنائے رات دن اس کی پوجا کی لیکن ظالموں کا ظلم بدستور قائم رہا اور غلاموں کی پیٹھ پر جو کوڑے پڑا کرتے تھے بدستور پڑتے رہے یہاں تک کہ انسان نے لاکھوں سال کے تلخ تجربات کے بعد سمجھا کہ خدا انسانی معاملات میں دخل نہیں دیتا اور اس کے نزدیک گھاس کی پتی اور انسان سب برابر ہیں اسے لیے اس کی ترقی کا انحصار صرف اس کی محنت و کاوش اور رہبری عقل پر ہے آخر کار رفتہ رفتہ معجزات کا زمانہ گذر گیا روایات مذہبی کا دور ختم ہوگیا اور اب انسان اس کے لیے تیار نہیں کہ وہ مذہب کے بتائے ہوئے اصول نجات پر یقین رکھ کر اپنی دنیا کو تباہ کرے اور بے وقوف کہلائے۔

○ ○
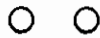
قیامت قائم ہے حشر و نشر کا ہنگامہ بپا ہے مسیح اپنے تخت پر جلوہ افروز ہیں کہ ایک روح سامنے آتی ہے۔

مسیح: تیرا کیا نام ہے

روح: تار کومیڈ (سپین کا وہ ظالم انسان جس نے سب سے پہلے غیر مسیحی لوگوں کے لیے جسمانی سزائیں دینے کا محکمہ قائم کرایا۔ 1410ء میں پیدا ہوا اور 1498ء میں مرا۔)

مسیح: کیا تو عیسائی تھا؟

تار: تھا

مسیح: کیا تو نے اوروں کو مسیح بنانے کی کوشش نہیں کی؟

تار: کی اور پوری طرح کی

مسیح: کیونکر؟

تار: میں نے منکرین کو قید کیا ان کے پاؤں میں خار دار زنجیریں ڈالیں ان کی زبانیں

کھنچوالیں ان کی آنکھیں نکلوائیں شکنجہ میں کسوا کر ان کی رگ رگ توڑ دی اور وہ پھر بھی زندہ رہے تو کھال کھنچوا کر زندہ آگ میں ڈلوا دیا۔

مسیح : خوب کیا اے میرے وفادار خادم خوب کیا اچھا جاؤ اور قریب خداوندی میں رہ کر نجات ابدی کی راحتیں حاصل کرو

(دوسری روح حاضر ہوتی ہے)

مسیح : تیرا کیا نام ہے؟

روح : برونو

مسیح : کیا تو مسیحی تھا؟

برونو : کچھ عرصہ تک مسیح رہا لیکن اس کے بعد میں نے خود اپنی عقل سے سچائی کی تلاش شروع کی

مسیح : کیا تو نے لوگوں میں تبلیغ کی؟

برونو : کی لیکن مسیحیت کی نہیں آزادی فکر و ضمیر کی اچھا کام کرنے کی بغیر طمع ثواب اور برے کام سے بچنے کی بلا خوف عذاب میں نے لوگوں کو بتایا کہ انسانیت نام ہے صرف بھلائی کا ہمدردی کا اور دوسروں کے لیے ایثار و قربانی کا

مسیح : یہ تو گویا تو نے انجیل کو جھٹلایا اور معجزات سے انکار کیا جا اسفل سافلین میں تیرا ٹھکانا ہے اور وہیں تجھے ابدالاباد تک دوزخ میں جلنا ہے۔

کیا خدا اور مسیح کے اس فیصلے کو دنیا اب بھی قرین انصاف سمجھ سکتی ہے؟ اور کیا مذہب کا دور معجزہ و کرامات اب پھر واپس آسکتا ہے؟

○ ○ ○

ملاحدہ دور حاضر کے نقطہ نظر سے!
(5) مذاہب عالم کی تاریکیاں

ترقی کرنا انسان کا فطری حق ہے لیکن ترقی کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اس کو سمجھ لینا ضروری ہے اس باب میں دو متضاد رائیں پائی جاتی ہیں کیونکہ وہی ایک حالت ہے جسے ایک جماعت ترقی تہذیب سے تعبیر کرتی ہے اور دوسری وحشت و جہل سے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ ہر وہ چیز جو قدیم ہے پرانی ہے قابل احترام ہے گویا جب تک کسی چیز کو جھاڑنے سے صدیوں کی جمی ہوئی خاک نہ اڑے قابل اعتناء نہیں ان کے نزدیک حکومتیں وہی تھیں جو ختم ہو گئیں فرمانروا وہی تھے جو گزر گئے سچے مصلح وہی تھے جو مر گئے نہ ویسے شاعر اب پیدا ہوتے ہیں نہ ویسے ادیب نہ ویسے سیاست داں اب نظر آتے ہیں نہ ویسے حکما و فلاسفہ۔

دوسرا گروہ قدیم و قدامت کا دشمن ہے جو موجودہ زمانہ کا مداح ان کے نزدیک زمانہ قدیم میں کوئی بات معقول تھی ہی نہیں اور قدرت نے اپنے تمام برکات زمانہ حال ہی کے لیے وقف کر دیے ہیں۔ میری رائے میں دونوں غلطی پر ہیں۔ نہ قدیم زمانے کی ہر چیز بری تھی نہ زمانہ حال کی ہر بات اچھی صداقت ہمیشہ ایک ہی رہی ہے اور اسے ہم قدیم وجدید نہیں کہہ سکتے وہ ہر زمانہ میں یکساں رہی اور ہمیشہ اس کی جستجو کرنا چاہیے۔

اگر ہم اصولاً" اس بات کو تسلیم کر لیں کہ فکر و عمل ہی ملک کی ترقی و مسرت کی بنیاد ہے اور یہ عمومی مسرت ہی فی الحقیقت فطری صداقت ہے تو پھر اس کا نمازی نتیجہ یہ ماننا پڑے گا کہ دنیا کے فکر و عمل کو بالکل آزاد ہونا چاہیے آپ اس عہد قدیم کو نہ دیکھیے جب ایشیا ترتیب تاریخ سے پہلے بھی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا ہوا تھا بلکہ عہد وسطی کو لیجئے کہ اس وقت یورپ کی جو اس وقت سب سے بڑا مدعی تہذیب و آزادی ہے کیا حالت تھی۔ طبقہ عمال کو جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا تھا۔ جہل کی تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی تھی اور فکر انسانی نام تھا صرف اوہام پرستی کا فضا میں ہر طرف ملائکہ و عفاریت چھائے ہوئے تھے اور سمجھ میں نہ آنے والی بات معجزہ خداوندی قرار دی جاتی تھی اعتقادات نے عقل انسانی کو بے کار کر رکھا تھا اور مذاہب نے غور و فکر کو۔ انسان کے لیے وجہ امتیاز صرف یہ تھا کہ یا تو وہ

سپاہی ہو یا پادری۔

یعنی سوائے لڑنے اور جھوٹ بولنے کے اور کوئی صورت انسانیت کی موجود نہ تھی صنعت و حرفت کو ذلیل سمجھا جاتا تھا اور اس ذریعہ سے ایک شخص بھی اپنا پیٹ آسانی سے نہ بھر سکتا تھا قومیں خرید و فروخت کے ذریعہ سے ضرورت زندگی حاصل نہ کرتی تھیں بلکہ لوٹ مار سے ہر مسیحی ملک غیر مسیحی قوم کے مال کو لوٹ لینا ثواب جانتا تھا لکھنا پڑھنا نہایت خطرناک بات سمجھی جاتی تھی اور اگر کوئی شخص بدقسمتی سے سیکھ لیتا تھا تو اسے ساحر یا کافر سمجھا جاتا تھا اس وقت تقریباً" بالکل ناممکن ہے کہ ہم اس زمانہ کی جہالت واہمہ پرستی اور کور دماغی کا صحیح اندازہ کر سکیں اس وقت انسان کے جسم و دماغ دونوں مقید تھے ایک کے لیے لوہے کی زنجیریں تھیں اور دوسرے کے لیے وہم پرستی کی اور اس غلامی سے آزاد ہونے کی صورت سوا موت کے اور کوئی نہ تھی۔

پندرھویں صدی میں انگلستان کا قانون یہ تھا کہ اگر کوئی شخص انجیل مقدس کا مطالعہ اپنی مادری زبان میں کرے گا تو اس کی جائداد اور اس کے مویشی ہمیشہ کے لیے ضبط ہو جائیں گے اور وہ حکومت کا باغی قرار دیا جائے گا چنانچہ اس قانون کے نفاذ کے بعد ایک دن 39 آدمی پھانسی پر لٹکائے گئے اور ان کی لاشیں سربازار جلائی گئیں۔ پھر یہ جہل صرف انگلستان ہی تک محدود نہ تھا بلکہ یورپ کے ہر حصہ میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ سولھویں صدی میں فرانس کی حکومت نے ایک شخص کو اس خطا پر آگ میں تڑپا تڑپا کر ہلاک کر ڈالا کہ وہ راہبوں کے ایک جلوس کے سامنے دوزانونہ ہوا تھا۔ اب آیئے اس اجمال کی ذرا تفصیل بھی سن لیجئے۔

عہد وسطی کے تمام انسان جاہل و عالم آقا و غلام پادری و غیرپادری سب کے سب جادو ٹونا اور ٹوٹکے کے قائل تھے انھیں یقین تھا کہ شیطان نہ صرف انسان بلکہ جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کے اندر بھی حلول کر جاتا ہے اور چونکہ شیطان کا مقابلہ ایک مقدس فریضہ تھا اس نے کسی ایسے شخص کو جس کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ وہ شیطان کا ہمراز و ندیم ہے۔ مار ڈالنا یا زندہ جلا دینا بہت معمولی بات تھی جس حد تک حقیقت یا واقفیت کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ مہمل عقیدہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ کسی انسان کے اندر شیطان حلول کر جائے اور وہ اسے نجس و ناپاک افعال پر مجبور کرے لیکن اس عقیدہ کی مذہبی گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ لوگ جو اس جرم میں گرفتار کیے جاتے تھے جن کے خلاف عدالت گاہوں میں مقدمے چلائے جاتے تھے اور جن سے دنیا نفرت کرتی تھی خود بھی یقین رکھتے تھے کہ

واقعی ان پر شیطان سوار ہے اور وہ اس کا اعتراف کر لیتے تھے۔

جیمس اول کے زمانہ میں ایک شخص اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا اس جرم میں جلایا گیا کہ وہ شاہی خاندان کو ڈبو دینے کے لیے سمندر میں طوفان پیدا کر رہا تھا۔

ایک بار سر میتھوف ہیل کے سامنے جو انگلستان کا مشہور قانون دان جج تھا ایک عورت پیش کی گئی کہ یہ بچوں سے سوئیوں کی قے کراتی ہے اور شیطان سے ساز باز رکھتی ہے چنانچہ جج صاحب نے اس کو مجرم قرار دے کر زندہ جلوا دیا اور فیصلہ میں لکھا کہ یہ جادوگرنی ہے اور جادو کا ازروئے مذہب حق ہونا ثابت ہے۔ عام عقیدہ ایک یہ بھی تھا کہ بعض آسیب زدہ انسان بھیڑیئے کی شکل میں اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی شخص پر بھیڑیے نے حملہ کر دیا اس نے مقابلہ کر کے اس کا ایک پنجہ کاٹ لیا اور جیب میں رکھ کر گھر پہنچا دیکھا کہ اس کی بیوی کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے اور اس کے خون نکل رہا ہے اسے یہ یقین کیا گیا کہ اس کی بیوی بھڑیا بن کر گئی تھی چنانچہ اس نے اقرار کیا اور جلا دی گئی۔

اس طرح لوگوں پر یہ الزام بھی لگایا جاتا تھا کہ وہ گرمیوں میں پالا گراتے ہیں اولے برسا کر فصلیں تباہ کرتے ہیں شرابیں ترش کر دیتے ہیں اور گایوں کو بانجھ بنا دیتے ہیں اس زمانہ میں کسی کی زندگی محفوظ نہ تھی کسی کا اپنے دشمن کے متعلق یہ کہہ دینا کہ ساحر ہے کافی تھا اور اس الزام کی تحقیق کوئی نہ کرتا تھا پھر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ یہ الزام صرف انسانوں ہی پر عائد نہ کیا جاتا تھا بلکہ جانور بھی اس سے محفوظ نہ تھے۔ 1474ء میں ایک مرغ پر یہ الزام قائم کیا گیا کہ اس نے انڈا دیا ہے اور چونکہ عام طور پر مرغ انڈا نہیں دیتا اس لیے یقیناً" اس میں شیطان حلول کر گیا ہے چنانچہ یہ مرغ معہ انڈے کے عدالت گاہ میں پیش کیا گیا اور اس کو سرارہ جلا دیئے جانے کا حکم صادر ہوا اسی طرح ایک سور پر یہ الزام قائم کیا گیا کہ اس نے آدمی کو مار کھا لیا ہے اور اسے بھی جلا دیا گیا۔ 1740ء میں ایک گائے پر بھی آسیب زدہ ہونے کا الزام قائم کر کے اسے سزا دی گئی جانوروں کو بطور شاہد کے طلب کرنا بھی اس وقت کا دستور تھا۔

ایک وقت میں یورپ کا قانون تھا کہ اگر کسی کے گھر میں کوئی شخص رات کو داخل ہوا اور وہ اسے قزاق سمجھ کر مار ڈالے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے کوئی شخص کسی بہانہ سے کسی کو بلا کر مار ڈالے اور اس طرح سزا سے بچ جائے اس بنا پر قانون میں ترمیم کی گئی کہ مالک مکان اس وقت تک بے گناہ نہیں سمجھا

جائے گا جب تک وہ گھر کے کتے دبلی یا دوسرے جانور کو پیش نہ کرے جس کے سامنے اس نے مارا ہے پھر یہ ہوتا تھا کہ جب کوئی ایسا واقعہ پیش آجاتا تھا تو گھر والے کوئی پلا ہوا جانور پیش کر کے اس کے سامنے اپنی بے گناہی کی قسم کھاتا پڑتی تھی عقیدہ تھا کہ اگر وہ جھوٹ بولے گا تو ضرور کسی نہ کسی طرح جانور اس کا اظہار کر دے گا۔

یہ بھی انگلستان کا قانون تھا کہ اگر کوئی شخص جرم کرے تو وہ اس متبرک پارہ نان و پنیر سے اپیل کرے جو اس مقصد کے لیے الگ کر دیا جاتا تھا یعنی مجرم اس روٹی کے ٹکڑے کو لے کر کہتا تھا کہ اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا کرے میرے حلق میں پھنس جائے۔

پانی اور آگ کے ذریعے بھی گناہ و بے گناہ کی جانچ ہوتی تھی یعنی مجرم کو آگ میں تپایا ہوا لوہا ہاتھ میں لیتا تھا اور عقیدہ یہ تھا کہ اگر وہ گناہ گار نہیں ہے تو اس کو کوئی ضرر نہ پہنچے گا (ہندستان کے بھی بعض سید خاندان مدعی ہیں کہ آگ ان پر اثر نہیں کر سکتی کیونکہ وہ معصوم ہیں یہ جاہلانہ عقیدہ بھی اسی نوع کی مذہبی تاریکی کا نتیجہ ہے) اسی طرح مجرم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پانی میں ڈال دیا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اگر وہ بے گناہ ہے تو ڈوبے گا نہیں۔

ان مثالوں کے دینے سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان قوموں میں جو مذہب کی جاہلانہ گرفت میں مبتلا تھیں یا ہیں کیا کیا بدتمیزیاں پائی جاتی ہیں اور عقل انسانی کا خون کرنے میں معتقدات مذہبی نے کتنا حصہ لیا تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب کی اس لعنت میں صرف جاہل انسان ہی مبتلا نہ تھا بلکہ پڑھے لکھے ذی فہم و ذی ہوش افراد بھی مبتلا نظر آتے تھے۔

کپلر دنیا کے مشہور بڑے آدمیوں میں سے تھا اور ہیئت دانی میں تو اس کا نظیر نہ تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس احمقانہ عقیدہ میں بھی مبتلا تھا کہ ستاروں کو دیکھ کر ایک شخص کے مستقبل کا حال معلوم ہو سکتا ہے یہ عقیدہ اس کے دل میں مذہبی بنیاد رکھتا تھا اوراس کا سبب یہ تھا کہ ایسے ہی ماحول میں اس کی ترتیب ہوئی تھی ۔ٹیکو بڑا زبردست ہیئت داں تھا یہ بہت سے مہمل الفاظ ایک جگہ لکھ کر پیشین گوئیاں کیا کرتا تھا اور ان کے پورا ہونے کا منتظر رہتا تھا۔

لوتھر کو یقین تھا کہ اس کی ملاقات شیطان سے ہوتی تھی اور بعض مذہبی مسائل پر اس سے مباحثہ بھی ہوا تھا۔ چارلس پنجم شہنشاہ جرمنی کے زمانہ میں اسٹوفلر بڑا مشہور ہیئت داں

گذرا ہے اس نے ایک بار ستاروں کو دیکھ کر حکم لگایا کہ ایک بہت بڑا طوفان آنے والا ہے اور اس کا اتنا یقین ہو گیا کہ ہزاروں آدمیوں نے جو نشیبی علاقہ زمین میں رہتے تھے ترک وطن کر دیا اور خانماں برباد ہو گئے فرانس میں تو لوگوں نے دوسری کشتی نوح تیار کر لیا اور ذخائر سے اسے بھر دیا تاکہ طوفان میں کام آسکے لیکن طوفان نہ آنا تھا نہ آیا۔

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہن انسانی کس درجہ غلامی میں جتلا تھا اور مذہب کا مفہوم سوائے شیطان کی پرستش کے اور کچھ نہ تھا۔

الغرض ان کی مذہبی روایات اسی طرح کی لغو باتوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انسانی معلومات کا ذریعہ صرف مذہبی ادارے تھے جن لوگوں کے ہاتھ میں یہ ادارے تھے وہ قصداً" جھوٹ بولتے تھے اور ارادتاً" خلاف عقل باتیں گھڑ لیتے تھے تاکہ لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں اور وہ اس کے جواب میں معجزات و کرامات وغیرہ بیان کر کے عوام کو مرعوب کر لیں اور اپنا اقتدار جمائیں۔

پھر جہل و ظلمت کا یہ اثر کسی ایک شعبہ تک محدود نہ تھا بلکہ تمام انسانی معلومات پر چھایا ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ زبان ہی کے مسئلے کو لیجئے تو عجیب و غریب حقائق کا انکشاف ہو گا اول اول عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ عبرانی ہی اصل زبان ہے اور تمام زبانیں اسی سے نکلی ہیں (عربی کو بھی ام الالسنہ اسی لیے کہتے ہیں) بعد کو یہی دعوی اور زبانوں نے بھی کیا۔ لیڈرے کمپ نے 1561ء میں ایک کتاب شائع کی جس کا مقصود یہ بتانا تھا کہ بہشت کی زبان کیا ہے چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ خدا نے آدم سے سویڈن کی زبان میں باتیں کیں آدم نے ڈنمارک کی زبان میں جواب دیا اور سانپ نے حوا سے فرانسیسی میں باتیں کیں۔

ایرو نے اپنی کتاب میں جو میڈرڈ میں شائع ہوئی تھی ظاہر کیا ہے کہ جنت عدن میں بکانی زبان (شمالی ہسپانیہ) کی بولی جاتی ہے 1580ء میں گروپیں نے ایک کتاب لکھی کہ یہ سب غلط ہے بہشت میں تو ڈچ زبان بولی جاتی ہے۔

اب جغرافیہ کو لیجئے کہ اس میں کیا کیا گل کھلائے گئے چھٹی صدی میں ایک راہب نے جس کا نام کاسماس تھا ایک کتاب ہیئت و جغرافیہ کی ملی جلی لکھی اور ظاہر کیا کہ بائبل میں جو کچھ پایا جاتا ہے وہی بالکل صحیح ہے یعنی دنیا مشتمل تھی ایک مسطح قطعہ زمین اور اس کے بعد دائرہ دار ٹکڑوں پر یہ قطعہ زمین چاروں طرف پانی سے بھرا ہوا تھا جسے سمندر کہتے ہیں

اور پانی کے حصہ سے آگے ایک اور حلقہ خشکی کا تھا اور طوفان سے قبل یہیں انسانی آبادی پائی جاتی تھی یہیں ایک بلند پہاڑ تھا جس کے گرد سورج چاند طواف کرتے تھے۔ اور جب سورج اس پہاڑ کے پیچھے چلا جاتا تو رات ہو جاتی تھی اور سامنے آجاتا تھا تو دن ہو جاتا تھا اس راہب نے یہ بھی بتلایا کہ بیرونی دائرہ خشکی کے کنارہ سے آسمان بندھا ہوا تھا اور وہ کسی ٹھوس چیز کا بنا ہوا تھا اور زمین میں ایک کڑھائی کی طرح ڈھکے ہوئے تھا۔

ان بیانات کے ساتھ ہی اس کا بھی اہتمام تھا کہ بائبل میں کائنات کے متعلق جو لکھا ہے اس کے خلاف کوئی شخص کچھ نہ کہے نہ سمجھے ورنہ وہ کافر و بے دین قرار دیا جائے گا۔

علم کے خلاف مذہب کی اس جنگ کا یہ حال تھا کہ لکھنا پڑھنا ممنوع تھا اور جو کوئی ایسا کرتا تھا اسے طرح طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ اگر کسی کے منہ سے نکل گیا کہ زمین ایک کرہ ہے تو اسے پکڑ کر جلا دیا گیا۔ اگر کسی نے دعوے کیا کہ آفتاب نظام شمسی کا مرکز ہے تو اسے جلا وطن کر دیا گیا۔ ایک عورت کو صرف اس لیے سولی پر چڑھا دیا کہ وہ بخار کی تکلیف کو گا گا کر کم کر رہی تھی۔

مگر چونکہ یہ عقیدہ عام تھا کہ انسان اپنی روح کا مالک نہیں ہے اس لیے ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی مرتسم ہو گیا کہ وہ اپنے جسم کا بھی مالک نہیں ہے اور اس طرح غلامی کی بنیاد قائم ہوئی پھر جنھوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے ان سے مخفی نہیں کہ یونان و روما' فرانس' و جرمنی وغیرہ میں غلامی کے کتنے وسیع و مہیب ادارے قائم تھے اور انسانوں کو جانور بنانے میں انھوں نے کتنا بڑا حصہ لیا۔

الغرض مذہب کے تاریک دور میں انسان کا جسم و ذہن دونوں انتہائی ذلیل غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور انسانیت کا مستقبل سخت تاریکی میں جلا تھا لیکن چونکہ حقیقت و صداقت کو عرصہ تک دبایا نہیں جا سکتا اور فراست انسانی وہ چنگاری نہیں جو کسی نہ کسی وقت بھڑک نہ اٹھے۔ اس لیے رفتہ رفتہ ایک زمانہ آیا کہ علم کی روشنی پھیلی۔ مذہب نے اس کے لیے جگہ چھوڑی اور اس طرح انسانیت جو ہزاروں سال سے وحشت و درندگی کے بوجھ کے نیچے پڑی کراہ رہی تھی آزاد ہوئی۔

پرانے جغرافیے بدلے تاریخ بدلی حقدارت بدلے اور آخر کار انسان مذہب کی گرفت سے چھٹ کر آزاد ہو گیا علم و فن کسی کی ملکیت نہ رہا سوچنے سمجھنے کا ہر شخص کو مجاز ہو گیا۔ غور و تدبیر ہر شخص کا فطری حق قرار پایا۔ اختراعات و ایجادات کا دروازہ کھل گیا آزادی

فکر ورائے کے لیے کوئی مانع حائل نہ رہا اور انسان کو اس طرح سب سے پہلے ترک مذہب ہی کے بعد معلوم ہوا کہ وہ خلیفتہ اللہ فی الارض ہے۔

ترقی کا مفہوم کیا ہے اس سوال کا مطالعہ آپ مذہبی نقطہ نظر سے بھی کیجئے اور مذہب سے علیحدہ ہو کر بھی آپ کو بالکل دو مختلف جواب ملیں گے مذہب کے نزدیک ترقی کا مفہوم اس دنیا سے تعلق رکھتا ہے جہاں دنیاوی افعال اعمال کے نتائج سے واسطہ پڑے گا اور عمل کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے پھر کیا یہ امر حیرت ناک نہیں کہ جس عالم کے کردار سے مذہب نے جزا و سزا کو متعلق بتایا ہے اسی کو اندھوں کی طرح بسر کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔

اب ذرا مذہب کی پابندیوں سے ہٹ کر انسانیت کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کتنی وسعت ہے جدوجہد کا کتنا پھیلاؤ ہے اور اس کے مقاصد کتنے بلند ہیں سب سے بڑی چیز جس پر انسان فخر کرسکتا ہے وسعت نظر ہے اور اس کا پتہ صرف عالم اخلاق میں چل سکتا ہے پھر دیکھیے کہ اخلاقی حیثیت کس کی زیادہ بلند ہے ایک مذہب کا پابند خواہ وہ کتنا ہی بلند نظریہ اخلاق کا رکھتا ہو دوسرے مذہب والے کو تحقیر و استخفاف کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہے۔ یہ خیال رہے کہ صرف میں راہ راست پر ہوں اور دوسرا گمراہ ہے قدرتاً ایک شخص کے جذبہ تفوق پیدا کر کے دوسرے کو حقیر و ذلیل ٹھہرائے گا اور یہی وہ ایک جذبہ تھا جو ہمیشہ دنیا میں فساد و خونریزی کا باعث ہوا۔

یوں تو مذہب نے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا ہے کہ وہ دنیا میں امن و سکون پھیلانے آیا ہے لیکن عمل سے وہ اس دعوی کو کبھی صحیح ثابت نہ کر سکا اور اس لیے اگر واقعی ترقی کی راہوں پر غور کرنا ہے تو مذہب سے علیحدہ ہو کر غور کرنا چاہیے اور انسانیت کے کلی مفہوم کو سامنے رکھ کر شاہراہ عمل متعین کرنا چاہیے۔

○ ○ ○

مذاہب کی واہمہ پرستیاں!

کل ایک بزرگ تشریف لائے اور عجیب و غریب بحث چھیڑ دی ان کا ذہن جن خیالات سے متاثر تھا ان کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ کہنے والے کہتے ہیں خدا مستجاب الدعوات ہے لوگوں کی دعائیں سنتا ہے' غریبوں کی فریاد کو پہنچتا ہے۔ اس نے آدم کی گریہ وزاری کو سنا اور کھوئی ہوئی جنت کے عوض اس سے بہتر فردوس کا وعدہ کر کے ان کے آنسو پونچھے یعقوب کی سرشک آلود آنکھوں کو دیکھا اور ان کے یوسف گم گشتہ کو پھر ان کی آغوش تک پہنچا دیا وہی تھا جس نے نوح کو طوفان سے زندہ سلامت نکالا۔ آتش نمرود کو ابراہیم کے لیے اک گلزار بنا دیا۔ یونس کو بطن ماہی کے اندر فنا ہونے نہ دیا موسیٰ کی حمایت میں فرعون کو غرق کیا۔ مسیح کو دوبارہ زندہ کر کے اپنے پہلو میں جگہ دی اور محمد کو ان کی دعائے نیم کشی کے عوض کونین اٹھا کر دے دیئے لیکن جس وقت ہم خود اپنے ذاتی احساس و تجربہ کی دنیا میں اس عقیدہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ یہ "روایتی خدا" واقعی ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو اس کی حقیقت و نوعیت کیا ہے؟

آج انسانیت جس دور اضطراب سے گزر رہی ہے اس نے نوح کے طوفان کو بھلا دیا۔ آتش نمرود اس کے سامنے ایک چنگاری کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ بنی اسرائیل پر جو مظالم روا رکھے گئے ان سے زیادہ ظلم اب دنیا پر ہو رہا ہے۔ محمدؐ کے زمانہ میں جس بت پرستی نے اخلاق انسانی کا خون کر رکھا تھا اس سے زیادہ صداقت سوز صورتیں اس وقت پیدا ہیں غریبوں کی فریاد مظلوموں کی کراہ اگر پہلے ہزاروں تک محدود تھی تو اب کروڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ پہلے آگ جسم سے شروع ہوتی تھی اور وہیں ختم ہو جاتی تھی اب یہ شعلے دل سے اٹھتے ہیں اور جسم و جان دونوں کو پھونک ڈالتے ہیں لیکن نہ خدائی قہر و غضب میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور نہ اس کا دریائے رحمت جوش میں آتا ہے "یہ سن کر میں نے جو جواب دیا" زیادہ تر فلسفی حیثیت رکھتا تھا لیکن ان کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ کیا یہ ذہنی گمراہی ہماری مذہبی تعلیم کا نتیجہ نہیں ہے اور کیا دلوں میں ایسے شکوک پیدا ہونے کی ذمہ داری مذہب پر نہیں ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ خود ہی ایک مفروضہ اپنے ذہن سے پیدا کرتا ہے۔

اور جب تجربہ سے اس کے نتائج خلاف امید ظاہر ہوتے ہیں تو وہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے دوسروں پر الزام رکھتا ہے اس نے خدا کا ایک مفہوم مقرر کیا اور جب خدا ویسانہ نہ نکلا جیسا اس نے سمجھا تھا تو اپنی غلطی تسلیم کرنے کی جگہ خدا کی طرف سے بدگمانیاں پیدا کرنے لگا یعنی خدا کو وہ ویسا ہی سمجھے جائے گا جیسا وہ سمجھ چکا ہے خواہ خدا کی خدائی رہے یا نہ رہے۔

خدا کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس مسئلہ پر انسان اپنی مجبورانہ حیثیت کو سامنے رکھ کر غور کرتا ہے اور اس لیے وہ چاہتا ہے کہ وہ کسی کا سہارا ڈھونڈھ کر اپنی جدوجہد کی مصیبتوں کو کم کر دے اور یہیں سے وہ خدا وجود میں جاتا ہے جس سے ہم اپنی ناکامیوں پر باز پرس کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر انسان اپنی قوت عمل کو اصل چیز قرار دے کر خدا کا مفہوم متعین کرے تو شاید خدا خود اس کو اپنے اندر نظر آئے اور وہ اپنی ہی عملی زندگی کی اصلاح و درستی کی طرف مائل ہو۔

سوچتے سوچتے جب میرے سامنے مذاہب عالم کی تاریخ آئی اور ان معتقدات کی تفصیل جن کو مذہب نے دنیا سے تسلیم کرایا ہے تو میرے ذہن نے زیادہ عمیق فلسفیانہ رخ اختیار کیا۔ ایک بے لاگ انقلابانہ کیفیت میرے اندر پیدا ہوئی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اگر مذاہب کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی بنیاد سوا واہمہ پرستی کے اور کچھ نظر نہیں آتی۔

سب سے بڑی واہمہ پرستی جو سرچشمہ ہے اور بہت سے اوہام کا۔ معجزہ کا اعتقاد ہے معجزہ نام ہے ایسے فعل کا جو قوانین فطرت کے خلاف ہو' یعنی اگر کوئی شخص ایسا دائرہ بنا سکے جس کا قطر اس کے محیط کا نصف ہو تو یہ اقلیدس کا معجزہ کہلائے گا اگر ہم دو اور دو کے مجموعہ کو پانچ ثبت کر دکھائیں تو یہ دنیائے ریاضی کا معجزہ کہلائے گا۔ اگر کوئی شخص بلندی سے پتھر گرائے اور پہلے سیکنڈ میں اس کی رفتار دس فٹ ہو دوسرے سیکنڈ میں 25 اور تیسرے میں 35 اور تیسرے سیکنڈ میں پانچ فٹ تو یہ طبیعیات کا معجزہ کہلائے گا۔ اگر ایک آدمی ہائیڈروجن آکسیجن اور نائٹروجن کو ملا کر سونا تیار کر لے تو یہ علم الکیمیا کا معجزہ ہوگا اور اگر کوئی حکومت چاندی کے سکے کو سونے کا سکہ بنا سکے تو فنانس کا معجزہ ہوگا اس طرح ایک چوکور مثلث بنانا آئینہ کی پشت پر کھڑے ہونے والے کا عکس آئینہ میں دکھا دینا۔ آواز بازگشت سے علاوہ اپنی آواز کے اور کوئی آواز پیدا کرنا الغرض قدرت کے مقررہ قوانین کے خلاف کوئی بات کر دکھانا معجزہ کہلائے گا لیکن اس وقت جبکہ فطرت کے قوانین اٹل سمجھے

جاتے ہیں اور تمام ذہنی ترقیوں کا انحصار اس پر ہے۔ کیا آپ میں اس کی ہمت ہو سکتی ہے کہ ایسا دعویٰ کریں اور کیا کوئی اس کا یقین کر سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو انسان ہی نے پیدا کیا اور بڑی حد تک اپنی ہی طرح سے انسان سمجھا۔ عہد وحشت کے انسان نے جو تصور خدا کا پیش کیا اس میں بھی وہی وحشت و درندگی پائی جاتی تھی اس کے بعد جب انسان نے کچھ ترقی کی تو خدا بھی ایک حد تک ترقی یافتہ ہو گیا۔ اس کی وحشت کم کر کے تھوڑا سا رحم بھی اس کے دل میں ڈال دیا گیا جب انسانی ذہن و خیال میں اور زیادہ وسعت پیدا ہوئی تو خدا بھی زیادہ منصف زیادہ رحم کرنے والا اور زیادہ مقدس ہو گیا۔ یہاں تک کہ مسیح تشریف لائے اور انھوں نے خدا کو سراپا رحم و محبت ظاہر کیا۔ لیکن زلزلے برابر آتے رہے' وبائیں بدستور پھیلتی رہیں قحط برابر پڑتے رہے اور لاکھوں آدمی تڑپ کر جان دیتے رہے جس کی تاویل مذہب والوں نے یہ کی کہ یہ تباہیاں' یہ مصائب سب انسان ہی کی فلاح کے لیے ہیں کیونکہ لذت تنعم عیش و راحت اخلاق خراب کر دیتے ہیں لیکن کیا یہ باتیں اس زمانہ میں بھی نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا۔ ہم کو معلوم ہے کہ نہ نیکی کبھی بدی ہو سکتی ہے نہ بدی نیکی' یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ تاریکی کسے کہتے ہیں اور روشنی کیا ہے؟ لیکن یہ کبھی نہیں مان سکتے کہ نیکی و بدی کی تعیین و تحدید خدا کی طرف سے ہوئی ہے بلکہ ہم کو ہماری ضروریات زندگی نے بتایا ہے کہ ہماری معاشرت کے تجربات نے سکھایا ہے اور آئندہ بھی اصول اخلاق میں جو تغیرات پیدا ہوں گے وہ ہمارے ہی وضع کیے ہوئے ہوں گے اور ہماری ضروریات تمدن سے متعلق ہوں گے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ معتقدات مذہبی سے ہم کو کیا نقصان پہنچتا ہے اگر ہم دوزخ و جنت' حور و قصور' جن و ملک' معجزہ و خرق' عادات وغیرہ پر عقیدہ رکھتے ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے جبکہ ان عقائد کا مقصود بھی اصلاح اخلاق ہے بظاہر یہ بات قرین عقل معلوم ہوتی ہے لیکن فی الحقیقت ان عقائد کے نقصانات حد درجہ مہلک ہیں!

یہ معتقدات چونکہ یکسر روایات پر مبنی ہیں اور عقل و درایت کا ان سے کوئی تعلق نہیں اس لیے ان کو صحیح سمجھ لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا ذہن حقائق کی جستجو سے منحرف ہو جاتا ہے۔ اسباب و نتائج کے رابطہ کو سمجھنے کی اہلیت ہم میں باقی نہیں رہتی انسان کے تمام قواء ذہنی معطل ہو جاتے ہیں اور ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔

پھر اگر خدا کا تصور ہمیشہ زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے تو اب بھی اس کو بدلنا پڑے گا اور اگر مذہب انسان کے لیے ضروری ہے تو اس کے اصول بھی وہی مقرر کرنے ہوں گے جو ہمارے لیے مفید ہوں یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم قدرت کا مفہوم اس کے قوانین سے قطع نظر کر کے متعین کریں۔ اگر خدا ہے تو یقیناً وہ ان اصولوں کا پابند ہے جو اس نے وضع کیے ہیں اور اگر وہ ان اصولوں سے منحرف ہو سکتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم بھی اس سے منحرف ہو سکتے ہیں اور رشتہ عبد و معبود کبھی استوار نہیں ہو سکتا۔

خدا کا وجود فی نفسہ نہ خلاف عقل ہے نہ مضرت رساں لیکن ہمارا نفع و ضرر اس کے تصور کی نوعیت سے ضرور متعلق ہو جاتا ہے اگر ہم خدا کو ایسی ایک قوت مان لیں جو کائنات کے نظام تخلیق و ارتقاء میں کارفرما ہے تو اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم اس کا تصور ایک دنیاوی بادشاہ کی طرح کریں کہ وہ کسی سے خوش ہو کر نہال کر دیتا ہے اور کسی پر غضب ناک ہو کر تباہ تو بے شک یہ تصور غلط' مضرت رساں اور مانع ترقی ہو گا!

ہر چند خدا کے اس جدید تصور سے انبیاء ورسل' صحف مقدسہ' حیات بعدالموت' دوزخ و جنت' ملائکہ و شیاطین' حشر و نشر' عذاب و ثواب ختم ہو جائیں گے یا ان کی کوئی عقلی توجیہہ و تاویل کرنا ہو گی۔ لیکن اس کا کوئی علاج نہیں۔ ہم کو ان مروجہ عقائد اور خدا دونوں میں سے ایک کو لینا ہے اور غالباً یہ زیادہ آسان ہو گا کہ خدا کے مقابلہ میں ان معتقدات کو پس پشت ڈال دیا جائے اور بقائے مذہب کی ہلکی سی ہلکی جو صورت ہو سکتی ہے اس پر قناعت کی جائے۔

میں اس سے قبل بھی بارہا لکھ چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں جب تک مذہب کا وجود باقی ہے دنیا کا امن و سکون خطرہ میں ہے یہ ہو نہیں سکتا کہ تمام کرہ ارض پر ایک ہی مذہب کے ماننے والے پائے جائیں اور مذہب کا اختلاف حقیقتاً دلوں کا اختلاف ہے جس سے جذبہ منافرت پیدا ہونا ضروری ہے' یہ بالکل درست ہے کہ مذہب کے فنا ہونے کے بعد بھی جنگ و جدال یقیناً قائم رہے گی لیکن یہ اختلاف ہمارے قوائے ذہن کو مضمحل کرنے والا ثابت نہ ہو گا بلکہ مدافعت و حفاظت کا جذبہ ہمیں زیادہ حرکت و عمل پر آمادہ کرے گا' اور ہو سکتا ہے کہ آخر کار تمام نوع انسان کسی ایک مرکز پر جمع ہو کر ان مادی اختلافات کو دور کر سکیں لیکن مذہب کے ہوتے ہوئے اس کا کوئی امکان نہیں۔

○ ○ ○

بت پرستی و بت شکنی

دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے بت پرستی کی شدید مخالفت کی اور جس کے علمبرداروں نے اپنے آپ کو بت شکن' کہلانے کے لیے نہ ہمالیہ کی بلندیوں کی پروا کی اور نہ بحرہند کی گہرائیوں کی۔ وہ مورو ملخ کی تعداد میں فوجیں فراہم کر کے اٹھے۔ صرصرو سیل کی طرح نہ رکنے والا عزم لے کر آگے بڑھے اور برق و زلزلہ کے مانند ہر اس بت کدہ کو تباہ و برباد کر گئے جو ان کے سامنے آیا۔ ان کا ہر قدم جو اس غرض سے اٹھتا تھا جنت عدن سے قریب تر کر دینے والا ہوتا تھا۔ اور تیشہ کی ہر وہ ضرب جو کسی بت پر پڑتی تھی گویا قصر فردوس کی تعمیر کی مترادف تھی۔ وہ مذہب جس کی بنیاد ہی لات و ہبل کی مسماری پر قائم ہوئی ہو اس کے متبعین میں یہی جوش و خروش ہونا چاہیے تھا اور ہر سومنات کے لیے ان کے اندر ایک محمود کا پیدا ہو جانا ضروری تھا لیکن صبح صادق کی نورانی صباحت میں جب مندر کے کسی گھنٹہ کی آواز میرے کانوں میں پڑتی تو میں دیر تک سوچتا رہتا کہ ہوں کہ ایک بت کا تعلق انسان کے کن جذبات سے وابستہ ہے اور کیوں یہ اختلاف ہے کہ ایک طرف گرز گراں اٹھا ہوا نظر آتا ہے اور دوسری طرف "جنید کلید ہست کدہ وروست برہمن"

یوں تو دنیا کا ہر پتھر جس کو ہم ٹھوکر لگاتے ہوئے گزر جاتے ہیں' بت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنے اندر ایک "نا تراشیدہ معبود" چھپائے ہوئے ہے لیکن نہ بت پرست اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے اور نہ "بت شکن" اس پر اپنا تیشہ صرف کرتا ہے۔ کیوں؟ آیئے آج کی صحبت میں اسی پر غور کریں۔ شاید تسبیح وزنار کی گتھیوں کو اس طرح سلجھا سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق "مادہ" سے ہوئی ہے اور مادہ قدیم ہے ہمیں اس دعوی کے صدق و کذب پر اس وقت بحث کرنا مقصود نہیں۔ لیکن ہمارا تجربہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ محض مادہ کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ اصل چیز جو اس کو باوقعت بناتی ہے انسان کی ذہانت ہے جو اس پر صرف ہوتی ہے۔ مٹی یوں کوئی قیمت نہیں رکھتی لیکن جس وقت اس سے کوئی برتن بنا لیا جاتا ہے تو اس کی قیمت متعین ہو جاتی ہے لوہا اپنے معدن کے اندر بے کار ہے لیکن

جب انسان اسے باہر نکال کر دوسری شکلوں میں تبدیل کر لیتا ہے تو اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے سونا یوں کسی کام کی چیز نہیں لیکن چونکہ ذہن انسانی نے اس کو معیاری قدرو قیمت کی چیز سمجھ لیا ہے اس لیے وہ گراں ہے الغرض مادہ بذات خود کوئی چیز نہیں اور اگر انسان کی ذہانت خواہ وہ خالص عملی پہلو رکھتی ہو یا جذباتی' اس سے متعلق نہ ہو تو وہ بالکل بے کار شے ہے!

اب اس نظریہ کو سامنے رکھ کر ایک "بت" کی حقیقت پر غور کیجیے کہ وہ کیا ہے بت فی الاصل ایک پتھر کا ٹکڑا تھا۔ جب تک اس کو انسانی ذہانت نے ایک مخصوص شکل میں تبدیل نہ کیا تھا وہ ایک حقیر پارہ سنگ تھا جس وقت تک انسان نے اپنے جذبات کو اس میں مشکل نہ کیا تھا' لیکن "بت تراش" کی چھینی اور ایک "برہمن" کے جذبہ عقیدت سے مس ہوتے ہی وہ اس قدر مقدس ہو گیا کہ پیشانیاں اس کے سامنے جھکنے لگیں اس لیے اگر بت شکنی' کا ہدف صرف وہ "پیکر سنگیں" قرار پائے جو مندروں میں رکھا ہوا نظر آتا ہے تو اس سے زیادہ کوتاہ نظری اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ پتھر کو بت بنا دینے والی حقیر و ذلیل پارہ سنگ کو "معبود" کی حیثیت دینے والی ذہنیت اس سے بدل نہیں سکتی' اور وہ ہزار بت شکنیوں کے بعد بھی بدستور قائم رہ سکتی ہے۔ ہاں اگر کسی مخصوص و متعین "بت" کو توڑنے کے بعد کوئی دوسرا بت اس کی جگہ نہ لے سکے تو بے شک "بت شکنی" مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن چونکہ بت پرستی کا تعلق صرف انسان کی ذہنیت سے ہے اس لیے جب تک اس بت کدہ کو نہ توڑا جائے جو انسان کے قلب و دماغ میں چھپا ہوا ہے۔ یہ مادی بربادیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام دنیا کا تنہا وہ مذہب ہے جس نے بت شکنی میں خاص شہرت حاصل کی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصود "لات وہبل" کی صرف مورتیوں کو مسمار کر کے خاموش ہو جانا نہیں تھا بلکہ اس ذہنیت کو منہدم کرنا تھا جو انسان کے اندر غلامانہ تذلل پیدا کرتی ہے اور اسی لیے جب کسی بت کو توڑا تو اس کا فلسفہ بھی ساتھ ہی ساتھ بتا دیا کہ پرستش کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ اس مادی عالم سے جدا ایک اور چیز ہے جو خود انسان کے اندر ہی موجود ہے اور جس کا اصطلاحی نام "خدا" ہے۔ انسان جسم ظاہری کے لحاظ سے یقیناً" فانی ہے لیکن اپنی معنویت کے لحاظ سے وہ قطعاً" غیر فانی ہے۔ انفرادی حیثیت سے وہ چاہے کتنا ہی بے بود ہو لیکن کلی و اجتماعی حیثیت سے وہ

لازوال مقصود آفرینش ہے اور یہی وہ حقیقت تھی جو بعض زبانوں سے "انا الحق" کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

بہرحال "بت پرستی" اگر انسان سے اس جذبہ بلند کو محو کر دینے والی ہے تو یقیناً" نہایت مضرت رساں چیز ہے اور اس کو یقیناً" مٹ جانا چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس وقت بھی نزاع کفر و دین کو جاری رہنا چاہیے اور ایک کے جذبہ بت شکنی کو دوسرے کے جذبہ بت پرستی سے متصادم ہونا چاہیے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ وہ ہے جب تمام دنیا سے مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے اور عام طور پر محسوس کیا جا رہا ہے کہ وہ عقول انسانی کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں میں کہتا ہوں کہ یہی وہ زمانہ ہے جب مذہب کا وہ ارتقائی مفہوم ہمارے سامنے آیا جس پر تمام نوع انسانی متفق ہو سکتی ہے اور یہی وہ دور عقل و فراست ہے جس نے حقیقی مذہب کے چہرے کو بے نقاب کر کے اس کے دلکش خط و خال نمایاں کر دیئے ہیں۔

مذہب ضرورت انسانی کی پیداوار تھی اور ہماری ضرورتوں کے ساتھ ہی ساتھ اس کو بھی چلنا چاہیے اول اول جب انسان کی "اجتماعی حیثیت" محدود طبقوں اور مخصوص قوموں کے لحاظ سے بہت تنگ تھی تو مذہب کا نقطہ نظر بھی تنگ تھا۔ اور ہونا چاہیے تھا لیکن اب کہ نظام تمدن نے وسیع ہو کر مشرق و مغرب کے امتیاز کو مٹا دیا ہے اور انسان صحیح معنی میں " خلیفہ اللہ فی الارض" بن کر سارے کرہ ارض پر چھا گیا ہے۔ مذہب کو بھی وسیع ہونا چاہیے۔ اس کے مقصود کو بھی بدلنا چاہیے اور اس کے اصول میں بھی وسعت پیدا ہونا چاہیے تاکہ امتیاز نسل و رنگ اور اختلاف مسجد و کلیسا سے بلند ہو کر تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لایا جا سکے۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مذہب کو صرف مابعد الطبیعیات تک محدود رکھا جائے' جزا و سزا کا معیار' بہشت و دوزخ یا حور و قصور کی سطح سے بہت بلند ہو گیا ہے اور اب خدا نام کسی ایسی قہار و جبار ہستی کا نہیں رہا جو کسی خود مختار فرمانروا کی طرح دنیا میں صرف غلامی کو رواج دینا چاہتا ہے۔ مذہب کا دوسرا استبداد (AUTO CRACY) ختم ہو گیا اور اگر وہ اپنے آپ کو قائم رکھنا چاہتا ہے تو اس کو بھی زمانہ کا ساتھ دینا پڑے گا جو اس وقت صرف عالمگیر سکون و آزادی چاہتا ہے۔

وہ دور جب انسان نے خدا کے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے تھے گزر گیا ہے آج جو خدا

عیسائیوں کا ہے وہی ہندوؤں کا ہے جو ہندوؤں کا ہے وہی مسلمانوں کا ہے جس طرح وہ مسجد کی اذانوں میں چھپا ہوا ہے اسی طرح وہ ناقوس میں پوشیدہ ہے۔ اس کا سورج سب پر یکساں چمکتا ہے۔ اس کے الطاف سب کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اس کی محبت ہر ہر فرد کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اس کے حسن نے کائنات کی ہر ہر چیز کو مخصور کر رکھا ہے اس کے نغموں نے ہر ہر شے کو مبہوت بنا رکھا ہے وہ ذرہ ذرہ کے اندر سمایا ہوا ہے وہ کائنات کی نبض میں گرم خون کی طرح دوڑ رہا ہے عالم کون کے سینہ میں قلب بنا ہوا دھڑک رہا ہے وہ گویا ایک مرکزالمراکز ہے جہاں پہنچ کر ماضی حال و مستقبل سب ایک ہو جاتے ہیں۔

آج کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا کا مفہوم کوئی علیحدہ قرار دے اس کا کوئی جداگانہ تصور پیدا کر کے اپنے لیے مخصوص کرے۔ مذاہب قدیمہ نے عرصہ تک خدا کو اپنا غلام بنا رکھا تھا لیکن اب وہ اس شکنجہ سے آزاد ہو گیا ہے اور اپنا معبد اس نے عقل انسانی کی اس غیر محدود فضا میں تعمیر کیا ہے جہاں وحوش و طیور' انس و جن' سیاہ و سفید' جاہل و عالم' شاہ و گدا سب ایک سطح پر نظر آتے ہیں اور نوع انسانی اپنی تفریق کو محو کر چکی ہے۔

آج کوئی قوم ایسی نہیں جو برگزیدگی کو صرف اپنے لیے مخصوص کر سکے۔ کوئی جماعت اس کی مستحق نہیں کہ وہ سوا اپنے باقی سب کو گمراہ قرار دے۔ اگر انسان کی قسمت میں نجات لکھی ہے تو وہ اسی دنیا میں حاصل ہو گی اور نوع انسانی کا ہر ہر فرد اس میں برابر کا شریک ہو گا۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک انعام خداوندی کا مستحق قرار دیا جائے۔ اور دوسرا آلام و مصائب کا شکار بنا رہے۔ اگر معصیت کی بناء پر انسان کو دوزخ میں جانا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ میں جاؤں اور آپ بچ جائیں۔ اب تو یہاں دوزخ ہی رہے گی یا فردوس' اور بلا تفریق سب کو اسی ایک سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ دور اشتراکیت کا اجتماعیت کا ہے جب ہر چیز ایک کلی و عمومی حیثیت اختیار کرنا چاہتی ہے اور خدا کی (UNIVERSALITY) حیات انسانی کی ہر ہر پہلو کو کائناتی' بنا دینا چاہتی ہے' ہمارا خدا ہمارا معبد ہمارا مذہب' ہماری عبادت' ہماری روحانیت سب کو "کائناتی" رنگ اختیار کرتا ہے اور یہی وہ حقیقی مقصود آفرینش تھا جس کی تکمیل کا زمانہ اب آرہا ہے۔

خدا اب مندروں' مسجدوں اور کلیساؤں کے اندر مقید نہیں رہنا چاہتا اس کا مطالبہ اب یہ ہے کہ فطرت کی وسعت میں اسے تلاش کیاجائے اور دل کے اندر اس کا استھان بنایا جائے۔ وہ اب انسان کے بنائے ہوئے معبدوں میں رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ اس معبد میں جو

خود اسی کا بنایا ہوا ہے جہاں بلا تفریق و امتیاز سب کے سر جھک جاتے ہیں اور وہ معبد انسان کا قلب و دماغ ہے۔

مسجد و کلیسا کی تفریق کا وقت گزر گیا۔ زنار و تسبیح کے امتیاز کا زمانہ ختم ہو گیا۔ جن کو ہم بت سمجھ کر پوجتے تھے وہ ازخود سرنگوں ہوتے جا رہے ہیں جن کی پرستش ہم خدا سمجھ کر کرتے تھے وہ خود ہم سے بیزار ہیں اس لیے ہم کو بت پرستوں کی جستجو اجودھیا اور کاشی سے باہر کسی اور جگہ کرنا چاہیے اور پرستاران خدا کی تلاش حطیم کعبہ سے باہر کہیں اور دنیا میں بت پرستی اب بھی قائم ہے لیکن مورتیوں کی صورت میں نہیں۔ بت شکنی اب بھی ضروری ہے لیکن تیشہ آہنی سے نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ بت کہاں اور کن کن شکلوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بت ہر جگہ موجود ہیں اور مختلف شکلوں میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔

یہ بت تم کو خانقاہوں میں زرکار مسندوں پر بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے۔ تعلیمی اداروں میں قرآن وحدیث کا درس دیتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سیاسی جلسوں میں صدارتی تقریریں کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

ان کی صورتیں نورانی ہوں گی لیکن دل سیاہ ان کی زبانوں پر خدا رسول کا نام ہو گا لیکن صرف نمود ونمائش کے لیے ان کی تقریروں سے ملک و قوم کی محبت ٹپکتی ہو گی لیکن ان کا مقصود صرف اپنی ذات ہو گی۔ان کی پیشانیوں پر سجدہ کا نشان ان کی دامندر طویل قبائیں ان کی عریض و طویل داڑھیاں' ان کی ہر وقت گردش کرنے والی خاک شفا کی سرنیں' ان کی وہ خصوصیات ہیں جن سے تم ان بتوں کو ہمیشہ آسانی سے پہچان سکتے ہو۔ یہ خود کبھی سلام میں تقدیم نہیں کریں گے۔ کوئی دوسرا سلام کرے گا تو جواب میں کبھی سر نہ جھکائیں گے جب یہ کسی طرف سے گزریں گے تو ان کے زائرین کا ایک ہجوم ان کے ساتھ ہو گا اور جب خانقاہوں کے اندر شہ نشینوں پر ان کو بیٹھا دیکھو گے تو یہ معلوم ہو گا کہ خداوند لقا' اپنے بندوں کو دیدار سے مشرف کر رہا ہے۔

جس وقت یہ قرآن کا درس دے رہے ہوں گے تو سوائے نحوی صرفی نکات کے کوئی اور موضوع ان کے سامنے نہ ہو گا۔ جب حدیث پڑھا رہے ہوں گے تو اسماء رجال کی تحقیق ان کا انتہائی کارنامہ ہو گا۔ جب یہ منبر پہ وعظ فرما رہے ہوں گے تو سوا خدا کے قہر و غضب اور جہنم کے ہولناک مناظر کے وہ کچھ نہ بیان کریں گے' سیرۃ اکابر پر اظہار خیال فرمائیں گے تو سوا ان باتوں کے جو حماقتوں سے پر ہیں کوئی لفظ ان کے منہ سے نہ نکلے گا فرشتوں کی

باتیں جنت کے افسانے' معجزہ و کرامات کے واقعات اور اسی طرح کے دیگر مزخرفات ان کے مواعظ کی جان ہیں۔ اخلاق کا ورس بھولے سے اگر کبھی دیں گے بھی تو وہ بہشت کی طمع جہنم کے خوف سے خالی نہ ہو گا اور ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئے گی کہ نیکی کرنا ہر انسان کا فطری فرض ہے اور اسے خیال مزدو تعزیز سے بہت بلند ہونا چاہیے۔

یہ اگر رواداری و ہمدردی کا ورس دے رہے ہوں گے تو یقین رکھو کہ ضرور کسی نہ کسی کا حق غضب کو کے آئے ہیں۔ یہ اگر اہل و عیال کے ساتھ محبت ورافت کا وعظ فرما رہے ہوں گے تو باور کرو کہ ابھی ابھی اپنی بیوی کو ٹھوکروں سے مار کر باہر نکلے ہیں۔ لوگوں کو سچ بولنے کی ہدایت کرتے ہیں تاکہ جھوٹ بولنے کا حق ان کے سوا کسی اور کو حاصل نہ ہو' عجزو انکسار کی خوبیاں بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ آ آکر ان کے قدموں کو بوسہ دیں۔

الغرض یہ ہیں وہ بت جن کو اس وقت توڑنے کی ضرورت ہے اور یہ ہیں آج کل کے وہ "لات و ہبل" جن کو مسمار کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔

○ ○ ○

قرآن کے کلام خدا ہونے کا صحیح مفہوم

میں آج کی صحبت میں ذرا تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کو اس مفہوم میں خدا کا کلام کہنا جو عام طور پر قرار دیا جاتا ہے نہ صرف یہ کہ خود قرآن کے منشا کے خلاف ہے بلکہ اس صحیح تصور وحدانیت کے بھی منافی ہے جس کی تعلیم رسول اللہ نے پیش کی ہے میں اس بحث میں نہ احادیث و تفاسیر سے استناد کروں گا نہ اقوال سلف سے کیونکہ یہ جھگڑے کی چیزیں ہیں بلکہ خود کلام پاک کی آیات سے یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ کیا قرآن واقعی خدا کا کلام ہے اور اگر ہے تو کس مفہوم میں؟

1- چونکہ قرآن کے متعلق اہل مذہب کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ وہ وحی کے ذریعہ سے پہنچایا گیا تھا اس لیے نا مناسب نہ ہو گا اگر سب سے پہلے وحی کی حقیقت معلوم کر لی جائے وحی کے لغوی معنی اشارہ سریع یا الہام بالسرعۃ کے ہیں۔ اردو میں اس کا صحیح مفہوم بر محل سوجھ بوجھ کے فقرہ سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوت کسب و اکتساب سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ فطری ودیعت ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحی خدا کی عنایت ہے اور نتیجہ ہے اس ذہنی قوت کا جو فطرتاً انسان میں ودیعت کی گئی ہے اور چونکہ یہ قوت انبیاء میں زیادہ پائی جاتی ہے اور ان کا ہر قول و فعل صرف نوع انسان کی خدمت کے لیے ہوتا تھا اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ ان کی ہر بات وحی کا نتیجہ تھی اور ان کے منہ سے جو کچھ نکلتا تھا وہ اسی اشارہ خداوندی کے تحت ہوتا تھا۔

وحی کا مفہوم جو میں نے متعین کیا ہے وہ میری ذاتی رائے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خود قرآن پاک سے ظاہر ہوتا ہے۔

سب سے پہلے غلطی جو وحی کا مفہوم متعین کرنے میں روا رکھی گئی ہے یہ ہے کہ وحی کو انبیاء ورسل کے لیے مخصوص سمجھ لیا گیا حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انبیاء ورسل کے پاس وحی بھیجے جانے کا ذکر کلام پاک میں پایا جاتا ہے لیکن غیر انبیاء بلکہ حیوانات و جمادات پر بھی وحی کا نازل ہونا قرآن سے ثابت ہے سورہ قصص میں ارشاد ہوتا ہے۔

ولوحینا الی ام موسی ان ارضیعة

ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں' ظاہر ہے کہ موسیٰ کی ماں نبیہ نہ تھیں اور اس لیے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ کی ماں کے جی میں یہ بات ڈال دی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں اور اس طرح وحی کے معنی وہ نہ رہے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں۔

خدا نے انسان کے علاوہ حیوانات پر بھی وحی بھیجی ہے سورہ نحل کی آیت ہے۔

ولوحی ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا ومن الشجر وممایعرشون

ہم نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی کہ وہ پہاڑوں اور درختوں اور مکانوں میں اپنا چھتا بنائے۔

اس جگہ وحی کے معنی اس فطرت ذکاوت کے ہوئے جس سے کام لے کر شہد کی مکھی اپنا خوب صورت چھتا تیار کرتی ہے جمادات پر وحی نازل ہونے کا ثبوت سورہ زلزال کی اس آیت سے ملتا ہے۔

یومیذ تحدث اخبارہابان ربک اوحی لہا

"اس دن زمین اپنی خبریں اس طرح بیان کرنے لگے گی جیسے خدا نے اس پر وحی نازل کی ہو۔"

ظاہر ہے کہ زمین زبان نہیں رکھتی اس لیے اس کا یہ بیان بہ زبان حال ہو گا اور اس جگہ وحی کا مفہوم ماحول و اقتضا ماحول قرار پایا۔

کلام مجید میں ایک جگہ اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے سورہ "حم" میں ارشاد ہوتا ہے۔

فقضاہن سبع سموات فی یومین واوحی فی کل سماء امرہا

پس ہم نے دو دن میں سات آسمانوں کی تخلیق کا حکم دے دیا اور ہر آسمان میں اس کے نظم و اصول کو وحی کر دیا۔

اس جگہ وحی کے معنی وہی ودیعت کرنے کے ہوئے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن میں وحی کا لفظ کس قدر وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلق بڑی حد تک اس فطری صلاحیت یا ذکاوت سے ہے جو خدا نے ایک انسان کی

ذہن و دماغ میں ودیعت کر دی ہے لیکن آپ سن کر تعجب کریں گے کہ الہام و وحی کا استعمال بری باتوں کے لیے بھی کیا گیا ہے۔

سورہ شمس میں نفس ایمانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

فالهمها فجورها و تقوٰها

یعنی اس میں برائی بھلائی الہام کی —— یہاں بھی الہام اسی فطری صلاحیت وعدم صلاحیت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

لفظ وحی بھی ایک جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بری باتوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے ملاحظہ ہو سورہ انعام کی یہ آیت۔

وکذالک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضهم الی بعض زخرف القول غرورا۔

اس طرح ہم نے ہر نبی کے ساتھ اس کے دشمن اس کے ساتھ لگا دیے یہ وہ شیاطین ہیں جو ایک دوسرے کو لغو باتوں کی وحی کرتے رہتے ہیں۔

اس جگہ وحی کے معنی بری بات سمجھانے کے ہوئے یہاں تک تو لفظ وحی کے اس مفہوم سے بحث ہوئی جو مختلف جگہ پر مختلف مفہوم میں مستعمل ہوا ہے اب خود قرآن پاک سے جو تعلق وحی کا ظاہر کیا گیا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

سورہ نجم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وما ینطق عن الهوی ان ہوالاوحی یوحی علمه شدید القوی

رسول ہوائی باتیں نہیں کرتا بلکہ وہ سب کچھ وحی ہے اور ایک بڑی قوت والے نے اسے سکھلایا ہے۔

سورہ انعام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ لفظ کہے جاتے ہیں۔

واوحی الی هذالقرآن لانذرکم به۔

مجھ پر قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تمہیں بری باتوں کی طرف سے ڈراؤں۔

سورہ بنی اسرائیل میں قرآن کو حکمت کی کتاب بتایا جاتا ہے۔

ذلک مما اوحی الیک ربک من الحکمة۔

سورہ انعام میں ارشاد ہوتا ہے۔

قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الاما یوحی الی۔

(اے رسول کہہ دو کہ نہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ میں غیب کا حال جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ فرشتہ ہوں میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے وحی کیا جاتا ہے)

ان تمام آیات سے قرآن کو وحی بتایا گیا ہے لیکن صرف اس کے علم و حکمت ہونے کے لحاظ سے اور کہیں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ اس کے الفاظ بھی خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں۔

خدا کسی سے ہم کلام نہیں ہو سکتا نہ کوئی انسان اس سے ہمکلام ہو سکتا ہے اور عبدو معبود کی اس باہمی گفتگو کی صورت کوئی اگر ہو سکتی ہے تو صرف وحی کے ذریعہ چنانچہ سورہ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے۔

وماکان لبشران یکلمہ اللہ الا وحیاً اومن وراء حجاب

اس آیت سے اس عقیدہ کی بھی تردید ہوتی ہے کہ موسیٰ خدا سے باتیں کرتے تھے مسلمانوں میں یہ عقیدہ کیوں پیدا ہوا کہ قرآن کے تمام الفاظ خدا کے الفاظ اور فرشتہ ان الفاظ کو رسولوں کے پاس لایا کرتا تھا۔ اس کے متعلق ہم آئندہ بیان کریں گے لیکن ایسا عقیدہ رکھنے والوں کی طرف سے جو آیتیں کلام پاک کی پیش کی جاتی ہیں پہلے انھیں سن لیجئے۔

سورہ زخرف کی آیت ہے۔

انا جعلناہ قرآنا عربیا لعلکم تعقلون وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم

اس آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم ہے کہ قرآن اس ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جو ہمارے پاس موجود ہے یہ ام الکتاب ہے کیا اس کی صراحت میں وہ کلام مجید کی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ

یعنی قرآن ایک تختی میں محفوظ ہے۔

ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جس کا دوسرا نام لوح بھی ہے لیکن جس وقت ہم سورہ رعد کی حسب ذیل آیت پڑھتے ہیں تو ہم کو لوح و ام الکتاب دونوں کا صحیح مفہوم معلوم ہو جاتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

هوالذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ھنہ ام الکتاب واخر متشابہات

اس آیت میں ام الکتاب کو آیات محکمات سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی مضبوط و مستحکم نشانیاں یا بالفاظ دیگر وہ قوانین فطرت جو اٹل ہیں اور جن میں تبدیلی ممکن نہیں اور یہی مفہوم لوح یا تختی کا بھی قرار پایا۔

2- اب عام روایات کی بنا پر اس عقیدہ کو بھی ملاحظہ فرمایئے جو قرآن کے ام لاکتاب و لوح محفوظ میں مرسوم ہونے کے متعلق عام مسلمانوں میں رواج پا گیا ہے قصص الانبیاء کی روایت ملاحظہ ہو۔

عرش اعظم سے نیچے اس نے ایک دانہ مروارید پیدا کیا اور اس موتی سے اس نے لوح محفوظ بنائی اس لوح کا طول 700 سال کی راہ اور عرض 300 برس کی راہ تھا (معلوم نہیں راہ کس کی مراد ہے انسان کی طیور کی یا حشرات کی اور اگر موٹر یا ہوائی جہاز کی رفتار کو سامنے رکھا جائے تو یہ رہ کتنے دن کی قرار پائے گی) اس کے حاشیہ پر خدا نے اپنی قدرت سے لعل و یاقوت کی گلکاری کی تھی بعد ازاں قلم کو حکم ہوا کہ لکھ اے قلم میری تمام مخلوق کی نسبت اور جو کچھ تاقیامت ہو گا اس کے متعلق میرے علم کا حال۔

قلم نے لوح محفوظ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا اور پھر تمام مخلوقات کی نسبت قیامت تک کا حال لکھا یہاں تک کہ درخت کا پتہ ہلنے گرنے یا اوپر اڑنے تک کا حال درج کیا۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لوح محفوظ ایک مادی تختی تھی جو موتی سے بنائی گئی تھی اور جس پر خوشنویسوں کی رسم کے مطابق چاروں طرف حاشیہ میں گلکاری بھی کی گئی تھی۔ اس لغویت کے ساتھ ہی اس بیان سے یہ عقیدہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عالم کی تخلیق سے قبل ہی قرآن لوح محفوظ میں درج ہو گیا تھا لیکن اس خیال کی تکذیب خود قرآن پاک کے بیانات سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس میں زبور توریت و انجیل وغیرہ کا بھی ذکر ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن سے پہلے ہی لوح محفوظ میں درج ہو گئی ہوں گی ورنہ ایسی چیز کا ذکر جو وجود میں نہ آئی ہو کوئی معنی نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ لوح کے عقیدہ کا خیال بہت قدیم ہے اہل بابل کا عقیدہ تھا کہ ہر شخص کی قسمت کا حال ایک لوح پر لکھا ہوا محفوظ ہے یہی خیال توریت میں منتقل ہوا جیسا کہ کتاب استثنا باب 10 آیتہ الغایتہ 5 سے ظاہر ہوتا ہے اس میں لکھا ہے کہ جب موسیٰ نے

خدا کے حکم سے ویسی دو تختیاں پتھر تراش کر بنائیں جیسی اس نے توڑ دی تھیں تو خدا نے ان پر احکام عشرہ تحریر فرمائے اور موسیٰ کو خدا نے حکم دیا کہ وہ ان تختیوں کو ببول کی لکڑی کے صندوق میں محفوظ رکھے" اور پھر یہی خیال یہود سے مسلمانوں میں منتقل ہوا چنانچہ عبرانی زبان میں جو لفظ تختی کے لیے استعمال ہوا ہے وہی ہے جو عربی میں پایا جاتا ہے۔

چونکہ رسول اللہ کے زمانے میں یہود و نصاریٰ عام طور پر یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے توریت و انجیل لوح محفوظ میں منقوش خدا کے پاس موجود ہیں اور اس عقیدہ سے عوام بہت متاثر ہوتے تھے اس لیے مسلمانوں نے بھی سمجھ لیا کہ اگر قرآن توریت و انجیل کی طرح خدا کی بھیجی ہوئی کتاب ہے تو اسے بھی لوح محفوظ میں درج ہونا چاہیے اور اس باب میں متعدد حدیثیں گھڑلی گئیں۔

3- یہاں تک میں نے روایتی حیثیت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر واضح کر دیا ہے کہ قرآن کا وحی ہونا کیا مفہوم رکھتا ہے اور اس کو لوح محفوظ میں درج سمجھنا ایک مستعار عقیدہ ہے جو قدیم بابلیوں اور یہود و نصاریٰ سے لیا گیا ہے اب روایتی حیثیت سے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ قرآن کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی زبان سے ادا کیا ہوا لفظ ہے حددرجہ جاہلانہ عقیدہ ہے جس سے ایک طرف خدا کے تصور وحدانیت کو صدمہ پہنچتا ہے اور دوسری طرف رسول کی عظمت کو۔

اگر ہم الفاظ قرآن کو بھی الہامی اور منطوق خداوندی کہیں گے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا کی صفت نطق مادی اسباب کی محتاج ہو گی اور یہ اسلام کے تصور وحدانیت کے منافی ہے۔

گفتگو نطق الفاظ ان سب کے تخیل کے ساتھ ہم مجبور ہیں کہ ان تمام آلات نطق یا عضلات و اعصاب وغیرہ کو بھی سامنے رکھیں جو ادائے صورت کے لیے ضروری ہیں اور اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ خدا ایسے الفاظ بغیر کسی مادی اسباب یا ذرائع کے پیدا کر سکتا ہے تو ایسا فرض کرنے کی نہ کوئی دلیل موجود ہے اور نہ اس کی ضرورت۔

خدا کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے تو قطعی اس امر کی ضرورت نہیں کہ وہ انسان کی طرح چلتا پھرتا بولتا چالتا فرض کیا جائے اور رسول کی برتری اخلاق کے ثبوت کے لیے بھی ضروری نہیں کہ خدا اس سے باتیں کرے یا اس کی زبان میں کوئی کتاب تصنیف کر کے اپنے فرشتہ کے ذریعہ سے اس کے پاس بھیج دے بلکہ سچ پوچھئے تو یہ رسول کی عظمت کے

منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے وہ خود اس کے دماغ کا نتیجہ نہ ہو۔

رسول کو محض ایک ایسے پیغمبر کی حیثیت دینا خود کوئی عقل یا ارادہ نہ رکھتا ہو جسے خود کچھ کہنے سننے کا اختیار نہ ہو ایک ڈاکیہ کی حیثیت دے دینا ہے اور اس کی انسانی حیثیت کو عام انسانی سطح سے بھی نیچے گرا دینا ہے۔

ہم رسول کو مصلح قوم کہتے ہیں لیکن کیا وہ شخص صحیح معنی میں مصلح ہو سکتا ہے جو وقت و زمانہ کے لحاظ سے خود کوئی حکم لگانے یا فیصلہ صادر کرنے کا اختیار نہ رکھتا ہو جو خود قوانین اصلاح وضع نہ کر سکتا ہو اور جسے اپنی ذاتی عقل ورائے سے کام لینے کا مجاز نہ ہو' فوج کے ایک جنرل کا یہ کام نہیں کہ وہ صرف مرکز کے احکام کی تعمیل کرے اور خود اپنی سوجھ بوجھ سے کام لے کر فوج کو نہ لڑائے اس کااولین فرض یہ ہے کہ وقت و موقعہ کے لحاظ سے خود مناسب احکام صادر کرے کیونکہ وہ جنگ کو کامیاب بنانے کا ذمہ دار ہے۔

اگر قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف خدا کا بتایا ہوا ہے تو پھر اس میں رسول اللہ کا کیا کمال ہے اور خود ان کے ذاتی شرف پر اس سے کیا روشنی پڑتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا دنیا میں جواب نہیں اور اگر خدا کوئی کلام کر سکتا ہے تو واقعی اس کو ایسا ہی فصیح و بلیغ ہونا چاہیے لیکن اس سے رسول اللہ کی ذہنی بلندی یا قوت اختراع کیا ثابت ہوتی ہے؟

الغرض قرآن کو خدا کا کلام کہنا یا لوح محفوظ میں اس کا مرتسم ہونا یقین کرنا صحیح اسلامی خیال نہیں ہے بلکہ مستعار ہے یہود و نصاریٰ سے قرآن میں جہاں جہاں کلام اللہ اور کلمات اللہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے مراد خدا کے احکام ہیں رسول نے صرف الفاظ پیش کر کے ان کی پوجا نہیں کرائی بلکہ احکام پیش کر کے ان کی تعمیل چاہی ہے۔

یہ ہے میرا عقیدہ قرآن پاک اور رسول اللہ کی رسالت کے متعلق اور میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا اقتضاء یہی ہے کہ قرآن کو انھیں کا کلام سمجھا جائے اور اس کے وحی ہونے کا مفہوم وہی قرار دیا جائے جو اس سے قبل کے صفحات میں ظاہر کیا گیا ہے۔

اگر قرآن کو خدا کا کلام سمجھا جائے جو عام طور پر لوگوں کے ذہن نشین ہے تو اس پر بہت سے شبہات وارد ہوتے ہیں مثلاً

(1) قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کے ساتھ وہ بھی ازخود وجود میں آیا ہے دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس طرح قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننا

پڑے گا حالانکہ قدیم ذات صرف خدا کی ہے اور اگر اول صورت مانی جائے تو قرآن کو "شے مخلوق" ماننا پڑے گا لیکن شے کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ کل شئی ھالک الا وجھہ اس لیے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فنا ہو جانے والی چیز ہے اور اس لیے خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔

(2) اگر قرآن شریف نام ہے ان الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں جو پریس کے ذریعہ چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو کلام مجید کا ہر نسخہ کلام خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضائع ہو جائے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کلام ضائع ہو گیا۔

(3) اگر قرآن پاک خدا کا کلام ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو اس کو خدا کی عین ذات تصور کیا جائے یا صفات خداوندی میں شامل کیا جائے قرآن کو خدا کی عین ذات نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کے معنی ہوں گے کہ قرآن خدا ہے اور خدا قرآن ہے اس لیے لامحالہ اسے صفت ربانی ماننا پڑے گا لیکن چونکہ خدا کی ہر صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے اس لیے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ نطق خداوندی ہے جو جبریل کے ذریعہ سے آنحضرت تک پہنچایا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ نے بھی اس طرح اس کو نطق کیا تھا جس طرح خدا نے کیا تھا بلکہ ہم لوگ سب اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں جس طرح خدا نے ادا کیا تھا اور اس طرح گویا رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے مماثل قرار پائیں گے جو بالکل محال ہے۔

(5) قرآن شریف جس سلسلہ سے نازل ہوا تھا وہ موجودہ ترتیب سے بالکل مختلف ہے اس لیے وہ قرآن جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے اس قرآن سے بہ لحاظ ترتیب مختلف ہے جو لوح محفوظ میں پایا جاتا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ اصل قرآن میں تغیر پیدا ہوا اور ہر تغیر پذیر چیز حادث ہے حالانکہ خدا کی طرح اس کے کلام کو بھی غیر فانی ہونا چاہیے۔

(6) کہا جاتا ہے کہ قرآن نجماً نجماً نازل ہوا ہے یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں رسالتمآب پر نازل ہوئی ہے جس کو اصطلاح میں شان نزول کہتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا وہ آیت بھی موجود نہ تھی اس لیے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوح محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی ہو جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بنا پر پہلے

ہی تمام آیات لوح محفوظ میں لکھ لی گئیں تھیں تو پھر ان واقعات و حالات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔

(7) اگر قرآن مجید پہلے سے لوح محفوظ میں موجود تھا تو پھر ان آیات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو لفظ قل سے شروع ہوتی ہیں یعنی جن میں رسول اللہ سے خطاب کر کے کہا جاتا ہے کہ ایسا کہو درآنحالیکہ اس وقت رسول اللہ کی ذات دنیا میں موجود نہ تھی اسی طرح ان دعاؤں کی کیا تاویل کی جائے گی جن کی تعلیم رسول اللہ کو دی گئی ہے کیا رسول اللہ کی پیدائش سے قبل یہ تمام دعائیں مرتب کر لی گئیں تھیں اور اس کی کیا ضرورت تھی۔

(8) اگر قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو پھر بسم اللہ الرحیم کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے جو بالکل بے معنی سی بات ہے۔

سورہ فاتح میں الحمد للہ سے لے کر مالک یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہے گویا مخاطب سامنے نہیں ہے اور پھر وفعتاً "ایاک نعبد" سے انداز تخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جا رہا ہے کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علیحدہ علیحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے اگر سورہ فاتح پہلے سے لوح محفوظ میں منقوش ہوتی تو اس کا انداز تخاطب یہ نہ ہوتا۔

(9) قرآن شریف میں بہ کثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے جن کا تعلق بالکل عہد نبوی سے ہے مثلاً ابولہب یا کفار مکہ اور ان کے اصنام وغیرہ پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلق عالم کے وقت لوح محفوظ میں منقوش تھا (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ بہ صورت مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہے درآنحالیکہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

(10) خدا کو سمیع و بصیر بھی کہتے ہیں لیکن اس کی سماعت و بصارت کان اور آنکھ کی محتاج نہیں پھر کیا وجہ ہے کہ جب اس کی صفت نطق کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ نطق ہو جو الفاظ کا محتاج ہے جس طرح اس کو سننے اور دیکھنے کے لیے کان اور آنکھ کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح کلام کے لیے زبان یا الفاظ سے اسے بے نیاز ہونا چاہیے اور اس صورت

میں الفاظ قرآنی کو خدا کا کلام کہنا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زبان و الفاظ کا محتاج ہے۔

یہ ہیں چند مسئلے اور شبہات کے جن کی بناء پر میں قرآن پاک کو مخلوق خداوندی سمجھنے سے مجبور ہوں لیکن اگر ان تمام باتوں کے جواب میں یہ کہا جائے کہ کلام خداوندی سے مراد قرآن کے الفاظ و حروف نہیں ہیں بلکہ ان کا مفہوم مراد ہے تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ خدا نے علی وجہ البصیرت تمام احکام رسول اللہ پر نازل کیے جنھیں آپ نے اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔

○ ○ ○

روح و بقاء روح
علمی و اسلامی نقطہ نظر سے

مذہبی و علمی دنیا کے درمیان یوں تو بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں لیکن ان تمام اختلافات کی بنیاد مذہب کے صرف مابعدالطبعی عقائد ہیں یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اگر اہل مذہب بقا روح و حیات بعد الموت سے انکار کر دیں یا اہل علم اس کے قائل ہو جائیں تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

مذہب والے کہتے ہیں کہ موت زندگی کا اختتام نہیں ہے بلکہ ابتدا ہے دوسری زندگی کی یعنی جس طرح اس عالم آب و گل میں ایک انسان اپنی انفرادیت کا حامل ہوتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد بھی اس کا تشخص باقی رہے گا کیونکہ روح غیر فانی ہے اور اسی کے ماننے یا نہ ماننے کا نام مذہب و لامذہبیت ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ بقا روح یا حیات بعدالموت کا عقیدہ دنیا کے مذہبی دور کی پیداوار ہے یا اس سے پہلے کی اور اس کا جواب تاریخ انسانی کے مطالعہ کے بعد ہم کو یہ ملتا ہے کہ مذاہب الہامی کے ظہور سے بہت پہلے جب انسان جہل و تاریکی کے دور سے گزر رہا تھا یہ عقیدہ پایا جاتا تھا اور مذاہب عالم نے اس میں کوئی تبدیلی ایسی نہیں کی جو الہام خداوندی کے بغیر ناممکن ہوتی یا جس کے ثبوت میں کسی ربانی دلیل کی ضرورت لاحق ہو اس لیے اگر لامذہب جماعت اس عقیدہ کی مخالف ہے تو دراصل یہ مخالفت مذہب کی نہیں بلکہ انسان کے تاریک دور کے ایک خیال کی مخالفت ہے اور اگر اہل مذاہب یہ کہنے کے لیے تیار نہیں کہ عہد قدیم کے انسان کا یہ عقیدہ بھی الہامی تھا تو پھر عہد تاریک کے اس عقیدہ کو بدستور قائم رکھنے کی ذمہ داری اہل مذاہب پر ہی عائد ہوتی ہے اور وہی اس کے جوابدہ ہیں۔

ابتداء آفرینش میں انسان کا علم و تجربہ دونوں بہت محدود تھے وہ کائنات کے ہر طبعی حادثہ کو دیکھ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اور اپنی کوتاہ عقل کے مطابق اس کے سمجھنے کی کوشش

کرتا تھا۔ دنیا کے حوادث میں سب سے پہلا اور اہم حادثہ جس سے اس کو دوچار ہونا پڑا غالباً" اس کی اولاد یا دوسرے عزیزوں کی موت کا رہا ہو گا۔ اول اول اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو گا کہ جیتا جاگتا چلتا پھرتا انسان کیوں اور کہاں چلا گیا لیکن جب اس کے واہمہ نے خواب میں پھر اس کو زندہ دکھایا ہو گا تو اس نے خیال کیا ہو گا کہ آنکھوں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی وہ زندہ ہے اور یہیں سے نہ صرف بقاء روح بلکہ حیات بعد الموت کے عقیدہ کی ابتداء ہوتی ہے جو اس وقت بھی مذاہب عالم میں اصل بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس عقیدہ کا دوسرے الفاظ میں یہ مفہوم قرار پاتا ہے کہ روح زندگی سے مختلف چیز ہے اور وہ زندگی ختم ہونے کے بعد بھی پائی جاتی ہے حالانکہ علمی تحقیق سے زندگی کی جو حقیقت دریافت ہوئی ہے وہ اس خیال کی تردید کرتی ہے۔

تمام اونچے درجے کی حیوانی زندگی صرف ایک خلیہ (CELL) سے شروع ہوتی ہے یہ خلیہ دوسرے خلیہ سے ملتا ہے اور پھر ان سے اور بہت سے خلایا پیدا ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک خاص صورت کا حیوان شکل پذیر ہو جاتا ہے اور اس کی تمام حیوانی زندگی کے دوران میں کروڑوں بلکہ اربوں خلایا اس کے جسم میں بنتے بگڑتے رہتے ہیں یہاں تک کہ بیماری یا کھولت یا کسی حادثہ کی وجہ سے یہ خلایا بے کار ہو جاتے ہیں اور زندگی ختم ہو جاتی ہے اگر یہ کہا جائے کہ خلایا میں روح ہوتی ہے تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ جس وقت استقرار حمل ہوتا ہے تو ماں کی طرف سے کم ازکم دس ہزار خلایا اور باپ کی طرف سے اربوں خلایا کام کرنے کے لیے حرکت میں آجاتے ہیں لیکن ان میں صرف ایک یا دو خلایا انسانی زندگی کا باعث ہوتے ہیں اور باقی سب ضائع ہو جاتے ہیں اس لیے اگر خلایا اور جراثیم میں بھی روح کا وجود تسلیم کیا جائے گا تو کائنات میں روحوں کی تعداد غیر محدود تسلیم کرنا پڑے گی علاوہ اس کے اگر روح کو حیات سے علیحدہ کوئی چیز دوسری مانیں گے تو پھر یہ سوال پیدا ہو گا کہ انسان میں وہ روح کب کیونکر اور کہاں سے داخل ہوئی اور جسم سے جدا ہو جانے کے بعد وہ کہاں چلی جاتی ہے۔

اس سے پہلے جب علم طب نے زیادہ ترقی نہ کی تھی تو ایک مردہ بچہ پیدا ہونے پر اسے دفن کر دیا جاتا تھا اور اس طرح ڈوبنے کے بعد جب انسان بے جان ہو جاتا تو اسے بھی سپرد خاک کر دیتے تھے لیکن اب بعض صورتوں میں بجلی یا دوسرے ذرائع سے ان کے ساکن قلب میں حرکت پیدا کر دی جاتی ہے اور زندگی عود کر آتی ہے اگر ہم روح کے وجود کو

زندگی سے علیحدہ تسلیم کرلیں گے تو ان صورتوں میں قدرتاً" یہ سوال پیدا ہو گا کہ مردہ روح کیا کہیں قریب ہی منڈلا رہی تھی جو ان کے جسموں میں داخل ہو گئی اور اگر ایسا ممکن تھا تو پھر وہ بغیر طبی ذرائع اختیار کیے ہوئے ازخود کیوں نہ آگئی اگر یہ کہا جائے کہ ہم جس چیز کو زندگی سے تعبیر کرتے ہیں وہی دراصل روح ہے تو پھر حشرات و نباتات میں بھی روح کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ زندگی سے وہ بھی خالی نہیں ہیں حالانکہ اہل مذاہب سوا انسان کے کسی اور جاندار میں روح کا وجود تسلیم نہیں کرتے۔

بہرحال اہل مذاہب کا یہ عقیدہ کہ روح زندگی یا حیات سے علیحدہ کوئی ایسی چیز ہے جو فنا نہیں ہوتی اہل علم کے نزدیک قابل تسلیم نہیں اور اس اعتراف و انکار کے سلسلہ میں مذہب کی طرف سے کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی جاتی ہے اور اہل علم انکار کے بعد بہت سے دلائل اپنے پاس رکھتے ہیں مثلاً

(1) اگر روح غیر فانی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قدیم ہے اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک چیز کی انتہا نہ ہو لیکن ابتدا ہو وجود کا ایک سرا اگر لامحدود ہے تو دوسرا بھی یقیناً" لامحدود ہو گا اس لیے روح کو غیر فانی کہنا گویا اسے واجب الوجود تسلیم کرنا ہے حالانکہ یہ صفت صرف خدا کو حاصل ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔

(2) اگر روح حیات سے علیحدہ کوئی چیز ہے تو پھر یہ امر غور طلب ہے۔ کہ وہ کس وقت جسم انسانی میں داخل ہوتی ہے آیا اسی وقت جب نطفہ رحم مادر میں قرار پاتا ہے یا اس کے بعد کسی اور زمانہ میں اگر استقرار حمل کے وقت ہی کو آمد روح کا اولین لمحہ قرار دیا جائے تو چونکہ روح کو صاحب شعور و ادراک کہا جاتا ہے اس لیے جنین کو رحم مادر کے اندر بھی صاحب شعور و ادراک ہونا چاہیے حالانکہ ایسا نہیں ہے اور اگر آمد روح کا کوئی وقت مقرر کیا جائے گا تو پھر اس تعین کے کیا اصول ہوں گے جبکہ شعور و ادراک کے مسئلہ میں تمام انسان یکساں نہیں ہیں کسی میں شعور و ادراک بہت جلد پیدا ہو جاتا ہے کسی میں بہت دیر کے بعد کسی کا حافظہ ابتداء ہی سے قوی ہوتا ہے اور کسی کا آخر عمر تک ضعیف رہتا ہے اور جو دیوانے پیدا ہوتے ہیں ان میں آخر عمر تک شعور و ادراک پیدا نہیں ہوتا حالانکہ روح ان کے اندر بھی پائی جاتی ہے اس صورت میں مجبوراً" یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شعور و ادراک کا تعلق روح سے نہیں ہے جو عقیدہ مذہبی کے خلاف ہے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ دماغی

خرابی یا موت کے ساتھ ختم بھی ہو جاتی ہے حالانکہ یہ بقاء روح کے عقیدہ کے منافی ہے۔

(4) اگر یہ کہا جائے کہ روح اور حیات ایک ہی چیز ہے تو پھر حیات کے ساتھ اس کی ابتدا اور موت کے ساتھ اس کا اختتام بھی تسلیم کرنا چاہیے اور اس صورت میں روح کو غیر فانی نہیں کہہ سکتے۔

(5) اگر روح غیر فانی ہے تو اس کے بقاء دوام کی نوعیت متعین کرنا پڑے گی اور اس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ روح کے وجود کے لیے زمان و مکان کی تعیین ضروری ہے اور جب زمان و مکاں کی قید لگ جاتی ہے تو پھر اسے محدود ماننا پڑے گا اور ہر محدود چیز فانی ہے اس لیے روح کو بھی فانی ماننا پڑے گا۔

(6) اگر ہر انسان کی روح انفرادی طور پر علیحدہ علیحدہ وجود رکھتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وجود انسانی سے قبل بھی انفرادیت رکھتی تھی لیکن وہ انفرادیت کیا تھی؟ اگر عقیدہ تناسخ کی رو سے اس کا تشخص کسی اور ہستی کے تشخص کے ساتھ وابستہ تھا تو پھر ان تمام ہستیوں کا شعور و ادراک جن جن میں وہ روح داخل ہوئی تھی یکساں ہونا چاہیے حالانکہ ایسا نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ جس شعور و ادراک کی روح جسم میں داخل ہو گی وہی شعور و ادراک انسان میں پیدا ہو گا تو پھر اس کا جوابدہ کون ہے کہ احمد میں کیوں احمقانہ روح داخل کی گئی اور محمود کو کیوں عقلمند روح سے سرفراز کیا گیا۔

(7) اگر یہ کہا جائے کہ روح میں پہلے سے کوئی شعور نہیں پایا جاتا بلکہ جسم انسانی میں داخل ہونے کے بعد شعور پیدا ہوتا ہے تو پھر بتانا پڑے گا کہ اس شعور و ادراک کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہوتا ہے اور کیا اس کا تعلق کسی اور روح سے ہے۔

(8) اگر حیات اور روح کو ایک ہی چیز تسلیم کیا جائے تو جنین کی اولین جنبش و حرکت کے ساتھ اس کے آغاز کو ماننا پڑے گا اور انسان کی موت کے ساتھ اس کے اختتام کو اور اس صورت میں روح کو فانی ماننا پڑے گا یا حیات کو غیر فانی اور یہ دونوں مسلمات مذہب کے خلاف ہیں علاوہ اس کے ہم کو ان تمام مخلوقات میں بھی روح کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا جو ذی حیات کہلاتے ہیں اور روح کی حامل نہیں۔

(9) اگر یہ کہا جائے کہ روح انسانی روح حیوانی روح نباتی اور روح حشراتی سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو اس صورت میں ان سب روحوں کو غیر فانی ماننا پڑے گا یا پھر اس کی وجہ بتانا پڑے گی کہ روح انسانی کیوں غیر فانی ہے اور دوسری قسم کی روحیں کیوں فانی ہیں

اور اگر روح نباتی روح حشراتی کے غیر فانی ہونے کو عقل قبول نہیں کرتی تو روح انسانی کے غیر فانی ہونے کو کیوں قبول کرے۔

(10) اہل مذاہب اس کا ایک الزامی جواب یہ دیتے ہیں کہ جب مادئین مادہ کو غیر فانی مانتے ہیں تو روح کو غیر فانی ماننے میں کیا حرج ہے یعنی اگر جسم کے اجزاء فنا نہیں ہوتے بلکہ صرف ہیئت بدلتے رہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ روح بھی انہیں مختلف تشخصات کے ساتھ نہ پائی جائے۔

اہل مذاہب کا یہ اعتراض خود ان کے عقائد کے خلاف ہے کیونکہ اس صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانی روح اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہی اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کتنے کیڑوں مکوڑوں یا پودوں کی روحوں میں منقسم ہو گئی اور اس طرح یوم آخرت میں انسانی روح کے جوابدہ ہونے کا عقیدہ باطل ہے۔

(11) مذاہب بقا روح اور عذاب و ثواب کے ثابت کرنے میں ایک اخلاقی منطق سے بھی کام لیتے ہیں اور وہ یہ کہ مرنے کے بعد احیاء موتی بقاء روح حشر و نشر عذاب و ثواب کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر اس کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی ہے کہ ایک شخص اس دنیا میں باوجود عصیاں کاری کے لطف و مسرت کی زندگی بسر کرے اور دوسرا شخص اس دنیا میں باوجود تقدس و نکوکاری کے خراب و خستہ رہے اس عدم توازن کے دور کرنے کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مرنے کے بعد ایک عدالت گاہ قائم کی جائے اور وہاں عذاب و ثواب سے دونوں پلے برابر کر دیئے جائیں اس صورت میں خدا کے عادل ہونے کی صورت برقرار رہتی ہے۔

قطع نظر اس سے کہ یہ عقیدہ علمی حقائق و مسلمات اور فطری قوانین اور مقادیر کے خلاف ہے سب سے بڑا نقص اس میں یہ ہے کہ خدا کی مسولیت اس عقیدہ کے بعد بھی دور نہیں ہوتی کیونکہ ایک انسان کو انسان ایک حیوان کو حیوان ایک پودے کو پودا پیدا کرنے کی ذمہ داری بہرحال خدا ہی پر عائد ہوتی ہے اور اس لیے سبزہ فریاد کر سکتا ہے کہ اسے کیوں سبزہ پیدا کر کے ہمیشہ پامال رکھا۔ ایک کیڑا شکایت کر سکتا ہے کہ اسے کیڑا پیدا کر کے کیوں چڑیوں اور جانوروں کا لقمہ بنایا ایک جانور کہہ سکتا ہے اسے جانور بنا کر کیوں انسان کے بس میں دے دیا اور اگر ان کا جواب دیا جائے کہ یہ خدا کی مصلحت ہے جسے چاہا جیسا بنا دیا پھر انسانی دنیا کے اس عدم توازن کا بھی یہی جواب ہو سکتا ہے کہ خدا مختار ہے دنیا میں جس طرح جس کو چاہا رکھا اگر اچھے کام کرنے والے کو تکلیف پہنچی تو کیا اور برے کام کرنے

والے آرام سے رہے تو کیا؟ خدا بے نیاز ہے اور اس سے کوئی اخلاقی بازپرس نہیں ہو سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام مذہبی عقائد صرف اس کے اس پندار کا نتیجہ ہیں کہ وہ کوئی بہت بڑی چیز ہے اور اگر کسی کام کا نتیجہ اس کی خواہش کے مطابق نہیں نکلتا تو وہ اپنی تسکین اس طرح کرنا چاہتا ہے کہ یہاں نہیں تو کہیں اور اس وقت نہیں تو کسی وقت اور اس کی تلافی ہو گی اس نے اپنی دنیاوی زندگی کے لحاظ سے اچھائی اور برائی کی تعین کی اور اسی لحاظ سے اس نے اخروی عذاب و ثواب کی طرح ڈالی ہر وہ شخص جس نے اس دنیا میں عیش کی ہے کبھی یہ نہیں چاہ سکتا کہ اس سے اس عیش کوشیوں کی بازپرس ہو اور ہر وہ شخص جس نے اس دنیا میں ناکام زندگی بسر کی ہے اپنی تسلی صرف اس طرح کر سکتا ہے کہ ایک دوسری دنیا فرض کر کے اس میں اپنے آپ کو عیش کرتا ہوا دیکھے۔ الغرض بقاء روح اور عذاب و ثواب کا عقیدہ خدا کی بے نیازی اور علم و عقل کو دیکھتے ہوئے ضرورت و مصلحت اور قانون قدرت دونوں کے خلاف ہے اور اس کو تسلیم کرانے کے لیے نہ کوئی رہانی دلیل پیش کی جا سکتی ہے نہ اخلاقی و علمی۔

یہاں تک تو علمی بحث اس عقیدہ کے متعلق ہوئی اب آیئے دیکھیں کہ اسلام نے اس گتھی کو کس طرح سلجھایا ہے اور چونکہ اسلامی لٹریچر میں صرف قرآن ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اس لیے ہم اپنی جستجو کو صرف آیات قرآن ہی تک محدود رکھیں گے۔

قرآن مجید میں روح کا لفظ متعدد جگہ آیا ہے اور ضرورت ہے کہ اس کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کے لیے ہم ان آیات کو اپنے سامنے رکھیں جن میں لفظ روح استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی متعدد آیات ایسی ہیں جن میں روح کا لفظ حضرت عیسی سے تعلق رکھتا ہے مثلاً سورہ بقر میں ارشاد ہوتا ہے وایدہ ناہ بروح القدس یعنی ہم نے روح القدس سے ان کی مدد کی سورہ مائدہ میں خطاب ہوتا ہے کہ ایدتک بروح القدس (ہم نے روح القدس سے تمہاری مدد کی) سورہ نساء میں ارشاد ہوتا ہے عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ و کلمۃ القیھا الی مریم و روح منہ اس ایت میں گویا عیسیٰ کے روح اللہ ہونے کی صراحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ اور کلمۃ اللہ کا بھی وہی مفہوم ہے جو روح اللہ کا۔
ہرچند ان آیات سے اس روح پر کوئی روشنی نہیں پڑتی جو زیر بحث ہو لیکن ان سے

کم ازکم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ روح کا لفظ اپنے لغوی و اصلی معنی سے ہٹ کر مجازاً" کسی دوسرے مفہوم میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

سورہ سجدہ میں ایک جگہ انسان کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے و نفخ فیہ من روحہ سورہ شوریٰ میں خود قرآن کو روح سے تعبیر کیا گیا کہ کذالک اوحینا الیک روحامن امرنا سورہ مومن میں ارشاد ہوتا ہے۔

یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ" یعنی اپنے بندوں میں سے جس پر وہ چاہتا ہے روح نازل کرتا ہے۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں روح کو بہ معنی الہام وحی یا فراست استعمال کیا گیا ہے اور اس روح سے اس کا کوئی واسطہ نہیں جو حیات انسانی سے تعلق رکھتی ہے سورہ بنی اسرائیل میں البتہ ایک آیت ایسی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ روح کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے وہ آیت یہ ہے یسئلونک عن الروح قل الروح من امرربی (تجھ سے روح کے متعلق لوگ سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ روح حکم خداوندی کا نام ہے)

اول تو اس آیت کے بعد کی آیتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی روح سے قرآن یا وحی و الہام مراد ہے کیونکہ بعد کی آیتوں میں صراحتاً" وحی قرآن کا ذکر موجود ہے لیکن اگر ہم سیاق کی دوسری آیتوں سے علیحدہ سمجھ کر یہاں روح کے معنی واقعی روح کے لیں تو اس سے روح کی حقیقت صرف اس قدر ظاہر ہوتی ہے کہ وہ خدا کا حکم ہے اور شاید اس سے بہتر الفاظ میں روح کی حقیقت کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آپ امر ربانی یا حکم خداوندی پر غور کریں گے تو قانون قدرت یا مقادیر الیہ کے علاوہ کچھ نظر نہ آئے گا اور اس طرح روح کی معنی صرف اس حیات یا زندگی کے رہ جائیں گے جو قانون قدرت کے مطابق پیدا ہوتی اور فنا ہو جاتی ہے۔

مجھے تلاش سے کلام مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ روح زندگی سے علیحدہ کوئی دوسری چیز ہے اور موت کے بعد وہ باقی رہتی ہے۔

سورہ نباء میں بے شک ایک جگہ یوم یقوم الروح والملائکتہ صفا کہا گیا ہے لیکن غالباً" یوم قیامت کا ایک منظر اس میں ظاہر کیا گیا ہے یہ پوری صورت مکہ میں نازل ہوئی تھی جب عہد رسالت کی ابتدا تھی اور کفار عرب نے رسول اللہ کو بہت پریشان کر رکھا تھا اس لیے یہ صورت دراصل رسول اللہ کی کامیابیوں اور کفار کی ناکامیوں کی پیشین گوئی ہے

جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب اچھی اور بری طاقتوں کا مقابلہ ہو گا اور کامیابی رسول اللہ کو ہو گی۔

○ ○ ○

آپ مذاہب عالم کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مادیات سے ہٹ کر خدا کا تصور آج تک کوئی مذہب قائم نہ کر سکا یہاں تک کہ جمادات نباتات و حیوانات میں سے کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو کبھی نہ کبھی خدا بننے کا شرف حاصل نہ ہوا ہو خیر آفتاب و ماہتاب کو چھوڑیئے کہ ان میں تو ایک قسم کا علو پایا جاتا ہے لیکن حیرت یہ ہے کہ مذہب نے پتھروں درختوں اور جانوروں کے سامنے بھی ہمیں سر جھکانے پر مجبور کیا گویا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مذہب نے انسان کو ذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا اور ایسی صورت میں اخلاق انسانی پر جو خراب اثر پڑنا چاہیے تھا پڑا اور آج تک مذہب زدہ قومیں اس کا خمیازہ بھگت رہی ہیں۔

جن بانیان مذہب نے خدا کا تصور قائم کرنے میں ان پریشان خیالیوں سے کام لیا ان کو میں برا نہیں کہتا کیونکہ انھوں نے جو کچھ کیا خلوص نیت سے کیا جہل کی مجبوری سے کیا اور اس سے زیادہ کوئی اور توقع ان سے ہو بھی نہ سکتی تھی لیکن میں موجودہ زمانہ کے انسان پر ضرور حیرت کرتا ہوں کہ وہ اب بھی اس تقویم پارینہ کو سامنے رکھ کر اپنے آپ کو اپنی زندگی کا جوابدہ سمجھتا ہے۔

انسان کو جتنے حواس فطرت نے عطا کیے ہیں ان سب کا تعلق مادیات سے ہے یعنی وہ کسی ایسی بات کا تصور کر ہی نہیں سکتا جو اس کے حواس کے حدود سے باہر ہو اس لیے جب اول اول انسان کو ان ناکامیوں سے واسطہ پڑا جن کا سبب وہ متعین نہ کر سکتا تھا تو اس کا خیال کسی ایسی قوت کی طرف منتقل ہوا جسے وہ اپنے سے زیادہ زبردست سمجھتا تھا لیکن اس کا تصور اس نے قائم کیا انھیں چیزوں کو دیکھ کر جن سے وہ دنیا میں روز دو چار ہوتا تھا یہ تو تھا خوف کا عنصر جس نے انسان کو خدا کا خوفناک تصور قائم کرنے پر مجبور کیا لیکن بعض تجربات اس کے دلخوش کن بھی تھے اس لیے ان کا تعلق اس نے مہربان خداؤں سے رکھا اور ان کا تصور اس نے ایسی چیزوں کی مدد سے قائم کیا جو اس دنیا میں اس کے لیے سازگار ثابت ہوئیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کا بتایا ہوا خدا غیر مادی ہے لیکن جو تصور اس نے پیش کیا ہے وہ مادیت کی جھلک سے بالکل پاک نہیں ہے اسلام کے تصور الٰہی کا تذبذب اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ننانوے ناموں سے اسے سمجھانا چاہا حالانکہ ان میں سے بعض نام مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے کے متضاد بھی ہیں مثلاً رحمان و جبار رحیم و قہار اور مفہوم کے لحاظ سے سوا ایک آدھ کے کوئی ایسا نہیں جو جذبات سے علیحدہ ہو ان ناموں میں صرف ایک نام کل ایسا ہے جو فلسفیانہ گہرائی لیے ہوئے ہے لیکن یہ ایسا زیادہ مشہور نہیں اور میں نے آج تک نہیں سنا کہ کسی درویش یا مولوی نے یہ نام ورد کیا ہو۔ وہ یا غفور' یا رحمن' یا رحیم کا ورد تک بکثرت کرتا ہے کیونکہ دوزخ سے ڈرتا ہے لیکن ھواکل اس کی سمجھ میں نہیں آتا اس لیے وہ اس نام سے سرسری گزر جاتا ہے۔

ان ناموں کے مفہوم میں جو تضاد پایا جاتا ہے اس کی تاویل میں ہم کو کل یوم ھوفی شان سنایا جاتا ہے یعنی وہ رحم و کرم کے موقعہ پر رحیم و کریم ہے اور قہر و جبر کے موقعہ پر قہار و جبار لیکن اس قسم کی تاویل کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ وہ یہ کہہ کر خدا کو انسان کی صف میں لاکر کھڑا کر دیتے ہیں کیونکہ رحم و کرم قہر و غضب خوشی و برہمی لطف بیزاری عطا و انتقام ان سب کا تعلق جذبات سے ہے اور خدا اگر جذبات رکھ سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان بھی خدا نہ کہلائے ان ناموں میں بعض نام مثلاً صبور شکور مومن وغیرہ تو ایسے ہیں جو انسان کے انفعالی جذبات سے متعلق ہیں اور کسی طرح خدا کی صفات میں شامل نہیں ہو سکتے اور ادنیٰ تامل سے یہ بات ہر پر واضح ہو سکتی ہے کہ اگر یہ عقیدہ صحیح ہے تو پھر خدا کا صحیح ترین نام سوائے جامع اضداد کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں انسان کے لیے کسی ایسی چیز کا تصور بہت دشوار ہے جس نے اس کو نہ دیکھا ہو وہ کسی غائب چیز کو سمجھنے میں صرف قیاس سے کام لے سکتا ہے اور قیاس کا تعلق صرف انھیں اشیاء سے ہوتا ہے جن کو انسان دیکھ چکا ہے اس لیے خدا کا تصور قائم کرنے میں بھی اس کو یہی دشواری پیش آئی اور چونکہ انتہائی عظمت و قوت کے تصور میں وہ ایک مستبد و جابر بادشاہ سے زیادہ اور کوئی چیز موزوں نہ پا سکتا تھا اس لیے اس نے خدا کو اسی صورت میں سمجھنا چاہا۔

ہمارے پاس اس کی کوئی شناخت موجود نہیں ہے کہ خدا کے اس تصور میں کوئی خاص تبدیلی امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئی لیکن یہ ضرور ہے کہ اسلام نے جو تصور پیش کیا

اس میں کہیں کہیں اس بلندی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے جو اس مادی تصور سے خدا کو تھوڑی دیر کے لیے علیحدہ کر دیتی ہے اور شاید یہ سب سے پہلا قدم تھا جس نے بعد کو علم کلام کی بنیاد ڈالی اور صوفیہ نے اس الجھن کو ہمہ اوست اور ہمہ ازوست کہہ کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

میں خود ایک زمانہ تک اس کے سمجھنے میں سرگرداں رہا اور آخر کار مجھے پناہ ملی تو انھیں صوفیہ کے یہاں جن کا تصور واقعی ایک کائناتی اور ہمہ گیر تصور ہے اور جس کو سامنے رکھ کر ہم دنیا کے ہر انسان کو اس کے سمجھنے کی دعوت دے سکتے ہیں۔

ہر چند صوفیہ نے بھی بعد کو اس میں بہت سی الجھنیں پیدا کر دیں لیکن احساس و اصول کے لحاظ سے ان سب کا اتفاق اسی تصور پر ہے جسے ہم دوسرے الفاظ میں ہوالکل یا ہوالاول اور ہوالاخر سے ظاہر کر سکتے ہیں۔

اسلام نے ایک اور تصور بھی پیش کیا جو خالص فلسفیانہ ہے اور وہ تصور خدا کے واجب الوجود اور قدیم ہونے کا ہے لیکن اس قسم کے فلسفیانہ تخیل سے اخلاق انسان پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا البتہ ذہن انسانی کی ورزش ضرور ہو جاتی ہے چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ محض واجب الوجود اور قدیم کا مفہوم متعین کرنے میں دفتر کے دفتر لوگوں نے سیاہ کر دیئے اور بجائے اس کے کہ اس سے کوئی فائدہ ہوتا فرقہ بندی کی صورت پیدا ہو گئی۔

میری رائے میں خدا کا بہترین تصور وہی ہو سکتا ہے جو ہمارے اندر خدا کے ساتھ محبت کی کیفیت پیدا کرے خوف و خشیت کا جذبہ نہ خدا سے محبت کرنا سکھا سکتا ہے نہ ابنائے جنس کے ساتھ رواداری کی تعلیم دے سکتا ہے عیسوی مذہب میں خدا کا تصور یک گونہ اس معیار پر پورا اترتا ہے لیکن ان کے یہاں تثلیث کے عقیدہ نے اس کو بالکل مہمل بنا دیا۔ اب سائنس کے دور میں اگر خدا کا کوئی تصور قائم ہو سکتا ہے تو اس کو ہم صرف قوت (ENERGY) سے تعبیر کر سکتے ہیں لیکن یہ بھی ہمارے اندر محبت و شفقت کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتا اور دنیا کے امن و سکون کے لیے ہمیں ضرور کوئی نہ کوئی تصور خدا کا ایسا قائم کرنا پڑے گا جو ہمیں محبت کرنا سکھائے۔

خدا کو آگ برساتے ہوئے خون اور پیپ پلاتے ہوئے آتشیں کوڑوں سے سزا دیتے ہوئے بہت زمانہ ہو چکا ہے اب ضرورت ہے کہ وہ صرف زخموں پر مرہم رکھے ٹوٹے ہوئے دلوں کو ڈھارس پہنچائے اور بجائے کسی خاص قوم پر لطف کرنے کے وہ تمام بنی نوع انسانی کو

اپنا ہی بندہ سمجھے اور نجات کا دروازہ بغیر کسی شرط کے سب کے لیے کھول دے لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک مذاہب کا عقائدی اختلاف دور نہ ہو خدا کا کوئی ایسا کائناتی تصور قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی شخص اس اختلاف عقائد کو مہمل قرار دیتا ہے تو اسے ملحد و کافر کہا جاتا ہے اس لیے میری رائے میں اب خدا کی خدائی اگر صحیح معنی میں قائم ہو سکتی ہے تو اس کی توقع ہم کو صرف کافروں اور ملحدوں ہی سے کرنا چاہیے۔

○ ○ ○

ماخذ القرآن پر ایک اصولی گفتگو

علماء کرام کا سکوت

ڈاکٹر تسدل کے "ماخذ القرآن" کی اشاعت کو عرصہ گزر چکا اور اس وقت تک مجمل یا مفصل ایک جواب بھی ایسا موصول نہیں ہوا جسے واقعی جواب کہا جا سکے میں سمجھا تھا کہ علماء کرام کے بعض افراد جو واقعی سنجیدگی سے گفتگو کرنے کے اہل ہیں اس موضوع پر ضرور قلم اٹھائیں گے اور غیر ضروری مباحث سے قطع نظر اصل اعتراضات کے متعلق کچھ ایسی باتیں کہہ سکیں گے جو خالص علم و عقل کے نقطہ نظر سے بھی لوگوں کے لیے باعث تسکین ہوں گی لیکن افسوس ہے کہ میرا یہ خیال غلط نکلا اور ہمارے اکابر مذہب نے کوئی توجہ نہ کی۔

انھوں نے اس وقت تک زیادہ سے زیادہ صرف اتنا کہا کہ یہ بحث نئی نہیں ہے اس پر اس سے قبل کافی کہا جا چکا ہے اور اس کے ثبوت میں وہ احمدی جماعت امرتسری اور اسی طرح کی بعض دوسری تبلیغی جماعتوں کے ان رسائل کو پیش کرتے ہیں جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں اور اگر کسی نے کچھ اس کے علاوہ لکھنے کی کوشش بھی کی تو بالکل دورازکار باتوں کا چھیڑ دیا۔

اول تو بعض کے لیے یہی سمجھنا مشکل ہو گیا کہ ینابیع الاسلام' اور ماخذ القرآن دو بالکل علیحدہ علیحدہ کتابیں ہیں اور اگر بعض نے اسے سمجھا بھی تو جواب میں اسی پارینہ لٹریچر کو کافی سمجھا جو ایک ربع صدی بلکہ اس سے بھی قبل بعض مشنریوں کی طرف سے شائع ہو چکا تھا اور جن کا اب حوالہ دینا عذر گناہ بدتر از گناہ سے زیادہ نہیں۔

میں ایک سے زائد بار اس حقیقت کو واضح کر چکا ہوں کہ اس وقت سوال نہ تسدل کا ہے نہ کسی اور عیسائی مشنری کا بلکہ ان مسلم یا غیر مسلم افراد کا ہے جو ماخذ القرآن کے مطالعہ کے بعد اوہام و شکوک میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور جن کو ان استدلات سے مطمئن نہیں کیا جا سکتا جو تسدل یا دوسرے ارباب کلیسا کو خاموش کر سکتے ہیں ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب والے کو نہایت آسانی کے ساتھ الزامی جواب سے مطمئن یا ساکت کر سکتا ہے کیونکہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں کوئی نہ کوئی بات خلاف عقل نہ پائی جائے اور اس

صورت میں ایک مذہب والا نہایت اطمینان کے ساتھ فریق ثانی سے کہہ سکتا ہے کہ تمہارے مذہبی عقائد میں اس سے زیادہ اہمل پایا جاتا ہے لیکن مشکل تو اس وقت آن پڑتی ہے جب ہم مدعی کو اس قسم کا الزامی جواب نہ دے سکیں اور یہیں پہنچ کر اہل مذاہب کا یا تو تاویلات سے کام لینا پڑتا ہے یا اگر ان میں کوئی صاحب حال ہے تو وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ۔

خود گرفتہ کہ نظر بر رخ خوباں جرم ست
من ازیں بازنیایم کہ مرا ایں دیں ست

لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک نہ کسی صاحب قال نے توجہ کی اور نہ کسی صاحب حال نے۔

مجھ سے تقاضائے جواب

اس دوران میں علماء کرام کے سکوت کو دیکھ کر قارئین نگار نے مجھ پر تقاضہ شروع کیا کہ میں خود اس بحث میں براہ راست حصہ لوں اور ان تقاضہ کرنے والوں میں سے چونکہ اکثر ایسے ہیں جن کو میرے مسلمان ہونے کی طرف سے شک ہے اس لیے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیونکر انھیں مطمئن کر سکتا ہوں کیونکہ اسلام کا واقعی جو مفہوم میرے ذہن میں ہے اس کا تعلق زیادہ تر محمد سے ہے نہ کہ خدا سے

قرآن کی روح سے ہے نہ کہ الفاظ سے کردار سے ہے نہ کہ گفتار سے یعنی دنیا محمد کو سمجھنا چاہتی ہے قرآن و احادیث سے اور میں قرآن و حدیث کو پرکھنا چاہتا ہوں محمد کی زندگی سے لوگ کہتے ہیں کہ محمد وہ ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے میں کہتا ہوں قرآن وہ ہے جسے محمد نے اپنے عمل سے ظاہر کیا دنیا کے نزدیک اسلام سمجھنے کی منزلیں یہ ہیں خدا قرآن اور محمد اور میرے یہاں اس کے بالکل برعکس ان منازل کی ترتیب ہے محمد قرآن اور خدا لوگ خدا سے ڈر کر قرآن و محمد کا مطالعہ کرتے ہیں اور میں محمد سے محبت کر کے قرآن و خدا کو سمجھنا چاہتا ہوں۔

تو گل از باغ می خواہی من از گل باغ می جویم
من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

ان حالات میں میرے لیے یہی مشکل ہے کہ میں اسلام کے مروجہ عقائد و مسلمات کو

سامنے رکھ کر مذہب اسلام کا مفہوم متعین کروں چہ جائیکہ ان عقائد و روایات کو علم و عقل کی رو سے صحیح ثابت کرنا کہ یہ تو اس سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔

اسلام میرے نزدیک

پچھلے پندرہ سال کے اندر مجھے اتنی بار کافر مرتد ملحد و دہریہ کہا گیا کہ کبھی کبھی مجھے بھی سوچنا پڑا کہ کیا حقیقتاً میں اسلام سے خارج ہو چکا ہوں کیا واقعی میرے لیے اب اس مذہب میں کوئی جگہ باقی نہیں رہی لیکن باور کیجئے کبھی مجھ کو اس کا یقین نہ آیا اور میں نے جس قدر زیادہ غور و فکر سے کام لیا میں اپنے خیال پر زیادہ مستحکم ہو گیا اور بار بار رسول اللہ کا وہی ارشاد سامنے آیا جو آپ نے اپنے چچا ابو طالب سے کہا تھا کہ خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند لا کر رکھدیں تو بھی اپنے خیال سے باز نہ آؤں گا۔

اس موقعہ پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں تو میرا اسلام کس قسم کا ہے اس کے کیا اصول ہیں اور یہ اصول قرآن و حدیث پر کیونکر منطبق ہو سکتے ہیں۔

اگر میری سابقہ تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں ان سوالات کا جواب مل سکتا ہے لیکن چونکہ وہ سب کے سامنے نہیں ہیں اس لیے مجملاً اس کی وضاحت یہاں کر دینا چاہیے۔

اسلام کی اساسی شرط یہ بتائی جاتی ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو معبود نہ سمجھا جائے اور محمد کو اس کا رسول تسلیم کیا جائے اور اس حد تک مجھ میں اور عام مسلمانوں میں شاید کوئی فرق نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تسلیم کرنے کے بعد بھی ایک شخص مسلمان نہیں ہو سکتا اور غالباً یہی وہ خیال تھا جس کی بنا پر حضرت عمر نے من قال لا الہ الا اللہ فقد دخل الجنۃ کی روایت کو بہ جبر روک دیا کیونکہ محض خدا کو زبان سے ایک کہہ دینا کوئی ایسی بات نہیں جس کا انعام جنت قرار پائے رسول اللہ کی بعثت سے قبل بھی بہت سے لوگ توحید کے قائل تھے اور اس کے لئے بھی کافی تعداد ایسے لوگوں کی پائی جاتی تھی لیکن اپنے اخلاق کے لحاظ سے وہ اتنے گرے ہوئے تھے کہ ان کو کوئی توقع جنت یا کسی دوسرے انعام کی نہ ہونا چاہیے تھی۔

ہر جماعت میں داخل ہونے کے بعد بعض مخصوص شرائط ہوا کرتے ہیں جن کا تعلق

ظاہر و باطن دونوں سے ہوا کرتا ہے اور اس قسم کے بعض شرائط جماعت اسلامی میں داخل ہونے کے لیے مقرر تھے ظاہری شرائط یہ تھے۔

(1) توحید و رسالت کا اقرار (2) متعینہ طریقوں سے مراسم عبادت ادا کرنا (3) بعض مخصوص مابعدالطبیعیاتی عقائد کا ماننا لیکن معنوی شرط صرف ایک تھی اور وہ یہ کہ اسوہ رسول کی پابندی کی جائے پھر چونکہ اجتماعی مفاد صحیح طور پر معنوی شرائط ہی سے وابستہ ہوتا ہے اور ظاہری شرائط محض علامات و آلہ کار کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے میرے نزدیک مسلمان ہونے کی پہلی اور آخری شرط یہی ہے کہ وہ رسول کی سیرت کو سامنے رکھ کر اس کی پابندی کرے اور اسی لیے میں نے بارہا اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ میں اگر مسلمان ہوں تو صرف محمد رسول اللہ کی حد تک لا الہ للاللہ کی بحث میں پڑنا نہ صرف یہ کہ بیکار بلکہ ایک حد تک نقصان رساں بھی ہے کیونکہ یہ مسئلہ اتنا مشکل یا دلچسپ ہے کہ پھر انسان کو ترک ماسوا کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہتا اور مذہب وذہب سب رخصت ہو جاتے ہیں حالانکہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی ایسا لائحہ عمل ہمارے سامنے ہوتا بالکل ضروری ہے جو یہاں کی مادی کش کمش میں ہماری بقاء و حیات کا ضامن ہو اور یہی وہ لائحہ عمل ہے جس کو میں سیرت نبوی سے تعبیر کرتا ہوں اور اسی کی پابندی کو اصل اسلام قرار دیتا ہوں۔

میری نامسلمانی کی ابتدا

میری نامسلمانی کی تاریخ بہت دلچسپ ہے اور ممکن ہے کہ کسی وقت اپنے سوانح حیات کے ساتھ ساتھ بالتفصیل اسے پیش کر سکوں تاہم نہایت اختصار کے ساتھ اس وقت بھی سن لیجیے۔

مجھے بالکل علم نہیں کہ میرے والد سے قبل میرے خاندانی افراد جاہل تھے یا عالم مذہبی یا غیرمذہبی لیکن خود اپنے والد کے متعلق مجھے یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ وہ سخت مذہبی انسان تھے گو اصطلاحی حیثیت سے وہ فرنگی محل یا دیوبند کے سند یافتہ عالم نہ تھے لیکن ان کا علم بڑے بڑے عالموں سے زیادہ وسیع تھا فارسی کے وہ بڑے زبردست شاعر و انشاء پرداز تھے صہبائی سے عنفوان شباب میں مشورہ لیتے تھے غالب کے پرستار تھے اور کتب بینی کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ رہی مذہبیت سو اس کی سختی کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ میری عمر "6-7 سال سے زیادہ نہ تھی لیکن وہ اس وقت بھی مجھے جماعت کے ساتھ نماز ادا

کرنے پر مجبور کرتے تھے۔

اب یہاں اس تفصیل کا موقعہ نہیں کہ میری تعلیم و تربیت کے متعلق ان کا کیا نظریہ تھا اور انھوں نے اس کے لیے کیا کیا اہتمامات کیے مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ میری ابتدائی تعلیم نہایت سخت مذہبی ماحول میں ہوئی اور ایک نہایت متعصب مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا نشو ونما ہونے لگا میں نمازیں بھی پڑھتا تھا روزے بھی رکھتا تھا ظاہری وضع و لباس میں بھی سر سے لے کر پاؤں تک نہایت خشک و بھیانک قسم کا مسلمان تھا اور چونکہ صحبت عالموں اور مولویوں ہی کی تھی اس لیے شب و روز میرے دل و دماغ پر مذہب ہی مسلط رہتا تھا اور میں دنیا کی ہر بات کو مذہب ہی کے نقطہ نظر سے دیکھتا تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بات ضرور دل میں کھٹکتی رہتی تھی کہ مذہبی لوگوں اور مولویوں کے اخلاق پست کیوں ہیں خصوصیت کے ساتھ ان کی رعونت ان کا پندار تفوق مجھے بہت برا معلوم ہوتا تھا ان کی یہ خواہش کہ ہر شخص دور ہی سے دیکھ کر ان کے سامنے جھک جائے مجھے اچھی نہ معلوم ہوتی تھی اور آخر کار یہ سمجھنے پر مجبور ہوا کہ ان کی عبادتیں بے روح ہیں اور بے روح عبادت بالکل بے کار چیز ہے۔

میری فطرت شروع سے ہی یہ ہے کہ ہر بات کے سبب و نتیجہ پر غور کرتا ہوں اور جب تک کوئی معقول وجہ نہ ہو میں مشکل ہی سے کسی بات کو مان سکتا ہوں چنانچہ حضرات علماء کرام کے ان اطوار و انداز کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ لوگ نمازیں پڑھتے ہیں صرف نماز کی غرض سے اور مذہب کا مفہوم ان کے یہاں سوا اس کے کچھ نہیں کہ مراسم عبودیت کو مخصوص اوقات پر مخصوص طریقہ سے ادا کر دیا جائے اور بس انھیں اس سے بحث نہیں کہ ان کے قلب و روح میں بھی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے یا نہیں اس کا نتیجہ قدرتاً یہی ہونا چاہیے کہ ان کے دلوں میں شقاوت پیدا ہو اور اس پندار کی بناء پر کہ وہ خدا کے بڑے عبادت گزار مقبول بندے ہیں عام لوگوں سے وہ اپنے آپ کو بلند سمجھنے لگیں۔

یہ تھی ابتدا میرے تنفر کی جو مولویوں کی طرف سے مجھ میں پیدا ہوا اور مطالعہ و تجربہ کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتا رہا یہاں تک کہ احادیث کا نصاب میرے سامنے آیا اور مشکوٰۃ کا درس شروع ہوا چونکہ اب مجھ میں غور و فکر کی اہلیت زیادہ پیدا ہو گئی تھی اس لیے خود میری عقل نے فیصلہ کیا کہ تمام احادیث یقیناً رسول اللہ کا ارشاد نہیں ہو سکتیں کیونکہ ان میں سے اکثر بالکل طفلانہ خیالات کا مجموعہ ہیں اور جب میں نے اپنے شبہات اساتذہ کے

سامنے پیش کیے تو انہوں نے زجرو توبیخ کے علاوہ کوئی تشفی بخش جواب نہ دیا اور ہمیشہ یہی کہہ کر خاموش کرنا چاہا کہ مذہب میں عقل آرائی کافروں اور ملحدوں کا کام ہے۔

یہ تھا سب سے پہلے فتوائے کفروالحاد جس نے مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ اگر مولویوں کی جماعت واقعی مسلمان ہے تو میں یقیناً" کافر ہوں اور اگر میں مسلمان ہوں تو یہ سب نامسلمان ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اسلام نام ہے صرف کورانہ تقلید کا اور تقلید بھی رسول و احکام رسول کی نہیں بلکہ بخاری اور مسلم و مالک وغیرہ کی اور میں سمجھتا تھا کہ حقیقی کیفیت یقین کی اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک ہر شخص اپنی جگہ غور کرکے کسی نتیجہ پر نہ پہنچے۔

محمدؐ کی عظمت کا تصور

قصہ مختصر یہ کہ اولین بیزاری اسلامی لٹریچر کی طرف سے مجھ میں احادیث نے پیدا کی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ مطالعہ اسلام کے لیے مجھے اقوال رسول نہیں بلکہ افعال رسول پر غور کرنا چاہیے چنانچہ میں نے سیرت نبوی کے متعلق چھان بین شروع کی اور ہرچند سیرت کی کتابوں میں بھی مجھے بڑا حصہ مزخرفات ہی کا نظر آیا (کیونکہ یہاں بھی وہی احادیث و استنا و احادیث کا جھگڑا موجود تھا) تاہم میں نے یہ ضرور سمجھ لیا کہ محمدؐ کی ہستی واقعی نہایت عجیب و غریب ہستی تھی اور ایسی پاکیزہ اطوار و خصائل کا انسان بن نہیں سکتا بلکہ پیدا ہوتا ہے اور یہی مفہوم ان کے اور تمام انبیاء کے مبعوث ہونے کا ہے اسکے بعد قدرتاً" مجھے قرآن کی طرف متوجہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس باب میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ قرآن میں جو کچھ پایا جاتا ہے وہ یقیناً" رسول کی زبان سے ادا ہوا ہے اور اگر اسے عام مروجہ مفہوم میں خدا کا کلام نہ مانا جائے تو رسول کا کلام ہونے میں تو شک ہو ہی نہیں سکتا اور اس لیے اسلام کے حقیقی مقاصد سمجھنے کے لیے تنہا یہی ذریعہ اختیار کرنا چاہیے۔

خدا کا تصور

اس وقت تک خدا کا تصور میرے لیے بالکل مبہم سی چیز تھا لیکن مطالعہ قرآن کے سلسلہ میں میرے لیے ناگزیر ہو گیا کہ سب سے پہلے خدا کو سمجھوں لیکن میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ خدا کے سمجھنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جاتی ہے وہ اتنا ہی زیادہ ناقابل فہم ہو جاتا ہے یہاں تک کہ برسوں اسی حیرانی کے عالم میں گزر گئے اور آخرکار جب میں نے فلکیات کا

مطالعہ کیا تو مجھ پر خدا کی حقیقت ظاہر ہوئی لیکن یہ انکشاف حقیقت اس سے زیادہ نہ تھا۔

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجاست
چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہاں تاب کجاست
دریں غصہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم
کعبہ زیں دردیہ پوش کہ محراب کجاست
اے سمندر بہ ہوس داغ وفروش آتش کو
ماہیاں تشنہ بمیرید دم آب کجا ست

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے متعلق قرآن کے بتائے ہوئے تصورات دوزخ و جنت' حشر و نشر وغیرہ کے عقائد ان سب کا مفہوم میرے لئے کچھ سے کچھ ہو گیا کیونکہ اب مجھے نہ صرف یہ عقائد بلکہ خود مذاہب کا وجود بچوں کا کھیل نظر آنے لگا اور میں نے اس کو خدا کی توہین سمجھا کہ اس کے اور اس کے کاروبار کے متعلق انسانی نفسیات اور دنیا کے اصول زندگی کو سامنے رکھ کر کسی انسانی زبان کے ذریعہ سے اظہار خیال کیا جائے یہ تھا میرا دوسرا لیکن زیادہ مضبوط قدم لامذہبیت یا لا ادریت کی طرف لیکن باوجود ان تمام پریشان خیالیوں اور ذہنی تشویشوں کے رسول کی عظمت ایک لمحہ کے لیے بھی میرے دل سے محو نہیں ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ جب خدا کی ہستی اتنا زبردست معمہ ہے جسے رسول وغیر رسول کوئی بھی حل نہیں کر سکتا اور جس کی حقیقی عظمت کا تصور مذاہب کے وجود سے بھی بے نیاز ہے تو پھر قرآن میں جو تمام بیانات خدا اور جزا و سزا وغیرہ کے متعلق پائے جاتے ہیں ان کی کیا حقیقت ہے اور ان کے اظہار کا مقصود کیا ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑا مشکل سوال تھا کیونکہ ایک طرف محمد کی شخصیت تھی جس کے متعلق میرا ایمان ہے کہ ان سے زیادہ سچا مخلص اور مکمل انسان ہونا مشکل ہے اور دوسری طرف قرآن کے وہ بیانات جن کا اگر واقعی وہی مفہوم قرار دیا جائے جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے تو پھر خدا' خدا نہیں رہتا بلکہ مشرکوں کا وہ دیوتا ہو جاتا ہے جو انسانوں پر غصہ بھی کر سکتا ہے ان سے خوش بھی ہو سکتا ہے جس میں جذبہ انتقام بھی ہے اور ولولہ لطف و انعام بھی۔

قرآن اور وحی والہام

اس سلسلہ میں میرے لیے ضروری ہوا کہ پہلے میں اس حقیقت پر غور کروں کہ قرآن

کو خدا کا کلام کہنا کیا معنی رکھتا ہے وحی والہام کا کیا مفہوم ہے اور گفتہ او گفتہ اللہ بود کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے یہی وہ خیال تھا جس کی بناء پر پچھلے سال میں نے اس مسئلہ پر گفتگو کی اور جس کے جواب میں ہندوستان کے اکابر علماء کی متفقہ قوت نے براہین وحی لکھ کر شائع کی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے جو "امنّا وصدقنا" بغیر کسی حجت و دلیل کے قرآن کو واقعی خدا کا کلام سمجھتے ہیں یہ کتاب مزید ایقان کا باعث ہوئی ہو لیکن میں نے اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہ پایا جو مجھے مطمئن کر سکتا البتہ اکابر اعظم گڈھ اور دریا باد کی گالیوں نے اسے دلچسپ ضرور بنا دیا۔

بہرحال اس بحث کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ سب سے پہلے قرآن کے کلام خداوندی ہونے کی حیثیت کو متعین کر لیا جائے۔ اس کے بعد یہ غور کیا جائے کہ رسول اللہ کی تعلیمات کا اصل مقصود کیا تھا اور پھر قرآن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر معقولات کے نقطہ نظر سے غور کرنے کی ضرورت بھی پیدا ہوتی ہے یا نہیں۔

امر اول کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ کسی انسانی زبان کی کتاب کو اسی مفہوم میں خدا کا کلام قرار دینا جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا کی ذات ہر نوع کے مادی لگاؤ سے بلند ہے اس لیے ظاہر ہے کہ یہاں کلام سے صرف اس کا مفہوم مراد ہو گا بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں وہ طبعی و نفسیاتی کیفیت جس کے زیر اثر ایک شخص بے اختیار نہ کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس کیفیت کا نام مذہبی زبان میں وحی و الہام جبرئیل اور روح القدس وغیرہ ہے اس سے انکار ممکن نہیں کہ قرآن کے الفاظ عربی زبان کے الفاظ ہیں اس لیے اگر قرآن کے الفاظ کو کلام الٰہی کہا جائے گا تو ساری عربی زبان کلام خداوندی قرار پائے گی حالانکہ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ کسی ملک کی مخصوص زبان کو خدا کی زبان کہا جائے کیونکہ اگر خدا کسی زبان میں گفتگو کر سکتا ہے تو پھر کسی خاص زبان کی قید کیسی، اسے دنیا کی ہر زبان جاننا چاہیے اور وہ ہر زبان میں قرآن نازل کر سکتا ہے۔

عام مسلمانوں اور مولویوں کا یہ عقیدہ کہ قرآن اپنے الفاظ اور اپنی ترتیب کے لحاظ سے پہلے ہی لوح محفوظ میں منقوش تھا اور فرشتہ جبرئیل یہی محفوظ و منقوش کلام رسول اللہ کو آکر سناتا تھا اور رسول اللہ انھیں آسمانی الفاظ کو دہرا دیتے تھے حد درجہ مضحکہ خیز ہے اگر قرآن کی زبان عربی نہ ہوتی بلکہ کوئی نئی زبان ہوتی تو بھی خیر کچھ کہا جا سکتا تھا لیکن جبکہ وہ اس زبان

میں نازل ہوا تھا جو عام طور پر عرب میں رائج تھی تو اس کے الفاظ کو کیونکر خدائی الفاظ کہا جا سکتا ہے بہرحال قرآن کو خدا کا کلام اس حیثیت سے تسلیم کرنا کہ اس کا ایک ایک نکتہ ایک ایک لفظ خدا کا بنایا ہوا ہے اور خود رسول اللہ کے عقل و دماغ کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا تو خدا کو اس منصب سے گرا کر انسان کی حد تک کھینچ لاتا ہے اور رسول کو سطح انسانیت سے بھی نیچے گرا دیتا ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ خدا کو سمیع و بصیر ماننے کے بعد تو اس کی سماعت و بصارت کی کیفیت کو انسانی سماعت و بصارت سے بالکل علیحدہ سمجھتے ہیں لیکن صفت کلام کی بحث میں انسان ہی کی طرح الفاظ کا محتاج قرار دیتے ہیں اگر خدا کی سماعت و بصارت کا مفہوم اس کی عام توجہ و نگرانی قرار دیا جائے تو اس کے نطق یا کلام کا مفہوم کیوں نہ وہ اثر قرار پائے جس سے متاثر ہونے کے بعد ایک انسان والہانہ بے اختیارانہ کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

منصب رسالت

اگر ہم رسول اللہ کی قائم کی ہوئی شریعت اور ان کے بتائے ہوئے اصول اخلاق و معاشرت کے متعلق یہ فرض کر لیں کہ وہ بالکل خدائی چیز تھی اور خود رسول اللہ کے وہم و فراست اور عزم و ارادہ کو اس میں کوئی دخل نہ تھا تو رسول کی اتنی اہمیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور ان کی حیثیت محض ایک ایسے پیام رساں یا قاصد کی سے ہے جو خود کوئی انفرادیت نہیں رکھتا اور جس سے کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا۔

اگر رسالت کا منصب کوئی ایسی چیز ہے جو بالکل خدا کے انتخاب پر منحصر ہے اور خدا کے انتخاب کی کوئی نہ کوئی وجہ ہو سکتی ہے اور نہ اس سے اس باب میں کوئی سوال ہو سکتا ہے جس میں خود انسانی سعی و عمل یا غور و فکر کو مطلق دخل نہیں ہے تو پھر یہ بالکل قسمت کی چیز ہوئی اور ممکن تھا کہ محمد کے علاوہ کسی اور کا انتخاب ہو جاتا۔

رسول کی جو عظمت میرے دل میں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہی عظمت ہر مسلمان کے دل میں پیدا ہو جائے اس کا تعلق خدا اور رسول دونوں کی ذات سے ہے جس کی وضاحت یہاں ضروری ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہر شخص اپنی فطرت اپنے ساتھ لاتا ہے اور یہ اس کے اختیار سے باہر ہے کہ وہ جو چاہے بن سکے ہرچند دنیا میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ محض اپنی کوشش سے انسان نے ایسی راہ اختیار کی جس کے لیے وہ وضع نہ ہوا تھا لیکن ایسا کبھی نہیں

ہوا کہ وہ اس میں زیادہ کامیاب ہوا ہو اور ایسا ہمیشہ ہوا ہے کہ جس نے اپنی فطری اہلیت کو سامنے رکھ کر اپنا دائرہ عمل قائم کیا سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا اور اسی چیز کو میں خدا کا عطیہ کہتا ہوں کیونکہ فطری اہلیت قدرت یا خدا ہی کا عطیہ ہے اور اسی اہلیت کو مذہبی زبان میں بعثت و منصب رسالت کہتے ہیں قرآن میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ رسول اللہ مامور من اللہ تھے یعنی اللہ کی طرف سے انھیں حکم دیا گیا تھا یا متعین کیے گئے تھے ہدایت و اصلاح کے لیے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ صحیح تعبیر رسالت و بعثت کی اور کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی شخص کا فطرت کی طرف سے کوئی خاص اہلیت یا ملکہ لے کر پیدا ہونا گویا خدا کی طرف سے ماموری ہے کہ وہ اپنے اس فطری ودیعت سے کام لے اور چونکہ رسول اللہ نے اس ماموری یا اہلیت سے فائدہ اٹھایا اس لیے وہ بہت کامیاب رسول ثابت ہوئے۔

میرے اس بیان سے غالباً یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ منصب رسالت میں خدا یا قدرت کا کتنا دخل تھا اور خود رسول کی سعی و عمل کا کس قدر ان دونوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق تھا۔

اب آیئے رسول اور قرآن کے تعلق پر غور کریں۔

رسول اور قرآن کا باہمی تعلق

جنھوں نے تاریخ اسلام اور سیرت نبوی کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہو گی کہ رسول اللہ کی پیدائش کے وقت اہل عرب کی اخلاقی حالت کتنی گری ہوئی تھی اور دنیا کی کوئی غیر انسانی وغیر شریفانہ حرکت ایسی نہ تھی جس کے وہ مرتکب نہ ہوتے ہوں آپ نے ہوش سنبھالتے ہی اپنی قوم کی اس گری ہوئی حالت کا بہت اثر لیا اور یہ اثر لینا صرف اس بناء پر تھا کہ قدرت نے آپ کے دل و دماغ میں غیر معمولی صلاحیت سوچنے سمجھنے کی ودیعت کر دی تھی جسے ہم مذہبی زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو خدا نے منصب نبوت کے لیے چن لیا تھا۔

آپ نے سوچا کہ قوم کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے آپ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان برائیوں کی اصلاح کریں اور قوم کے تمام افراد کو اس پستی سے نکالیں چنانچہ آپ نے اس مسئلہ پر رات دن کی تنہائیوں میں غور کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ آپ کے تا

ثرات اس قدر شدید ہو گئے کہ انھوں نے ایک آہنی عزم کی صورت اختیار کر لی اور آپ نے فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو وہ اپنی قوم کے اصلاح کی کوشش ضرور کریں گے۔

اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ایسے خراب ماحول میں پیدا ہونے کے بعد آپ میں ایسا پاکیزہ جذبہ کیونکر پیدا ہوا لیکن اس کا جواب میں وہی دوں گا جو ابھی ظاہر کر چکا ہوں اور وہ یہ کہ قدرت نے آپ کے دماغ ہی میں پاکیزہ بات سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی علاوہ اس کے تاریخ بھی بتاتی ہے کہ ماحول سے جنگ کرنے والی ہستیاں قدرت نے ہمیشہ پیدا کی ہیں کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو انسان کے قواء ذہنی کبھی نشوو نما نہ پاتے اسی کے ساتھ اگر ہم توارث نسلی کے اصول کو سامنے رکھیں تو علمی حیثیت سے بھی یہ بالکل قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ رسول اللہ نہایت ہی شریف و معزز خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور آپ کے آباؤ اجداد میں بعض ایسے نفوس بھی گزر چکے تھے جنھیں اس قسم کا مرتبہ رشد و ہدایت مل چکا تھا۔

بہرحال اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی ذہنی صلاحیت لے کر آئے تھے اور سالہا سال کی غور و فکر کے بعد آپ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی قوم کی اصلاح کر کے رہیں گے اور دنیا کی کوئی مخالفت انھیں اس ارادے سے باز نہ رکھ سکے گی آپ کے اس عزم کا ثبوت آپ کے واقعات زندگی سے بخوبی مل سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی جسمانی و ذہنی تکلیف ایسی نہ تھی جو آپ کو نہ پہنچائی گئی ہو بڑی سے بڑی رشوت ایسی نہ تھی جو آپ کے سامنے پیش نہ کی گئی ہو لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی کبھی آپ کا قدم متزلزل نہیں ہوا۔ وہی کر کے رہے جو سوچ چکے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ انسانی جدوجہد کی ایسی غیر معمولی مثالیں ہم کو تاریخ کے صفحات میں اور بھی ملتی ہیں لیکن ان میں اکثر کا تعلق مادی خواہشات سے تھا اور اسی لیے جب یہ خواہشیں پوری ہو گئیں تو آخر کار دنیا کے لیے عذاب ہو کر رہ گئیں۔

چنگیز' ہلاکو' ہنی بال' سکندر' نپولین ان میں سے ہر ایک بڑے پختہ ارادے کا انسان تھا اور ان کی کامیابیاں اس میں شک نہیں تمام انھیں کے ذاتی جدوجہد اور عزم صمیم کا نتیجہ تھیں لیکن ان کوششوں کا مقصود صرف مال وجاہ کا حاصل کرنا تھا اور ان کا یہی پست مقصد زندگی کے زوال کا باعث ہوا۔

انسان کے ذہن کا بلندی کے اس درجہ پر پہنچ جانا کہ ذاتی یا خاندانی مفاد کا خیال تک

کبھی اس کے دل میں نہ آئے انتہائی کامیابی کے وقت بھی جذبہ انتقام اس میں پیدا نہ ہوا دشمنوں پر قابو پا جانے کے بعد بھی لطف و محبت و عفو و درگزر سے کام لے اور پھر باوجود ان تمام روحانی بلندیوں کے دنیا میں اسباب زندگی بسر کرنے کی بھی ایسی راہیں بتا جائے جو واقعی دنیا کی نجات کی ضامن ہوں یقیناً" بہت بڑی چیز ہیں اور اگر ان تمام خصوصیات کا کسی ایک ہستی میں اجتماع قدرت کا معجزہ ہو سکتا ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس معجزہ کا ظہور محمد کی ذات پر ختم ہو گیا اور اگر دنیا نے کبھی انسانیت کبریٰ کا مجسمہ تیار کیا تو وہ محمد ہی کا ہو گا کسی انسان کا نہیں کسی انسان اعلیٰ (SUPERMAN) کا نہیں بلکہ ایک ایسے انسان اور انسان کا جس کے حدود انسانیت حدود الوہیت سے ٹکر کھاتے ہیں اور ازل سے ابد تک فضائے فطرت کو معمور کیے ہوئے ہیں۔

جواہر اعتبار غیب و شہود
اصل کیفیت خفا و نمود
ازل افسانہ ہدایت او
ابد اندیشہ نہایت او

ظاہر ہے کہ جو شخص اتنے بلند مقصد کو لے کر اٹھا ہو گا اور جس نے اپنے جسم و جان کو اس کی تکمیل کے لیے تج دیا ہو گا۔ اس کے انہماک کا کیا عالم رہا ہو گا اس کے دل و دماغ کیسی والہانہ کیفیت سے معمور رہے ہوں گے رسول اللہ کی سیرت کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جب آپ غار حرا میں سکون و تنہائی میں اپنے ابنائے وطن کی دردناک حالت پر غور کر کے باہر تشریف لاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آپ پر کوئی نہایت گہری کیفیت طاری ہے اور آپ کا سینہ جذبات کی شدت سے پھٹا جا رہا ہے لیکن آپ ضبط سے کام لیتے اور پھر غور و فکر میں مصروف ہو جاتے یہاں تک کہ زندگی کا بڑا حصہ اسی عالم میں گزر گیا اور آخر کار وہ وقت آیا کہ یہ سیلاب ابل پڑا یہ چشمے پھوٹ نکلے اور جذبات و تاثرات کے طوفان نے الفاظ کی صورت اختیار کر لی اور انھیں الفاظ کا مجموعہ قرآن ہے پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ الفاظ معمولی انسان کے الفاظ تھے یہ الفاظ دراصل کیفیات روحانی کی مسموعی صورت تھے ولولہ رشد و ہدایت کی روح القدس کا مظہر تھے جذبہ اصلاح و تزکیہ اخلاق کے جبرئیل کی زبان تھے یعنی یہ وہ نطق ہمایونی تھا جو بغیر مرتبہ نبوت ملے ہوئے محمد کو عطا ہی نہ ہو سکتا تھا اور اس لیے یقیناً" وہ خدا کا الہام تھا اس کی وحی تھی، اس کا کلام تھا جسے محمد نے سنایا اور جس کو سن

کر دنیا محو حیرت ہو گئی اس لیے نہیں کہ وہ کوئی نئی زبان تھی نئے الفاظ تھے بلکہ اس لیے کہ ان کے اندر نئی روح تھی نیا اثر تھا اور قوت تھی سر تسلیم خم کرا دینے والی ایک اعجاز تھا حیران و مبہوت بنا دینے والا۔

قرآن کے اسالیب بیان

اگر آپ قرآن کا بغور مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ رسول اللہ کے تاثرات کے لحاظ سے اس کا انداز بیان بھی بدل گیا ہے کہیں تو بالکل (SOLOLOQUEY)ہے یعنی رسول اللہ نے خود اپنے نفس سے خطاب کیا ہے کہیں انھوں نے خدا کو مخاطب کر کے اپنے جذبات عبودیت و تشکر کا اظہار کیا ہے کسی جگہ اپنے ابناء قوم و اپنے اعزاہ و احباب اور اپنے دشمنوں کو مخاطب کیا ہے اور کہیں ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے گویا خدا خود کچھ فرما رہا ہے اور ان مختلف اسالیب بیان سے صرف یہی نہیں کہ ہم رسول اللہ کے ذہنی تاثرات کی صحیح تاریخ مرتب کر سکتے ہیں بلکہ اس نتیجہ پر بھی پہنچتے ہیں کہ رسول اللہ کا تنہا مقصود کسی نہ کسی طرح لوگوں کی درستی اخلاق کی طرف متوجہ کرنا تھا اور اسی مقصود کو مختلف طریقوں اور مختلف اسالیب بیان سے پورا کیا گیا ہے۔

جس زمانہ میں رسول اللہ مبعوث ہوئے ہیں اس سے پہلے ہی عرب میں فن خطابت و شاعری پورے عروج پر پہنچ چکا تھا اور کاہنوں کی فصیح و بلیغ تقریریں صرف ادب و انشاء بلکہ اپنے اثرات کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتی تھیں اہل عرب جاہل ضرور تھے لیکن ملک کی جغرافی خصوصیات وہاں کے ریگزاروں کو ستانوں اور ان کی صحرائی طرز معاشرت نے انھیں دنیا کی تلخ ترین حقیقتوں کو بھی برداشت کرنے اور ان پر غور کرنے کا اہل بنا دیا تھا اور ان کے ذہن و فکر کی تمام راہیں ایک پتھریلی قسم کی ٹھوس کیفیت اپنے اندر رکھتی تھیں اور چونکہ تہذیب و تمدن کے غیر حقیقی تکلفات سے وہ آشنا نہ تھے اس لیے زندگی کی سچی سادگی ان کے شعر و ادب میں بھی منتقل ہو گئی تھی اور اسی سے وہ متاثر ہوئے تھے۔

ظاہر ہے کہ ایسے زمانہ میں ایسی قوم کی اصلاح کے لیے کوئی ایسا لٹریچر پیش نہیں کیا جا سکتا تھا جو ان کی ذہنی رفتار کے مطابق نہ ہوتا اور حقائق علمی و تاریخی سے تعلق رکھتا خطابت ہی سے وہ متاثر ہو سکتے تھے اور ان کی اصلاح کے لیے یہی طریقہ کار اختیار کرنا ضروری تھا پھر چونکہ رسول اللہ ایسے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی فصاحت و بلاغت اور

پاکیزگی زبان کے لحاظ سے بہت شہرت رکھتا تھا اس نے آپ کے تمام اقوال و ارشادات کو عربوں کے ذوق کے لحاظ سے یوں بھی بہت بلند ہونا چاہیے تھا لیکن قرآن کی زبان میں چونکہ علاوہ آپ کے خاندانی فصاحت و بلاغت کے آپ کے وہ بلند تاثرات بھی شامل تھے جو خدا کے منزہ تصور میں ڈوب جانے کے بعد ہی پیدا ہو سکتے ہیں اس لیے قرآن کا انداز خطابت اس وقت کی عام مروجہ خطابت سے کہیں زیادہ بلند چیز تھا اور اسی لیے اس وقت کے بڑے بڑے کاہنوں خطیبوں اور شاعروں نے اس کو ادبی معجزہ سمجھا۔

جیسا کہ ابھی میں نے ظاہر کیا قرآن کا انداز بیان ہر جگہ ایک سا نہیں ہے بلکہ وہ رسول اللہ کے تاثرات کے لحاظ سے ہر جگہ بدلتا گیا ہے لیکن کسی جگہ ان لوگوں کے ذہن و عقل سے متجاوز نہیں ہوا جن سے خطاب کیا گیا ہے اور قرآن کی سب سے بڑی بلاغت یہی ہے۔

نزول قرآن کا حقیقی مقصود

اس سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہو گا کہ رسول اللہ کا مقصود انسان کے اخلاق درست کرنا بھی تھا اور ذہنی ترقیوں کی طرف مائل کرنا بھی لیکن زیادہ اہم اخلاق کی درستی ہی تھی کیونکہ بغیر اس کے ذہنی ترقیاں بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوتی ہیں اور اس لحاظ سے یقیناً" اسلام ہی دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے روح و مادہ دونوں کی ترقی کی تعلیم ایک ساتھ پیش کی اور ان دونوں کے صحیح امتزاج کی وہ صورتیں بتائیں جو اس سے قبل کسی مذہب میں نہ پائی جاتی تھیں اور اس لیے ان کی تعلیمات کا بڑا حصہ اس کے لیے وقف ہے پھر ان حالات میں قرآن کا مطالعہ کسی اور نقطہ نظر سے کرنا یقیناً" اصولی غلطی ہو گی۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں بہت جگہ انسان کو تعقل و تدبر غور و فکر تعلیم اور تعلم اور کسب فضل و کمال کی ہدایت کی گئی ہے لیکن خود کوئی مخصوص علمی تاریخی یا فنی نظریہ اس نے پیش نہیں کیا اور اس کا سبب یہ تھا کہ علمی تحقیقات اور جستجوئے حقائق کے ساتھ ساتھ علمی و فنی نظریئے بدلتے رہتے ہیں اور ان کے متعلق کسی زمانہ میں کوئی لٹریچر اس دعوے کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہو اور قرآن کو حرف آخر ہی کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا اور وہ یقیناً" یہی حیثیت رکھتا ہے بشرطیکہ ہم ضرورت سے زیادہ خوش اعتقادی سے کام لے کر اس کے صحیح مقاصد و اصول سے ہٹ کر اس کا مطالعہ نہ کریں۔

بعض حضرات اس اعتقاد کے زیر اثر کہ قرآن جامع الکل کتاب ہے موجودہ علمی مسائل کا حل بھی اس میں تلاش کرتے ہیں عہد حاضر کے فنی نکات بھی اس میں ڈھونڈھتے ہیں یہاں تک کہ فلکیات کی پیچیدہ ریاضی بھی انھیں قرآن میں مل جاتی ہے لیکن یہ غور نہیں کرتے کہ اگر کل یہ نظریئے بدل گئے جو ایک حد تک یقینی امر ہے تو وہ پھر کیا تاویل کریں گے اور قرآن آخر کب تک اسی دماغی و ذہنی ورزش کا شکار رہے گا۔

اس لیے میری رائے میں قرآن کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ دنیا کے تمام مسائل اور ان کے جزئیات سے بھی بحث کرتا ہے نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ قرآن اور رسول دونوں کی توہین بھی ہے۔

رطب ویابس دونوں کا کتاب مبین میں ہونا بالکل درست ہے لیکن اس مفہوم میں نہیں جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ روحانی و مادی دونوں قسم کی صحیح ترقی کے جو اصول ہو سکتے ہیں وہ سب اس میں پائے جاتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا اسلام دنیا کا سب سے پہلا مذہب ہے جس نے دین و دنیا دونوں کو یکساں اہمیت دی ہے اور کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ انسان کاروبار عالم سے منہ موڑ کر عضو معطل ہو کر رہ جائے اس لیے انسان کو سراپا سعی و عمل بننے کا درس دیا اس نے ذہنی قوتوں کو بروئے کار لانے کے لیے غور و فکر تعقل و تدبر کی تاکید کی یہاں تک کہ اس نے اسلام کا معیار ہی یہ قرار دے دیا کہ اس کا ماننے والا کبھی پست حالت میں نہیں رہ سکتا (انتم الاعلون ان کنتم مومنین) لیکن اسی کے ساتھ چونکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ محض دنیاوی ترقی کو مقصد حقیقی قرار دینا کبھی نوع انسانی کے لیے مفید نہیں ہو سکتا جب تک اس کے اخلاق بھی بلند نہ ہوں اس لیے اس نے دنیاوی ترقی کی ضروری شرط یہ قرار دی کہ انسان پہلے یہ سمجھ لے کہ وہ دنیا میں فساد برپا کرنے نہیں آیا ہے بلکہ اس کا فرض تمام انسانی برادری میں رشتہ اخوت و مساوات قائم کر کے امن و سکون کی اشاعت کرنا ہے اور اس کی صداقت روز بہ روز زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہے۔

آج دنیا ترقی کی جن راہوں سے گزر رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہو گا کہ اب آدمی انسان ہونے سے زیادہ کچھ کچھ خدا بھی ہو چلا ہے لیکن یہ خدا یزداں نہیں ہے بلکہ اہرمن ہے اور اس کی ذہنی ترقیاں بجائے اس کے کہ عالم میں امن و سکون پھیلائیں اس کو فتنہ و فساد کی آگ سے تباہ کرتی جا رہی ہیں برخلاف اس کے اسلام

نے جس ترقی کا درس دیا وہ کرہ ارض کو جنات عدن بنا دینے والا تھا اور اسی لیے رسول اللہ کو اس تعلیم کا صحیح مظہر قرار دے کر رحمتہ للعالمین کے لقب سے سرفراز کیا گیا اور آپ نے دین و دنیا کی فلاح و ترقی میں جو توازن پیدا کرنا چاہا اس کے سمجھنے کے لیے آپ کا صرف ایک ارشاد کافی ہے اور وہ یہ کہ دنیا کے کاموں کو اس طرح انجام دو گویا تمہیں کبھی مرنا ہی نہیں اور دین یعنی روح و اخلاق کے کام اس طرح کرو گویا تمہیں ابھی مر جانا ہے۔

الغرض قرآنی تعلیمات کا اولین مقصد اخلاق کی درستی تھی اور جو کچھ اس میں کہا گیا ہے اسی مدعا کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے لیکن چونکہ کسی قوم کی اصلاح آسان کام نہیں خصوصیت کے ساتھ عرب جیسی جاہل و متشدد قوم کہ ان کو سمجھانا گویا پتھر میں جونک لگانا تھا اس لیے اس مقصد کی تکمیل میں آپ نے وہ طبعی اصول اختیار کیے جن کی ناکامی کا امکان ہی نہ تھا۔

قرآنی تعلیم نفسیاتی نقطہ نظر سے

نفسیات کا مسلمہ نظریہ ہے کہ تعلیم و تربیت میں رجحانات کی رعایت بہت ضروری ہے کیونکہ رجحانات تاریخی و جغرافی ماحول کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں اور ماحول کے نتائج میں رد عمل پیدا کر کے کسی متضاد کیفیت کو عرصہ تک قائم رکھنا بہت مشکل ہے اگر ذہنی رواداری سے کام نہ لیا جائے اور آہستہ آہستہ اس کا عادی نہ بنایا جائے اب آپ تعلیمات قرآن کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اس میں بالکل اسی اصول سے کام لیا گیا ہے۔

عربوں میں بت پرستی کی شدت نے ایسا ذہنی جمود و تعطل پیدا کر دیا تھا کہ ان کی انسانی انفرادیت اور اجتماعی ہیئت دونوں محو ہو چکی تھیں اور ان کی حالت بالکل بہائم کی سی تھی جو بتوں کے وہمی و فرضی چابک سے ہانکے جا رہے تھے ان کی پست حالت کو دور کرنے کے لیے رسول اللہ نے انھیں توحید کی طرف لانا چاہا جسے وہ بالکل بھول چکے تھے لیکن اس کی ترکیب یہ نہ تھی کہ ان کے سامنے توحید کا فلسفہ پیش کیا جاتا بلکہ اس کے لیے ایک سخت ضرب کی ضرورت تھی تاکہ ان کی ذہنی رفتار کا رخ دفعتاً" بدل جائے اور اسی لیے رسول اللہ نے نہایت صاف الفاظ میں بتوں کی برائی شروع کر دی اور آخر کار ان کو توڑے بغیر باز نہ رہے۔

لیکن چونکہ نفسیاتی حیثیت سے یہ بات ان لوگوں کے لیے سخت رد عمل پیدا کرنے والی تھی اور اس کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے کفار و مشرکین کے رجحانات کی کوئی نہ کوئی رعایت ضروری تھی اس لیے ان کے عظیم بت کدہ کی عزت و اہمیت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا اور پرستش

گاہ ہونے کی حیثیت سے کعبہ کعبہ ہی بنا رہا۔ ورنہ خدا اور توحید کا جو پاکیزہ و بلند تصور اسلام نے پیش کیا ہے وہ کعبہ و حریم کعبہ سب سے بے نیاز ہے جب رسول اللہ اپنے اس بنیادی مقصد کو حاصل کر چکے تو اپنے ابنائے وطن کی معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس کے لیے انھوں نے ہمیشہ نفسیاتی اصول اختیار کیا اور کبھی کوئی ایسا طریقہ کام میں نہیں لائے جو لوگوں کے عقول و اذہان اور ان کی اہلیت تاثر کے لحاظ سے غیر مفید ثابت ہوتا۔ شادی کے باب میں عربوں کے اصول اس قدر ناپسندیدہ تھے کہ انھوں نے عورتوں کو بازار کی جنس سے بھی زیادہ کمتر حیثیت کی چیز بنا دیا تھا اور اس طرح گویا انسانیت کا نصف حصہ بالکل تباہ و برباد ہوا جا رہا تھا۔ چنانچہ آپ نے اس میں ان کی غیر محدود آزادی کو چار تک محدود کر کے اس اخلاقی ناسور کو بہت کچھ بھر دیا ممکن تھا کہ آپ بیک وقت صرف ایک ہی بیوی رکھنے کی اجازت دیتے لیکن قطع نظر اس سے کہ اس وقت کے مصالح کے لحاظ سے یہ مناسب ہوتا یا نہیں اتنی شدت شاید لوگوں کو گوارا نہ ہوتی اور پھر مطلق اصلاح نہ ہو سکتی لونڈی غلاموں کے باب میں رسول اللہ کی بلند تعلیم کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آزاد اور غلام کے درمیان بہ حیثیت انسان ہونے کے آپ نے کوئی فرق باقی نہیں رکھا اور گو اس وقت کے حالات کے لحاظ سے آپ کلیتا" اس کا استیصال نہ کر سکے لیکن اپنے قول و عمل سے یہ ضرور بتا گئے کہ دنیا میں کوئی انسان غلام بننے کے لیے نہیں پیدا ہوا ہے۔ اور اس رسوم کو دنیا سے بالکل اٹھ جانا چاہیے۔

شراب کا استعمال عرب میں نہایت بدتمیزی سے جاری تھا لیکن اس کا استیصال بھی آہستہ آہستہ تدریج کے ساتھ کیا پہلے صرف شراب کی برائیاں ظاہر کیں اور کچھ لوگوں نے اس سے متاثر ہو کر اسے ترک کر دیا اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ نشہ کی حالت میں نماز ادا نہ کرو یہ سن کر کچھ اور لوگوں نے اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ جب حالات اور زیادہ موافق ہو گئے تو ترک میخواری کا حکم نافذ کر دیا الغرض رسول اللہ نے اصلاح اعمال و تزکیہ اخلاق کے لیے جو کچھ اور جس طرح کیا وہ اس وقت کے ماحول اہل عرب کی فطرت اور اپنے ذرائع و مصالح کو سامنے رکھ کر کیا اور اس سے زیادہ ممکن نہ تھا۔

قرآن کی تقسیم مطالب کے لحاظ سے

قرآن اپنے مطالب کے لحاظ سے کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک حصہ عبادات

یا تعلیم اخلاق سے متعلق ہے دوسرا معاملات سے تیسرے میں قصص و حکایات درج ہیں اور چوتھے میں اعتقادات کا ذکر کیا گیا ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز پہلے دو حصے ہیں اور باقی دو حصے محض تدبیر و ذرائع اور اصول کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اگر ایک شخص قصص قرآنی اور معتقدات کو صحیح ماننے کے بعد عبادت و معاملات میں ہدایات قرآنی کا پابند نہ ہو تو وہ کبھی سوسائٹی کے لیے مفید نہیں ہو سکتا لیکن اگر قصص و معتقدات کو نہ مانتے ہوئے وہ عبادات و معاملات میں احکام الٰہی کا پابند ہے تو ہیئت اجتماعی اور نظام تمدن میں یقیناً وہ ایک عضو مفید کی حیثیت رکھنے والا سمجھا جائے گا بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے وہ تمام اجزا جو اسرائیلیات اور حیات بعدالموت سے تعلق رکھتے ہیں اصل مدعا کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ان کا مقصود صرف یہ ہے کہ لوگوں کو اخلاق کی درستی کی طرف مائل کیا جائے اور اس اصلاح پر انھیں مضبوطی سے قائم رکھا جائے۔

انسان فطرتاً طماع و خود غرض واقع ہوا ہے اور اسی کے ساتھ وہ ان معاملات و واقعات سے بھی بہت متاثر ہوتا ہے جو اس کی ذاتی اغراض کے منافی یا معاون ہوتے ہیں۔

بعثت نبوی کے وقت عرب میں یہود و نصاریٰ کی بہت سی روایات رائج تھیں اور مابعد الطبیعیاتی عقائد بھی قریب قریب وہی پائے جاتے تھے جو قرآن میں مذکور ہیں لیکن ان روایات و معتقدات سے جو اعتبار و بصیرت یا ولولہ عمل پیدا ہونا چاہیے وہ بالکل مفقود تھا لوگ سنتے تھے اور انھیں اساطیرالاولین کہہ کر ٹال دیتے تھے تاہم یہ ضرور تھا کہ ان کی یہ بے پروائی جحود و انکار نہیں بلکہ محض غفلت و سہل انگاری کا نتیجہ تھی انھیں اپنی بدمستیوں سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ان روایات و معتقدات کی روح پر غور کرتے اور ان کے اخلاق کی پستی اس حد تک گئی تھی کہ وہ اپنی موجودہ حالت و زندگی میں کسی بلند تغیر کا امکان ہی نہ پاتے تھے۔

پھر ان حالات میں یہی مناسب تھا کہ بھولی ہوئی باتیں یاد دلا کر ان کو اصلاح کی طرف مائل کیا جاوے اور کوئی ایسی نئی چیز ان کے سامنے نہ لائی جائے جس کو ان کے دماغ کسی طرح قبول ہی نہ کر سکتے تھے اگر ان روایات و معتقدات کی جگہ ان کو قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ اور نوامیس فطرت کا اصول سمجھایا جاتا یا اخلاق کے ان بلند نظریوں کو پیش کیا جاتا جو انفرادی فائدہ اور اجر و ثواب کے خیال سے ہٹ کر محض اجتماعیت اور خالص احساس فرض شناسی سے تعلق رکھتے ہیں تو یقیناً ان پر کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ ہرگز تعلیمات اسلامی

کی طرف مائل نہ ہوتے۔

عرب قوم اپنے جذبات کے لحاظ سے بڑی متشدد قوم تھی وہ اگر کسی کے دشمن ہو جاتے تھے تو بیرحمی کا کوئی طریقہ ایسا نہیں جو انتقام لینے کے لیے صرف نہ کر دیتے ہوں اور ذرا سی بات پر سالہاسال تک لڑتے جھگڑے نہ رہتے ہوں الغرض لغاوی حیثیت سے ان کے مشاغل زندگی کچھ نہ تھے اور سوا اس کے کہ وہ اپنی قوتیں صرف جسمانی و شہوانی لذتوں کے حصول میں صرف کر دیں کچھ نہ جانتے تھے۔

ان کے عیش و مسرت کا انتہائی تخیل' دودھ شہد شراب اور عورت سے آگے نہ بڑھتا تھا اور ان کی ایذا پسندی کا ابتدائی تخیل بھی اس سے کم نہ تھا کہ دشمن کو ویسی ہی تکلیف پہنچائی جائے جیسے آگ میں ڈالنے سے کسی کو پہنچ سکتی ہے اس لیے اگر انھیں اچھی باتوں کی طرف یہ کہہ کر مائل کیا جاتا کہ اس کے عوض میں انھیں ایک روحانی ابدی راحت حاصل ہو گی اور بری باتوں سے انھیں یہ کہہ کر ہٹایا جاتا کہ اس کی سزا انھیں روحانی کرب و تکلیف کی صورت میں ملے گی تو وہ اس بیان سے قطعاً" متاثر نہ ہوتے کیونکہ ان کے ذہن و عقل نے اتنی ترقی نہ کی تھی کہ وہ لذت والم کے اس بلند فلسفہ کو سمجھ سکتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ اسلام اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتا۔

عذاب قبر' نکیرین' حشر و نشر' میزان و صراط' ہاویہ و جہنم طوبیٰ و فردوس کوثر و سلسبیل حور و قصور وغیرہ کا بیان جس انداز سے قرآن میں کیا گیا ہے وہ سب عربوں کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور اسلام سے پہلے جن مذاہب نے اس نوع کا انداز بیان اختیار کیا تھا انھوں نے بھی انسان کی اس عام ذہنیت کو سامنے رکھ کر حساب و کتاب اور سزا و جزا کی یہی مادی صورتیں پیش کی تھیں۔

اس سلسلہ میں یہ سوال ضرور سامنے آتا ہے کہ انبیاء نے جو مابعدالطبیعیاتی عقائد پیش کیے تھے وہ ان کو واقعی ویسا ہی سمجھتے تھے جیسا کہ انھوں نے ظاہر کیا یا صرف اصلاح کی غرض سے مصلحتاً" یہ انداز بیان اختیار کیا تھا۔

اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں اگر ضرورت سے زیادہ خوش اعتقادی سے کام نہ لیا جائے۔

اس سے تو شاید کسی کو انکار نہ ہو گا کہ انسان کی ذہنی و عقلی ترقیاں تدریج کے ساتھ ہوئی ہیں اور انبیاء و مصلحین قوم بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں جو علمی حقائق آج

دریافت ہوئے ہیں وہ آج ہی دریافت ہو سکتے تھے اس سے قبل ان کا علم ناممکن تھا اس لیے رسول اللہ سے قبل انبیاء نے جن عقائد کی تعلیم دی تھی وہ یقیناً" ان کی حقیقت سمجھتے تھے اور کوئی مصلحت ان کے سامنے نہ تھی لیکن قرآن و احادیث میں البتہ بعض بیانات ایسے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ کے ذہن میں دوزخ و جنت کا مفہوم ادیان سابقہ کے سمجھے ہوئے مفہوم سے مختلف تھا یہ موضوع ایک بسیط گفتگو چاہتا ہے تاہم اجمالاً" بعض تصریحات کا ذکر یہاں بھی ضروری ہے۔

جنت

اس میں شک نہیں کہ فردوس کے بیان میں قرآن بھی بہت سی باتیں ایسی پیش کرتا ہے جن کا تعلق مادی دنیا اور جسمانی لذتوں و راحتوں سے معلوم ہوتا ہے لیکن یہ انداز بیان یقیناً" تمثیلی ہے اور جس کا ثبوت قرآن و حدیث دونوں سے ملتا ہے۔

سورہ سجدہ میں برے اور اچھے اعمال کی سزا و جزا کا ذکر کرتے ہوئے نعائیم جنت کی حقیقت ان الفاظ میں ظاہر کی گئی ہے۔

فلا تعلم نفس مااخفی لہم من قرۃ اعین جزا" بماکانوا یعملون

یعنی کوئی اس حقیقت کو نہیں جان سکتا کہ اچھے کام کرنے والوں کی جزا کس کس طرح ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائے گی۔

ظاہر ہے کہ آنکھوں کی ٹھنڈک سے یہاں ظاہری آنکھ کی ٹھنڈک مراد نہیں بلکہ اس سے مقصود دل و دماغ اور قلب و روح کے سکون کو ظاہر کرنا ہے۔

سورہ محمد میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ جنت کے متعلق جو بیانات پیش کیے جاتے ہیں وہ سب تمثیلی ہیں۔

مثل الجنۃ اللتی وعد المتقون فیہا انہار من ماء غیر آسن و انہار من لبن لم یتغیر طعمہ وانہار من خمرلذۃ للشار بین وانہار من عسل مصفی ولہم فیہا من کل الشمرات

یعنی پرہیز گاروں کے لیے جو وعدہ کیا گیا ہے کہ ان کے لیے جنت میں دودھ شراب اور شہد کی نہریں ہوں گی لیکن یہ سب تشبیہات ہیں۔

رسول اللہ کی ایک حدیث جسے بخاری نے نقل کیا ہے اس مسئلہ کو اور زیادہ صاف کر

دیتی ہے آپ سے دریافت کیا گیا کہ نعایم جنت کی حقیقت کیا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ وہ لذتیں ایسی ہیں کہ۔

مالاعین رات ومالاذن سمعت و ماخطر علی قلب بشر

نہ کسی آنکھ نے آج تک ان کو دیکھا ہے نہ کسی کان نے ان کا ذکر سنا ہے اور نہ انسان ان کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کر سکتا ہے۔

تلاش سے متعدد ایسی آیات و احادیث پیش کی جا سکتی ہیں جن سے جنت کا صحیح مفہوم متعین ہو سکتا ہے۔

دوزخ

جنت کی طرح دوزخ کا مفہوم بھی قرآن میں مادیات سے تعلق نہیں رکھتا اور اس کے ثبوت میں غالباً قرآن میں صرف ایک آیت کو پیش کرنا کافی ہو گا جس میں آتش دوزخ کی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

نارالله الموقدة اللتی تطلع علی الافئدۃ

یعنی دوزخ کی آگ وہ خدائی آگ ہے جو انسان کے دلوں پر مستولی ہوتی ہے۔

اگر دوزخ کی آگ سے یہی دنیا کی آگ مراد ہوتی تو اس کو خدا سے منسوب کر کے نار اللہ نہ کہا جاتا اور نہ یہ کہ وہ دلوں سے تعلق رکھتی ہے ظاہر ہے کہ دل کی آگ وہی ہو سکتی ہے جو انسان کو روحانی کرب میں مبتلا کر دے اور ظاہری آگ سے اسے کوئی تعلق نہیں۔

دیگر معتقدات

دوزخ و جنت کی طرح تمام عقائد جو میزان صراط حشر و نشر اور ملائکہ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی سب مادیات سے علیحدہ اپنا مفہوم جدا گانہ رکھتے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات خود قرآن سے ثابت ہو سکتی ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ اسلام میں حیات بعدالموت کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ ادیان سابقہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اور اس سلسلہ میں تقریباً تمام انھیں عقائد کو پیش کیا گیا ہے جو اسلام سے قبل رائج تھے لیکن جیسا کہ میں اس سے قبل ظاہر کر چکا ہوں قرآن میں ان کو حقائق کی صورت سے نہیں بلکہ تمثیل و تعبیر کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔

چونکہ عام ذہن انسانی مادیات سے ہٹ کر کوئی روحانی تصور جزا و سزا کا قائم نہیں کر

سکتا اس لئے اس کو سمجھانے کے لیے ضروری تھا کہ مثال میں دنیا کی وہی چیزیں پیش کر جاتیں جن کو انسان روز دیکھا رہتا ہے وہ جانتا تھا کہ جب کوئی شخص جرم کرتا ہے تو حکومت اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے اسے گرفتار کراتی ہے اس کے اعمال کا احتساب کرتی ہے اور جب جرم ثابت ہو جاتا ہے تو نوعیت جرم کے لحاظ سے سزا دی جاتی ہے اور اگر آپ مذاہب کے مابعد الطبیعیاتی عقائد کا تجزیہ کریں گے تو وہ سب اسی دنیاوی طریق احتساب و سزا کی مختلف صورتیں نظر آئیں گی۔

پھر اگر رسول اللہ لوگوں کی اس عام ذہنیت کا خیال نہ کر کے عذاب و ثواب یا لذت و الم کا وہ فلسفہ پیش کرتے جس کا تعلق روحانی زندگی سے ہے تو یقیناً" کوئی نتیجہ مترتب نہ ہوتا۔

یہی حال قصص و روایات کا ہے کہ قرآن قطعاً" اس سے بحث نہیں کرتا کہ وہ صحیح ہیں یا غلط بلکہ انھیں محض اعتبار و بصیرت کے لیے پیش کرتا ہے تاکہ لوگ انھیں سنیں اور عبرت حاصل کریں۔

احادیث

اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ نے اپنے دوران رسالت میں لوگوں سے خدا جانے کتنی باتیں کہی ہوں گی لیکن چونکہ قرآن کی طرح آپ کے اقوال کو محفوظ رکھنے کا طریقہ رائج نہ تھا اس لیے آج ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے کس سے کب کیا فرمایا اور اگر کوئی آپ کے کسی قول کی کوئی نقل بھی کرے تو یہ اعتبار کیونکر آسکتا ہے جو بات بیسوں آدمیوں کی وساطت سے نقل در نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہے وہ واقعی وہی ہے جو رسول اللہ نے فرمائی تھی۔

احادیث کے نقل و جمع کرنے کا رواج بہت بعد ہوا اور ہرچند جامعین احادیث نے اس باب میں بڑی چھان بین کی ہے اور اسماء الرجال کا انتقادی فن ہی اس سلسلہ میں علیحدہ قائم ہو گیا پھر بھی کتب احادیث میں خرافیات کا بڑا حصہ پایا جاتا ہے۔

رسول اللہ کی رحلت کے بعد جب حکومت اسلام کے سامنے نئے نئے مسائل آئے تو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے متعلق رسول اللہ کے اقوال و ہدایات معلوم کیے جائیں اور ایسے لوگوں کی جستجو ہوئی جن کو آپ کے ارشادات کا علم ہو پھر چونکہ اسلام کی حیثیت اب خالص مذہبی نہ رہی تھی بلکہ ان میں سیاسی مصالح اور ذاتی و جماعتی اغراض بھی شامل ہو

گئے تھے اس لیے خلفاء چاہتے تھے کہ انھیں کی خواہشوں کے مطابق احادیث میسر آئیں اور اس طرح بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانہ میں وضع احادیث کی ٹکسالیں قائم ہو گئیں اور لوگوں نے طمع و خوف کے زیر اثر لاکھوں حدیثیں اپنی طرف سے گھڑ کر رسول اللہ سے منسوب کر دیں اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ خلفاء وقت کے اغراض پورے ہو گئے لیکن اسلام کے صحیح خط و خال بالکل چھپ گئے اور لوگ اسلام کا مطالعہ بجائے قرآن کے احادیث سے کرنے لگے اور پھر انھیں حدیثوں کی بنیاد پر مذہبی کتابیں تصنیف ہونے لگیں یہاں تک کہ لغویات و مزخرفات کا ایک انبار لگ گیا اور اسی انبار کو سامنے رکھ کر اسلام پر اعتراضات ہونے لگے۔

تسڈل کے اعتراضات

جن حضرات نے میرے نوٹ اور استدراکات کو ملاحظہ فرمایا ہے ان سے یہ امر پوشیدہ نہ ہو گا کہ عبادات معاملات و اخلاقیات کے متعلق تسڈل نے جو اعتراضات کیے ہیں ان کا جواب میں اسی وقت دے چکا ہوں اور اب ان سے اعتناء کرنے کی ضرورت نہیں البتہ اسرائیلیات و معتقدات کے متعلق جو کچھ اس نے کہا ہے اس پر تسڈل کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ علمی و عقلی حیثیت سے غور کرنا ضروری ہے تاکہ اسلام کی منقح صورت سامنے آئے۔

تسڈل کو خاموش کرنا تو بہت آسان بات ہے کیونکہ انجیل و توریت کے محرف ہونے سے تو خود عیسائیوں کو بھی انکار نہیں اور ان کو تو صرف یہ کہہ کر خاموش کیا جا سکتا ہے کہ تحریف شدہ کتابوں کو سامنے رکھ کر قرآن کے بیانات پر نکتہ چینی کرنا جن کے غیر محرف ہونے کا ساری دنیا کو اعتراف ہے کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن اس سلسلہ میں قطع نظر اس سے کہ تسڈل یا کوئی اور کیا کہتا ہے خود قرآن کے بیانات خواہ وہ کہیں سے ماخوذ ہوں یا نہ ہوں عقلی نقطہ نظر سے ضرور زیر بحث آجاتے ہیں اور انھیں پر ہم کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں قرآن کے قصص و روایات یقیناً قدیم اسرائیلیات سے لئے گئے ہیں لیکن تاریخی حیثیت سے نہیں بلکہ لوگوں میں کیفیت اعتبار و بصیرت پیدا کرنے کے لیے اور اس لیے ان کے ماخوذ ہونے یا نقل کیے جانے یا خلاف عقل ہونے کا سوال ہی سامنے نہیں آتا۔

یہی حال معتقدات کا ہے کہ وہ بھی دراصل سب تمثیلی حیثیت سے بیان کیے گئے ہیں

اور اس باب میں اسلام کا امتیاز یہی ہے کہ اس نے سب سے پہلے ادیان سابقہ کے ان معتقدات کی حقیقت کو ظاہر کیا۔

لیکن اگر علماء اسلام کے نزدیک قرآن کے قصص و حکایات واقعی تاریخی حقیقت رکھتے ہیں اور معتقدات کا تعلق مادیات سے ہے تو اس کے ثبوت کی ذمہ داری انھیں پر عائد ہوتی ہے۔

روحانی تاثرات

اس سلسلہ میں مجھے ایک بات اور عرض کرنا ہے وہ یہ کہ بہ سلسلہ معتقدات میں عذاب ثواب وغیرہ کو روحانی یا احساسی چیز سمجھتا ہوں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ بقاء روح اور حیات بعدالموت کا اسی معنی میں قائل ہوں جس معنی میں عام طور پر لوگ اسے سمجھتے ہیں۔

روح و روحانیت کا تعلق بھی میرے نزدیک اسی دنیا سے ہے جو انسان کے اعمال کے لحاظ سے دوزخ بھی بن جاتی ہے اور جنت بھی جہاں ہمارے اعمال آئندہ نسلوں کے لیے اچھا یا برا نقش چھوڑ کر ہم کو مرنے کے بعد نہیں مرنے دیتے۔

○ ○ ○

سامی مذاہب کی روایات
(علمی و تاریخی نقطہ نظر سے)

تخلیق انسان

کتاب پیدائش کے باب میں 1 آیتہ 27 میں لکھا ہے کہ خدا نے چھٹے روز انسان کے نر و مادہ دونوں کو اپنی صورت پر پیدا کیا اس کے بعد آیت 22 میں الہام درج ہے کہ خداوند اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا اور پھر اس کتاب کے باب 3 آیتہ 7 میں تحریر ہے کہ خدا نے زمین کی مٹی سے آدم کو پیدا کیا آدم کا مٹی سے پیدا ہونے کا خیال تمام سامی مذاہب موسوی عیسوی اور اسلام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مٹی کیا چیزیں بنانے کا فن عہد قدیم میں بہت ترقی کر گیا تھا اول اول وہ لوگ صرف ایسی چیزیں مٹی سے بناتے تھے جن کی ضرورت ہوتی پر انسانوں اور بعد ازاں دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیں مٹی سے بنانے لگے۔

پروفیسر کلیفورڈ ایچ فار لکھتے ہیں کہ جب ان قدیم زمانہ کے کاریگروں کا خیال زیادہ ترقی یافتہ ہو گیا تو ان کی قوت شعور نے ان میں یہ عقیدہ پیدا کیا کہ خود انسان کو بھی کسی اعلیٰ ہستی نے ازل میں مٹی ہی سے بنایا تھا۔

چنانچہ اہل بابل اپنے صنم کبیر کو .حل یا .حل کہا کرتے تھے جس کے معنی ہیں کمہار اور اہل مصر بھی اپنے بڑے دیوتا کو خنومنو کہا کرتے تھے۔ اس مصری لفظ کے معنی بھی کمہار کے ہیں عبرانیوں میں انسان کو آدم کہتے ہیں ان کے یہاں لاحقہ تانیث ہے آدمتہ کے معنی ان کے ہاں مٹی کے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ خود عبرانی زبان ہی اس عقیدہ کے پیدا کرنے کا باعث ہوئی کہ انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے۔

پروفیسر فار کے بیان سے معلوم ہوا کہ عبرانی زبان میں جو قصہ آفرینش آدم کا پایا جاتا ہے خود عبرانیوں کی جودت طبع کا نتیجہ ہے حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ یہ خیال بہت پہلے قائم ہو چکا تھا۔

آفرنیش و ہبوط آدم

توریت میں آفرنیش عالم کے متعلق جو بیان دیا گیا ہے اس میں اس قدر تناقض و اختلاف پایا جاتا ہے کہ ایک شخص اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ہرگز کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔

آفرنیش آدم سے لے کر واقعہ ہبوط تک کی تمام وہ تفصیلات لیجئے جو توریت میں پائی جاتی ہیں اور جن سے تقریباً ہر شخص واقف ہے یہ ہیں خدا کا چھ دن میں کائنات کی مختلف مخلوقات کو پیدا کرنا ساتویں دن آرام کرنا آدم و حوا کی پیدائش باغ عدن میں ان کا قیام شجر ممنوع کے پاس نہ جانے کا حکم سانپ کا اغوا اور پھر آدم کا اس درخت کے پاس جا کر پھل کھانا وغیرہ وغیرہ۔

توریت کو الہامی کتاب ماننے والے کہتے ہیں کہ یہ تمام واقعات ذریعہ وحی خدا کی طرف سے بتائے گئے یعنی دوسرے الفاظ میں مدعا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ سے قبل کسی کو ان حقیقتوں کا علم نہ تھا حالانکہ جس وقت ہم آثار قدیمہ اور باقیات عہد عتیق کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب کے سب یا اکثر اعتقادات وہ ہیں جو حضرت موسیٰ سے بہت قبل دنیا میں پائے جاتے تھے کیونکہ جب آشوریوں نے فلسطین کو فتح کیا اور غیر ملکی لوگ وہاں آباد ہوئے تو اپنے ساتھ وہ تمام افسانے بھی لائے جو ان کے یہاں رائج تھے۔ چنانچہ فسانہ عدن ہی کو لیجئے جو مصر جنوبی هندوستان چین ایران فنیقیہ اور قدیم میکسیکو تک میں پایا جاتا ہے۔

فرینکلن نے اپنی کتاب بدھ مت والے اور جینی میں لکھا ہے کہ ہمارے اولین والدین آدم و حوا کے ہبوط کے واقعہ کی ایک نہایت دلچسپ تصویر پتھر پر رکھی ہوئی ملک نوبہ میں مقام السپامبول کے ایک شاندار مندر میں سیاح ولسن نے دیکھی تھی۔ سیاح موصوف بیان کرتے ہیں کہ اس غار میں آدم و حوا کی تصویر ٹھیک اسی زندگی کی ہے جو باغ عدن میں بتائی جاتی ہے اس میں سانپ کو درخت کے گرد لپیٹا ہوا نہایت خصوصیت کے ساتھ دکھلایا ہے۔ ایسی ہی ایک تصویر کرنل کو مبس بھی لائے تھے یہ تصویر جنوبی ہندوستان کے ایک مندر میں ایک سنگین ستون پر کندہ تھی اس تصویر میں دکھلایا گیا ہے کہ آدم و حوا بہشتی درخت کے نیچے کھڑے ہیں اور درخت کی گنجان شاخوں میں لپٹا ہوا ایک سانپ چھپا ہے جو

اپنے منہ میں اس درخت کا پھل لیے ہوئے ہے اور آدم و حوا کو کھانے کی ترغیب دے رہا ہے۔

مجوسیوں میں جو باغ عدن کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس میں یہ لکھا ہے کہ ایرانیوں کے خدائے خیر ہوار مزدا نے زمین اور انسان کو پیدا کیا اور اس کے لیے آرام و راحت کے جملہ سامان بہم پہنچائے یعنی جس طرح بائبل کی کتاب پیدائش کے مطابق ایلوہیم نے تکوین عالم کے کام کو چھ دن میں ختم کیا تھا اسی طرح ہورا مزدہ نے تکوین کے کام کو چھ اوقات میں درجہ تکمیل تک پہنچایا اور مرد عورت کو اس نے بھی چھٹے روز پیدا کیا مرد کا نام اس نے آدم اور عورت کا نام ایوہ (EVAH) رکھا تھا ساتویں دن ہورا مزدہ نے آرام کیا یہ دن سینچر یعنی زحل کا تھا قدیم ملک اتروریہ (اطالیہ) کی روایت آفرینش بھی قریب قریب مجوسیوں کی روایت سے ملتی جلتی ہے ڈاکٹر طامس انمان لکھتے ہیں کہ ایرانیوں کے ساتھ میل جول ہونے سے پیشتر عبرانیوں کے یہاں ہفتہ کا دن یوم السبت نہیں مانا جاتا تھا دوسری قومیں اس دن کو اپنا مقدس دن خیال کرتی تھیں چنانچہ انھیں دیگر اقوام و ملل کے لوگوں سے لے کر عبرانیوں نے بھی یہ رسم اختیار کی۔

مجوسیوں کی روایت میں ہے کہ اہرمن نے ہورا مزدا کے خلاف بغاوت کی اور وہ دنیا کی تمام برائیوں کا بانی خدائے شر بن گیا بائبل میں اسی کا نام شیطان رکھا ہے۔ ایک خاص قسم کا پھل کھا کر اہرمن نے اپنی ہیئت سانپ کی سی بنالی اور زمین پر لوگوں کو بہکانے لگا وہ لوگوں کو عیش پرستی انتقام ظلم و ستم اور دروغ گوئی اور افترا پردازی وغیرہ کی ترغیب دیتا تھا سب سے پہلے مرد عورت کو ایک عجیب و غریب درخت ہوم (یہی سنسکرت میں سوم ہے) کا پھل کھلا کر اس نے ان کے دلوں میں برے خیالات پیدا کر دیئے جس کے باعث وہ گرا دیئے گئے اس کے بعد انھوں نے جانوروں کو مارا اور ان کی کھالوں سے تن پوشی کی ہورا مزدا اور اہرمن کی اس جنگ کی وجہ سے اب دنیا کے ہر حصہ میں خیر و شر پائے جاتے ہیں مگر مجوسیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جبکہ پرستاران ہورا مزدا کو فتح حاصل ہو گی اہرمن مغلوب ہو گا اس وقت امن و صلح اخوت و مسرت دنیا میں قائم ہو جائے گی الل میدیا (MEDIA) اور ایرانیوں میں تقریباً 700 ء ق م ایک نبی بنام زروشت (زرتشت) مبعوث ہوا جس نے ایرانیوں کے قدیم مذہب کی اصلاح کی اس کے زمانہ کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ عہد سائرس (CVRUSO) سے لے کر جو 550 برس قبل مسیح گزرا ہے

اسکندر اعظم کے ہاتھوں ایران فتح ہونے تک تمام مغربی ایشیا میں دین زروشت ہی کا غلبہ تھا تکوین عالم کے متعلق مجوسیوں کے یہاں جو کچھ روایات ہیں ان کا علم ہم کو خاص طور پر پارسیوں کی کتاب زندواوستا سے حاصل ہوتا ہے ڈاکٹر فان بولین لکھتے ہیں کہ بائبل کی کتاب پیدائش کے قصوں اور ژند کے بیان میں نہایت ہی گہرا تعلق اور مطابقت پائی جاتی ہے۔

مسٹر جارج اسمتھ نے (جن کا تعلق برٹش میوزیم کے شعبہ مشرقیہ سے ہے) ایسی آشوری الواح گلی کھود نکالی ہیں جو 1500 سے لے کر دوہزار سال قبل مسیح تک کی ہیں یعنی حضرت موسیٰ کی پیدائش سے بھی صدیوں قبل کی۔ ان الواح گل پر آفرینش عالم ہبوط آدم برج بابل انتشار اقوام دطل اور طوفان نوح کا حال بالکل ایسا ہی لکھا ہے جیسا کہ بائبل کی کتاب پیدائش میں بیان کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ خط مخی کے یہ کتبے مکمل نہیں ہیں یعنی ان قصص کا کچھ اہم حصہ ضائع ہوگیا اور جس حصہ میں درخت سانپ اور طوفان نوح کے حالات درج ہیں اس کا کچھ حصہ ضائع ہوگیا ہے مگر سرزمین بابل سے بعض ایسے جواہرات دستیاب ہوئے ہیں جن پر باغ عدن کے واقعات کی تصویریں کندہ ہیں اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام باتیں ان کی روایات میں شامل تھیں۔

بائبل کی کتاب پیدائش میں جس شجرۃ الحیوۃ کا ذکر کیا ہے وہ بالکل ویسا ہی جیسا کہ خداوندانو (ANU) کا مقدس باغیچہ تھا جس کی نگہبانی تلوار کے ذریعہ سے ہوتی تھی جو چاروں طرف گھومتی تھی اس مقدس درخت کی تصویر مع محافظ فرشتوں کے مسٹراسمتھ نے ایک آشوری اسطوانہ سے نقل کر کے اپنی کتاب کے صفحہ 81 پر دی ہے اور اسی صفحہ پر ایک دوسری تصویر بھی ہے جس میں دو آدمی درخت کے ادھر ادھر بیٹھے ہوئے ہیں اور پھل توڑنے کے لیے ہاتھ پھیلا رہے ہیں ان آدمیوں میں جو عورت ہے اس کے پشت پر سانپ کی تصویر کھنچی ہوئی ہے اصل تصویر برٹش میوزیم میں دیکھی جا سکتی ہے مسٹراسمتھ لکھتے ہیں کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ان قدیم کتبوں میں اس قسم کی تصویریں خیالی یا اتفاقی نہیں ہو سکتیں بلکہ وہ واقعات گذشتہ یا مفروضہ واقعات کے مناظر ہیں اور یہ واقعات ان کی قدیم روایات سے تعلق رکھتے ہیں اور اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہبوط آدم کا جو قصہ بائبل کی کتاب پیدائش میں دیا گیا ہے وہی قصہ قدیم زمانے کے اہل بابل میں بھی رائج تھا۔

جو آشوری کتبے مسٹراسمتھ نے برآمد کیے ہیں اگرچہ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو

آشوربنی پال (688 لغایت 626 ق م) کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ الواح گلی جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اصلی نہیں ہیں بلکہ قدیم الواح کی نقلیں ہیں جو اور بھی زیادہ پرانی ہوں گی اہل آشور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ لٹریچر ان کے یہاں بابلی ذرائع سے آیا تھا اور خط میخی کی ان تختیوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ 2500 اور 1500 ق م کے درمیانی زمانہ میں اہل بابل بھی انھیں عقائد کے ماننے والے تھے جو بائبل کی کتاب پیدائش میں بیان کیے گئے ہیں۔

مسٹرپیرپانٹ مارگین کے پاس قدیم کتبے یا نقوش کے ٹکڑے ایسے موجود ہیں جن میں طوفان نوح کا حال درج ہے اور یہ انیس سو برس قبل مسیح کے ہیں مگر ان کے ٹکڑوں کی نسبت بھی یہ خیال ہے کہ وہ اصلی نہیں ہیں بلکہ اور زیادہ قدیم کتبوں کی نقلیں ہیں۔

1543ء کا واقعہ ہے کہ ایک فرانسیسی ماہر آثار قدیمہ موسیو ا-یمیل بوٹے نے نینوا کے قریب ایک ترکی گاؤں خورس آباد میں کھدائی شروع کی یہاں مزدور کھودتے کھودتے ایک آشوری محل کے کھنڈر تک پہنچ گئے جو کسی زمانے میں شاہ سارگون دوم (722 لغایت 75 ق م) کا قصر شاہی تھا۔ اس واقعہ کے بعد ایک جوشیلے نوجوان انگریز سی آسٹن ایچ لیارڈے نے مردو کے بڑے ٹیلے کے نیچے قدیم شہر قلاہ کھود نکالا۔ اس کے بعد اس نے قصر شاہی برآمد کیا جو نینوا میں ساحریب (705 لغایت 681 ق م) نے تعمیر کیا تھا اور ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ سنگ موسیٰ کی چند لوحیں برآمد ہوئی تھیں جو اس وقت ییل یونیورسٹی کے میوزیم میں موجود ہیں ان کی سطح پر ایک پیغام ایسے رسم الخط میں تحریر ہے جو مسیح سے غالباً 6 ہزار سال پیشتر رائج تھا۔

1924ء میں خرابہ شہر کش عراق کے ایک قدیم سلطنت کے پایہ تخت میں کچھ اینٹیں دستیاب ہوئی تھیں اور ایک بہت بلند برج کے کھنڈر دریافت ہوئے تھے جس کی تعمیر جیسا کہ اینٹوں سے ظاہر ہوتا ہے زائداز چار ہزار سال قبل ہوئی تھی۔ توقع کی جاتی ہے جب اس تعمیر کے تمام حصوں کو صاف کیا جائے گا تو سات ہزار برس قبل مسیح کے زمانے کی لکھی ہوئی تاریخ برآمد ہوگی یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ برج غالباً وہی ہے جو قدیم روایات میں برج بابل کے نام سے پکارا گیا ہے اور اس کا تعلق طوفان نوح سے بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ شمس ایلو کے زمانہ کی بھی کچھ اینٹیں برآمد ہوئی ہیں جو بابل کے اول شاہی خاندان کا ساتواں بادشاہ تھا اس کا زمانہ 2080 لغایت 2043 ق م ہے اینٹوں کی تحریر کا ترجمہ بھی کرلیا گیا ہے اس کے علاوہ اسی خاندان شاہی کے دوسرے بادشاہ شمس اللایلو (2211 لغایت 2176 ق م) کی

سلطنت کے زمانہ کی بھی منقوش اینٹیں برآمد ہوئی ہیں اور ایک قدیم مندر بھی برآمد ہوا ہے جو شمس الالیو نے جنگ کے دیوتا ایل بابا کے نام پر بنایا تھا۔ ماہرین فن کا خیال ہے کہ اب کھودتے کھودتے مزدور مٹی کی اس تہہ تک پہنچ گئے ہیں جہاں قدیم ترین بابلی تمدن کی باقیات برآمد ہوں گے اور توقع کی جاتی ہے کہ بہت جلد ایسے آثار دستیاب ہوں گے جس سے عراق کی قدیم ترین تاریخ پر روشنی پڑے گی۔

بہت عرصہ ہوا پروفیسر اگناز گولڈزھیر نے اس امر کے نہایت قوی ثبوت پیش کیے تھے کہ عبرانیوں نے آفرینش عالم کے حالات قدیم اہل بابل سے لیے تھے پروفیسر موصوف نے یہ رائے ظاہر کی تھی کی بورے (BORE) اور یوسر (YOSER) یعنی خالق کی صفات کا خیال سب سے پہلے ان عبرانیوں نے ظاہر کیا تھا جو اسیر ہو کر بابل گئے تھے یا جو وہاں بحالت اسیری پیدا ہوئے تھے اسی طرح باغ عدن کا قصہ جو تاریخ آفرینش کا ضمیمہ ہے خاص بابل میں لکھا گیا تھا۔ یہی باعث ہے کہ توریت کی کسی دوسری کتاب یا عہد نامہ عتیق کے کسی دوسرے صحیفہ میں کتاب پیدائش کے قصہ کا ذکر کہیں نہیں ہے مسٹر لنکان لکھتے ہیں کہ عبرانیوں کی قدیم کتب مقدسہ میں ہبوط آدم کے قصہ کا مطلقاً" کہیں ذکر نہیں آیا آدم حوا سانپ عورت کا اپنے شوہر کو ورغلانا وغیرہ یہ سب وہ باتیں ہیں جن کا اسرائیلی کتب میں کہیں بھی ذکر نہیں پروفیسر جان فسکے تحریر کرتے ہیں کہ باغ عدن میں سانپ کا قصہ معہ تمام اپنی تفصیلات کے آریہ قوم سے لیا گیا ہے شیطان کے خالق شر ہونے کا خیال صرف بعد کی لکھی ہوئی کتابوں میں آتا ہے اور یہ کتابیں اس وقت تصنیف ہوئی تھیں جبکہ یہودیوں میں ایرانی خیالات بکثرت رائج ہو گئے تھے۔

باغ عدن اور آدم

اس باب میں اسفار موسیٰ کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ خدا نے آدم و حوا کا جوڑا پیدا کر کے کہا کہ ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاؤ نسل بڑھاؤ زمین کو رونق دو اور اس پر حکومت کرو دوسرے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے صرف آدم کو پیدا کیا اور باغ عدن میں لے متمکن کر کے حکم دیا کہ اس کی حفاظت اور آراتگی کر۔

اول بیان کے مطابق اس کو وہ تمام پودے دے دیئے گئے جو زمین پر پائے جاتے ہیں اور ان کے پھل کھانے کی اجازت دے دی گئی دوسرے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان

درختوں میں سے ایک درخت مستثنیٰ کر دیا گیا جو علم کا درخت تھا کیونکہ یہ بہت زہریلا تھا۔

اگر کہا جائے کہ درخت علم صرف کنایہ ہے کسی اور حقیقت کی طرف تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ خصوصیت کیا ہے اور اس اشارہ کنایہ کے استعمال کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن اگر اس درخت کو واقعی درخت سمجھا جائے تو قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے اس درخت کو پیدا ہی کیوں کیا اگر اسے پیدا کرنا تھا تو عدن سے باہر خدا کی خدائی پڑی ہوئی تھی کہیں اور پیدا کیا جاتا اور اگر پیدا کر کے اسے ممنوع قرار دینا تھا تو آدم کو اس سے علیحدہ رکھا ہوتا ان تمام سوالات کا جواب اسفار موسیٰ میں صرف اس قدرت ملتا ہے کہ۔

"خدا نے کہا دیکھو' انسان اس درخت کا پھل کھا کر نیک و بد سے واقف ہو گیا اور ہم جیسا بن گیا پس ہو سکتا ہے کہ اب وہ شجر حیات کا پھل کھا کر غیر فانی بھی ہو جائے اس لیے اس کو عدن سے نکال دینا چاہیے چنانچہ وہ وہاں سے علیحدہ کر کے زمین پر پھینک دیا گیا تاکہ جوتے اور بوئے۔"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا یہ نہیں چاہتا تھا کہ انسان شجر علم کا پھل کھا کر نیک و بد سے واقف ہو جائے گویا وہ انسان کو ہمیشہ جاہل کندہ ناتراش اور بے وقوف رکھنا چاہتا تھا۔

اسفار خمسہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو شجر حیات کی حفاظت کا بہت زیادہ خیال تھا چنانچہ آدم کے نکالے جانے کے بعد بھی اس قدر احتیاط سے کام لیا گیا کہ اس کے چاروں طرف فرشتے مامور کر دیے گئے جو شعلہ فشاں تلواریں لیے ہوئے اس کی نگرانی کرتے تھے۔

مفسرین میں باغ عدن کی جائے وقوع کے متعلق بہت اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ تیسرے آسمان میں تھا بعض چوتھا آسمان بتاتے ہیں کوئی چاند میں اس کا واقعہ ہونا ظاہر کرتا ہے اور کوئی خلا میں (کشش زمین کی حدود سے بلند) بعض اس کا موقعہ زمین ہی بتاتے ہیں اور بعض زیر زمین کوئی قطب شمالی میں اس کا سراغ پاتا ہے کوئی قطب جنوبی میں اسی طرح یہ اختلاف روایات چین تاتار' لنکا' آرمینا' افریقہ' عراق' شام' ایران' عرب' بابل' ایشیا' فلسطین اور یورپ وغیرہ میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

انسان کے عدن سے نکالے جانے کے سلسلہ میں سانپ کا ذکر بھی اسفار خمسہ میں پایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ سانپ نے حوا کو ترغیب دلائی تھی کہ وہ شجر ممنوع کا پھل کھائیں

اور حوا نے اپنے شوہر کو بھی آمادہ کیا اس پر خدا نے سانپ کو تو یہ سزا دی کہ اسے رینگنے والا جانور بنا دیا اور آدم و حوا کو زمین پر اٹھا کر پھینک دیا۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو اس وقت سانپ کہا جاتا ہے وہ عدن کے اندر کسی اور صورت و ہیئت کا تھا چنانچہ ڈاکٹر آدم کلارک کہتے ہیں کہ سانپ پہلے آدمیوں ہی کی طرح چلتا تھا۔ باتیں کرتا تھا عقل و فہم بھی رکھتا تھا گویا جس جانور کی مدد سے شیطان نے آدم و حوا کو بہکایا وہ سانپ نہ تھا جسے ہم اس وقت دیکھتے ہیں بلکہ بندر کی قسم کا کوئی حیوان تھا۔

ڈاکٹر ہنری کہتے ہیں کہ سانپ سے مراد شیطان ہے جو کسی وقت نہایت معزز فرشتہ تھا اور اپنی نافرمانی کی وجہ سے مردود قرار دے دیا گیا تھا اسی نے حوا کو دھوکہ دے کر وہ پھل کھلایا اور ان کے نکالے جانے کا باعث ہوا سانپ کی شکل اختیار کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ جانور اپنی صورت و ہیئت کے لحاظ سے عورتوں کے لیے بہت زیادہ جاذب توجہ ہے پھر ہو سکتا ہے کہ اس نے اڑنے والے سانپ کی صورت اختیار کی ہو۔ ذرا اوپر فضا ہے اس کی آواز سن کر حوا نے اسے اشارہ خداوندی سمجھا ہو۔

اب یہاں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ سانپ کہاں سے آیا ایام تخلیق کے چھ دنوں میں کس دن اور کس نے اس کو پیدا کیا اگر خدا نے پیدا کیا تو کیا اس کے علم میں یہ بات نہ تھی کہ وہ آدم و حوا کو بہکائے گا اور نوع انسانی معصیت میں مبتلا ہو جائے گی۔

وہ انسان نہیں تھا چوپایہ نہیں تھا طائر نہیں تھا مچھلی نہیں تھا اور نہ رینگنے والا جانور کیونکہ پیٹ کے بل چلنے کا عذاب تو اس پر بعد کو مسلط کیا گیا ہے پھر وہ کیا تھا اس کی کیا غذا تھی اس کے پیدا کئے جانے کا کیا سبب تھا آدم کو دھوکہ دینے کی تحریک اس میں کیوں پیدا ہوئی یہ اور اسی قسم کے بہت سے سوالات اس ضمن میں پیدا ہو سکتے ہیں جن کا جواب نہ اسفار میں کہیں ملتا ہے اور نہ دوسری مذہبی کتابوں میں۔

اگر کہا جائے کہ شیطان ہی کو سانپ سے تعبیر کیا گیا ہے تو بھی اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ باوجود اس علم کے کہ وہ انسان کا دشمن ہے کیوں اسے عدن کے اندر داخل ہونے اور حوا کو بہکانے کی اجازت دی گئی اگر خدا کا منشاء یہی تھا کہ وہ انسان کو جنت میں پیدا کرے اور پھر معصیت بھری دنیا میں اٹھا کر پھینک دے تو تخلیق ہی کی کیا ضرورت تھی اگر مدعا یہی تھا تو کیا اس کی بہتر صورت یہی ہو سکتی تھی کہ اسے پہلے شجر علم سے دور رہنے کا

حکم دیا جائے اور پھر جب وہ اس تک پہنچ جائے تو صرف اس بناء پر کہ کیوں اس نے علم و شعور حاصل کرنے کی کوشش کی کہ نکال باہر کیا جائے۔

اسی سلسلہ میں اسفار خمسہ کا ایک اور بیان قابل ملاحظہ ہے لکھا ہے کہ جب آدم و حوا جنت سے نکالے جانے لگے تو خدا نے ایک چرمی قمیض ان کو مرحمت فرمائی یہ سن کر قدرتاً یہ سوال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ چمڑا کہاں سے آیا کیا خدا نے کسی جانور کو ہلاک کر کے اس کی کھال کھینچی تھی؟ چمڑے کی دباغت کس نے کی اور قمیص کیونکر تیار ہوئی؟

پھر ایک بات اور یہ ہے کہ ان کو لباس کی ضرورت ہی کیا تھی کیا وہ اپنی عریاں حالت پر جنت میں مطمئن نہ تھے اور اگر یہ لباس اس خیال سے دیا گیا تھا کہ زمین کی موسمی حالت سے متاثر نہ ہوں تو بھی بے کار تھا کیونکہ زمین کا موسم بدلتا رہتا ہے۔

طوفان نوح

اسفار خمسہ میں طوفان نوح کی نوعیت اور اس کے اسباب پر جو روشنی ڈالی گئی ہے وہ اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے اس میں لکھا ہے کہ جب آدم و حوا جنت سے نکالے جانے کے بعد زمین پر آکر بسے تو ان کی نسل بڑھی لیکن یہ نسل نہایت بداعمال تھی اس لیے خدا پچھتایا کہ میں نے کیوں انسان کو پیدا کیا اور آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ انسانوں اور جانوروں سب کو تباہ کر دے۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عدن سے آدم و حوا کا اخراج نوع انسانی کے لیے مفید ثابت نہیں ہوا بلکہ اور زیادہ مضرت رساں نکلا کیونکہ اس کی اخلاقی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی لیکن سوال یہ ہے کہ اس خرابی کا ذمہ دار انسان کیونکر ہو سکتا تھا جبکہ اس وقت تک اصلاح نوع انسانی کے لیے نہ خدا نے کسی نبی کو بھیجا نہ کوئی صحیفہ الہامی نازل کیا اور نہ کوئی دوسری صورت اس کے اخلاق درست کرنے کی اختیار کی گئی۔

یقیناً" خدا جانتا تھا کہ انسان روز بروز گنہگار ہوتا جائے گا اور سوائے نوح و خاندان نوح کے وہ سب کو غرق آب کر دے گا۔ پر کیا یہ مناسب نہ تھا کہ وہ بجائے آدم و حوا کے جنھوں نے نافرمانی کی تھی پہلے نوح ہی کو پیدا کرتا جو اولاد آدم میں سب سے پہلے مطیع و فرمانبردار بندے خدا کے تھے۔

دوسری عجیب و غریب بات یہ ہے کہ خدا نے انسانوں کے ساتھ جانوروں کو بھی تباہ

کرنے کا ارادہ کیوں کیا غلطی تو انسان کی تھی نہ کہ جانوروں کی۔ پھر انھیں کس قصور میں مبتلائے عذاب کیا گیا شجر ممنوع کا پھل کھائیں آدم و حوا گناہ میں مبتلا ہو ان کی نسل اور غصہ اتارا جائے جانوروں پر یہ کیسا انصاف تھا؟

طوفان لانے سے قبل خدا نے نوح کو حکم دیا کہ وہ ایک کشتی تیار کریں 300 ہاتھ (550 فٹ لمبی) 50 ہاتھ (91 فٹ 8 انچ چوڑی) اور 30 ہاتھ (55 فٹ اونچی۔)

اس کشتی کے تین درجے تھے اور چوٹی پر ایک کھڑکی 22 مربع انچ تیار کی گئی تھی ایک دروازہ بھی اس میں تھا جو باہر سے بند ہوتا تھا جب کشتی تیار ہو گئی اور سامان خورد و نوش اس میں رکھ دیا گیا تو خدا نے سات دن کی مہلت دی کہ وہ جانوروں کو اس کے اندر جمع کر لیں۔

بعض تاویل کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ طوفان زمین کے ایک حصے کے لیے مخصوص تھا اس لئے بہت زیادہ جانور اس میں جمع نہیں کیے گئے لیکن اسفار کی عبارت اس تاویل کی اجازت نہیں دیتی کیونکہ خدا نے ہر شخص کو تباہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا آسمان و زمین کے درمیان جتنی مخلوق تھی سب کو غرق آب کرنا چاہا تھا علاوہ اس کے اسفار کے صاف الفاظ یہ ہیں کہ ہم نے نوح کو حکم دیا کہ ہر جاندار کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لیں دوسری جگہ یہ تحریر ہے کہ تمام پاک جانوروں میں سے سات سات جانور نر و مادہ اور ناپاک جانوروں میں سے دو دو نر و مادہ طیور میں سے بھی سات سات نر و مادہ لے لیے جائیں۔

اب غور کرنا چاہیے کہ نوح نے کتنے وحوش و طیور جمع کیے؟ اس وقت تک پرندوں کی قسمیں کم ازکم 12500 دریافت ہوئی ہیں اور چین جنوبی امریکہ اور افریقہ کے تمام طیور کی ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکی۔ اس لیے حسب بیان توریت کم ازکم 17500 پرندے حضرت نوح نے فراہم کیے ہوں گے اسی طرح کم ازکم 658 قسمیں چوپایوں کی دریافت ہوئی ہیں اور 650 رینگنے ایسے جانوروں کی کیڑے مکوڑوں کی قسمیں تقریباً دس لاکھ ہیں۔ اس لیے کم ازکم 20 لاکھ جانور نوح نے اپنی کشتی میں جمع کیے ہوں گے اس لیے اب بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہو ہو گا ظاہر ہے کہ جب طوفان نے تمام پہاڑوں کو ڈبو دیا ہو گا اور سارا کرہ ارض کرہ آب ہو کر رہ گیا ہو گا تو تمام سمندروں اور دریاؤں کا پانی ایک ہو گیا ہو گا اور یہ پانی اتنا شور و نمکین ہو گا کہ اس سے پیاس کا بجھنا ناممکن رہا ہو گا۔ پس ظاہر ہے کہ حضرت نوح نے ان سب کے لیے شیریں پانی بھی اپنی کشتی میں رکھا ہو گا ہر

ایک قسم کے جانوروں کو مخصوص غذا فراہم کی ہو گی اس سے اندازہ کیجئے کہ 30 ایام کے لیے جو طوفان نوح کے قیام کا زمانہ بتایا جاتا ہے 20 لاکھ جانوروں کے لئے پانی اور چارہ کتنا درکا ہوا ہو گا۔

بتایا جاتا ہے کہ کشتی میں صرف آٹھ آدمی تھے تو کیا 105000 چڑیوں 3616 چوپایوں 1300 رینگنے والے جانوروں اور 20 لاکھ کیڑے مکوڑوں کی دیکھ بھال صرف آٹھ آدمیوں کے سپرد تھی۔

سال بھر میں ایک جانور تو جتنی غذا کھاتا ہے وہ اس کے وزن کی دو چند ہو جاتی ہے یعنی ایک جوڑے ہاتھی کے لیے 150 ٹن چارہ ضروری ہے میمنہ کے لیے اس سے دو چند ہونا چاہیے اسی طرح اور بہت سے جانور نوح کی کشتی میں ایسے رہے ہوں گے جو سال بھر کے اندر جنگل کے جنگل صاف کر جاتے پھر کیا ممکن ہے کہ 50 فٹ لانبی اور 91 فٹ چوڑی کشتی میں اتنے طیور وحوش سا گئے ہوں گے اور عقل اسے باور کر سکتی ہے کہ ان سب کی غذا بھی پورے ایک سال کے لیے کشتی کے اندر ذخیرہ کر لی گئی ہو۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف آٹھ آدمیوں نے کیونکر اتنے حیوانات کا انتظام کیا ہو گا اور جو غلاظت پھیلی ہو گی اس کی صفائی کی کیا صورت اختیار کی گئی ہو گی۔

کشتی میں تمام دنیا کے جانور تھے اور چونکہ کرہ زمین کے مختلف حصوں کا درجہ حرارت مختلف ہے اس لیے ظاہر ہے کہ ہر حصہ زمین کے جانور کے لیے اسی درجہ حرارت کی ضرورت رہی ہو گی جس میں وہ زندہ رہ سکتا ہے قطب شمالی کے جانوروں کے لیے انتہائی سردی کی ضرورت ہے اور صحرائے افریقہ کے جانوروں کے لیے انتہائی گرمی کی بعض جانور معتدل موسم چاہتے ہیں اس لیے کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کشتی کے امور ایک ہی وقت میں مختلف موسم اور مختلف درجہ ہائے حرارت پیدا کرنا کیونکر ممکن ہے۔

وہ جانور جو نباتات پر زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لیے تو خیر چارہ کا ذخیرہ ممکن ہے۔ لیکن جن جانوروں کی غذا گوشت یا کیڑے مکوڑے ہیں ان کے لیے کیا انتظام ہوا ہو گا کیا علاوہ وہ ان جانوروں کے جو نوح کے مہمان تھے۔ بہت سے اور جانور ایسے بھی کشتی میں موجود تھے جو غذا کا کام دے سکیں اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مہمان جانوروں سے زیادہ غذا کے جانور فراہم کئے ہوں گے جن کی تعداد ایک سال کی مدت کے لحاظ سے اتنی بڑی ہوتی ہے کہ ہزاروں میل کی وسعت بھی ان کے لیے کافی نہیں چہ جائیکہ

معمولی کشتی۔

کہا جاتا ہے کہ متواتر 40 دن تک بارش ہوتی رہی اور بلند سے بلند پہاڑ کی چوٹی ڈوب گئی بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ پانی 29 ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ گیا تھا اس حد تک پہنچنے کے بعد پانی کا دباؤ فی مربع فٹ 800 ٹن ہونا چاہیے اور یہ دباؤ اتنا زبردست ہے کہ پانی کے اندر کوئی جاندار کوئی درخت اور پودا باقی نہیں رہ سکتا اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب طوفان ختم ہونے کے بعد تمام جانور کشتی سے باہر نکلے ہوں گے ان کو غذا کیونکر ملی ہو گی جبکہ وہاں نہ کوئی درخت باقی رہا تھا نہ گھاس نہ کوئی جاندار موجود تھا نہ کیڑا کوڑہ نباتات کے نشوونما کے لیے کم از کم 6 ماہ کی مدت درکار ہے' تو کیا اتنی مدت تک جانور بھوکے رہے ہوں گے۔

جب طوفان ختم ہو کر خشک زمین نمودار ہوئی ہو گی اور تمام جانور کشتی سے باہر نکلے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے اپنے ملکوں کی طرف روانہ ہوئے ہوں گے۔ بعض جانور قطب شمالی کی طرف گئے ہوں گے بعض جنوبی کی طرف بعض افریقہ کی جانب بعض ایشیا کی جانب اس لیے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اصلی مستقر پر پہنچنے کی مدت تک زندہ کیونکر رہے ہوں گے جبکہ ان میں سے ہر ایک ناموافق موسم کی صعوبتیں برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کشتی کوہ ارارلط پر جا کر ٹھہری تھی پس سوا اس حصہ زمین کے دوسرے جانوروں کے لیے یہاں کا موسم ناموافق رہا ہو گا جسے وہ کسی طرح برداشت نہ کر سکے ہوں گے۔

علاوہ اس کے بعض جانور ایسے ہیں جو نہایت سست رفتار ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے مستقر تک کیونکر پہنچے ہوں گے فرض کیجئے کہ ایک گھونگھا جو دن بھر میں ایک فٹ چلتا ہے اپنے مستقر تک روانہ ہوا جو بارہ ہزار میل دور ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ ایک ہزار سال میں وہاں پہنچا ہو گا۔

اسفار موسیٰ کے آٹھویں باب میں لکھا ہے کہ ساتویں مہینے کے سترھویں دن نوح کی کشتی کوہ ارارلط پر جا کر ٹھہری پہاڑ کی چوٹیاں دسویں مہینے تک نظر نہیں آئیں اس کے بعد بھی نوح نے 40 دن کا انتظار کیا اور پھر ایک کوے کو روانہ کیا کہ خشکی کا پتہ چلائے لیکن وہ واپس نہ آیا۔ اس کے بعد فاختہ کو روانہ کیا جو واپس آئی اس کے بعد پھر سات دن انتظار کیا اور فاختہ کو مکرر روانہ کر دیا اس مرتبہ وہ واپس نہ آئی اور اس سے حضرت نوح نے سمجھا کے خشکی کا حصہ نمودار ہو گیا ہے اس کے بعد وہ خشکی پر اترے قربان گاہ تیار کی قربانی

چڑھائی اور خدا اتنا خوش ہوا کہ نوح اور ان کی اولاد کو اجازت دے دی کہ دنیا میں جو چاہیں کھائیں پئیں اور وعدہ کیا کہ آئندہ پھر کبھی طوفان لا کر نوع انسانی کو ہلاک نہ کرے گا چنانچہ قوس قزح اسی وعدہ خداوندی کی یادگار ہے۔

منجملہ دیگر داستانوں کے جو حسب روایت توریت موسیٰ پر بذریعہ وحی نازل ہوئیں ایک یہ بھی تھی کہ۔

جب روئے زمین پر آدمی بہت ہو گئے اور ان سے بیٹیاں پیدا ہوئیں تو خدا کے بیٹوں نے آدمیوں کے بیٹیوں کو دیکھا کہ وہ خوبصورت ہیں اور ان میں سے جو پسند آئیں ان کو اپنی بیوی بنا لیا اس مواصلت سے جابرہ پیدا ہوئے جنھوں نے بہت فساد پھیلایا تب خداوند زمین پر انسان پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا کتاب پیدائش باب 6 آیت 1/6 اور اس نے یہ ارادہ کر کے کہ وہ انسان کو مار ڈالے گا کہا کہ۔

میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا ہے روئے زمین سے مٹا دوں گا نہ صرف انسان بلکہ حیوانوں کو بھی پرندوں کو بھی حشرات الارض کو بھی کیونکہ میں ان کے بنانے سے پچھتاتا ہوں (پیدائش باب 64 آیت 7)

بہرحال جب کتاب پیدائش کے بیان کے مطابق انسان نے دنیا کو ظلم سے بھر دیا (پیدائش باب 6 آیت 13) تو خدا نے انسانوں کو غرق کر دینے کا فیصلہ کر لیا ور نوح کو حکم دیا گیا کہ۔

تو اور تیرے بیٹے اور تیری اور تیرے بیٹوں کی بیویاں تیرے ساتھ کشتی میں جائیں گے اور سب جانوروں میں سے ہر جنس کے دو دو جوڑے اپنے ساتھ کشتی میں لے لے تاکہ وہ بچے رہیں اسی طرح پرندوں اور حشرات میں سے بھی ہر ایک دو دو جوڑے لے لے اور تو اپنے پاس کھانے کی چیزیں جمع کر تاکہ وہ تیری اور ان کی خوراک ہوں (پیدائش باب 2 آیات 12/15)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوح کو تمام مخلوقات میں سے دو دو جوڑے لینے کا حکم دیا گیا تھا اور ساری دنیا کو تباہ کرنا مقصود نہ تھا لیکن کتاب پیدائش باب ہفتم آیات میں یہی واقعہ ان الفاظ میں درج ہے کہ۔

اور خدا نے نوح سے کہا کہ تو اپنے خاندان سمیت کشتی میں آ۔ کیونکہ میں تجھی کو اپنے حضور میں اس زمانہ کے درمیان صادق دیکھا سب پاک جانوروں میں سے سات سات نر

اور مادہ اور ان میں سے جو پاک نہیں ہیں دو دو جوڑے اپنے پاس لے لے اور آسمان کے پرندوں میں سے جو پاک ہیں سات سات جوڑے لے لے تاکہ زمین پر ان کی نسل باقی رہے کیونکہ سات کے بعد میں زمین پر چالیس دن اور چالیس رات پانی برساؤں گا تمام موجودات کو جنھیں میں نے بنایا زمین پر سے مٹا دوں گا۔

یہاں ہر چیز کا جوڑا جوڑا لینے کا حکم نہیں بلکہ سات سات کا حکم ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ تمام موجودات کو تباہ کیا جائے گا۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ۔

دوسرے مہینے کی سترھویں تاریخ کو اس دن بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں اور چالیس دن اور چالیس رات تک زمین پر پانی کی جھڑی لگی رہی اسی دن نوح اور سام اور یافث نوح کے بیٹے اور نوح کی بیوی اور اس کے بیٹوں کے تینوں بیویاں کشتی میں داخل ہوئیں اور تمام جانور جوڑے جوڑے کشتی میں داخل ہوئے اور خدا نے اس نوح کو باہر سے بند کر دیا کتاب پیدائش باب 7 آیات 11/16

یہاں پھر جوڑے جوڑے نوح کے پاس آتے ہیں اس اختلاف کا بیان کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے کتاب پیدائش کے یہ قصے لکھے ہیں اس کے سامنے دو قسم کی قدیم داستانیں تھیں لیکن ان میں وہ ربط پیدا نہ کر سکا۔

کشتی بند کر دینے اور دوسرے مہینے کی سترھویں تاریخ کے بارہ میں ڈاکٹر بونویک کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال قدیم مصر کی روایات سے عبرانیوں میں آیا ہو گا کیونکہ ہر سال ماہ اییٹر کی سترھویں تاریخ کو مصر قدیم کے پوجاری اپنے بڑے دیوتا اور سیرز کے بت کو ایک مقدس کشتی میں بند کر دیا کرتے تھے اور جس زمانہ مین نوح کا کشتی میں بند ہونا بتایا جاتا ہے وہ اییٹری کا مہینہ ہوتا ہے اور وہی تاریخ پڑتی ہے لیکن ہمیں اس سے اختلاف ہے کیونکہ طوفان نوح اور برج بابل کا قصہ عبرانیوں نے بابلیوں کا یہ کلدانیوں سے لیا تھا نہ کہ مصریوں سے۔

چنانچہ مسٹر ہارنگ گولڈ پادری کا بھی خیال یہی ہے کہ۔

جب یہودیوں کو اسیر کر کے بابل لے جایا گیا وہاں انھوں نے بہت سی ایرانی اور کلدانی روائتیں سنیں اور اپنے مذہبی لٹریچر میں داخل کر لیں۔

مسٹر جارج اسمتھ نے نینوا کے کھنڈر سے جو کتبے 74-1873ء مین برآمد کئے تھے ان

سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ طوفان کا قصہ اہل بابل کو اڑھائی ہزار برس مسیح سے پیشتر معلوم تھا۔

کلدانی مورخ بیروسوس نے طوفان کا جو حال لکھا ہے وہ بھی کتاب پیدائش کے بیان کے مطابق ہے اور اس کتبہ کے بھی مطابق ہے جو مسٹر اسمتھ نے برآمد کیا ہے۔ اگر بعض جگہ دونوں بیانات کچھ مختلف ہیں لیکن یہ اختلافات اہم نہیں ہیں اور یوں بھی ظاہر ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم کی کسی روایت کو بیان کرے گی تو اس میں کچھ نہ کچھ زیب داستاں کے لئے ضرور اضافہ کرے گی۔

دونوں قصوں میں ایک متقی و پاکباز آدمی کو خداوند کی طرف سے مطلع کیا جاتا ہے کہ ایک ایسا طوفان آنے والا ہے جو تمام بنی نوع انسان کو غرق کر دے گا اور دونوں قصوں میں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ایک کشتی یا جہاز بنائیں اور اس میں جانوروں اور پرندے وغیرہ بھی معہ سامان خورد و نوش کے رکھ لیں دونوں قصوں میں لکھا ہے کہ کشتی سے ایک پرندہ تین مرتبہ باہر بھیجا جاتا ہے اور تیسری مرتبہ واپس نہیں آتا دونوں قصوں میں کشتی ایک پہاڑ پر ٹھہرتی ہے اور کشتی سے باہر نکلنے کے بعد دیوتاؤں کی قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں بیروسوس کے قصہ کا ہیروز سوطرس (XISUTWARUS) ہے جو ملک کا دسواں بادشاہ تھا اور کتاب پیدائش کے ہیرو نوح ہیں جو دسویں سردار قبیلہ تھے پھر جس طرح زیسو طروس کے تین بیٹے (1) زیروفانوس (2) ٹیٹن (3) یافتو سینتھس بتائے جاتے ہیں اسی طرح نوح کے بھی تین بیٹے تھے (1) حام (2) سام (3) یافث ان میں سے یافتو سیتھس اور یافث دونوں کی شخصیت غالباً ایک ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب پیدائش کی اس روایت کا ماخذ قدیم کلدانی یا بابلی روایات ہیں۔ ہندوں کی روایات قدیمہ میں بھی منو کی کشتی کے ذریعہ بچتے ہیں اور ان کے بھی تین صاحبزادے تھے۔ سام' کام اور پرباتی۔ ان میں سے سام کا نام تو بعینہ وہی ہے اور تیسرا نام پرباتی سے بہت ملتا جلتا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ یہ روایت قدیم مصریوں سے لی گئی ہوں لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ قدیم مصریوں میں طوفان نوح کے متعلق کوئی روایت نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی کیونکہ ٹھیک اسی وقت جبکہ بقول بائبل طوفان نوح نے تمام روئے زمین کو غرق کر دیا تھا بادشاہ فرعون خوفو اپنا ہرم اعظم تعمیر کرا رہا تھا۔ علاوہ اس کے قدیم مصریوں کی کتاب مقدس کتاب الموتی میں طوفان کا حال درج نہیں ہے۔

مسٹر جارج اسمتھ نے جو مٹی کی تختیاں زمین سے برآمد کی ہیں ان میں سے ایک لوح پر حسب ذیل روایت دربارہ طوفان کندہ ہے۔

(1) سطح زمین زیر آب ہو گئی اس نے روئے زمین کی تمام جاندار چیزوں کو ہلاک کر دیا شدید طوفان جو لوگوں پر نازل ہوا وہ آسمان تک پہنچا بھائی نے بھائی کو نہ دیکھا اور آدمیوں نے ایک دوسرے کو نہ پہچانا آسمانوں میں دیوتا طوفان سے خوف کھا رہے تھے انھوں نے پناہ کی جگہ تلاش کی اور وہ انودیوتا کے آسمان پر چڑھ گئے دیوتا کتوں کی طرح (حرف مٹ گئے ہیں) سجدہ میں گر پڑے چھ دن اور رات گذرے۔ ہوا طوفان اور سیلاب نے غلبہ کر لیا ساتویں دن طوفان اور سیلاب بند ہوا جس نے زلزلہ کی طرح ہلاکت ڈال دی سکون ہو گیا سمندر کو اس نے خشک کر دیا اور ہوا اور بارش ختم ہو گئی میں نے سمندر متلاطم دیکھا اور تمام بنی آدم ہلاک ہو گئے لاشیں نرکلوں کی طرح تیرتی تھیں میں نے کھڑکی کھولی اور میرے منہ پر روشنی پڑی وہ گذر گئی اور میں بیٹھ گیا اور رونے لگا میں نے ایک فاختہ بھیجی اور وہ چلی گئی فاختہ گئی اور وہ واپس آگئی میں نے ایک ابابیل بھیجی وہ چلی گئی اور واپس آگئی۔ میں نے ایک کوا بھیجا اور وہ روانہ ہو گیا کوا آگیا اور اس نے پانی اترا دیکھا اور اس نے کھایا اور وہ تیرا اور آوارہ ہو گیا اور واپس نہ آیا میں نے جانوروں کو ہر سمت روانہ کیا اور میں نے پہاڑ کی چوٹی پر ایک قربان گاہ بنائی۔

افسوس ہے کہ اس کتبہ میں سے 8 سے 18 تک کی سطریں ضائع ہو گئی ہیں اگر وہ سطریں گم نہ ہو جاتیں تو یقیناً" یہ معلوم ہو جاتا کہ کشتی کس طرح بنائی گئی تھی اور کس طرح زیسوطروس اور اس کے تینوں بیٹوں کی جانیں بچی تھیں۔

کلدانی مورخ بیروسوس نے جو روایت بیان کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ زیسوطروس کو خواب میں کلدانی دیوتا کرونوس نظر آیا اور آنے والے طوفان سے مطلع کیا۔ زیسوطروس نے ایک بہت بڑی کشتی بنائی جس میں اس نے اپنے اہل و عیال اور اپنے دوستوں اور زمین کے تمام جانوروں اور پرندوں کے نمونے کشتی میں رکھے وغیرہ وغیرہ یہ بیان قریب قریب کتاب پیدائش کا ہے اور اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ وہ کلدانی یا بابلی روایات سے لیا گیا ہے۔

برج بابل

جب طوفان ختم ہو گیا اور نوح کی کشتی خشکی پر آکر ٹکی تو وہ اترے اور انگور کی کاشت

شروع کی جب انگور پختہ ہو گئے تو اس سے شراب بنائی اور خوب پی اپنے کو بددعا دی۔ سام و یافث کی دعا دی اور 350 سال تک زندہ رہے گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ جس وقت نوح کا انتقال ہوا ہے وہ اس وقت کے تمام انسانوں سے عمر میں 500 سال بڑے تھے لیکن نہ ان کے مرنے کا ذکر کہیں پایا جاتا ہے نہ کہ یہ کہ وہ کہاں دفن کیے گئے اور ان کی یادگار کوئی قائم کی گئی یا نہیں اسی طرح آدم و حوا کی وفات اور ان کے مدفن کا کوئی ذکر توریت میں نہیں پایا جاتا۔

اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ برج بابل کی تعمیر کے وقت چونکہ خدا نے انسانی زبان کو غلط ملط کر کے ایک دوسرے کے لیے ناقابل فہم بنا دیا تھا اس لیے آدم و نوح کے متعلق جو روایات پائی جاتی تھیں وہ محو ہو گئیں اور ان کی اولاد نہ طوفان کا صحیح حال یاد رکھ سکی نہ نوح کی وفات کا پھر جب دوسری زبان رائج ہوئی تو از سر نو ذریعہ الہام یہ داستان سنائی گئی۔

اس جگہ سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدم و حوا کی وہ زبان کیا تھی جسے سانپ بھی سمجھ سکتا تھا۔ زبان ایسی چیز ہے جو ایک دن یا ایک سال میں تیار نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے بہت کافی زمانہ درکار ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے ابتدائی حالت میں زبان صرف چند مخصوص آوازوں پر مشتمل ہوتی ہے جن سے صرف مسرت و غم یا محبت و نفرت کا اظہار کیا جا سکتا ہے لیکن پیچیدہ خیالات کے ظاہر کرنے کی صلاحیت زبان میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہے خیالات کا تعلق صرف تجربہ سے ہے اور ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا نے ان کو دفعتاً" پیدا کر کے انسان کے دماغ میں بھر دیا تھا آدم و حوا کی زبان عبرانی رہی ہو یا کچھ اور بہر نوع وہ دفعتاً" پیدا ہو جانے والی چیز نہ تھی اور ایک زمانہ اس کی تشکیل میں صرف ہوا ہو گا اب رہا سانپ کا حوا سے گفتگو کرنا یہ اور زیادہ حیرت انگیز امر ہے کہ اس نے آدم و حوا کی زبان کب اور کیونکر سیکھی؟

الغرض اول تو زبان کے باب میں یہی معمہ حل نہیں ہو سکتا کہ آدم و حوا دفعتاً" کوئی زبان کیونکر ایجاد کر سکے اور دوسرے اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ برج بابل کی تعمیر سے قبل تمام انسانوں کی وہی ایک زبان تھی جو عدن میں آدم و حوا کو سکھائی گئی تھی تو پھر یہ بات اس زیادہ ناقابل فہم ہے کہ برج بابل کی تعمیر کے وقت خدا نے زبان کو غلط ملط کر دیا تھا تاکہ کوئی دوسرے کی بات نہ سمجھ سکے۔

بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ برج کی تعمیر کے وقت تک تمام باشندگان کرہ

ارض کی ایک ہی زبان تھی اور ایک ہی رہتی اگر انسان برج بابل کی تعمیر کا ارادہ کر کے آسمان تک پہنچنے کی کوشش نہ کرتا۔ خدا انسان کی اس گستاخی سے برہم ہو گیا اور اس نے زبان کو گڑبڑ کر دیا تاکہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکے اور برج تعمیر نہ ہو سکے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ زبان کے مسخ ہونے کے بعد سب منتشر ہو گئے۔

اول تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خدا کو تعمیر برج میں کیا اعتراض تھا جبکہ وہ جانتا تھا کہ اس طرح انسان آسمان تک نہیں پہنچ سکتا اگر کہا جائے کہ یہ خیال انسانی گستاخی کی سزا تھی تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لیے زبان کو خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی کیا وہ ایسا نہ کر سکتا تھا کہ جتنا برج وہ دن میں تعمیر کرتے تھے رات کو اسے ڈھا دیا کرتا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ زبان کی گڑبڑ سے تعمیر برج پر کیا اثر پڑ سکتا تھا اور وہ کیونکر عمل میں آئی۔

زبان اسی وقت مسخ ہو سکتی تھی جب قوت حافظہ مٹ جائے تو کیا خدا نے انسان کی قوت حافظہ محو کر دی تھی یعنی دماغ کے اس حصہ کو مفلوج کر دیا تھا جو اعصاب گویائی پر حکمراں ہے یا یہ کہ قوت سلب کر لی تھی؟ اس کا کوئی ذکر توریت میں نہیں۔

اسی کے ساتھ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ زبان کے مسخ ہو جانے سے انسانوں میں انتشار کیوں پیدا ہوا اور الگ الگ ہو جانے کا سبب کیا تھا کیا وہ ایک ہی جگہ قیام کر کے اس وقت تک انتظار نہ کر سکتے تھے کہ ایک دوسرے کی بات سمجھنے لگتے۔ معیت کے وقت میں تمام افراد قدرتاً ایک ساتھ زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہیں نہ کہ منتشر ہو جانا۔ پھر ایک سوال یہ بھی ہے جب مسخ زبان کے بعد مختلف جماعتیں مختلف مقامات پر چلی گئی ہوں گی تو وہاں انہوں نے کیا کیا ہو گا جبکہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھتا تھا۔

بائبل کی کتاب پیدائش باب 11 آیت 1/9 میں لکھا ہے کہ -

تمام زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی اور جب وہ پورب سے روانہ ہوئے تو انہوں نے سنعار کے ملک میں ایک میدان پایا اور وہاں رہنے لگے۔ آپس میں کہا کہ آؤ ہم اینٹ بنائیں اور آگ میں پکائیں۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر بنائیں اور ایک برج بنائیں جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے اور یہاں اپنا نام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ تمام روئے زمین پر پریشان ہو جائیں اور خداوند اس شہر اور اس برج کو جسے بنی آدم بناتے تھے دیکھنے اترا اور خداوند نے کہا دیکھو لوگ ایک ہی ہیں اور ان سب کی ایک ہی بولی ہے

اور اب وہ یہ کرنے لگے سو وہ جس کام کا ارادہ کریں گے اس سے نہ روک سکیں گے۔ آؤ ہم اتریں اور بولی میں اختلاف ڈالیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھیں تب خداوند نے ان کو وہاں سے تمام روئے زمین پر پراگندہ کر دیا سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز رہے اس لیے اس کا نام بابل ہوا کیونکہ خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبانوں میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے خداوند نے ان کو تمام روئے زمین پر پراگندہ کر دیا۔

بائبل کی اس الہامی روایت کا ماخذ بھی بابلی روایت ہے بیروسوس مشہور کلدانی مورخ نے بھی قریب قریب یہی بیان درباره برج بابل لکھا ہے' وہ لکھتا ہے کہ۔

زمین کے پہلے باشندے اپنے زور و قوت پر گھمنڈ کرتے ہوئے دیوتاؤں کو حقیر و حقیر سمجھنے لگے اور انھوں نے اس مقام پر جہاں اب شہر بابل ہے ایک برج بنانا شروع کیا جب اس کی چوٹی آسمان تک پہنچی تو ہواؤں نے دیوتاؤں کی مدد کی اور انھوں نے اس سربفلک برج کو اکھاڑ پھینکا نیز ان لوگوں میں اختلاف لسانی پیدا کر دیا۔ اس وقت تک ان تمام آدمیوں کی ایک ہی زبان تھی۔ کہتے ہیں کہ اس برج کے کھنڈر اب بھی بابل میں موجود ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ برج کی حقیقت کیا ہے۔ اس باب میں جو زلفیس کا قول یہ ہے کہ یہ برج نمرود نے بنوایا تھا اور دیودرس کا بیان ہے کہ اس برج کو اہل کلدانیہ نے سیارگان کی صورت سے بنایا تھا اور اس کا نام ہفت منازل رصدگاہ رکھا تھا۔

اس صدرگارہ کی منزلیں علی الترتیب آفتاب قمر زحل مشتری مریخ زہرہ اور عطارد سے منسوب تھیں۔ لیکن بادشاہ بخت نصر کے عہد کے کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برج شہر بورسیپا (بابل) کا برج تھا اور اس نے اس کے پشتے خام اینٹ سے اور احاطہ خشت پختہ سے بنایا تھا وغیرہ وغیرہ' مگر ان بیانات میں اختلاف لسانی کا کہیں ذکر نہیں۔

اختلافات لسانی کے بارہ میں قدیم ارمن روایت بے شک عبرانی روایت سے ملتی ہے اور قدیم میکسیکو میں بھی ایسی ہی ایک روایت درباره اختلاف السنہ پائی جاتی تھی اور وہ لوگ اسی سلسلہ میں اپنے ملک کا برج چولولا دکھایا کرتے تھے میکسیکو کی روایت یہ تھی کہ طوفان سے سات نفر دیوزاد بچے تھے ان میں سے ایک دیو نے جس کا نام ز۔ملوا تھا آسمان پر حملہ کرنے کے لیے چولولا کا برج تعمیر کیا مگر دیوتاؤں نے اس برج کو آگ لگا کر تباہ کر دیا اور بنانے والوں کی بولی میں اختلاف ڈال دیا۔ اسی قسم کی ایک روایت شمالی ہندوستان کی تھارو قوم میں بھی پائی جاتی ہے جو مغل نسل سے ہے مشہور انگریزی سیاح ڈاکٹر لونگسٹن کا

بیان ہے کہ ایسی ہی روایت دربارہ اختلاف السنہ افریقہ کے قبائل میں بھی پائی جاتی ہے جو جھیل نگامی کے سواحل پر آباد ہیں اور قدیم الیتھونیہ میں بھی ایسی ہی ایک روایت مشہور تھی۔ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں بھی اس قسم کی روایت دربارہ اختلاف السنہ پائی جاتی ہے۔

جارج اسمتھ کی آثاری تحقیق سے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں ان میں برج بابل کا جو حال لکھا ہے وہ بائبل کے بیان سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے ان کتبوں میں درج ہے کہ۔

بعض لوگوں نے ایک شخص کی سیادت میں جس کے خیالات اچھے نہیں تھے اور جس نے تمام دیوتاؤں کے باپ سے کفر کیا تھا بابل میں ایک ٹیلہ یا پہاڑی کی وضع کا ایک برج تعمیر کرنا شروع کیا لیکن ہواؤں نے اس کا کام خراب کر دیا اور انو دیوتا نے اس ٹیلہ پر چھوٹے بڑے تمام لوگوں میں گڑ بڑ ڈال دی ان کی بولی بھی بدل دی اور ان کے اصلاح و مشورہ میں بھی اختلاف پیدا کر دیا۔ وہ بعل دیوتا دیوتاؤں کا باپ ہے جس کا غیظ و غضب ان نابکار معماروں پر مشتعل ہوا اور وہ دیوتا انو ہے جس نے ان لوگوں کو ہلاک کیا۔

اب رہی یہ بات کہ برج بابل کہاں تھا۔ اس کے متعلق بجز اس کے کچھ معلوم نہیں کہ وہ بابل میں تھا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ برج وہاں تھا جہاں آجکل بیرو نمرود کا ٹیلہ پایا جاتا ہے یہ نواح بابل میں شہر سے آٹھ میل کے فاصلہ پر بمقام بورسیپا واقع ہے اور اسے ہیکل ہفت انوار کہتے تھے۔ سرہنری رالنس نے جب اس برج کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ ایک مٹی کے چبوترے پر اینٹوں سے سات منزلیں تعمیر کی گئی تھیں اور ہر منزل کا رنگ جدا جدا تھا۔ اس برج کی بلندی اس وقت بھی میدان سے 153 فٹ بلند ہے۔ برج مذکور عرصہ دراز سے ناکمل چلا آتا تھا حتیٰ کے بادشاہ بخت نصر نے اس کی مرمت کر کے اسے درجہ تکمیل تک پہنچایا۔

ان تمام روایات اور بیانات سے ایک شخص اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ برج بابل دراصل ایک رصد گاہ تھا جس میں ہیئت داں لوگ رصد کیا کرتے تھے۔ اس رصد کو آسمان پر حملہ یا خدا کی دشمنی سے تعبیر کیا گیا چونکہ وہ قدیم رصد گاہ عرصہ دراز سے ناکمل چلی آتی تھی۔ اس لیے یہ روایت پیدا ہو گئی کہ چونکہ بانیان برج نے خدا کی شان میں گستاخی کی تھی اس لئے وہ ہلاک کر دیے گئے اور برج ناکمل رہ گیا عراق کے میدانوں میں ایک قوم نہیں بلکہ مختلف قومیں آباد ہیں جن کی بولیاں الگ الگ ہیں اور اسی کو اختلاف السنہ کہا گیا۔

مصنفین بائبل نے لفظ بابل کو عبرانی مصدر بئیل سے مشتق سمجھا ہے جس کے معنی ہیں پراگندہ کرنا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دو آشوری لفظوں بابِ اور ایل سے مرکب ہے جس کے معنی ہیں خدا کا دروازہ۔

اسی سلسلہ میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ہندوؤں کی روایات میں دیوتاؤں کے رہنے کا مقام میروپربت بتایا جاتا ہے اس پہاڑ کی نسبت بھی یہ خیال تھا کہ وہ سات درجوں کے تعمیر کیے جاتے تھے میروپربت کے درجہ اعلیٰ میں برہما کا مقام تھا اور ہیرو ودطوس نے لکھا ہے کہ برج بابل کے ساتویں ہی درجہ میں بیلس دیوتا رہا کرتا تھا۔ یہ مماثلت بیان بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

حضرت ابراہیم

برج بابل کی تعمیر اور مسخ زبان کے بعد سے ابراہیم کی پیدائش تک جو طویل زمانہ گزرا ہے اس کا کوئی ذکر توریت میں نہیں پایا جاتا کہ اتنا زمانہ انسان نے کہاں اور کیونکر بسر کیا اس میں صرف اس قدرت تحریر ہے کہ مسخ زبان اور انتشار آبادی کے بعد سرزمین کنعان میں ایک قوم عبرانیوں کی پیدا ہوئی جس کے سردار ابراہیم تھے یہ لوگ خیموں میں رہتے تھے اور کچھ مویشی بھی رکھتے تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ مارے مارے پھرتے تھے اور ساری دنیا میں یہی ایک جماعت ایسی تھی جو خدا کی مہربانی کا مرکز تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سینکڑوں شہر ہزاروں محل اور بیشمار مندر آباد تھے لاکھوں انسان اور اوسائرس کی پرستش کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی ترقی میں معروف تھے لیکن خدا نے ان سب کو نظر انداز کر کے صرف ابراہیم اور ان کے خاندان کو اپنی توجہ کے قابل سمجھا۔ کیوں؟ اس کا کوئی جواب توریت میں نہیں ملتا۔

اسفار خمسہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم اور خدا کے درمیان کافی بے تکلفی تھی اور مختلف امور پر آپس میں بہت کھل کر باتیں ہوا کرتی تھیں چنانچہ خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ میں تیری قوم کو بہت دوں گا اور جو کوئی تیرے خاندان کی مخالفت کرے گا اسے تباہ کر دوں گا۔

یہ خوشخبری سننے کے بعد حضرت ابراہیم سرزمین کنعان میں پہنچے یہاں پھر خدا نے اپنے کو ظاہر کیا اور حکم دیا کہ ایک گائے' ایک بکری' ایک بھیڑ' ایک فاختہ اور ایک کبوتر لے کر

قربانی کرو چنانچہ حضرت ابراہیم نے ان جانوروں کے دو ٹکڑے کر کے رکھ دیئے شام کو غروب آفتاب کے بعد ایک شعلہ گوشت کے ان ٹکڑوں کے درمیان پھرتا ہوا نظر آیا گویا یہ علامت تھی اس امر کی کہ خدا نے قربانی قبول کر لی۔

اس کے بعد خدا نے ابراہیم کو حکم دیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کریں چنانچہ وہ اس پر راضی ہو گئے لیکن عین اس وقت جبکہ یہ خون کرنے والے تھے بجائے بیٹے کے مینڈھے کی قربانی کا حکم ہوا۔

اس تمام بیان میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جسے عقل سلیم قبول کر سکے خدا کا ابراہیم سے بے تکلفانہ گفتگو کرنا چند مخصوص جانوروں کو ذبح کر کرا کے ان کے خون آلود ٹکڑوں کے درمیان روشنی کا نمودار ہونا' پھر انسان کی قربانی طلب کرنا اور بعدازاں مینڈھے پر راضی ہو جانا ایسی باتیں ہیں کہ خدا کی حقیقی عظمت اور اس کے بلند تصور کے لحاظ سے کسی طرح قبول نہیں کی جا سکتیں۔

خدا نے حضرت ابراہیم سے بہت وعدے کیے تھے لیکن جیسا کہ اسفار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ان میں سے کوئی پورا نہیں کیا گیا خدا نے ابراہیم کو ایک بڑے قوم کا مورث اعلیٰ ہونے کی بشارت دی تھی۔ مگر پوری نہیں ہوئی ایک وسیع حصہ زمین کے مالک ہونے کی خبر دی تھی جس میں دریائے نیل اور دریائے فرات کے درمیان کا حصہ بھی شامل بتایا گیا تھا لیکن یہ وعدہ بھی ایفانہ ہوا۔

جب ابراہیم کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے اسحاق جانشین ہوئے پھر یعقوب اور اس کے بعد یوسف جو مصر میں صاحب اقتدار ہو گئے لیکن اس وقت یوسف اور ان کی تمام اولاد کو ملا کر کل ستر عبرانی موجود تھے۔ جو مصر میں دو سال تک رہے لیکن اس کی مدت میں ان کی تعداد تقریباً 30 لاکھ تک پہنچ گئی تھی اس تعداد کا اندازہ ہمیں اس طرح ہو سکتا ہے کہ حسب بیان موسیٰ اس وقت 30 لاکھ جنگجو سپاہی ان کی قوم کے موجود تھے اس لیے بہ لحاظ آبادی ہر چھ آدمیوں میں سے ایک آدمی فوجی خدمت کا اہل قرار دے دیا جائے تو آبادی کا اندازہ کم از کم 30 لاکھ ہوتا ہے۔

اس لیے اب غور طلب امر یہ ہے کہ کیا ستر آدمیوں کی مختصر آبادی 215 سال میں 30 لاکھ تک پہنچ سکتی ہے اور اگر اسے معجزہ خداوندی قرار دے دیا جائے تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ غلاموں کی اتنی بڑی آبادی بڑھانے سے کیا فائدہ متصور تھا اور خدا نے اتنا انتظار

کیوں نہ کیا کہ یہ جماعت آزاد ہو جاتی اور اس کے بعد آبادی بڑھانے کا یہ معجزہ صادر کیا جاتا۔

اگر ہم فرض کرلیں کہ وہ ہر صدی میں چار مرتبہ دو چند ہو جاتے تھے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ستر آدمیوں کی آبادی دو سال کے بعد بڑھ کر زیادہ سے زیادہ 17920 نفوس تک پہنچ سکتی تھی اب باقی 15 سال میں اگر یہ دو چند ہو جائیں تو بھی 35840 سے زیادہ نہیں بڑھ سکتے تھے چہ جائیکہ 30 لاکھ۔

اسی زمانہ میں عبرانیوں نے مردم شماری بھی کی تھی تو معلوم ہوا تھا کہ 22273 پہلوٹی کے مرد ان کے یہاں موجود تھے اگر پہلوٹی کی لڑکیاں بھی اتنی ہی فرض کرلی جائیں تو یہ تعداد 44546 تک پہنچ جائے گی پھر ظاہر ہے کہ مائیں بھی اتنی رہی ہوں گی اسی لیے 30 لاکھ کی آبادی کے لحاظ سے اگر حساب لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ پیدائش کا اوسط فی عورت 66 قرار پاتا ہے جو کسی طرح قرین عقل نہیں۔

حضرت موسیٰ

جب بنی اسرائیل کو غلامی کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہوئے تقریباً 215 سال کا زمانہ گذر گیا تو فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے آئندہ جو لڑکے پیدا ہوں وہ ہلاک کر دیئے جائیں لیکن اتفاق سے ایک لڑکا بچ گیا جس کو فرعون کی لڑکی نے نیل میں بہتا ہوا دیکھ کر بچا لیا اور اس کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ جوان ہو گیا ایک دن اس جوان نے کسی مصری کو ہلاک کر ڈالا اور بھاگ کر مدین پہنچا یہاں ایک مقدس راہب سے ملاقات ہو گئی جس کی سات لڑکیاں تھیں ان میں سے ایک کے ساتھ شادی کرلی اور راہب کی بھیڑیں چرانے لگا یہ نوجوان موسیٰ تھے۔

ایک دن بھیڑیں چرانے کے دوران ایک مشتعل جھاڑی کے اندر خدا ظاہر ہوا اور موسیٰ کو حکم دیا کہ فرعون سے جا کر بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کرو اور اس کے ساتھ ید بیضا اور عصا کا معجزہ عطا کیا عصا کا معجزہ یہ تھا کہ جس وقت موسیٰ اسے زمین پر ڈال دیتے تھے تو سانپ بن جاتا تھا اور اٹھا لیتے تھے تو پھر وہی عصا کا عصا۔ ید بیضا یہ کہ جب وہ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالتے تھے چمکنے لگتا تھا۔

الغرض موسیٰ ان معجزات کے حربہ سے آراستہ ہو کر مصر چلے ان کے بھائی ہارون بھی

ان کی اعانت کے لیے مامور کیے گئے مصر پہنچ کر بنی اسرائیل کو جمع کیا اور معجزے دکھا کر پیام خداوندی سنایا جب سب نے ان کو پیغمبر تسلیم کر لیا تو یہ فرعون کے پاس گئے اور خدا کا پیام سنا کر بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا لیکن فرعون نے اور زیادہ سختی شروع کر دی موسیٰ نے خدا سے عرض کیا کہ فرعون نہیں سنتا۔ حکم ہوا کہ پھر جاؤ چنانچہ یہ گئے اور اس مرتبہ اپنے عصا کا معجزہ دکھلیا۔ فرعون نے اپنے جادوگرں کو بلایا انھوں نے اپنی لکڑیاں سانپ بنا کر پیش کیں جنھیں موسیٰ کا عصا نگل گیا لیکن اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوا کہ فرعون نے موسیٰ کو ایک بڑا جادوگر سمجھ کر ان کا مطالبہ رد کر دیا۔

حیرت ناک امر یہ ہے کہ موسیٰ و ہارون نے فرعون کے پاس جا کر کوئی ایک لفظ بھی آزادی کی حمایت اور غلامی کی مذمت میں نہیں کہا۔ انھوں نے مطلقاً بحث نہیں کی کہ نوع انسانی اپنی محنت کی پیداوار سے پورا فائدہ اٹھانے کی مستحق ہے اور ایسے مالک و آقا جو مزدوروں اور غلاموں کے منہ سے نوالہ چھین لیتے ہیں عرصہ تک برسراقتدار نہیں رہ سکتے اور وہ قوم جو دوسروں کو غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہے خود بھی غلام ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کو غلامی سے آزاد کرانا چاہتے ہیں لیکن فرعون کے پاس پہنچ کر کوئی ایک لفظ بھی پندو نصیحت کا نہیں کہتے اور فوراً عصا کو سانپ بنا کر خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں کیا کسی مصلح یا پیغمبر کے اس طرز عمل کو مستحسن سمجھا جا سکتا ہے کہ درستی اخلاق کا درس دینے کے بجائے وہ صرف ایسے مظاہروں سے کام لے جنھیں فریق ثانی بھی شعبدہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہ دے سکے اس لیے اگر فرعون نے عصائے موسوی کا معجزہ دیکھ کر مطالبہ آزادی کو پورا نہیں کیا تو تعجب نہ کرنا چاہیے کیونکہ خرق عادات کی نمائش اصلاح اخلاق کے لیے کبھی مفید نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ نے دوسرا معجزہ دکھلیا کہ اپنے عصا کی ضرب سے نہ صرف دریائے نیل بلکہ تمام چشموں جوہڑوں کنوؤں حتیٰ کہ گھر کے اندر ظروف میں رکھے ہوئے پانی کو بھی خون میں تبدیل کر دیا کہا جاتا ہے کہ مصر کے ساحروں نے بھی ایسا ہی شعبدہ دکھا درآنحالیکہ پانی باقی ہی نہ رہا جسے وہ خون میں بدل دیتے۔ اس معجزہ قہر و غضب کا یہ نتیجہ ہوا کہ دریائے نیل کی تمام مچھلیاں مر کر سڑنے لگیں اور تمام مصر پانی کے لیے تڑپنے لگا آخر کار انھوں نے نئے کنوئیں کھودے اور اپنی پیاس بجھائی اس واقعہ کے بعد سات دن تک موسیٰ و ہارون نے انتظار کیا لیکن فرعون نے بنی اسرائیل کو آزاد نہ کیا خدا نے اس مرتبہ

مینڈکوں کا عذاب نازل کیا اور زمین کا چپہ چپہ ان جانوروں سے ڈھک گیا ساحران فرعون نے خود بھی اس معجزہ کا جواب اسی طرح دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مینڈکوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا فرعون اس عذاب سے گھبرا اٹھا اور اس نے موسیٰ کو بلا کر کہا کہ اس مصیبت سے مجھے نجات دلاؤ میں بنی اسرائیل کو آزاد کر دوں گا چنانچہ حضرت موسیٰ کی دعا سے یہ عذاب رفع ہو گیا مگر فرعون پھر اپنے وعدے سے پھر گیا۔

اس کے بعد خدا نے کلینوں کا عذاب مسلط کیا مگر فرعون نے وعدہ خلافی کی۔ مکھیوں کا عذاب نازل کیا لیکن وہ نہ مانا سرزمین مصر کے تمام مویشی ہلاک کر دیئے وہاں کے تمام باشندوں کو جلدی امراض میں مبتلا کر دیا ژالہ باری سے تباہ کیا ٹیڑیوں کو مسلط کیا نہایت شدید قسم کی تاریکی پھیلائی لیکن فرعون وعدے کر کر کے پھر گیا آخر کار خدا نے موسیٰ کے ذریعہ سے فرعون کو کہلا بھیجا کہ مصر میں جتنی اولاد پہلوٹی کی ہیں وہ آج کی رات فنا کر دی جائیں گی چنانچہ اس خیال سے بنی اسرائیل کے گھرانے اس عذاب سے بچے رہے ان کے گھروں پر خون کے چھاپے لگ گئے تاکہ خدا کا فرشتہ عذاب غلطی سے کہیں بنی اسرائیل کے لوگوں کو ہلاک نہ کر دے آخر کار رات کو یہ عذاب نازل ہوا اور مصریوں کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس سے صبح کو جنازہ نہ نکلا ہو اور اس مرتبہ فرعون نے بہ مشکل تمام بنی اسرائیل کو آزاد کیا۔

اس تمام بیان کو پڑھنے کے بعد یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ فرعون کو راہ راست پر لانے کے لیے پے درپے اتنے عذاب اہل مصر پر کیوں نازل کیے جب کہ اسے معلوم تھا کہ ان میں سے کوئی عذاب کارگر نہ ہو گا اگر خدا جانتا تھا اور یقیناً" جانتا ہو گا کہ جب تک مصر والوں کی پہلوٹی کے لڑکے فنا نہ ہوں اس وقت تک فرعون بنی اسرائیل کو آزد نہ کر دے گا تو پہلے ہی یہ عذاب کیوں نہ مسلط کر دیا گیا اور درمیانی متعدد عذاب نازل کرنے کی زحمت کیوں گوارا کی گئی۔

علاوہ اس کے سب سے زیادہ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ گناہ تو فرعون کا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد نہ کرتا تھا لیکن مصیبت میں مبتلا کیا گیا مصر کی تمام آبادی کو جس میں معصوم عورتیں بچے بوڑھے سبھی شامل تھے اور وہاں کے تمام جانوروں کو جنھوں نے کوئی قصور نہ کیا تھا کیا خدا یہ نہ کر سکتا تھا کہ صرف فرعون کو شدائد میں مبتلا کر کے نافرمانی کی سزا دیتا یا اگر بنی اسرائیل کی آزادی یا فرعون کی اصلاح مقصود تھی تو وہ اس کے خیال کو بدل دیتا اور اس کے دل میں رحم و نرمی پیدا کر کے مقصد حاصل کر لیتا اسی کے ساتھ دوسرا تعجب خیز امر

یہ ہے کہ بنی اسرائیل مصر کے اندر لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے تھے چھ لاکھ نبرد آزما جوان ان میں موجود تھے۔ ایک چھوڑ دو دو پیغمبر موسیٰ و ہارون ان کی حمایت کر رہے تھے خدا کی طرفداری کا یہ عالم تھا کہ بار بار فرعون اور اہل مصر پر عذاب نازل کر رہا تھا لیکن خود ان کے اندر ظلم و استبداد کے مقابلہ کا جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا اور بے حس جانوروں کی طرح سر ڈالے تمام تکلیفیں غلامی کی برداشت کر رہے تھے میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی بزدل ناکارہ کم ہمت اور بے غیرت قوم کی طرفداری کا خیال خدا کو کیوں پیدا ہوا اور اگر ایسی ہی خاطر منظور تھی تو کیوں نہ ان کے اندر مردانہ جوش اور ولولہ حریت پیدا کر دیا گیا' وہ خود اپنی ہمت و پامردی سے آزادی حاصل کر لیتے۔

بنی اسرائیل کی ہجرت

جب متعدد و عظیم عذاب نازل ہونے کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دے دی تو یہ سب کے سب مع اپنے گلوں اور اسباب کے خانہ بدوشوں کی طرح ایک رات مصر سے باہر نکلے کہا جاتا ہے کہ روانگی کا وقت مقرر کر دیا تھا اور تمام افراد بیک وقت سب کے سب ایک ساتھ روانہ ہو گئے اور صحرا سینا میں جا کر پناہ لی۔

اس بیان کو صحیح باور کرنے کے لیے عقل انسانی کو کتنی جگہ تامل کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ زیادہ دشوار نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ فرعون کی پروانگی حاصل کرنے کے بعد فوراً 30 لاکھ افراد کا ایک ہی وقت میں روانہ ہو جانا کیونکر قابل عمل تھا۔ اور حضرت موسیٰ نے کیونکر اپنی قوم کے 30 لاکھ افراد کو اس قدر جلد وقت روانگی کی اطلاع دے دی کہ وہ سب دفعتاً تیار ہو کر ایک ساتھ روانہ بھی ہو گئے۔

اس زبردست جماعت میں 6 لاکھ تو صرف وہ نوجوان تھے جو نبرد آزمائی کر سکتے تھے بچے عورتیں اور بوڑھے ان کے علاوہ تھے اب غور کیجئے کہ یہ جا کہاں رہے تھے؟ صحرا سینا میں۔ یعنی اس صحرا میں جس کی خشکی و ویرانی کے سامنے صحرا اعظم گویا باغ کی حیثیت رکھتا تھا یہاں یہ 40 سال تک رہے لیکن عقل حیران ہے کہ اتنی بڑی آبادی کے لیے ایسے خشک و بے آب و گیاہ صحرا میں سامان خورد و نوش کہاں سے میسر آیا۔ ان کے ساتھ بھیڑیں اتنی کثرت سے موجود تھیں کہ ایک بار بنی اسرائیل نے ایک لاکھ پچاس ہزار پہلوٹی کے بچوں کی قربانی کی پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ بھیڑوں کے اتنے بڑے بے شمار گلوں کے لیے جن کو

لاکھوں ایکڑ چراگاہ کی ضرورت تھی اس ریگستان میں کیونکر زندہ رکھا گیا۔

خدا بنی اسرائیل کو ارض فلسطین کی طرف سے نہیں لے گیا اس خوف سے کہ مبادا یہاں کے لوگوں کو دیکھ کر وہ پھر مصر واپس چلے جائیں بلکہ صحرا کے راستہ سے بحر احمر تک لے گیا اور اس سفر کی شان یہ تھی کہ دن کو بادلوں کا ایک ٹکڑا ان کی راہنمائی کرتا تھا اور رات کو آگ کا ستون۔

جب فرعون کو معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل بھاگ گئے تو اس نے 600 رتھوں پر اپنے سپاہیوں کو بٹھا کر ان کا تعاقب کیا اور ساحل تک پہنچتے پہنچتے ان کو جالیا۔

اول تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب حضرت موسیٰ کی بددعا سے وبا میں مبتلا ہو کر مصر کے تمام جانور فنا ہو چکے تھے اور طاعون نے وہاں کی بہترین آبادی کو ختم کر دیا تھا تو 600 رتھوں کے لیے گھوڑے اور سپاہی کہاں سے آگئے؟

اسی کے ساتھ اسفار موسیٰ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل مصریوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے در آنحالیکہ ان میں 6 لاکھ جنگجو نوجوان موجود تھے اور یہ خوف اس درجہ غالب ہوا کہ آخر کار حضرت موسیٰ کو پھر معجزہ سے کام لینا پڑا یعنی اپنے عصا کے اشارہ سے پانی کے دو حصے کر دیے جس سے درمیان میں راستہ پیدا ہو گیا اور بنی اسرائیل اس سے عبور کر گئے لیکن جب مصری فوج عبور کرنے لگے تو خدا نے رتھوں کے پہیے الگ کر دیئے اور جس وقت وہ بیچ دریا میں پہنچے تو پھٹا ہوا پانی پھر مل گیا اور سب کے سب غرق ہو گئے۔

اول تو یہ بات نہایت عجیب و غریب ہے کہ آزاد ہونے کے بعد بھی بنی اسرائیل کی بزدلی و کم ہمتی بدستور باقی رہی اور باوجود 6 لاکھ نبرد آزما سپاہ رکھنے کے ان کو مصریوں کا مقابلہ کرنے کی جرات نہ ہوئی حالانکہ 600 رتھوں میں زیادہ سے زیادہ 50 یا 60 ہزار سے زیادہ آدمی نہ رہے ہوں گے اور حضرت موسیٰ کو اپنے معجزہ کے دامن میں پناہ لینا پڑی علاوہ اس کے یہ بات بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ عصا کے اشارہ سے پانی پھٹ کر دو دیواروں کی طرح علیحدہ علیحدہ کیونکر قائم ہو گیا اور خدا نے رتھوں کے پہیئے علیحدہ کرنے کے لیے کیا صورت اختیار کی؟

اب دیکھیئے یہ لوگ جا کہاں رہے تھے یہ اس ارض موعودہ کی طرف جا رہے تھے جس کا رقبہ 12 ہزار میل سے زیادہ نہ تھا اور جو سوائے خشک چٹانوں اور بے آب و گیاہ ویرانیوں کے کچھ نہ تھا یہاں پہلے سے کتنے لوگ آباد تھے اس کے متعلق حضرت موسیٰ کا بیان ہے کہ

یہاں سات قومیں یہودیوں سے زیادہ قوی آباد تھیں اس کے معنی یہ ہیں کہ یہودیوں کی 30 لاکھ آبادی کے مقابلہ میں ان کی تعداد کم از کم 2 کروڑ رہی ہو گی جن کو خدا نکال کر یہودیوں کو بسانا چاہتا تھا لیکن خدا کا یہ مقصود نہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فوراً ارض کنعان تک پہنچا دے اس لیے انھیں 40 سال تک برابر صحرا میں سرگرداں رکھا یہاں تک کہ سوا دو کے باقی سب فنا ہو گئے۔

جب بنی اسرائیل نے بحر احمر کو عبور کیا تو انھوں نے دیکھا کہ یہاں غذا کا کوئی سامان فراہم نہیں ہو سکتا اور پانی اس قدر شور ہے کہ اس کا پینا محال ہے یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ نے خدا سے دعا کی تو ایک درخت نمودار ہوا جس کو کاٹ کر حضرت موسیٰ نے پانی میں ڈال دیا اور پانی شیریں ہو گیا غذا کے لیے خدا نے یہ تدبیر کی کہ رات کو چھوٹے چھوٹے اولوں کے برابر ایک گول سی چیز آسمان سے برسائی جو سورج کی گرمی سے تو پگھل جاتی تھی لیکن آگ میں اس کو بھون سکتے تھے اس کا نام من تھا اس پر 40 سال تک انھوں نے بسر کی یہاں تک کہ وہ اس سے بیزار ہو گئے اور گوشت وغیرہ طلب کرنے لگے جس پر خدا بہت برہم ہوا اور انھیں لوگوں کو جن سے دودھ اور شہد بہنے والی سرزمین کا وعدہ کیا گیا تھا سانپوں سے ڈسوایا گیا ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے گوشت اور لہسن پیاز وغیرہ کی خواہش کی تو خدا نے نہایت زبردست آندھی چلائی جس سے ایک پرندہ جس کا نام لوا (سلویٰ) ہے خیموں پر آکر گرنے لگا اور ایک مہینہ تک اس قدر گوشت ان کا کھلوایا کہ آخر کار وہ ان کے ناک منہ سے باہر آنے لگا اور پھر سانپ سے ڈسوانے کے بعد طاعون کی بلا ان پر نازل کی۔

اس بیان میں بعض باتیں نہایت عجیب و غریب ہیں اور اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کر لیں تو صحرا میں درخت کا نمودار ہونا اس کی مدد سے شور پانی کا شیریں ہو جانا من و سلویٰ کا آسمان سے نازل ہونا یہ سب کچھ معجزہ تھا تو بھی یہ امر کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا کہ خدا اپنی اس برگزیدہ قوم سے جس کی نجات کے لیے تمام مصریوں کو تباہ کرنا گوارا کیا گیا صرف اس بناء پر کہ وہ ایک ہی قسم کی غذا 40 سال تک کھاتے کھاتے اکتا گئی تھی کیوں برہم ہو گیا اور اس میں ان کا کیا قصور تھا یہ بالکل فطرت انسانی ہے کہ مسلسل ہفتہ عشرہ تک ایک ہی غذا کھانے کے بعد اس سے تنفر پیدا ہو جاتا ہے چہ جائیکہ مسلسل 40 سال۔ اس لیے ان کے اس مطالبہ پر برہمی اور وہ بھی اس حد تک کہ انھیں سانپوں سے ڈسوایا گیا طاعون میں

جتلا کیا گیا کیونکر جائز و مناسب قرار دیا جا سکتا ہے۔

وہ خدا جو اپنے برگزیدہ بندوں کے لیے من وسلویٰ نازل کر سکتا تھا اس کی قدرت سے یہ امر باہر تھا کہ وہ غذا میں تنوع پیدا کرتا رہتا اور اس فطرت انسانی کی رعایت کرتا جو خود اس کی پیدا کی ہوئی ہے۔

اسفار موسیٰ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صحرا کے دوران قیام میں بنی اسرائیل کا لباس بھی بوسیدہ نہیں ہوا اور جو جوتے وہ پہنے ہوئے تھے وہ بھی نہیں پھٹے بعض مفسرین کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کے لباس وغیرہ کی نگہداشت خدا نے محض مخصوص فرشتوں کے سپرد کر دی تھی جو ان کا لباس آکر درست کر دیا کرتے تھے اور پھٹے ہوئے جوتے ٹانک دیا کرتے تھے لیکن یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ اگر 40 سال تک لباس وغیرہ وہی رہا تو کیا بچوں کی عمروں کے ساتھ ان کا لباس بھی بڑھتا رہا اور پاؤں کی درازی کے ساتھ ساتھ جوتوں کا سائز بھی بڑا ہوتا گیا۔

خدا نے بنی اسرائیل کو یہ بھی حکم دیا کہ وہ صحرا میں درخت نصب کریں اور درآنحالیکہ وہاں اس سے قبل گھاس تک کا بھی وجود نہ تھا تو کیا بنی اسرائیل مصر سے اپنے درختوں کے تخم بھی لائے تھے جو انہوں نے وہاں بوئے اور اگر بوئے تھے تو ان کی نشوونما کی کیا صورت تھی جبکہ پانی کا وہاں وجود نہ تھا اگر یہ کہا جائے کہ خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ بغیر پانی کے تخم یا درخت کو بار آور کر دے تو کیا اس کی قدرت سے دور تھا کہ صحرا کو دفعتاً چمنستان میں تبدیل کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور ایک محال بات کے انجام دینے پر بنی اسرائیل کو مجبور کیا۔

حضرت موسیٰ کو ایک خاص قسم کا خوشبودار تیل بنانے کا بھی نسخہ خدا نے بتایا جو حنا و زیتون وغیرہ مختلف درختوں کے پھلوں پھولوں سے تیار ہوتا تھا اس تیل سے بپتسمہ دیا جاتا تھا اور اس نسخہ کو نہایت راز رکھا گیا تھا اور یہاں تک کہ اگر سوائے موسیٰ اور ہارون کے کوئی اور یہ تیل بنانے کی جرات کرتا تو اس کے لیے خدا کا حکم یہ تھا کہ مار ڈالا جائے۔

اول تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جس صحرا کی ویرانی و خشکی کا یہ عالم ہو کہ لوگوں کا سامان خورد و نوش فراہم نہ ہو سکے وہاں عطریات پیدا کرنے والے درخت کہاں سے آگئے اور حضرت موسیٰ نے کوئی تیل ایسا تیار کیا تھا تو دوسروں کو کیوں ممانعت کی گئی اور اس میں ایسی کیا خصوصیت تھی کہ سوائے حضرت موسیٰ کے کسی اور کو اس کی تیاری کی اجازت نہیں

دی گئی اسی صحرا کے دوران قیام میں یہودیوں کو یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ بطور کفارہ گناہ ہر جننے والی ماں فاختہ کا ایک جوڑا موبدوں کے پاس لائے جس کا کھانا ان پر فرض تھا جس وقت خدا کا یہ حکم نازل ہوا ہے اس وقت یہودیوں کی آبادی 30 لاکھ تھی اور موبدوں کی تعداد صرف تین تھی اگر پیدائش کا اوسط روزانہ 300 رکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ہر موبد کو روزانہ دو دو سو فاختہ یا کبوتر کھانے پڑتے تھے جو بالکل خلاف عقل ہے اس وقت ایک عورت بچہ جننے کے بعد بالکل ناپاک سمجھی جاتی تھی اگر وہ لڑکا جنتی تھی تو 40 دن تک کسی مقدس چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی اور لڑکی جننے کی صورت میں پورے 80 دن تک اس کی نجاست قائم رہتی تھی پھر کیا کوئی وجہ اس کی بتائی جا سکتی ہے کہ بچہ جننا کیوں ایک عورت کو نجس و گنہگار بنا دیتا تھا اور یہ گناہ کبوتر یا فاختہ کے ذبح کرنے اور موبدوں کو شکم پری کے بعد کیوں دور ہو جاتا تھا اور لڑکا اور لڑکی میں کیا فرق تھا کہ ایک کی ولادت کے بعد تو وہ صرف 40 دن تک نجس قرار دی جائے اور دوسرے کی ولادت کے بعد 80 دن۔

الواح موسیٰ کے متعلق مختلف روائتیں پائی جاتی ہیں ایک یہ کہ جب وہ خدا سے ہمکلام ہونے کوہ طور پر گئے تو وہاں دو تختیاں پتھر کی خدا کی طرف سے دی گئیں جن پر احکام عشرہ درج تھے جب آپ واپس آئے تو دیکھا کہ لوگوں نے سونے کا بچھڑا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی تھی آپ بہت برہم ہوئے تختیاں زمین پر پٹک کر توڑ ڈالیں بچھڑے کو جلا کر اس کا سفوف پانی میں ملایا اور بنی اسرائیل کو اس کے پینے پر مجبور کیا۔

دوسری روایت میں نہ تختیوں کے توڑنے کا ذکر ہے نہ بچھڑے کا تیسری میں احکام عشرہ کچھ اور بتائے گئے ہیں آخری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ جب کوہ سینا پر گئے تو بنی اسرائیل زیور ہارون کے پاس لائے اور انھوں نے اس زیور کو گلا کر سونے کا بچھڑا تیار کیا اور جب موسیٰ واپس آئے تو انھوں نے اس بت پرستی میں ان کو مبتلا دیکھ کر بہت غصہ کیا اور تین ہزار آدمی تہہ تیغ کر دیے۔

قطع نظر اس سے کہ خدا کے ہمکلام ہونے اور اپنے پاس پتھروں کی منقوش تختیاں دینے کا تصور بجائے خود ناقابل قبول ہے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اگر موسیٰ کے چلے جانے کے بعد بنی اسرائیل نے بچھڑا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی تھی تو انھوں نے خدا کے کس حکم کی نافرمانی کی اس وقت تک احکام عشرہ لے کر موسیٰ واپس نہ آئے تھے اور کوئی شریعت قائم نہ ہوئی تھی اس لیے بنی اسرائیل کو ایسے جرم میں ماخوذ کرنا جو فی الحقیقت اس وقت تک

جرم ہی قرار نہ پایا تھا۔ انصاف سے بالکل بعید تھا۔ بیشہ قانون کے نفاذ کے بعد جرم و سزا کی تعیین ہوا کرتی ہے اور نفاذ شریعت سے قبل کوئی فعل قابل سرزنش نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ احکام عشرہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ فلاں بات کرو اور فلاں بات نہ کرو اور اس میں یہ کہیں درج نہ تھا کہ اگر ان احکام کی خلاف ورزی کی تو سزا دی جائے گی قانون صرف یہی نہیں بتاتا کہ یہ فعل اچھا ہے یا برا بلکہ وہ اس سے نافرمانی کرنے والوں کی سزا بھی متعین کرتا ہے اس لیے اگر احکام عشرہ کی تبلیغ کے بعد بنی اسرائیل سرتابی کرتے تو بھی وہ مستحق سزا نہ تھے کیونکہ سزا کی تعیین احکام عشرہ میں پائی نہیں جاتی۔

کہا جاتا ہے کہ احکام عشرہ ہی تمام دنیا کے قانون و انصاف کی بنیاد ہیں لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کیونکہ موسیٰ کی پیدائش سے ہزاروں سال قبل مصر میں جو قانون رائج تھا اس میں نہ صرف چوری زنا قتل جھوٹ وغیرہ کی سزائیں مقرر تھیں بلکہ تمدنی تعلقات کے سلسلہ میں اور جتنے جرائم ہو سکتے ہیں ان سب کی صراحت اس میں موجود تھی اور وہ احکام عشرہ سے بدرجہا زیادہ مکمل تھا قانون ہمیشہ انفرادی و اجتماعی احساس تحفظ کے تحت بنا کرتے ہیں اور ضروریات تمدن اور مخصوص واقعات و حالات کے لحاظ سے ان میں تغیر و تبدل ہوا کرتا ہے اس لیے تمام شریعتیں یا قوانین حقیقتاً نتیجہ ہیں انسان کے احساس اجتماعی کا اور اس میں الہام وغیرہ کے دخل کی توجیہہ ممکن ہی نہیں۔

بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی عظمت و صداقت کے اعلان کے لیے بنی اسرائیل کا انتخاب کیا تھا اور اسی لیے وہ متعدد بار کوہ سینا کی بلندی پر آگ اور بادل کے ملبوس میں ظاہر ہوا اور ہزاروں معجزے بنی اسرائیل کی اصلاح و تعلیم کے لیے دکھائے ان کی خاطر اس نے سمندر کے پانی کو شق کر دیا آسمان سے روٹیاں برسائیں ان کی پیاس بجھانے کے لیے خشک چٹانوں سے چشمے پیدا کیے ان کے دشمنوں پر طرح طرح کے عذاب نازل کیے الغرض چالیس سال تک ان کی حفاظت کی پھر بھی بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ کوئی مصیبت ان پر نازل ہوتی تھی تو وہ پتھر اور لکڑی ہی کے دیوتاؤں سے التجا کرتے تھے پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ وہی خدا جس نے بنی اسرائیل کے لیے یہ سب کچھ کیا وہ ان کے دل میں اپنی صحیح عظمت و جلالت پیدا نہ کر سکا اور کیا بنی اسرائیل کی انھیں نافرمانیوں کو دیکھ کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل خدا کی برگزیدہ قوم تھی اور اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لیے اس نے اس قوم کا انتخاب کیا تھا۔

اگر کہا جائے کہ انھوں نے خدا کی وحدانیت کی تعلیم دی تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ موسیٰ کی پیدائش سے بہت پہلے یہ عقیدہ موجود تھا اگر دعوے کیا جائے کہ انھوں نے حقوق ملکیت کی تعیین کی تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ چوری حضرت موسیٰ سے پہلے بھی جرم سمجھی جاتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ قربانیاں کرنا انھوں نے سکھلایا تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہودیوں کے وجود سے ہزاروں سال قبل قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ اس طرح قتل جھوٹ وغیرہ کو بھی ہمیشہ برا سمجھا گیا اور اسفار خمسہ میں اگر ان کو برا بتایا گیا تو کوئی نئی بات نہیں تھی پس یہ دعویٰ کرنا کہ اسفار موسیٰ کی تحریر بغیر الہام خداوندی کے ممکن نہ تھی اور اس میں جو کچھ درج ہے وہ ذہن انسانی سے بہت بلند ہے کیونکر درست ہو سکتا ہے؟۔

گلیلو سرعت جوہری (VIRTUAL VELOCITY) کے میکانکی اصول بتاتا ہے لیکن اسے الہامی نہیں کہتے کہ پرنیکس کرہ زمین کی صحیح پوزیشن کو متعین کرتا ہے لیکن الہام سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہے نیوٹن نظریہ کشش ثابت کرتا ہے مگر اسے الہامی کوئی نہیں مانتا اسی طرح گلرائی دوتا فرنیکلن وغیرہ ریاضیات میکانکیات اور علم الکیمیا وغیرہ کے متعلق بیش بہا اختراعات و اکتشافات پیش کرتے ہیں مگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی الہامی نہیں ملی جاتی لیکن اسفار خمسہ جن میں ایک کوئی بات بھی عقل سے تعلق نہیں رکھتی الہامی ہیں اور جو کوئی انھیں منجانب اللہ نہ سمجھے وہ بے دین اور کافر ہے۔

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ چین ہندوستان مصر یونان اور رومہ کے قوانین جو اس قدر مکمل تھے دماغ انسانی کا نتیجہ سمجھے جائیں اور اسفار خمسہ جو نہایت ناکمل شریعت کو پیش کرتے ہیں ان کو الہامی قرار دیا جائے۔

یونس اور مچھلی

بائبل کی کتاب صحیفہ یونس نبی میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ حسب تعمیل کلام خداوند نینوا کو جا رہا تھا اور نبی یونس کو اسی کہنے پر طوفانی سمندر میں ڈال دیا گیا صحیفہ یونس باب 1 آیتہ 12 مگر خدا نے نہ چاہا کہ یونس کو نینوا نہ جانے کی وجہ سے سمندر میں غرق کردے پس خداوند نے ایک بڑی مچھلی مقرر کر رکھی تھی کہ وہ یونس کو نگل جائے اور یونس تین شب و روز مچھلی کے پیٹ میں رہا صحیفہ یونس باب 1 آیت 17 پھر یونس پاتال کی بطن میں سے چلایا یونس باب 2 آیتہ 2 اور نجات کے لیے دعا مانگی۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم یونان کے باشندے بھی اپنے دیوتا ہر قلیس کے متعلق یہی روایت بیان کرتے تھے کہ یافہ کے قریب جہاں یونس کو مچھلی نے نگل لیا تھا وہ بھی تین دن تین رات اس کے پیٹ میں رہا دونوں روایتوں میں صرف اس قدر فرق ہے کہ یونس تو مچھلی کے پیٹ سے صحیح و سالم نکل آگے مگر ہر قلیس کے سر کے بل گل گئے تھے ملاحظہ ہو برنارڈڈی مونٹفاکن کی کتاب (ANTIQUITE EOXPBICA) جلد اول صفحہ 2.4 مطبوعہ پیرس 1832ء

ڈاکٹر گاڈفرے ہگنس کا بیان ہے کہ یونس اور مچھلی کی داستان یونانی دیوتا ہر قلیس کی داستان کا ایک حصہ ہے جو ہر قل نامہ میں بیان کی گئی ہے ملاحظہ ہو کتاب (ANACLYPSIS) جلد اول صفحہ 638 نیز ٹائر صاحب کی کتاب (CULTURE PRIMITIVE) جلد اول صفحہ 3.6 مطبوعہ لندن 1871ء۔

عرصہ ہوا جرمنی کے مشہور سربراہ وردہ پروفیسر دینیات روز ئیسوگر نے لکھا تھا کہ صحیفہ یونس میں جو معجزہ درج ہے وہ محض ایک تمثیل ہے جس کی بنیاد ایک قدیم فنیقی روایت پر قائم ہے کہ ہر قلیس ایک حسینہ ہزیوکی کو کسی عظیم الجثہ خونخوار بحری جانور سے بچانے کے لیے اس کے منہ میں کود پڑا تھا اور تین دن اور تین رات اسکا پیٹ پھاڑتا رہا۔

ہر قلیس اور یونس کی طرح کا ایک قصہ ہندوؤں کی کتاب ہوم دیو بھاڑ میں بھی درج ہے ملاحظہ ہو ٹاکر صاحب کی کتاب بنی نوع انسان کی قدیم تاریخ۔ (EARBY HISTORY OF MAN KIND) صفحہ 345/344-

معلوم ایساہوتا ہے کہ اس قسم کی روایات درحقیقت تمثیلی ہیں جن سے مراد آفتاب کا طلوع و غروب ہے یا بالفاظ دیگر رات کا آفتاب کو نگل لینا اور صبح کو اگل دینا۔

قدیم زمانہ کی بہت سی قوموں میں آفتاب کو جونا کہا کرتے تھے قوم ہلسک میں آفتاب کا نام جونا جون یا جونا تھا ٹروجن قوم بھی آفتاب کو جونا کہتی تھی اور پارسیوں میں آفتاب کا نام جونا تھا۔ ناروے اور سویڈن میں آفتاب کو جان کہتے ہیں الغرض یونس ہوں یا ہر قلیس یا کوئی اور ان سب سے مراد آفتاب ہے اور مچھلی سے مراد زمین ہے چنانچہ جزائر بحر جنوبی کی روایات قدیمہ میں زمین کو ایک بہت بڑی مچھلی ہی سے ظاہر کیا جاتا ہے اب رہا تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہنا سو اس سے مراد غالبا" 22 دسمبر سے 25 دسمبر تک کا زمانہ ہے جب آفتاب سب سے نیچے کے درجہ میں ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ اس منزل سے

گزر جاتا ہے ملاحظہ ہو گولڈزیہر کی کتاب (HEBEDS MY THOLOGY) صفحہ 102-
معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سعدی نے اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر یہ شعر کہا تھا

قرص خورشید در سیاہی شد
یونس اندر دہان ماہی شد

○ ○ ○

شیطان

بجواب استفسار

شیطان، عفریت یا جن کے وجود کا خیال بہت قدیم خیال ہے اور انسان کے عہد وحشت کی یادگار ہے جب طبیعیات کے مناظر سے وہ حال ہی میں آشنا ہوا تھا اور نظام فطرت کے رموز و نوامیس سے قطعاً اسے آگاہی نہ تھی۔ فطرت کے ان برکات کے ساتھ ساتھ جو اسے کاشتکاری و فراہمی غذا و لباس میں مدد کرتی تھیں جب وہ آفات ارضی و سماوی سے دو چار ہوتا تھا تو کبھی وہ خیال کرتا تھا کہ یاسی قوت کا حصہ ہے۔ جو اس کی مسرت و نشاط کی ضامن ہے، اور کبھی وہ اس کو کسی اور قوت سے منسوب کر کے سمجھتا تھا کہ یہ قوت ان دیوتاؤں کی قوت سے تو کمتر درجہ کی ہے جو اس پر مہربان ہیں لیکن انسان کے معاملات میں وہ ضرور دخیل ہو سکتی ہے۔

بعد کو رفتہ رفتہ یہ سمجھا جانے لگا کہ بعض روحیں ایسی ہیں جو دیوتاؤں اور انسانوں کے درمیان واسطہ العقد کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں بعض انسان کی خیر خواہ محافظ اور بعض اس کی دشمن۔

خیر و شر کے لیے دو علیحدہ علیحدہ قوتیں تسلیم کرنے میں قدیم ایرانی مذہب کو خاص شہرت حاصل ہے جس نے یہودی مذہب کو بھی متاثر کیا اور پھر اس سے عیسویت نے اسی خیال کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ جزو مذہب بنا لیا اور قوا عالم کو اچھی اور بری روحانی قوتوں کے زیر اثر تسلیم کر کے فرشتوں اور شیطانوں کے وجود کے قائل ہو گئے۔

مسلمان چونکہ یہود و نصاری دونوں کے مذاہب سے متاثر تھے اس لیے ان کے یہاں اس عقیدہ میں اور زیادہ غلو نظر آتا ہے ان کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم سے بھی دو ہزار سال قبل وہ جن کے وجود کو تسلیم کرتے تھے لیکن چونکہ جن نے خدا کی نافرمانی کی اس لیے وہ مردود قرار دے دیئے گئے ان منکرین کا سردار ابلیس تھا جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا اور اس کی ذریات کا نام شیطان ہے عفریت کا مرتبہ ذرا کم ہے لیکن

نہ اتنا کم کہ انسان اس سے بے خوف رہے اس طرح کے اور متعدد نام اسلامی روایات میں پائے جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے عقیدہ ابلیس کو ایک مستقل فن کی حیثیت دے دی اور ہزاروں قصے اس سلسلے میں گھڑ لیے گئے جو یکسر خرافیات کے تحت آتے ہیں۔

انسان اپنے عہد وحشت میں بھی خبیث روحوں کے وجود کا قائل تھا اور اسے یقین تھا کہ اکثر بیماریاں انھیں روحوں کے حلول کر جانے سے پیدا ہو جاتی ہیں چنانچہ آج بھی بہت سے لوگ عورتوں کے امراض اختناق الرحم ہسٹریا کو بھوت پریت کا اثر بتاتے ہیں اور جھاڑ پھونک کے ذریعہ سے اس کا ازالہ چاہتے ہیں۔

دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کے لٹریچر میں شیطان عفریت جن اور ارواح خبیثہ کا وجود نہ پایا جاتا ہو اور اس کا سبب یہی ہے کہ جب انسان اپنے عہد جاہلیت میں حقائق سے بے خبر تھا تو وہ بہت سی باتوں کو غیبی قوت کا مرکز سمجھا کرتا تھا اور جب کوئی مصیبت اس پر نازل ہوتی تھی تو وہ اسے کسی غضبناک مخالف قوت سے منسوب کیا کرتا تھا۔

رفتہ رفتہ اس عقیدہ میں اوہام انسانی نے عجیب عجیب اضافے کیے یہاں تک کہ وہ علم للاصنام کی ایک مستقل شاخ بن گیا جو تمام وحشی اقوام میں اب ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

سلافی قوم کا خون چوسنے والا عفریت جسے انگریزی میں (Vampire) کہتے ہیں اسیریا کی عورتوں کا ہم صحبت والا شیطان ہندوؤں کا راکشش جو مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے جاپان کا اونی جو طوفان لاتا ہے اور اسی طرح کے اور بہت سے شیطان مختلف ممالک کے لٹریچر میں نظر آتے ہیں اکثر قوموں میں شیطان کا تصور اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ لنگڑاتا ہے اس خیال کا اصل سبب یہ عقیدہ ہے کہ شیطان اول اول جنت سے باہر پھینک دیا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ جو اتنی بلندی سے گرایا جائے گا وہ اگر مرے گا نہیں تو لنگڑا ضرور ہو جائے گا۔

یورپ کا شیطان پھٹا ہوا کھر رکھتا ہے کیونکہ وہ زیادہ تر جانوروں ہی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے ان جانوروں میں جن کی شکل وہ اختیار کرتا ہے خاص خاص یہ ہیں۔ سانپ (وہی جنت والا سانپ) خرگوش، بکرا، کوا، کتا، بلی چنانچہ آپ نے اب بھی ہندوستان کے بعض مسلمان گھرانوں میں دیکھا ہو گا کہ سیاہ کتے اور سیاہ بلی کو جن سمجھ کر کچھ نہیں کہتے ہمارے فاضل اسلاف میں سے بعض نے نصیحت کی ہے کہ جب سانپ نظر آئے تو اسے فوراً ہلاک نہ کرو بلکہ اس سے پہلے یہ کہو کہ اگر جن ہے تو چلا جائے ورنہ کھڑا رہے۔ اگر اس تنبیہہ

کے بعد بھی وہ نہ جائے تو اس کے ہلاک کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

سفید اقوام میں شیاطین کو اکثر سیاہ فام دکھایا گیا ہے لیکن افریقہ میں اس کا رنگ سفید ہے کیونکہ جس طرح گورے رنگ کی قوموں میں سیاہ رنگ کو برا سمجھا جاتا ہے اسی طرح حبشیوں کے نزدیک سفید رنگ مکروہ ہے کیونکہ وہ گورے آدمیوں کو منحوس سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں میں دوزخ کا عقیدہ بھی اس سلسلہ کی چیز ہے جہنم کا اصل عقیدہ یہود کا تھا جسے وہ شیاطین کے رہنے کی جگہ سمجھتے تھے اور جہاں سوا آگ کے اور کچھ نہ تھا یہودیوں کے یہاں یہ خیال اس عہد قدیم کی یادگار تھا جب آگ کا ایک مستقل دیوتا علیحدہ قرار دیا جاتا تھا اور جو بعد کو اس منصب سے علیحدہ کر کے شیطان بنا دیا گیا۔

آگ اور شیطان کے تعلق کا پتہ اکثر اقوام کی روایات سے چلتا ہے چنانچہ یوروپین اقوام کا یہ عقیدہ کہ شیطان پانی کو عبور نہیں کر سکتا اور مسلمانوں کا جن کو آتشی سمجھنا اور دھواں بن کر اس کا غائب ہو جانا اسی قدیم عقیدہ سے تعلق رکھتا ہے الہ دین کا قصہ الف لیلہ میں آپ نے پڑھا ہو گا اس میں بھی جن کو چراغ ہی کا تابع بتایا جاتا ہے اور جب کسی آسیب زدہ کے سر سے بھوت پریت کا اثر دور کیا جاتا ہے تو اس کے سامنے دھونی کی جاتی ہے اور فلیتہ جلایا جاتا ہے۔

الغرض جن شیاطین جہنم اور آگ یہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں جو انسان کے عہد جاہلیت میں تیار کی گئیں اور جن کی جھنکار اب بھی گاہے گاہے سننے میں آجاتی ہے۔

اس سلسلہ میں جو روایات اہل قلم نے پیش کیں ان میں سب سے بلند مرتبہ گوئٹے کی فاوسٹ (FAUST) کا ہے جس میں شیطان کے کیریکٹر کو نہایت باوقار ثابت کر کے آخر میں اس کی نجات کی پیشین گوئی کی گئی ہے مسلمانوں میں صرف محی الدین ابن عربی نے شیطان کو زیادہ مکروہ نہیں سمجھا بلکہ وہ اس کی انانیت کو ایک خاص رمز سمجھتے ہیں۔

○ ○ ○

معصیت اور مذہب و عقل

ایک استفسار کے جواب میں

آپ کا استفسار متعدد مباحث چاہتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصل مقصود آپ کا یہ ظاہر کرنا ہے کہ پوشیدہ گناہوں سے احتراز کرنے کے لیے بہشت و دوزخ اور وجود باری کا عقیدہ ضروری ہے اور اس کے ثبوت میں آپ نے ابتداء اسلام کے عربوں کو پیش کیا ہے مجھے اس کے جواب میں آپ سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ کیا ان مذاہب و اقوام میں (مثلاً اسلام و پیروان اسلام ہی کو لے لیجئے) جو آپ کے نقطہ نظر سے وجود باری کے بھی قائل تھے اور مرنے کے بعد فردوس و جہنم سے واسطہ پڑنے کو بھی ضروری خیال کرتے تھے معصیت کرنے والے نہ پائے جاتے تھے۔ کیا وہ سب معصوم تھے آپ خیال کی معصیت کو کہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ مسلمان ہونے کے بعد وجود باری پر یقین رکھنے اور بہشت و دوزخ کے قائل ہونے کے باوصف وہ علانیہ معصیت سے بھی باز نہ آتے تھے۔ پوشیدہ گناہوں کا کیا ذکر ہے خیر اس عہد کو چھوڑیئے خود رسول اللہ اور عہد خلفاء راشدین کو لے لیجئے اور تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ اسلام لانے کے بعد مسلمانوں نے شراب بھی پی زنا بھی کیا قتل و غارت گری بھی کی چوری سے بھی باز نہ آئے مکرو فریب سے بھی ضرورت کے وقت کام لیا الغرض وہ کون سی ایسی معصیت ہے جس کا ارتکاب وجود باری و اعتقاد بہشت و دوزخ کے بعد بھی انسان نے نہیں کیا اور کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خود خلیفہ ثانی نے اپنے بیٹے پر حد جاری کی۔

مجھے حیرت ہے کہ آپ نے بالکل خلاف حقیقت یہ لکھنے کی جرات کیونکر کی کہ شیر شتر پینے والوں اور سوسمار کھانے والوں کو جب خدائی بہشت و دوزخ پر ایمان آگیا تو پھر انھوں نے خلوت و تنہائی میں بدیوں کے ارتکاب کا خیال ترک کر دیا ان شیر شتر پینے والوں اور سوسمار کھانے والوں نے تو وہ گناہ کیے ہیں کہ باید و شاید۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہر مذہب اپنے ساتھ ایک شریعت لاتا ہے یعنی دینی عقاید کے ساتھ ساتھ وہ ایک دنیاوی قانون بھی بناتا ہے جس کی مدد سے سوسائٹی کا نظام قائم رکھا

جاتا ہے اگر آپ کے خیال کے مطابق محض مذہبی عقائد گناہ سے باز رکھنے کے لیے کافی ہوں تو قانون و شریعت کی ضرورت باقی نہ رہے گی درآنحالیکہ شریعت کا نفاذ اجرا ہمیشہ ضروری خیال کیا گیا۔ کیا اسلام سے آپ ان حدود شریعت کو علیحدہ کر سکتے ہیں جن کی صراحت کلام مجید میں پائی جاتی ہے۔

اس لیے اب سوال صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ آیا مجرد عقل معصیت سے باز رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے یا نہیں مذہب کا تجربہ تو بہت کافی ہو چکا ہے اور وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اس لیے اب سوا اس کے ہم کارگاہ عقل سے مدد چاہیں اور کیا چارہ کار ہے۔

میں یہ کہنے کے لیے تو تیار نہیں کہ عقل کا استعمال وجوباً انسان کو معصیت سے باز رکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر عقل سے کام لیا جائے تو وہ بہ نسبت مذہب کے زیادہ اس میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

آپ غالباً گناہ کی حقیقت سے ناواقف نہ ہوں گے یعنی آپ یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ ایک فعل کو معصیت قرار دینے کا کیا سبب ہے آپ کوئی فعل کیجئے اس کا اثر واسطہ یا بلاواسطہ ضرور سوسائٹی کے نظام پر پڑے گا اور یہی وہ تجربہ تھا جس کی بنا پر عہد قدیم میں اچھے اور برے افعال کے درمیان خط فاصل کھینچا گیا۔ انسان کے گناہ کا علم کسی الہام کے ذریعہ سے نہیں ہوا ہے بلکہ خود حیات دنیاوی کے تجربات نے اس کو بتایا ہے کہ یہ فعل برا ہے اور وہ اچھا۔

پھر جب انسان کو اول اول اس کی عقل یا اس کے تجربہ نے یہ بتایا ہو گا کہ چوری کرنا برا ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جس فعل کو خود اس نے برا قرار دیا تھا اس کے ارتکاب کے وقت اس کے دل نے ملامت نہ کی ہو گی اور کیا قلب و ضمیر کی بار بار ملامت نے اسکو اس حرکت سے متنفر نہ کر دیا ہو گا۔

فرض کیجئے آپ ایک شراب خوار سے کہتے ہیں کہ دیکھو شراب نہ پیو ورنہ خدا برہم ہو جائے گا اور تم کو جہنم میں پھینک دے گا اب دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ واقعی خدا اور اس کے جہنم کا قائل تھا یا نہیں تھا اگر تھا تو یہ عقیدہ اسے شراب خوری سے باز نہ رکھ سکا لیکن اگر نہیں تھا تو بھی خدا و جہنم پر ایمان لانے کے بعد اس کا میخواری ترک کر دینا ضروری نہیں جبکہ بالکل یہی عقیدہ رکھنے والوں میں کبھی پوری طرح اس کا انسداد نہ ہو سکا۔ اس کے مقابلے میں دوسری صورت استعداد عقل کی اختیار کیجئے یعنی ایک شراب خوار کو بتایئے کہ اس کی یہ مذموم عادت خود اس کی صحت کے لیے بہت مضر ہے اور وہ اس کا عادی ہو کر

اپنے قواء عمل کو برباد کر رہا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ وہ اس نصیحت سے متاثر ہو کر یقیناً ترک میخواری پر آمادہ ہو جائے گا لیکن وہ اس فعل کی قباحت کو ضرور تسلیم کرنے لگے گا اور اس طرح ممکن ہے کسی وقت وہ اس سے باز آجائے۔

گناہ دوسرا نام ہے ترک فرائض کا اور ایک فرض کسی شخص پر اسی وقت عائد ہوتا ہے جب اس سے کوئی مفید نتیجہ مترتب ہو۔ اس لیے ایک شخص کا کسی طمع یا خوف کی مدد سے ادائے فرض کی طرف متوجہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اسے احساس فرض نہیں لیکن اگر وہ بغیر خیال مزدود اندیشہ تعزیر اپنے فرض کو ادا کرتا ہے تو بے شک یہ سمجھا جائے گا کہ احساس فرض شناسی اس میں موجود ہے۔

دوزخ کا خوف یا بہشت کی لالچ دلا کر کسی کو اچھے کام کی طرف راغب کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے نا سمجھ بچے کو مٹھائی کی لالچ یا مار کے خوف سے پڑھنے کی طرف مائل کرنا۔ اس لیے مذہب کا انسان سے یہ مطالبہ کہ وہ بہشت و دوزخ کا یقین کر لے گویا اس کو حد درجہ احمق و بے وقوف قرار دینا ہے اور اگر وہ اس پر عمل کرے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ واقعی ایسا ہی احمق ہے۔

اعمال انسانی کے مختلف مدارج ہیں اس کا ادنی درجہ یہ ہے کہ وہ کوئی کام صرف تعمیل حکم کی حیثیت سے کرے اور اعلی درجہ یہ ہے کہ بلاخیال احتساب فرض کو محض فرض سمجھ کر انجام دے اس لیے اگر مذہب کسی شخص کو اچھے کام کی طرف مائل کر بھی سکتا ہے تو پہلے اس میں غلامی و محکومی کی اسپرٹ پیدا کر دیتا ہے۔ برخلاف اس کے عقل کی رہبری و ہدایت آزادی ضمیر و حریت فکر ورائے پر قائم ہوتی ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

یہاں تک کہ تو صرف منطقی بحث تھی اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں آپ کچھ قیل و قال کر سکیں لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ امریکہ میں جو جدید نقشے ارتکاب جرائم کے مرتب کیے گئے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت 90 فی صدی مجرم وہی ہیں جو کسی نہ کسی مذہب کے پابند ہیں اور ملحدین میں ارتکاب جرائم کا اوسط 10 فی صد بھی نہیں ہے کیا اس سے زیادہ کوئی ثبوت اور آپ کو درکار ہے۔

آپ اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ امریکہ والے اسلام کے پابند نہیں ہیں اور آپ ذکر کر رہے ہیں اسلام کا کیونکہ جس حد تک وجود باری اور بہشت و دوزخ کے عقیدہ کا تعلق ہے وہ بالکل آپ ہی کے ہم آہنگ ہیں اور مرنے کے بعد عذاب و ثواب کی حقیقت کو بالکل آپ ہی کی طرح تسلیم کرتے ہیں۔

○ ○ ○

کیا شریعت اسلامی میں تغیرو تبدل درست نہیں؟

(بجواب استفسار)

کیا آپ نے کبھی اس پر غور فرمایا ہے کہ اسلام و شریعت دونوں ایک چیز ہیں یا ان کا مفہوم جداگانہ ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اگر یہ ایک ہیں تو کیوں اور مختلف ہیں تو ان دونوں میں باہم کیا تعلق ہے۔

آپ جس چیز کو شریعت سے تعبیر کرتے ہیں وہ فی الحقیقت فقہ اسلامی ہے اور آپ نہیں اکثر مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ فقہ اور مذہب اسلام دونوں ایک چیز ہیں اس لیے سب سے پہلے میں آپ کو بتاؤں کہ فقہ کی حقیقت کیا ہے؟

اس میں کلام نہیں کہ شریعت یا فقہ نام ہے اس مجموعہ قوانین کا جو مسلمانوں کی مذہبی سیاسی معاشرتی اور تمدنی زندگی پر حاوی ہے اور جس کی حدود سے ان کی انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو بچا ہوا نہیں ہے لیکن یہ دعوی کرنا کہ ہمارے اسلاف جو قوانین وضع کر گئے ہیں ان میں تغیرو تبدل کی ضرورت نہیں یا یہ کہ ان سے ہٹنا مذہب اسلام سے ہٹ جانا ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمانہ میں فقہ کے مفہوم کو جو اتنی اہمیت دے دی گئی ہے وہ ابتداء عہد اسلام میں مفقود تھی۔

اگر آپ نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قرون اولی میں فقہ کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور چیز بھی پائی جاتی تھی جس کا اصطلاحی نام علم تھا اور جو فقہ سے بالکل جدا حیثیت رکھتی تھی۔

علم سے مراد قرآن و تفسیر کا علم تھا اور ان روایات کا جو رسول اللہ اور صحابہ سے منسوب کی جاتی تھیں لیکن فقہ سے جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے ظاہر ہے مراد عقل ورائے کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچنا تھا اسی لیے کبھی کبھی الفاظ فقہ اور رائے مترادف حیثیت سے استعمال کیے جاتے تھے۔ الغرض علم اور فقہ دو بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں تھیں اور اسی بنا

پر مجاہد نے (من یوتی الحکمۃ) کی تفسیر میں ظاہر کیا ہے کہ صاحب حکمت سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن علم و فقہ کا ماہر ہو ہارون رشید اپنے گورنر شمہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اولوا لفقہ فی الدین اور اولوا العلم بکتب اللہ سے مشورہ کرتا رہے الغرض عالم اور فقیہ دو بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور اسی بنا پر ابن عمر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جیدالحدیث تھے لیکن جیدا لفقہ نہ تھے اور ابن عباسؓ فقہ و علم دونوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے بالفاظ دیگر گویا یوں سمجھئے کہ عالم وہ شخص کہلاتا ہے جسے صرف قرآن اور روایات کا علم ہو اور فقیہ وہ کہلاتا ہے جو مسائل میں غور و فکر کے بعد خود اپنی رائے سے کام لے کر کوئی فیصلہ کرے۔

جب اسلام بالکل ابتدائی دور سے گذر کر ارتقاء کی دوسری منزل میں آیا اور فتوحات کی وسعت کے ساتھ اسے غیر قوموں کے تمدن اور نئے نئے مسائل سے واسطہ پڑا تو بہت سی باتیں ایسی نظر آئیں جن کا ذکر نہ کلام مجید میں تھا نہ رسول اللہ کے اقوال میں اس لیے جن علماء کو عدل و انصاف کی خدمت سپرد کی گئی تھی وہ اپنی عقل و رائے سے کام لیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو علم ورائے دونوں مل جائیں اسی کا نام تفقہ فی الدین تھا اور جو اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہوتا تھا اسی کو سب سے بڑا فقیہ سمجھا جاتا تھا۔ الغرض شریعت اسلامی میں جو مرتبہ علم قرآن و حدیث کا تھا وہی بلکہ اس سے زیادہ رائے کا تھا۔ کیونکہ بغیر اس کے کام چلنا دشوار ہو جاتا۔ ایک بار امیر معاویہ نے جناب زید بن ثابت سے کسی امر میں قانونی مشورہ کیا لیکن فلم یوجد عندہ او عندہم فیہا علم (نہ وہ کوئی روایت پیش کر سکے نہ دیگر حضرات) آخر کا امیر معاویہ نے اپنی ذاتی رائے سے فیصلہ کیا ایک بار مصر کے قاضی نے خلیفہ عمر ثانی سے کسی معاملہ کے متعلق دریافت کیا آپ نے جواب دیا کہ مجھ تک اس باب میں کوئی روایت نہیں پہنچی اس لیے خود اپنی رائے سے کام لے کر فیصلہ کر دو۔

بنو امیہ کے زمانہ تک باقاعدہ تنظیم شریعت نہ ہو سکی تھی لیکن بنو عباس کے دور میں البتہ قانون سازی کی ابتداء ہوئی اور اس کے چار اصول مقرر کیے گئے قرآن سنت قیاس اور اجماع چنانچہ ان اصول پر فقہ اہل سنت کی جو کتاب سب سے پہلے مرتب کی گئی وہ مالک ابن انس کی موطا ہے اس وقت علاوہ مدینہ کے شام عراق اور ہسپانیہ میں بھی مختلف حضرات اپنی اپنی فقہ مرتب کر رہے تھے لیکن سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت موطا ہی کو حاصل ہوئی اس کے بعد عراق کی رائج کردہ فقہ کو حماد بن ابی سلیمان نے سنبھالا اور پھر ابو حنیفہ نے اس کو

چار چاند لگا دیئے اور بعد کو ان کے دو شاگرد ابو یوسف اور محمد کی خدمات تدوین شریعت میں بہت مقبول ہوئیں اور انھیں کی مرتب کردہ فقہ پر آج کل اکثر سنت عمل کر رہے ہیں۔

یہ تھا نہایت مختصر سا بیان تدوین فقہ کی تاریخ کا لیکن اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مسائل شریعت میں تمام مسلم جماعتوں کا اتفاق کبھی نہیں ہوا اور ٹھیک اسی وقت جبکہ قیاس ورائے کام لے کر قوانین و قواعد مرتب ہو رہے تھے ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اس کی سخت مخالف تھی اور وہ کہتی تھی کہ قرآن و حدیث میں کیا چیز نہیں ہے کہ ہم کو قیاس ورائے سے کام لینا پڑے' بعد کو یہ اختلاف برابر بڑھتا ہی گیا اور کبھی کوئی ایسی شریعت قائم نہ ہو سکی جس پر تمام سنیوں نے بھی اتفاق کیا ہو چہ جائیکہ شیعہ اور خوارج وغیرہ کہ اگر ان کو بھی لے لیا جائے تو پھر اختلاف کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

اس بیان سے دو باتیں واضح ہو گئیں ایک یہ کہ جس چیز کو شریعت اسلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ کوئی منصوص چیز نہیں ہے یعنی نہ خدا کی نازل کی ہوئی چیز ہے نہ رسول اللہ کی بتائی ہوئی اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں میں کبھی کوئی ایسی شریعت نہیں پائی گئی جس پر بالاتفاق سب کا عملدر آمد ہو رہا ہو اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ آپ کا یہ دعوی کرنا کہ شریعت یا فقہ میں تغیر و تبدل کو راہ دینا اسلام کو خراب کرنا ہے کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔

اس بحث میں آپ لوگ اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ دین و مذہب دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں دین سے مراد وہ اصولی عقاید ہیں جو تمام افراد میں جزو مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا مثلاً یہ کہ خدا ایک ہے اور محمد اس کے رسول ہیں لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ مذہب ہے اگر اس میں اختلاف بھی ہو تو اس کا اثر وحدت فی الدین پر نہیں پڑتا اور اسی بناء پر ایک زمانے سے یہ کہتا چلا آرہا ہوں کہ شیعہ سنی کے جھگڑے دین سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور ان کا تعلق ان مسائل سے ہے جو ہماری دینی مرکزیت یا اسلامی اشتراک پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

مذہب جس میں ہمارے سیاسی معاشرتی اور تمدنی قوانین سب شامل ہیں کبھی متفق علیہ چیز نہیں ہو سکتا اور نہ ایک جگہ قائم رہنے والی چیز ہے کیونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ ہمارے تمدن ہماری معاشرت ہمارے عادات و اطوار اور ہماری ضروریات میں تغیر ہونا ضروری ہے اور تہذیب یا کلچر کے اس تغیر کے ساتھ ہمارے اجتماعی نظام کا بدلنا بھی لازم ہے چنانچہ آپ

دیکھیے کہ آج خود ہمارے علماء کرام کی تہذیب و معاشرت کیا ہے کیا یہ بالکل وہی ہے جو عہد رسالت و خلافت میں پائی جاتی تھی اگر نہیں ہے تو آپ ان سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے شریعت کی پابندی نہیں کی کیونکہ قانون اسلامی میں ہمارے لباس وغیرہ کے مسائل بھی شامل ہیں۔

اس سے تو آپ کو انکار نہ ہو گا کہ علوم و فنون کی ترقی نے اس وقت زمان و مکان دونوں کے مفہوم کو بدل دیا ہے اور تجارت نے ہر ملک و قوم کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زندگی کے مشاغل بہت وسیع ہو گئے ہیں اور ایسے ایسے مسائل ہمارے سامنے آگئے ہیں جن کا اب سے قبل وجود تو خیر کیا وہم و گمان بھی نہ تھا ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ کے بعد ہی معاشرت کی گتھیاں سلجھانے میں لوگوں کو قرآن و احادیث سے ہٹ کر قیاس ورائے سے کام لینے کی ضرورت پڑی تو اب کہ زمانہ نے اتنی ترقی کر چکا ہے اور ہزاروں نئی باتیں پیدا ہو گئی ہیں ہم قیاس ورائے سے کیونکر قطع نظر کر سکتے ہیں اور وہ شریعت جواب سے صدیوں سال قبل مرتب ہوئی تھی وہ ہماری موجودہ زندگی میں کیا کار آمد ثابت ہو سکتی ہے قانون ہمیشہ اقوام کی زندگی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اگر کسی مذہب میں اتنا لوچ نہیں ہے کہ وہ ضروریات ملک و ملت کے لحاظ سے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر سکے تو وہ قطعاً" بے روح مذہب ہے اور زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا اگر میں یہ کہتا ہوں کہ شریعت میں تبدیلی کی ضرورت ہے تو کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ اسی مطالبہ کا اعادہ کرتا ہوں جو قرون اولی میں اکابر دین کی طرف سے کیا گیا تھا اور جس کا نتیجہ آپ کی موجودہ شریعت ہے۔

ظاہر ہے کہ سرزمین عرب میں جو قوانین مرتب کیے گئے تھے ان میں وہیں کی آبادی اور اسی زمانہ کے مقامی ماحول کو پیش نظر رکھا گیا ہو گا کیونکہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آج چین میں بیٹھ کر لندن کے لیے قانون وضع کیا جائے اور لندن میں بیٹھ کر چین کا یا یہ کہ اس وقت ہم کوئی ایسی شریعت مرتب کر دیں جو ہزار سال بعد بھی کام دے سکے پھر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت فقہ حنفی تیار ہوئی ہے اس وقت اہل عرب کو اس کا علم حاصل تھا کہ ایک وقت ہندوستان میں بھی اسلام پھیلے گا اور ان کو اپنی ملکی ضروریات کے لحاظ سے فلاں فلاں امور رشد و ہدایت کی ضرورت لاحق ہو گی یقیناً" نہیں پھر آپ کیونکر اس کا دعوی کر سکتے ہیں کہ شریعت اسلامی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بھی اتنی ہی مفید و کار آمد

ثابت ہو سکتی ہے جتنی اب سے سینکڑوں سال قبل عرب کے باشندوں کے لیے تھی اور اس میں اب کسی تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں اس سلسلہ میں ایک بات البتہ قابل غور ہے اور وہ بھی ان لوگوں کے لیے جو بہت زیادہ قدامت پرست ہیں وہ یہ کہ فقہ اسلامی میں بعض مسائل ایسے ہیں جن کی صراحت قرآن مجید میں موجود نہیں بعض احادیث سے لیے گئے ہیں اور بعض قیاس ورائے سے کام لے کر اجتہاد کیے گئے ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں جو مسائل مذکور ہیں ان کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اور وہ ایسے ہیں بھی نہیں جن میں تغیر کی ضرورت زیادہ محسوس کی جائے لیکن احادیث و قیاس کی مدد سے جو حصہ فقہ اسلامی کا مرتب ہوا ہے اس کو بدلا جا سکتا ہے اگر اس کی ضرورت محسوس ہو ایسا کرنے سے اصل دین کو کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا کیونکہ قرون اولیٰ میں بھی برابر اسی اصول پر عملدرآمد ہوتا رہا ہے اور اس کو سامنے رکھے بغیر شریعت اسلامی ہر زمانہ اور ہر ملک کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتی رہا یہ اعتراض کہ اب سے ایک ہزار سال قبل کا انسان تو اجتہاد سے کام لے سکتا تھا اور اب اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے سو اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ معترض کے سامنے بیل گاڑی اور ہوائی جہاز دونوں کو پیش کر کے خاموش ہو جاؤں۔

○ ○ ○

درود شریف

بجواب استفسار

اس سے غالباً آپ کو انکار نہ ہو گا کہ درود شریف ہو یا اور کوئی دعا ان سب کا تعلق عبادت سے ہے اس لیے سب سے پہلے مختصراً عبادت کی حقیقت کو سمجھ لیجئے۔

پرستش یا عبادت سے مراد کسی ایسی ہستی کے سامنے اظہار عجز و طلب فلاح کرنا ہے جو انسانی ہستی سے بہت بلند واقع ہوئی ہے اور جس کا اصطلاحی نام خدا ہے اس لیے عبادت کا تعلق محض جذبات انسانی سے ہے اور الفاظ و حرکات کو اس میں کوئی اہمیت حاصل نہ ہونا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ خدا کا تصور جو عام طور پر مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے وہ اتنا عجیب و غریب ہے کہ اس کے سامنے انسان اپنی انفرادیت و شخصیت' اپنی رائے و تمیز' اپنی آزادی و خودداری سب کچھ کھو بیٹھتا ہے اور اپنے تمام قواء ذہنیہ معطل کرنے کے بعد ہی وہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس نے حق بندگی ادا کیا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ جب معاملہ خدا ایسی عجیب و غریب ہستی کو خوش کرنے یا ناخوش رکھنے کا ہو تو ایک بندہ خدا کے جذبات نیایش و پرستش کی شدت کا کیا عالم ہو گا اور کسی شدید تاثر کے ساتھ حضوری کا تصور اس پر مستولی ہونا چاہیے۔

پھر چونکہ ایک مذہبی انسان یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ خدا اپنی تمام لازوال و غیر متناہی قوتوں کے ساتھ ساتھ ہر وقت گوش برآواز بھی رہتا ہے اور بصارت مطلق ہونے کی بھی صفت کا حامل ہے اس لیے وہ اس کی تعریف میں کچھ الفاظ بھی اپنی زبان سے ادا کرتا ہے جس کا نام حمد و ثنا ہے اور اپنے حرکات سے اپنے عجز و تذلل کو بھی ظاہر کرنا چاہتا ہے جس کا نام رکوع و سجود وغیرہ ہے۔

مذہب نے خدا اور بندہ کے درمیان اس تعلق کا تصور چونکہ اسی دنیا کے شاہ و گدا کو سامنے رکھ کر کیا ہے اسی لیے وہی تمام باتیں جو یہاں کی ایک خود مختار فرمانروا ہستی کو خوش کرنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں خدا سے بھی متعلق کر دی گئیں اور عبادت یا حمد و ثنا کی صورت بھی تقریباً وہی قرار دی گئی جو کسی دربار شاہی میں رعایا و خدام کی طرف سے

زمین بوسی وغیرہ کی صورت میں نظر آتی ہے اور ان میں سوا اس کے کوئی فرق نہ رکھا گیا کہ خدا کی تعریف کا نام حمد اور بادشاہ کی تعریف کا بہ تبدیلی حروف مدح ہے اس کو خدا کے لفظ سے یاد کرتے تھے تو اس کو اور چند حروف کے اضافہ کے ساتھ خداوند کہنے لگے انھوں نے سوچا کہ اگر بادشاہ اپنی تعریف سے خوش ہو کر انعام و اکرام کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدا بھی خوش ہو کر بخشش و عطا سے کام نہ لے اور اگر بادشاہ بغاوت اور عدول حکم سے برہم ہوتا ہے تو یقیناً" خدا کو بھی سرکشی و نافرمانی سے غضبناک ہونا چاہیے۔

میں یہاں اس امر سے بحث نہ کروں گا کہ خدا کا یہ تصور اور عبادت کا یہ فلسفہ بجائے خود کس قدر لغو و مہمل ہے کیونکہ موضوع زیر بحث سے اس کو کوئی تعلق نہیں میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ درود شریف یا کسی اور طریق عبادت سے انسان کو تسکین ہونا چاہیے یا نہیں؟

جب خدا اور بندہ کا تعلق وہی قرار پایا جو آقا و خادم یا مولی و غلام کا ہے تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ حصول مقصود کے لیے جو ذرائع یہاں موثر ہو سکتے ہیں وہی وہاں بھی کارگر سمجھے جائیں گے اور جس طرح یہاں انسان کو اپنی امیدوں کی تکمیل کے خیال سے تسکین پہنچتی ہے اسی طرح وہاں کی آرزوؤں کی تکمیل کے خیال سے بھی پہنچنا چاہیے۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ خدا کی عبادت کسی غرض پر مبنی نہیں ہے دنیاوی ثروت و دولت نہ سہی اخروی آسائش و راحت تو ہے زہرہ صبح و جام بلور نہ سہی جنت کا موتی محل اور وہاں کی اچھوتی حور تو ہے اور زیادہ بلند جایئے قرب خداوندی کی تمنا تو ہے؟ اس سے زیادہ اور عمیق فلسفہ تراشی کیجئے جز اصلی میں گم ہونا تو ہے حدود تعینات سے گذر کر لا متناہی میں جذب ہو جانا تو ہے؟ بہرحال عبادت کا خیال خواہ وہ کسی نہج وصورت سے ہو غرض سے خالی نہیں ہے اور اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ ہماری کوئی غرض ہمارے کسی قول و فعل سے پوری ہو سکتی ہے تو اس قول یا فعل سے تسکین ہونا ضروری ہے۔

بنابریں اگر درود شریف کے ورد سے آپ کو تسکین ہوتی ہے تو اس کا کھلا ہوا نفسیاتی سبب موجود ہے اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نفس درود شریف کے الفاظ میں کوئی خاص اثر پوشیدہ ہے اور ہر شخص اس سے وہی تسکین حاصل کر سکتا ہے جو آپ کو حاصل ہوتی ہے۔

درود شریف کے ورد سے جو سکون قلب آپ کو میسر آتا ہے بالکل وہی ایک ہندو کو گائتری کے پڑھنے سے ایک عیسائی کو دعائے یسوع کے ورد سے حاصل ہوتا ہے اور اس

ہے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حقیقتاً" نہ درود کے الفاظ میں کوئی طلسمی اثر موجود ہے نہ گائنتری اور دعائے یسوع میں بلکہ اس کا تعلق خود اپنے اعتقاد و یقین سے ہے آپ ایک ہندو سے کہیے کہ وہ درود پڑھا کرے اور آپ گائنتری کی جاپ کیجئے نہ آپ کو تسکین حاصل ہو گی نہ ہندو کو۔

اگر آپ کو درود شریف اور نماز سے کوئی ذہنی فائدہ پہنچتا ہے تو یقیناً" آپ کو اس کی پابندی کرنا چاہیے اور تمام نفوس کے لیے جو بغیر اس قسم کی تدابیر کے اپنی وحشت نہیں کھو سکتے علاج کی یہی صورت مناسب ہے آپ نے وہ قصہ پڑھا ہو گا کہ لومڑی ایک شیر کو ہلاک کرنے کے لیے کسی طرح اس کو ایک کنوئیں پر لے گئی اور وہاں پہنچ کر جب شیر نے اپنا عکس دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ کوئی دوسرا شیر جنگل میں آگیا ہے اس پر حملہ کرنے کے لیے کنوئیں کے اندر پھاند پڑا۔

اب رہا نفس درود شریف کے دعا ہونے کا مسئلہ سو درود شریف ایک دعا و التجا تو ضرور ہے لیکن اپنے لیے نہیں اور دوسروں کے لیے عام طور پر درود شریف میں جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ یہ ہیں۔

اللھم صلی اللہ علی محمد وعلی آل محمد واصحابہ حضرات شیعہ آل محمد سے آگے نہیں بڑھتے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اے خدا محمد و آل محمد و اصحاب رسول پر برکت نازل کر کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ پر نزول برکات کی دعا سے خدا خوش ہوتا ہے اور دعا مانگنے والے کو بھی اس کا ثواب ملتا ہے ثواب سے مراد ہی خوشنودی خدا اعمال سیئہ کی معافی اور آخر کار وہی بہشت و کوثر یا قرب خداوندی ہے جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔

درود میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ درود پڑھنے والا خود کوئی خواہش اپنی پیش کرتا ہے بلکہ وہ رسول و آل رسول کے لیے دعا کرتا ہے درآنحالیکہ ایسی برگزیدہ ہستیوں کے لیے نزول برکات کی دعا کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا یہ کہنا کہ۔

دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز

میں نہیں سمجھتا کہ تحصیل حاصل کی اس سے زیادہ بہتر مثال کوئی اور پیش کی جا سکتی ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ آپ درود کا ورد اس کو سمجھ کر کرتے ہیں یا بغیر سمجھے لیکن گمان غالب یہی ہے کہ اس کے مفہوم پر غور کئے بغیر یہ مشغلہ جاری رکھتے ہیں ورنہ یہ تسکین و سکون سب ختم ہو جاتی اور میری طرح آپ بھی گمراہ ہو جاتے۔

○ ○ ○